JAMMU MEIN URDU NASR KA AAGAZ O IRTEQA

A thesis submitted to the University of Hyderabad in partial fulfillment of the requirement for the award of the degree of

DOCTOR OF PHILOSOPHY

in

Urdu

Submitted by

PARSHOTAM SINGH

Reg. No. 17HUPH01

Supervisor

Dr. Rafia Begum

Assistant Professor

Department of Urdu
School of Humanities
University of Hyderabad
Hyderabad-500046
Telangana, India

June-2022

प्रतिष्ठित संस्थान
INSTITUTION OF EMINENCE

جموں میں اردو نثر کا آغاز و ارتقاء

مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی

جون 2022ء

مقالہ نگار

پرشوتم سنگھ

Reg No. 17HUPH01

نگراں

ڈاکٹر رفیعہ بیگم

اسسٹنٹ پروفیسر

شعبۂ اُردو
اسکول آف ہیومانیٹیز
یونیورسٹی آف حیدرآباد
حیدرآباد 500046
تلنگانہ، انڈیا

University of Hyderabad

(A Central University by an Act of the Parliament)

Department of Urdu School of Humanities

प्रतिष्ठित संस्थान
INSTITUTION OF EMINENCE

DECLARATION

I, **PARSHOTAM SINGH,** hereby declare that the research embodied in the present thesis entitled **“JAMMU MEIN URDU NASR KA AAGAZ O IRTEQA"** submitted by me under the supervision of **Dr. Rafia Begum** is a bonafide research work for the award of **Doctor of Philosophy** in **Urdu** from the **University of Hyderabad**. I also declare to the best of my knowledge that it has not been submitted in part or full to this or any other university or institution for the award of any degree or diploma. I hereby declare that my thesis can be deposited in Shodganga/ INFLIBNET.

Date: 30-06-2022

Name: **PARSHOTAM SINGH**

Signature of the Student

Reg. No.17HUPH01

University of Hyderabad
(A Central University by an Act of the Parliament)
Department of Urdu School of Humanities

CERTIFICATE

This is to certify that the thesis entitled **"JAMMU MEIN URDU NASR KA AAGAZ O IRTEQA"** submitted by **PARSHOTAM SINGH** bearing Enrolment Number **17HUPH01** in partial fulfillment of the requirements for award of **Doctor of Philosophy** in the School of Humanities, Department of Urdu is bonafide work carried out by his under my supervision and guidance. The thesis is free from plagiarism and has not been submitted previously in part or full to this or any other university or institution for award of any degree or diploma.

Papers related to this thesis have been:

A. Published in the following publications.

1. "Nusrat Choudhary: Bahaisiyat Faiz Shanas", Sabras, Pages:44-48, January -2022, (ISSN: 2278-6902)
2. "Maulana Abul Kalam Azad Ki Nasr Nigari", Qaumi Zuban, Pages:47, November-2019, (ISSN: 2321-4627)

B.Presented at the following Conferences.

1. Three- day International Seminar on, "Jammu Ki Tahzeeb-O- Saqafat Ek Jaeza" 25-27 February 2019, at Dept. of Urdu, Banaras Hindu University Varanasi, U.P.India.
2. Two- day International Seminar on "Anand Lehar Ke Novelon Mein Qaumi Yekjehti" on 25-26 March 2021, at Department of Urdu, Satavahana University Karimnagar

Further, the student has passed the following courses towards fulfillment of coursework requirement for Ph.D. on the basis of the following courses passed during his Ph.D. programme.

S.No.	Course No.	Course Title	Credits	Result
01	UR801	Research Methodology	4.00	Pass
02	UR802	Practical Criticism	4.00	Pass
03	UR821	Textual Criticism	4.00	Pass

Supervisor **Head of the Department** **Dean School of Humanities**

حیدرآباد فرخندہ بنیاد سے شائع ہونے والا قدیم متوازن علمی و ادبی ماہ نامہ

سب رس

جنوری 2022
30/- روپے

APPROVED IN THE UGC CARE LIST SL.NO. 869

ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد

THE SABRAS URDU MONTHLY

ORGAN OF IDARA-E-ADABIYAT-E-URDU

Vol.84/Issue-01, January 2022

RNI No. 10922-57

Postal Regd. No.: RNP/HD/970/2021-2023

ISSN-2278-6902

Date of Publication: 15th of every month.

Date of Dispatch: 20th of every month.

Rs. 30/-

سیاست

حیدرآبادی دور،

ثقافت اور طرز زندگی کا

مصدقہ عکاس!

سیاست آج ملک کے موقر اردو روزناموں میں اپنی نوعیت کا ایک منفرد اخبار ہے۔ سیاست نے دیگر ممالک میں بسے ہوئے اردو قارئین کی روز مرہ کی زندگی میں اپنا ایک نمایاں مقام بنایا ہے۔ اخبار کی روزانہ بذریعہ طیارہ مشرق وسطی، یو کے، یو ایس اے اور کینڈا ترسیل عمل میں آتی ہے۔

... اور وہ حیدرآبادی حضرات جو اپنے وطن سے دور ہیں، سیاست کے مطالعہ کے بعد خود کو حیدرآباد میں ہی محسوس کرتے ہیں۔ سیاست کی ویب سائٹ کے ذریعہ انہیں حیدرآبادی ثقافت، مناظر، ذائقہ اور گنگا جمنی تہذیب اور روایات تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔ ایک ایسی ویب سائٹ جسے 107 ممالک سے روزانہ چار لاکھ ہٹس موصول ہوتے ہیں۔

سیاست نے اردو زبان سے واقف قارئین کے دلوں تک رسائی حاصل کر کے ایک بار پھر بطور روزنامہ اپنی مقبولیت کو ثابت کر رہا ہے۔

روزنامہ سیاست حیدرآباد

The Siasat Daily

J.N. Road, Abids, Hyderabad - 500 001 (A.P.)
Tel : 24744180, 24603666, 24744109, 24744114
Fax : Editorial : 040-24603188, Advertisement : 24610379
Website : www.siasat.com, E-mail : siasat.daily@yahoo.com

حیدرآباد کا دوسرا نام سیاست

Printed and Published by Prof. S.A.Shukoor on behalf of Idara-e-Adabiyat-e-urdu,
Printed at Taahaa Print Systems, Lakdi-ka-pul, Hyderabad and Published at Idara-e-Adabiyat-e-Urdu
Aiwan-e-Urdu, Panjagutta Road, Somajiguda, Hyderabad-500 082 (T.S.) Editor : Prof. S.A.Shukoor Ph : 040-23310469

اس شمارے میں

اداریہ

پروفیسر ایس۔اے۔شکور 6-7

نقد مکرر

حب وطن — ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور 8-12

خصوصی مضمون

دیدہ و شنیدہ — راجکماری اندرا دیوی دھن راج گیر/اشرف رفیع 13-14

مضامین

سوشیل میڈیا چند تعلیمی مباحث — ڈاکٹر آفتاب عالم بیگ 15-17

اردو سفرناموں کے فروغ میں خواتین کا حصہ — ڈاکٹر رفیعہ سلیم 18-25

جہاں آراء: مغل حرم کی ایک ہمہ جہت شخصیت — ڈاکٹر قیصر احمد 26-29

عصمت چغتائی کی ڈرامائی کائنات — اشفاق احمد آہنگر 30-35

سلطان محمد قلی قطب شاہ ناقدین کی نظر میں — خیر الدین آعظم 36-43

نصرت چودھری: بحیثیت فیض شناس — پرشوتم سنگھ 44-48

شاعری

اسلم عمادی، شاہد پٹھان، احسن رضوی، مسرور عابدی، جمیل نظام آبادی، کامل حیدرآبادی، صادقہ نواب سحر، گل بخشالوی، انجنی کمار گوئل 49-53

افسانے

پھر صبح ہوئی — لکشمی دیوی راج 54-60

مصبا بنو کی کہانی اور مرگِ ناگہانی — ڈاکٹر غلام شبیر رانا 61-75

پردہ — جبین 76-81

نصرت چودھری: بحیثیت فیض شناس

مضمون ________ پرشوتم سنگھ

نصرت آرا چودھری؛ پروفیسر نصرت آرا چودھری ریاست جموں وکشمیر میں اردو زبان وادب کے حوالے سے ایک بہترین افسانہ نگار شاعرہ، محقق اور نقاد ہیں۔ پروفیسر نصرت چودھری کی پیدائش 4 مارچ 1955 کو ضلع جموں کے دور دراز علاقہ علاپونچھ میں ہوئی تھی۔ جموں و کشمیر میں اردو تنقید و تحقیق کے عصری منظرنامے میں نصرت چودھری کا بھی ایک اہم نام ہے۔ انہوں نے 1981ء میں کشمیر یونیورسٹی سے ایم۔اے۔اردو میں امتیازی کامیابی حاصل کی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے اسی یونیورسٹی سے 1983ء میں اپنے ایم۔فل کا مقالہ لکھا تھا اور پھر انہوں نے جموں یونیورسٹی کا رخ کیا جہاں سے انہوں نے فیض احمد فیض کی شخصیت اور شاعری کے موضوع پر اپنی، پی۔ایچ۔ڈی۔کا مقالہ مکمل کیا۔

اگر چہ انہوں نے اردو زبان وادب میں شاعری اور افسانہ نگاری سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا تھا مگر اس کے بعد انہوں نے تحقیق و تنقید کی طرف اپنا رخ موڑ دیا۔ اور لگ بھگ 1985ء کے بعد سے اردو تحقیق وتنقید میں ان کے اکثر کارنامے دیکھے جاسکتے ہیں، بلکہ یوں کہا جاسکتا کہ 1985ء کے بعد سے انہوں نے اپنی ساری توجہ تحقیق وتنقید پر ہی مرکوز کی۔ اردو تحقیق وتنقید کے حوالے سے ان کی تصانیف میں خاص طور پر "فیض احمد فیض کی شاعری: ایک مطالعہ "، "فیض احمد فیض: روایت اور انفرادیت"، "اردو تنقید میں فیض شناسی"، "فیض احمد فیض اور جدید شعری ذہن"، "اردو کے چند اہم افسانوں کا تجزیاتی جائزہ"، جموں میں اردو افسانے کا منظرنامہ"، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ان متذکرہ بالا تصانیف سے ہم خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ نصرت آرا چودھری فیض احمد کی شخصیت سے بہت زیادہ متاثر نظر آتی ہیں۔ فیض شناسی کے حوالے سے اپنا ایک منفرد مقام رکھتی ہیں۔ نصرت چودھری کی کتاب فیض احمد فیض کی شاعری: ایک مطالعہ بہت ہی مستند کتاب ہے۔ ان کی یہ کتاب کل 222 صفحات پر مشتمل ہے جو 1984ء میں شان پبلیشنگ ہاؤس سرینگر سے شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں مصنفہ نے فیض احمد فیض کی شاعری کے متعلق جن موضوعات کو پیش کیا ہے ان میں خاص طور پر فیض احمد فیض کا تخلیقی عمل، فیض کا ذہنی ارتقاء، فیض کی شاعری اور روایتی اصناف سخن کی شاعری کا نسائی پہلو اہمیت کا حامل ہے، فیض متقدمین اور معاصرین، فیض اور مغربی شعراء، فیض سے ایک ملاقات وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ امر غور طلب ہے کہ فیض احمد فیض کی شاعری کے حوالے سے متعدد کتابیں اب تک منظر عام پر آچکی ہیں اور فیض کے موضوع پر ملک بھر میں فیض صدی کے حوالے سے بے شمار سیمینار، مشاعرے اور ادبی محفلیں منعقد کی جاتی رہی ہیں، لیکن فیض کی شخصیت پر نصرت چودھری کی یہ کتاب بہت سارے اہم پہلوؤں سے ہمیں روشناس کراتی ہے، جس میں مصنفہ نے فیض کی شخصیت، روایتی پاسداری کے حوالے سے ان کے کلام کا مفصل تجزیہ پیش کیا ہے۔ اس کتاب کی ادبی حلقوں میں کافی پزیرائی ہوئی اور بہت سارے قلم کاروں نے اس کتاب سے استفادہ بھی کیا۔ نصرت چودھری نے نہ صرف فیض احمد فیض کو پڑھا تھا بلکہ ان سے ملاقاتیں بھی کی تھیں، اس دوران انہوں نے فیض احمد فیض سے انکی نجی اور ادبی زندگی سے متعلق بہت سارے سوالات بھی اٹھائے تھے۔ جس میں فیض کے ہم عصر شعراء، فیض کی شاعری، زبان و بیان کی روایت، فیض احمد فیض کے دور کا بڑا شاعر، ہیئتی تجربے، فیض کے پسندیدہ شعراء، فیض کی شاعری کے

پوشیدہ پہلو، فیض کی پنجابی شاعری، ترقی پسند تحریک اور اور ترقی پسند تحریک کے شعرا میں بنیادی فرق، شاعری کے بارے میں فیض کے خیالات وغیرہ جیسے اہم سوالات شامل تھے۔فیض احمد فیض سے کیے گئے سوالات کو مصنفہ نے مذکورہ مقالے میں پیش کیا ہے۔ایک جگہ پر وہ فیض احمد فیض سے یوں سوال کرتی ہیں:

> نصرت: ترقی پسند تحریک اور غیر ترقی پسند تحریک کے شعراء میں آپ کے نزدیک بنیادی فرق کیا ہے؟
>
> فیض: ترقی پسند تحریک کے شاعر اور دوسروں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ وہ اپنے معاشرے کو، معاشرہ کی تاریخ کو اور معاشرہ کے مستقبل کو ایک خاص زاویے سے دیکھتے ہیں۔دوسرے یا تو سرے سے دیکھتے ہی نہیں اور اگر دیکھتے ہیں تو اس کو دوسرے زاویے سے دیکھتے ہیں۔لیکن یہ نہیں ہے کہ ترقی پسند شعرا کو عاشقانہ شعرا لکھنے کی ممانعت ہے۔یا ان پر قید لگا دی گئی ہے کہ وہ فلاں مضمون پر نہیں لکھ سکتے فرق صرف یہ ہے کہ ترقی پسند شاعر کوشش کرتا ہے کہ آج کی دنیا کی جو بھی حقیقت ہے اس کو دیانتداری سے پیش کریں اس میں ہر طرح کے تجربے کی آزادی ہے اس میں ذاتی عاشقی بھی شامل ہے"

بحوالہ فیض کی شاعری: ایک مطالعہ , ص۔197 سن اشاعت، 1984ء شان پبلیشنگ ہاؤس سرینگر۔

ایک اور اہم سوال نصرت چوہدری نے ان کی اہم اور پسندیدہ نظم "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" کے حوالے سے کیا تھا تھا ملاحظہ ہو۔

''نصرت: آپ نے مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ جیسی نظمیں لکھ کر عاشقی کو شاعری سے نکال نہیں دیا گیا؟

> فیض: (ہلکی سی ہنسی) نہیں ہم نے بالکل نہیں نکالا یہ کہنا بھی تو ایک طرح سے عشق کا اعتراف ہے بات صرف اہمیت کی آجاتی ہے۔کب کس وقت کون سے مسائل اہم ہیں اور کون سے غیر اہم مگر شامل تو سبھی ہوتے ہیں"

بحوالہ "فیض کی شاعری ایک مطالعہ "ص۔197 ایضاً

نصرت چودھری نے فیض احمد فیض کے موضوع پر کشمیر یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔اور ان کا محبوب شاعر بھی فیض احمد فیض ہی تھا۔"فیض کی شاعری: ایک مطالعہ" میں مصنفہ نے فیض کی نہ صرف دلبستگی کی دلیلیں پیش کی ہیں۔بلکہ ایک اچھی نقاد بن کر سامنے آئی ہیں۔اس کتاب کے حوالے سے جگن ناتھ آزاد صاحب نے لکھا ہے۔

> "اس انٹرویو میں نصرت نے فیض کو جس طرح کریدا ہے وہ ان کے لیے ہر اعتبار سے قابل تعریف ہے کیونکہ ان کی اس کاوش کی بدولت فیض نے بعض ایسے موضوعات پر تفصیل سے کہا جن کے متعلق انہوں نے ابھی تک تفصیل سے نہیں کہا تھا مثلاً زبان کے حوالے سے روایت کا تعین یا فیض کی پنجابی شاعری وغیرہ "۔

بحوالہ "فیض کی شاعری: ایک مطالعہ-ص-6 -ایضاً

"فیض احمد فیض روایت اور انفرادیت" کے عنوان سے بھی نصرت چودھری کی ایک اچھی کتاب ہے۔یہ کتاب 342 صفات پر مشتمل ہے۔جو 1955ء میں دریائے گنج نئی دہلی سے شائع ہوئی تھی۔مصنفہ نے اس کتاب کو کل پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔جس میں انہوں نے فیض کی حیات سے لے کران کی تمام ادبی کاوشوں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔اور فیض کی شعری انفرادیت کا راز منظر عام پر لانے کے لئے مصنفہ نے ان کی روایت کے شعور کا بہترین انداز میں تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔اور ساتھ ہی ساتھ انہوں نے اس کتاب میں فیض احمد فیض کی شاعری میں روایت کے عوامل اثرات اور روایت کے جدید مفاہیم پر تفصیل سے بحث کی ہے۔اس کام کو انجام دینے میں نصرت چودھری پوری طرح سے کامیاب ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں،جس طرح سے انہوں نے فیض احمد فیض کی روایت،انفرادیت اور بغاوت کی اصطلاحوں پر جدید تنقیدی شعور کو زیر بحث لایا ہے اس کام کے لیے مصنفہ کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ایک جگہ پر وہ فیض احمد فیض کی رومانی شاعری کے بارے میں لکھتی ہیں کہ:

"فیض کا رومانی طرز فکر آج کے ذہن کے لیے کوئی معنویت نہیں رکھتا۔رومانی فنکار زندگی کی حقیقتوں سے گریز کر کے خیال و جواب کی دنیا آباد کرتا ہے۔اور اس میں اپنی ذات کا تحفظ کرنا چاہتا ہے۔لیکن آج کے فنکار کی شخصیت خارجی حالات کے دباؤ سے شکست وریخت کی شکار ہے۔۔۔۔۔۔فیض کی شاعری میں ہمیں آفاقیت کے درخشاں نقوش نظر آتے ہیں۔یہ ان کی شاعری کے وہ عناصر ہیں جو ہمیں عصری شاعری میں بھی نظر آتے ہیں"

بحوالہ "فیض احمد فیض: روایت اور انفرادیت" ص-321 سن اشاعت-1995،دریائے گنج نئی دہلی۔

نصرت چودھری نے اس کتاب میں فیض احمد فیض کی شاعری کے فنی لوازمات کو بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔زبان و بیان کے میدان میں نصرت چودھری ایک الگ انداز اپناتی ہیں،ان کی نظر موضوع کی گرفت پر بھی رہتی ہے اور قاری کی دلچسپی کا بھی وہ خیال رکھتی ہیں۔فیض کی انفرادیت،شخصیت اور شاعری کے جن موضوعات پر انہوں نے روشنی ڈالی ہے۔اس سے فیض کی ادبی خدمات ہمارے سامنے آ جاتی ہیں۔نریندر ناتھ سوز نے نصرت چودھری کی کتاب "فیض احمد فیض: روایت اور انفرادیت" کا جائزہ لیتے ہوئے اظہار خیال کیا کہ:

"اس کتاب میں فیض کی شاعری کا مطالعہ ایک نئے تنقیدی نقطہ نظر سے کرنے کی کوشش کی گئی ہے یعنی ان کی شاعری کا مطالعہ روایت اور انفرادیت کے عمل اور ردعمل اور اس کے باہمی توافق کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ اور ساتھ ہی فیض کی شخصیت اور ان کی تخلیقات کو بھی مرکز توجہ بنایا گیا ہے ''

بحوالہ "فیض احمد فیض: روایت اور انفرادیت" ص-2

"نبض افسانہ" نصرت چودھری کی تحقیقی وتنقیدی کاوشوں کا مجموعہ ہے۔جس میں مصنفہ نے بہت سارے افسانہ نگاروں کے افسانوں پر تحقیقی وتنقیدی حوالے سے روشنی ڈالی ہے۔یہ کتاب کل تیرہ{13)افسانوں کے تحقیقی وتنقیدی مضامین پر مشتمل ہے۔جو 2002ء میں دریائے گنج نئی دہلی سے منظر عام پر کر داد و تحسین حاصل کر چکی ہے۔نصرت چودھری نے اس کتاب میں ریاست اور بیرون ریاست کے

منتخب افسانہ نگاروں کے افسانوں پر تجزیے کیے ہیں۔ جن میں خاص طور پر پریم چند کا افسانہ " کفن "، علی عباس حسینی کا" میلہ گھومنی "، کرشن چندر کا" کالو بھنگی، منٹو کا' ٹوبہ ٹیک سنگھ '، "عصمت چغتائی کا" چوتھی کا جوڑا" قرۃ العین حیدر کا" جلاوطن "، جیلانی بانو کا" کلچرل اکیڈمی "، "انتظار حسین کا" شہر افسوس "، "سریندر پرکاش کا" دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم "، "ظہور الدین کا" بیگ والا" وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

"نبض افسانہ" کے عنوان سے مصنفہ نے اس کتاب میں اردو افسانے کی روایت پر روشنی ڈالی ہے۔ کلاسیکی افسانے سے لے کر جدید دور کے افسانے تک افسانہ نگاروں کی افسانہ نگاری کا تجزیہ کیا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ روایت اور جدیدیت کے اہم پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ نصرت چوہدری نے افسانوں کے انتخاب کے ساتھ ساتھ افسانے کے ارتقائی عمل کو زیر بحث لایا ہے اس کتاب میں منتخب افسانوں پر تجزیہ کرنا ان کا مقصد تھا کہ نئی نسل کے طلبہ افسانہ نگاری کے فن سے روبرو ہو سکیں اور افسانے کی داخلی جہت پر بھی غور و فکر کر سکیں جس کی وجہ سے ان کے اندر داخلی سطح پر معنوی ربط تلاش کرنے کی جستجو پیدا ہو سکے۔ مصنفہ نے اس تصنیف میں مذکورہ بالا ہر افسانے کی وضاحت شعوری طور پر مختلف نظریوں سے کرنے کی کوشش کی ہے ان افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد جو نتیجہ اخذ ہوا ہے اسی کو مصنفہ نے اپنی اس کتاب میں پیش کیا ہے۔ پریم چند کے افسانہ " کفن " کے بارے میں مصنفہ لکھتی ہیں

> "جس سماج میں رات دن کام کرنے والوں کی حالت ان کی حالت سے کچھ بہت اچھی نہ تھی۔ اور کسانوں کے مقابلے میں وہ لوگ جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے کہیں زیادہ فارغ البال تھے۔ وہاں اس قسم کی ذہنیت کا پیدا ہونا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ ہم تو کہیں گے گھیسو کسانوں کے مقابلے میں زیادہ باریک بین تھا۔ اور کسانوں کی تہی دماغ جمعیت میں شامل ہونے کے بدلے شاطروں کی فتنہ پرداز جماعت میں شامل ہو گیا"

بحوالہ "نبض افسانہ: انتخاب اور تجزیے" ص۔15 سن اشاعت 2002ء دریا گنج نئی دہلی۔

پروفیسر ظہور الدین کا افسانہ "بیگ والا" جدید دور میں ایک علامتی افسانہ ہے۔ ان علامتوں میں افسانہ نگار نے اہم نکتوں کو ابھارا ہے اس کے علاوہ انہوں نے اس افسانے میں آج کے عہد کے تضادات، ذہنی کشمکش، اختلاف رائے اور حد بندیوں کو اس افسانے میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے، یہی سب ہے کہ اس افسانے میں مصنفہ نے دکھانے کی کوشش کی ہے کہ جس کا تجزیہ کرتے ہوئے نصرت چودھری لکھتی ہیں:

> 'ان علامتوں میں افسانہ نگار نے اہم نکتوں کو ابھارا ہے۔ ویسے تو بہتے ہوئے پانی کی طرح اپنی راہ تلاش کرنا نہ صرف انسانی فطرت ہے بلکہ ضرورت بھی۔ مگر بوڑھے ماں باپ جو خود زندگی کے بیشتر گرم و سرد سہہ کر جہاندیدہ ہو جاتے ہیں وہ اس حصار سے کبھی باہر نہیں آپاتے کہ انھوں نے جس انداز سے زندگی گزاردی ہے وہی صراط مستقیم ہے اور یہ بھی کہ اپنی زندگی کے بیگ میں انہوں نے جو کچھ سنبھال کے رکھا ہے وہی دراصل حاصل زندگی ہے۔"

بحوالہ "نبض افسانہ: انتخاب اور تجزیے" ص۔304 سن اشاعت 2002ء دریا گنج نئی دہلی۔

نصرت چودھری کی تحقیقی وتنقیدی تحریروں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی موضوع پر جب قلم اٹھاتی ہیں تو سب سے پہلے وہ موضوع کی گہرائی میں اس کی تہ تک جا کر چھان بین کر کے مقالے کو ضبط تحریر میں لاتی ہیں۔ وہ کسی سنی سنائی بات پر غور نہیں کرتی ہیں بلکہ خود مطالعہ کرتی ہیں، جس کی مثال فیض احمد فیض کی شخصیت اور شاعری ہے جس میں مصنفہ نے فیض کی شاعری کے ہر پہلو کو باریک بینی سے جانچنے کی کوشش کی ہے اور جہاں انہیں فیض کے حوالے سے کوئی اشتباہ پیدا ہوتا تو وہ خود فیض صاحب سے انٹرویو لے کر اس بات کو حل کرنے کی کوشش کرتیں، بقول ڈاکٹر لیاقت علی:

"ضرورت کے مطابق فن پارہ متن یا متون کو حرف حرف لفظ لفظ افزود خود پڑھ کر اس متن شعر، نظم، یا افسانہ کے لسانی پہلوؤں موضوعی معنویت، جمالیاتی محاسن اور فنی انفرادا ور تہہ داری کی نشاندی تحقیقی اور تنقیدی افکار و دلائل کے ساتھ کرتی ہیں۔"

بحوالہ "جموں وکشمیر میں اردو ادب "2000 تا 2013، سن اشاعت 2017ء دریائے گنج نئی دہلی.

اگر چہ فیض احمد فیض کی شاعری اور شخصیت کے حوالے سے کئی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں لیکن جب بھی فیض احمد فیض کی شخصیت کے حوالے سے بات کی جائے گی تو نصرت چودھری کی تحقیقی وتنقیدی کاوشوں کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔ نصرت چودھری کی ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ کسی پختہ کار دانشور کی طرح سے سب سے پہلے اپنے تحقیقی منصوبے کا مقصد قائم کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور اس کے بعد اس موضوع کی معنویت کو پرکھنے کے لیے موضوع کے متعلق سوالات قائم کرتی ہیں۔ مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نصرت چودھری نے جس محنت اور لگن سے فیض کی شخصیت اور شاعری پر تصانیف تخلیق کی ہیں، قابل تعریف ہیں اور نثر نگار کے علاوہ ایک اچھی شاعرہ بھی ہیں، اس حوالے سے ان کا مشہور شعری مجموعہ 2004 میں "ہتھیلی کا چاند" کے عنوان سے منظر عام پر آ چکا ہے۔ اور میں آخر میں ان کے اشعار سے اختتام کرتا ہوں،

دکھ دیکھ میرا تجھ کو اگر کچھ دکھائی دے
نا دیدہ غمزدوں کی نہ مجھ کو دہائی دے
زمانے بھر میں، میں بدنام ہو گئی اللہ
میں کیا کروں ترے در سے وحی نہیں آتی

قلم کاروں سے التماس

☆ برائے کرم مسودہ صاف اور خوش خط لکھیں۔
☆ مقالہ صفحے کی ایک جانب لکھا ہوا ہو۔
☆ سطروں کے درمیان فاصلہ چھوڑیں۔
☆ کمپوز کیے ہوئے مسودہ کا پروف اچھی طرح دیکھ لیں۔
☆ اپنے مضامین اور تخلیقات "idarasabras@yahoo.in" پر بھیج سکتے ہیں۔

ماہنامہ

قومی زبان

حیدرآباد

تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈمی کا علمی، ادبی، لسانی، فنی و سائنسی جریدہ

نومبر 2019ء

-/15 روپے

ISSN 2321-4627

... ی

... 12 نومبر1844

اکبرالہ آبادی

تاریخ پیدائش 16 نومبر1846

مولوی عبدالحق

تاریخ پیدائش 16 نومبر1870

علامہ اقبال

تاریخ پیدائش 09 نومبر1877

علامہ سید سلیمان ندوی

تاریخ پیدائش 22 نومبر1884

مولانا ابوالکلام آزاد

تاریخ پیدائش 11 نومبر1888

سید سجاد ظہیر

تاریخ پیدائش 05 نومبر1907

علی سردار جعفری

تاریخ پیدائش 29 نومبر1913

کرشن چندر

تاریخ پیدائش 23 نومبر1914

احمد ندیم قاسمی

تاریخ پیدائش 20 نومبر1916

یوسف ناظم

تاریخ پیدائش 07 نومبر1921

پروین شاکر

تاریخ پیدائش 24 نومبر1952

قرینہ

ہم کلامی	:	شاہنواز قاسم آئی پی ایس	6
حمد	:	مولانا اسمٰعیل میرٹھی	7

مضامین :

اسمٰعیل میرٹھی کی نظم 'بارش کا پہلا قطرہ' کی عصری معنویت	:	ڈاکٹر اسلم فاروقی	8
اکبرالہ آبادی کا لہجہ جرأت وظرافت	:	ڈاکٹر قطب سرشار	13
بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے تحقیقی کارنامے	:	ڈاکٹر احتشام الدین خرم	19
علامہ اقبالؔ اور جگن ناتھ آزاد	:	ڈاکٹر عقیل ہاشمی	23
اقبالؔ کی شخصیت اور شاعری کے منفرد پہلو	:	بلال احمد ڈار	29
علامہ سید سلیمان ندوی کا تاریخی شعور	:	مفتی تنظیم عالم	36
مولانا ابوالکلام آزاد کے عہد کا ہندوستانی سماج	:	پروفیسر مجید بیدار	41
مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر نگاری	:	پرشوتم سنگھ	47
سجاد ظہیر کی یاد میں	:	ڈاکٹر فضل اللہ مکرم	52
سردار جعفری ظہور ذات وصفات کا شاعر	:	ڈاکٹر مسعود جعفری	59
کرشن چندر کے افسانوں میں موسیقی کا صوت وآہنگ	:	ڈاکٹر حبیب نثار	62
کرشن چندر کا رپورتاژ پودے اور حیدرآباد کی یادیں	:	ڈاکٹر محمد ابرار الباقی	64
احمد ندیم قاسمی حقیقت پسند افسانہ نگار	:	محمد ارشد مبین زبیری	75
شگفتہ نثر کے خالق ''یوسف ناظم''	:	ڈاکٹر ناظم علی	79
خواب اور خوشبو کی شاعرہ ''پروین شاکر''	:	صابر علی سیوانی	84
غزل	:	پروین شاکر	90

oOo

پرشوتم سنگھ
ریسرچ اسکالر
شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی؟

مولانا ابوالکلام آزاد: پیدائش: 11۔نومبر 1888ء

مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر نگاری

مولانا ابو الکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔انہوں نے اردو نثر کے حوالے سے اردو ادب پر اپنی ایک الگ حیثیت قائم کی ہے جس کو کبھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ابوالکلام آزاد نے شعروادب، تقریر وتحریر، انشا پردازی ومکتوب نگاری، لسانیات، لغات، اصطلاحات اور ترجمہ، صحافت اور سائنس، تاریخ وجغرافیہ، ہیئت ومنطق، مذہب وفلسفہ، تفسیر، حدیث وفقہ، سیاسی قیادت اور تعلیم و ثقافت وغیرہ جیسے میدان میں اپنی چھاپ چھوڑی ہے۔آزاد ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت سے ان کی تعلیم وتنظیمی خدمات کو آج بھی سارے ملک میں قدر ومنزلت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور آئندہ بھی دیکھا جائے گا۔

مولانا ابوالکلام آزاد 1888ء میں مکہ میں پیدا ہوئے۔مولانا ابوالکلام آزاد کے دادا شیخ محمد ہادی اپنی علمیت اور غیر معمولی قوت حافظہ کی وجہ سے مشہور تھے۔ 1857ء سے پہلے جب علمائے دہلی ہندوستان کی زبوں حالی دیکھ کر ہجرت کر رہے تھے تو آزاد کے والد خیرالدین بھی اپنے نانا مولانا منورالدین کے ساتھ مکہ معظمہ چلے گئے۔ یہاں شیخ محمد طاہر دری نے اپنی بھانجی سے ان کا عقد کر دیا۔

شادی کے کچھ عرصہ بعد مولانا ابوالکلام کی ولادت یہیں ہوئی۔مولانا کا اصل نام ''احمد'' رکھا گیا تھا مگر ان کی کئی ناموں سے بھی پکارا جاتا تھا۔ان کا تاریخی نام فیروز بخت، تھا اور ان کا لقب ابوالکلام اور تخلص آزاد تھا۔ان کے مزاج میں بچپن سے ہی مولانا کی صفات شامل ہوگئی تھیں اس کی خاص وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے خاندان میں زیادہ تر لوگ علمی و ادبی صلاحیت رکھتے تھے جس کی وجہ سے ابوالکلام آزاد نے اپنے والدین اور اپنے دادا کی خوبیوں کا گہرا اثر قبول کیا۔وہ اپنے بچپن کے ساتھیوں سے بہت ہی الگ نظر آتے تھے۔ ان کو ہر وقت علم وادب، تعلیم وغیرہ سے لگاؤ رہتا تھا۔سات آٹھ سال کی عمر میں انہوں نے دوسرے ساتھیوں سے اپنی ایک الگ راہ نکالی تھی حالاں کہ دیکھا جائے تو اس عمر میں ایک بچے کے کھیلنے کودنے کے دن ہوتے ہیں اس کے باوجود بھی انہوں نے اپنا سارا وقت علمی میدان میں صرف کیا۔اور اگر کبھی کبھار کھیلنے بھی چلے گئے تو وہاں بھی مولانا ہی کردار ادا کرتے تھے۔اس پیشے سے وہ بے حد خوش ہوتے تھے اور خود کو اہ ایک بڑی شخصیت ثابت کرنا چاہتے تھے۔کیوں کہ انسان بڑے اور اچھے لوگوں کو نقل کر کے ہی خود میں اچھی

صلاحیتیں پیدا کر سکتا ہے۔ اسی طرح کی صفات مولانا میں بچپن سے ہی پائی جاتی تھیں۔ اس بات کا اندازہ ایک اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے۔ جس میں ڈاکٹر وہاب قیصر ایک جگہ ابوالکلام آزاد کے بارے میں لکھتے ہیں:

''والد کی پگڑی پہن لی، گھر کے تمام صندوقوں اور بکسوں کو الٹ کے ڈبوں کی طرح جماتے اور بہنوں سے خواہش کرتے کہ وہ فرضی لوگوں کو یہ کہتے ہوئے ہٹائیں کہ ہٹو! ہٹو! راستہ دو! دلی کے مولانا آرہے ہیں۔ پھر کسی اونچی جگہ خطاب کے لیے کھڑے ہوجاتے اور بہنوں سے کہتے کہ وہ تالیاں بجائیں اور سمجھیں ہزاروں کا مجمع ہے جو مولانا کے خطاب پر تالیاں بجارہا ہے''۔

مولانا ابوالکلام آزاد گیارہ برس سے ہی شعر گوئی سے دلچسپی لینے لگے تھے۔ اسی زمانے میں مختلف شہروں سے شعری گلدستے نکلا کرتے تھے۔ اس میں مولانا زیادہ تر غزلیں ہی کہتے تھے ان کی پہلی غزل بمبئی سے نکلنے والے گلدستہ ''ارمغان فرخ'' میں شائع ہوئی۔ مولانا ابوالکلام زیادہ تر بچپن گھر کی چاردیواری میں گزرا تھا۔ جوانی میں بھی ان کا زیادہ تر وقت جیل خانہ میں صرف ہوا۔ اور آخر کار اردو ادب کا یہ روشن ستارہ 22 فروری 1958 میں دہلی میں ہمیشہ کے لیے بجھ گیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر نگاری پر اگر ہم بات کریں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میدان میں انہوں نے اگرچہ کم لکھا تھا مگر جتنا بھی لکھا قابلِ ذکر ہے۔ مولانا آزاد نے اپنی ادبی اور دانشورانہ زندگی کا آغاز اپنی صحافیانہ سرگرمیوں سے کیا تھا۔ اس حوالے اسے مولانا کی شخصیت کے ناگزیر اجزائے سیاست، سماجی سوجھ بوجھ اور مذہب کے عناصر شامل تھے۔ ان کی نثر نگاری میں بہت سے اہم کارنامے ہیں جن کو اردو نثر کی تاریخ میں نظر انداز کیا جائے تو ایک کمی سی محسوس ہونے لگتی ہے۔

ان کی نثر نگاری میں سب سے زیادہ اہم ان کے رسالے ''الہلال'' و ''البلاغ'' تھے جو وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے تھے۔ مولانا آزاد کی ذہنی قوتوں کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے پندرہ سال کی عمر میں ماہوار جریدہ ''لسان الصدق'' شائع کیا تھا۔ اس جریدہ کی تعریف اردو دنیا کے بڑے بڑے قلم کاروں نے کی تھی اور یہاں تک کہ خواجہ الطاف حسین حالؔی نے بھی اس جریدہ کو سراہا تھا۔ اس کے بعد مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک نئی پہچان اردو زبان وادب میں ہونے لگی۔

1914ء میں مولانا آزاد نے اخبار ''الہلال'' شائع کیا۔ یہ اپنی طرز کا پہلا پرچہ تھا۔ اس اخبار کی خصوصیت یہ تھی کہ یہ ترقی پسند سیاسی تخیلات اور عقل پر کھری اترنے والی مذہبی ہدایت کا گہوارہ اور بلند پایا سنجیدہ ادب کا نمونہ تھا۔ اس کے دو سال بعد مولانا آزاد نے ''البلاغ'' شائع کیا تھا۔ ان دونوں اخباروں کی وجہ سے ابوالکلام آزاد کو سب سے زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کے مزاج کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ بیک وقت عمدہ انشاپرداز، جادو بیان خطیب، بے مثال صحافی اور ایک بہترین مفسر تھے۔

صحافت کے حوالے سے مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت میں شروع ہونے والے ادبی سفر کے مختلف مراحل، تذکرہ، تفسیر، انشائیہ نما مکاتیب تھے۔ ادبی اور اسلوبی نقطۂ نظر سے مولانا آزاد کا پہلا دور لسان الصدق، الوکیل، الہلال، البلاغ سے ہوتا ہوا تذکرہ پر ختم ہوتا ہے۔ ان کی شخصیت کے حوالے سے ''تذکرہ'' ہی ان کی وہ تصنیف ہے جس میں ان کے سب سے زیادہ علمی و ادبی اور تخلیقی اسلوب نگارش کے دور کی شروعات کی نشاندہی بھی کی جاسکتی ہے۔ جب الہلال پہلی بار کلکتہ سے شائع ہوا تو ایک زلزلہ سا اردو صحافت پر برپا ہوا۔ کیوں کہ یہ وہ دور تھا کہ جب صحافت میں کوئی بھی ایسی بات نہیں پیش کی جاتی تھی جس میں حکومت کے خلاف احتجاج شروع ہو جائے۔ الہلال کے شائع ہونے کے فوراً بعد تمام ملک کی نظریں بے اختیار اس کی جانب اٹھ گئیں۔ ہر طرف اس کے چرچے ہونے لگے۔ اب تک اس طرح کا کوئی بھی کارنامہ سامنے نہیں آرہا تھا' تاہم مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی جان پر کھیل کر اس کام کو بڑی ہنرمندی سے انجام دیا۔ اس حوالے سے فضل الدین احمد رقم طراز ہیں:

''یہ حالت تھی کہ یکا یک کلکتہ سے ''الہلال'' نکلا اور اس شان سے نکلا کہ تمام ملک کی نظریں بے اختیار اس کی جانب اٹھ گئیں۔ اس کی ہر بات انقلاب انگیز اور ہر بات نئی ظاہری شکل وصورت بھی نئی اور باطنی محاسن بھی نئے۔ ابھی دو چار نمبر ہی نکلے تھے کہ عام وخاص ادنیٰ و اعلیٰ سب کی زبانوں پر اسی کا نام تھا اور ہر گروہ اور ہر طبقہ کے لوگوں نے اس کے سوا سب کو بھلا دیا تھا''۔ (بحوالہ: ''تذکرہ''، ص،12)

تذکرہ کی تاریخی اور کسی حد تک صحافیانہ انداز تحریر مولانا کی اس موثر نثر کا نقطۂ عروج ہے جو لسان الصدق سے لے کر الہلال تک عربی اور فارسی کے الفاظ و تراکیب جا بجا شمولیت، بلند آہنگی اور مرعوب کن ہیئت و جلال کے باعث اس ناہمواری، غرابت اور اجنبیت کا بھی بہت کم احساس ہونے دیتی ہے جو اُن کی ابتدائی نثر میں خاص نمایاں ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں میں بہت سے خصوصیات ملتی ہیں۔ انہوں نے ہندوستان کی جدو جہد آزادی کی تعلیم و تربیت اور مذہبی کاموں میں اہم کارنامے انجام دیے۔ ان کی تحریروں کی یہ تمام خصوصیات اپنی عصری معنویت رکھنے کے باوجود ترجمان القرآن اور غبار خاطر کی نثر کے درجہ کمال تک نہیں پہنچتی۔ ترجمان القرآن اور غبار خاطر نہ صرف ان کی بہترین نثری تصانیف میں بلند درجہ رکھتی ہیں بلکہ اردو نثر کے حوالے سے ایک بلند مقام حاصل ہے۔ ''غبار خاطر'' میں مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے تین سال کی جیل میں گزری ہوئی زندگی کو خطوط کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ ان تین سالوں کے دوران ان کے ساتھ جو بھی واقعات پیش آئے انہوں نے ان کو اس کتاب میں قلم بند کر دیا۔ اس حوالے سے مالک رام کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''اس وقت دوسری عالمی جنگ اپنے پورے شباب پر تھی، انگریز بھلا ایسی قرارداد اور ایسی تحریک سے کیوں کر صرف نظر کر سکتا تھا! اخباروں میں اس طرح کی

افواہیں پہلے سے چھپ رہی تھیں کہ کانگریس اس مفاد کی قرارداد منظور کرنے والی ہے۔اس لیے حکومت نے حفظ ما تقدم کے طور پر سب انتظام کر رکھے تھے۔اس زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد کانگریس کے صدر تھے۔8اگست کی شب کو دیر تک یہ جلسہ ہوتا رہا جس میں یہ قرارداد منظور کی گئی تھی۔اسی رات کے آخری حصے میں یعنی 9اگست کو علی الصبح حکومت وقت نے تمام سرکردہ رہنماؤں کو سوتے میں بستروں سے اٹھا کر حراست میں لے لیا اور ملک کے مختلف مقامات پر نظر بند کر دیا۔مولانا آزاد ان کے بعض دوسرے رفقا احمد نگر قلعے میں رکھے گئے تھے۔مولانا آزاد کا یہ سلسلہ قید و بند کوئی تین برس تک رہا۔ اولاً اپریل 1945 میں وہ احمد نگر اور وہاں سے بانکوڑا جیل میں منتقل کر دیے گئے اور یہیں سے بالآخر 15 جون 1945 کو رہا ہوئے۔اسی قید کے زمانے کا ثمرہ یہ کتاب ''غبار خاطر'' ہے۔غبار خاطر مولانا آزاد مرحوم کی سب سے آخری تصنیف ہے جو ان کی زندگی میں شائع ہوئی۔ کہنے کو تو یہ خطوط کا مجموعہ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ دو ایک کو چھوڑ کر ان میں سے مکتوب کی صفت کسی میں نہیں پائی جاتی۔ یہ در اصل چند متفرق مضامین ہیں۔جنھیں خطوط کی شکل دے دی گئی ہے''۔

(بحوالہ:''غبار خاطر''ص،7۔8)

اس مذکورہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا آزاد جیل میں رہنے کے باوجود ان کے اندر قوم کی محبت کے علاوہ بہت سی صفات پائی جاتی تھیں۔اسی طرح سے تذکرہ کی نثر مولانا ابوالکلام آزاد کے ادبی سفر میں ایک نیا موڑ کھڑا کر دیتی ہے۔ اس تصنیف میں انہوں نے اپنے بزرگوں اور ان کے متعلقین کے حوالے و کوائف بیان کرتے ہوئے انہوں نے ''خود نوشت سوانح'' کا رنگ اختیار کیا۔اس وجہ سے ان کی خود نوشت سوانح ''تذکرہ'' نثر کے حوالے سے ایک اہم کارنامہ بن جاتا ہے، اسی طرح سے انہوں نے ترجمان القرآن میں قوم کی فلاح و بہبود کے لیے بہترین کارنامے انجام دیئے۔ اس کتاب کے مقدمے میں مولانا ابوالکلام آزاد نے تفسیر سے بحث کرنے کے بعد ایک مفسر کی حیثیت سے جہاں ذہین اور زندگی کی ناقابل عبور وادیوں کو سر کرنے کا تعلّی آمیز ذکر کرتے ہیں۔اور اپنی اہلیت کا اعتراف کرنا چاہتے ہیں۔مولانا نے اس تصنیف میں الفاظ کو بڑی عمدہ طریقے سے پیش کیا ہے۔اس سے ان کی نثر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔انہوں نے ایک جگہ لکھا تھا:

''۔۔۔میرے لیے وقت کی جدید راہیں بھی ایسی ہی دیکھی بھالی ہیں جس طرح قدیم راہوں میں سارے کانٹے نہ چبھ چکے ہوں اور میری روح کا کوئی اعتقاد ایسا نہیں ہے جو انکار کی ساری آزمایشوں میں سے نہ گزر چکا ہو، میں نے زہر کے گھونٹ بھی ہر جام سے پیئے ہیں۔اور تریاق کے نسخے بھی ہر دار الشفا کے آزمائے ہیں۔ میں جب پیاسا تھا، تو میری سب تشنگیاں دوسروں کی طرح نہ تھی اور جب سیراب ہوا تو میری سیرابی کا سرچشمہ بھی شاہراہ عام پر نہ تھا''۔

(بحوالہ:''مقدمہ،ترجمان القرآن''ص،19)

اسی طرح سے ایک اور جگہ پر مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے جس میں انہوں نے صاف طور پر واضح کر دیا ہے کہ خدائے حقیقی کے بارے میں انسان کی جو غلط فہمیاں ہوتی ہیں انھیں انسان محبت کی جگہ خوف دہشت کی چیز بنالیتا ہے۔ اس تصنیف میں مولانا نے انسان کی اصل حقیقت کو بڑے اچھے انداز میں بیان کر دیا ہے اور ہر ان غلط فہمیوں کو مولانا آزاد نے دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ ملاحظہ ہو ان کا ایک اقتباس:

''خدا کے تصور کے بارے میں انسان کی ایک بڑی غلطی یہ رہی کہ اس تصور کو محبت کی جگہ خوف و دہشت کی چیز بنالیتا ہے، سورۂ فاتحہ کے سب سے پہلے لفظ نے اس گم راہی کا ازالہ کر دیا۔ اس کی ابتدا ''حمد'' کے اعتراف سے ہوتی ہے۔ ''حمد'' ثناء جمیل کو کہتے ہیں۔ یعنی اچھی صفتوں کی تعریف کرنے کو۔ ثناء جمیل اسی کی کی جاسکتی ہے جس میں خوبی و جمال ہو۔ اس ''حمد'' کے ساتھ خوف و دہشت کا تصور جمع نہیں ہوسکتا جو ذات محمود ہوگی وہ خوف نالہ نہیں ہوسکتی''۔

(بحوالہ: ''ترجمان القرآن'' ص،144)

اس میں کوئی دورائے نہیں کہ مولانا ابو الکلام آزاد کی نثر نگاری میں علمی، ادبی، سماجی، سیاسی وغیرہ کے حوالے سے بہت ہی عمدہ مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ''غبار خاطر'' راقم السطور کے مطابق ان کا سب سے اہم کارنامہ ہے۔ اس میں انہوں نے بہت سی اہم باتوں کو بیان کیا ہے جہاں انہوں نے تاج محل کے درو دیوار اور گنبد و مینار کو اپنی شارنوازی اور نغمہ سرائی سے مسحور اور عالمِ وجد میں دکھانے کی کوشش کی ہے، یا جہاں چڑیا چڑے کی کہانی میں ایک نو آموز طائر بچے کو قوت پرواز سے آشنا ہوتے ہوئے دکھایا ہے وہاں ان کے دل میں محبت، احساس اور جذبات وغیرہ ان کی نثر نگاری میں ایک بلند درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے دوسرے کئی کارنامے ان کی نثر میں مل جاتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے تمام نثر پاروں میں حسن تعلیل، تمثیل نگاری، پراڈوکس کا استعمال، روزمرہ الفاظ، جذبات نگاری، بصری اور سمعی پیکر اس حد تک شامل ہوگئے ہیں کہ جگہ جگہ نثر اور شاعری کی تفریق تک مٹتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ جس کا ذکر ڈاکٹر محمد اسلم جامعی نے اپنے ایک مضمون" مولانا ابوالکلام آزاد کے اسلوب نثر کا تنوع" میں بھی کیا ہے۔ ان کی نثری تصانیف کے حوالے سے اگر بات کریں تو انہوں نے تقریباً تیس سے زائد تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ان تمام کا ذکر کرنا یہاں ممکن نہیں۔

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو بحیثیت ایک صحافی کے طور پر اردو ادب میں جانا جاتا ہے بلکہ وہ ایک اچھے مولانا، معلم، نثر نگار، مترجم، مورخ وغیرہ کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، ان کی تخلیقات کا اگر سرسری طور پر جائزا بھی لیا جائے تو بھی ایک مضمون میں ان کی شخصیت کو پیش نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے اپنی قوم اور ملک کے لیے اتنے اہم کارنامے انجام دئے ہیں کہ ان کو اگر ایک مضمون میں پیش کیا جائے تو یہ ان کی تخلیقات اور ان کی تصانیف کے لیے اچھا سلوک نہیں ہوگا۔

❁❁❁

काशी हिन्दू विश्वविद्यालय

BANARAS HINDU UNIVERSITY

اترپردیش اردواکادمی
उत्तर प्रदेश उर्दू अकादमी

अन्तर्राष्ट्रीय संगोष्ठी

''भारतीय धर्म, दर्शन और साहित्य''

بین الاقوامی سیمینار

موضوع: ہندستانی مذاہب، فلسفہ اور ادب

International Seminar on "Indian Religion, Philosophy & Literature"

25 - 27 February 2019

Certificate

This is certify that Prof./Dr./Ms./Mrs./... Parshotam Singh *...*

Dept of Urdu, Central University of Hyderabad *participated and presented his/her paper entitled* Jammu ki Tahzeeb-o-Saqafat ek Jaeza *...*

in the 3 day International Seminar on "Indian Religion, Philosophy & Literature" and contributed towards the success of the seminar.

Organizing Secretary
Dr. Mosharraf Ali
Department of Urdu, BHU

Convener
Prof. Aftab Ahmad Afaqui
Head, Department of Urdu, BHU

◆ *Organized By:* **Department of Urdu** Faculty of Arts, Banaras Hindu University

DEPARTMENT OF URDU

SATAVAHANA UNIVERSITY

Karimnagar 505002 - (T.S)

Sponsored By: National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Govt. of India, New Delhi.

A TWO-DAY INTERNATIONAL SEMINAR ON

URDU LITERATUR & NATIONAL INTEGIRITY

دوروزہ بین الاقوامی سیمینار بعنوان: اردو ادب اور قومی یکجہتی

CERTIFICATE

This is to certify that PARSHOTAM SINGH Ph.d Scholar University of Hyderabad Participated in the Seminar held on 25 & 26th March 2021

He/She/Presented the Paper Tiled آنند لہر کے ناولوں میں قومی یکجہتی

Dr. MOHD. JAFER JARI
Principal

Dr. NAZIMUDDIN MUNAWAR
Head & seminar Director

SL.NO. : 0175

UNIVERSITY OF HYDERABAD

(A Central University established by an Act of Parliament)

P.O. CENTRAL UNIVERSITY, HYDERABAD - 500 046 (INDIA)

Ph.D. SEMESTER TRANSCRIPT

REG.NO : 17HUPH01 SEMESTER : 1

EXAMINATION : Ph.D. / Urdu

MONTH AND YEAR : Nov 2017

NAME OF THE STUDENT : PARSHOTAM SINGH

FATHER'S NAME : SHANKAR LAL/RAMA DEVI

COURSE NO.	TITLE OF THE COURSE	CREDITS	RESULTS
UR801	Research Methodology	4.00	PASS
UR802	Practical Criticism	4.00	PASS
UR821	Textual Criticism	4.00	PASS
	** END OF STATEMENT **		

PREPARED BY

CHECKED BY

for CONTROLLER OF EXAMS

SECTION OFFICER
EXAMINATIONS

Date of Issue : 4/24/2018

فہــــــرست

■ پیش لفظ 2

■ باب اول: جموں کا پس منظر 6

(جموں میں اردو کا آغاز اردو کو سرکاری زبان کا درجہ)

■ باب دوم: جموں میں اردو فکشن 42

(افسانہ، ناول، ڈراما اور ریڈیو ڈراما نگاری)

■ باب سوم: غیر افسانوی اصناف میں جموں کا حصہ 358

(صحافت، سفر نامہ، تحقیق وتنقید، مضمون، انشایہ، خطوط اور ترجمہ نگاری)

■ باب چہارم: جموں میں اردو کے فروغ میں ادبی اداروں کا حصہ 476

■ اختتامیہ 495

■ کتابیات 506

﴿پیش لفظ﴾

پیش لفظ

شروع کرتا ہوں خدا کے نام سے جس نے پوری کائنات کو بنایا ہے۔جس کے حکم کی بنا ایک پتا بھی نہیں ہل سکتا، جس نے انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ عطا کیا، جس نے انسان کو قلم چلانا اور اپنے علم کو ظاہر کرنے کا موقع بخشا۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ کسی بھی تحقیق کار کے لئے سب سے اہم اور مشکل کام موضوع کا انتخاب ہوتا ہے اور کوئی بھی ادیب سب سے پہلے موضوع کے بارے میں جانچ پرکھ کرتا ہے، اس کے بعد اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے، موضوع کی جانچ پرکھ کرنا ہی اصل معنی میں تنقید ہے۔اس کے بعد تحقیقی کام شروع ہوتا ہے، اس لئے کہا گیا ہے کہ تحقیق اور تنقید کا ساتھ چولی دامن کا ہے، یہ دونوں کبھی بھی ایک دوسرے سے الگ نہیں رہے سکتے ہیں۔

جب ہم ادب کی بات کرتے ہیں، تو ادب زندگی کی مصوری کا بھی نام ہے، اور تنقید حیات کا بھی، ادب حقیقی معنوں میں فنکار کی ذات اور اس کے گرد و پیش کے ماحول کی عکاسی کرتا ہے۔جب ہم ادبی تحقیق کی بات کرتے ہیں تو سب سے اہم اور اولین مسئلہ موضوع کا انتخاب ہوتا ہے۔راقم الحروف کا جب سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد میں پی۔ایچ۔ڈی۔میں داخلہ ہوا تو اس وقت موضوع کا انتخاب کے لیے بہت سارے مراحل سے گزرنا پڑا، تاہم اس دوران میں نے اساتذہ کے مشوروں کے بعد میری دلچسپی ''جموں میں اردو نثر کا آغاز وارتقاء'' پر ہوئی۔اس سے قبل میری خواہش ''جموں میں اردو ادب کے آغاز وارتقا'' پر تھی لیکن میری نگرانی اور دیگر اساتذہ کی رہنمائی سے موضوع کی طوالت کا خیال رکھتے ہوئے میرا موضوع ''جموں میں اردو نثر کا آغاز وارتقاء'' طے پایا۔

جموں و کشمیر ابتداء سے ہی علم و ادب اور تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہا ہے۔یہاں مختلف زبانوں کے ادبی و شعری سرمایوں کی کثیر تعداد موجود ہیں۔قدیم دور سے لے کر جدید دور تک سنسکرت، فارسی، کشمیری، ہندی، اردو، ڈوگری زبانوں میں یہاں کے شعراء وادباء کی تخلیقی سرگرمیوں کو دیکھا جاسکتا ہے۔

جموں میں جہاں تک اردو زبان کی توسیع کا تعلق ہے، ڈوگرا حکمرانوں کا اہم رول رہا ہے۔مہاراجہ گلاب سنگھ اور مہاراجہ رنبیر سنگھ کے زمانے میں فارسی زبان کو ہی سرکاری زبان کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔لیکن فارسی کبھی بھی عوام کی زبان نہ بن سکی۔اس دور میں عوام کے لیے سرکاری دفاتر میں جس زبان کو استعمال کیا جاتا تھا، وہ اردو ہی تھی، سرکاری سرپرستی ملنے کے ساتھ ہی اردو زبان شعر و ادب کے حوالے سے بڑی تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کرتی چلی گئی، اور اس

طرح اردو ریاست کے تینوں خطوں کے لوگوں کو ملک کے باقی علاقوں سے جوڑنے کا ذریعہ بن گئی۔ مہاراجہ پرتاب سنگھ نے اردو کی ترقی کے لیے علمی وادبی خدمات انجام دیں اور آگے چل کر اسی زبان کو یہاں کے لوگوں نے اپنی مادری زبان بنالیا۔ جموں کے ادیبوں نے اردو نثر کی اصناف جیسے افسانہ، ناول، ڈراما، تحقیق وتنقید، سفرنامہ اور صحافت وغیرہ میں طبع آزمائی کی اور سارے ہندوستان میں اپنی ایک الگ پہچان قائم کی۔

اس مقالے کو راقم الحروف نے کل چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ باب اول دو حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول میں جموں کا پس منظر پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جس میں جموں کے جغرافیائی، تہذیبی، ثقافتی حالات وغیرہ پر مختصراً بحث کی ہے۔ اس کے بعد حصہ دوم جموں میں اردو کا آغاز اور اردو کو سرکاری زبان کا درجہ کے حوالے سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔

باب دوم: جموں میں فکشن کے حوالے سے صنف افسانہ، ناول اور ڈراما نگاری کے علاوہ ریڈیو ڈراما نگاری پر مشتمل ہے۔

باب دوم جو کہ اس مقالے کا سب سے اہم باب ہے۔ جس کو چار حصوں پر مشتمل کیا ہے۔ جس میں سب سے پہلے افسانہ نگاروں کے حالات زندگی پر مختصر بحث کی ہے، اور اس کے بعد ان کی افسانہ نگاری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ حصہ دوم میں جموں کے ناول نگاروں کی ناول نگاری کو زیر بحث لایا ہے۔ حصہ سوم میں ڈراما نگاروں کی ڈراما نگاری پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اس کے علاوہ جموں میں ریڈیو ڈراما نگاری کی روایت کو قلمبند کیا گیا ہے۔

باب سوم غیر افسانوی اصناف میں جموں کا حصہ پر مشتمل ہے۔

جس میں حصہ اول میں جموں میں اردو صحافت کی روایت کو پیش کیا ہے۔ حصہ دوم میں اردو سفرنامہ نگاری، حصہ سوم میں تحقیق وتنقید نگاری اور حصہ چہارم میں مضمون، انشائیہ، خطوط اور ترجمہ نگاروں کی تخلیقات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔

باب چہارم جموں میں اردو کے فروغ میں ادبی اداروں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آخر میں مجموعی جائزہ اور کتابیات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ مقالے کے آخر میں اظہار تشکر کے لیے میں احسان مند ہوں ہمارے ہر دلعزیز صدر شعبہ اردو پروفیسر فضل اللہ مکرم صاحب کا جنہوں نے اپنے زریں مشوروں سے نوازا اور شفقت کے ساتھ رہنمائی فرماتے رہے۔ میں اپنی نگران ڈاکٹر رفیعہ بیگم صاحبہ کا بے حد شکر گزار ہوں جنہوں نے اپنی نگرانی میں مجھے تحقیق کے اصول وضوابط سے سرفراز کیا، اور مواد کی فراہمی سے لے کر مقالے کے آخری مرحلے تک اپنے مفید مشوروں سے مجھے آگاہ کرتی

رہیں۔انہوں نے ہمیشہ مجھے درس و تدریس کے ساتھ ساتھ ادب و اخلاق بڑوں کا احترام اپنے چھوٹوں سے شفقت وہمدردی کا بھی درس دیا۔میں ڈاکٹر رفیعہ بیگم کا اس لیے بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے اپنے اساتذہ کے ساتھ ساتھ حیدرآباد کے بڑے ادباء وشعراء سے ملاقات کرواتی رہیں۔میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں اور اپنی نگران کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنی نگرانی میں مجھے اولین پی۔ایچ۔ڈی۔اسکالر بننے کا موقع بخشا۔میں اپنے شعبہ کے تمام اساتذہ کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ جنھوں نے اپنے مفید مشوروں سے مجھے ہمت عطا کی۔علاوہ ازیں میرے ڈی آر سی ممبران اور شعبہ کے دفتری عملہ کا بھی میں بے حد شکر گزار ہوں۔

رسماً جب والدین کے احسانات کا شکرادا کرنے کی بات ہے،تو قلم ٹھہر جاتا ہے،الفاظ ساتھ نہیں دے پاتے کیونکہ ان کی شفقتوں کا بدلا الفاظ ہر گز ادا نہیں کر سکتے۔والدین کی بس یہی خواہش ہوتی ہے کہ ان کا لخت جگر کامیابی کی منزل طے کرتا جائے،اور آج مقالہ پائے تکمیل کرتے ہوئے والدین کی دعائیں ہی تھیں جو ہمیشہ مشکل وقت میں میرا تعاقب کرتی رہیں اور بے فکری کے ساتھ میں اپنی توجہ اپنا مستقبل بنانے،سنوارنے لگا۔انہوں نے ہر وقت اپنی دلی دعاؤں اور نیک تمناؤں سے مجھے سرفراز کیا،میں پھر ایک بار یہی لکھوں گا کہ ان کا احسان میرے روم روم پر ہے،جس کا شکریہ الفاظ ادا نہیں کر سکتے۔اس کے علاوہ میرے بڑے بھائی بنٹی کمار اور ان کی اہلیہ ریکھا دیوی کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے میری تحقیق کے دوران والدین کا اچھے سے خیال رکھا،اور گھر کے کام کاج کو سنبھالا اور میری کمی کو محسوس نہ ہونے دیا۔

میں ریاست جموں وکشمیر کے ان اساتذہ اور دوستوں کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے مواد کی فراہمی میں میری مدد کی اور آخر میں میں اپنے ان تمام عزیز دوستوں،نسیم امانتی،اظہر جمال،شیراز،خالد،ارشد،فیصل،یاور،جاوید،اشفاق، مدثر،عبدالرزاق، سلطان،ابرار،رفیع،گلزار،شبیر،مشتاق،سجاد،مختار،انجلی،رمپا، رشدہ، زنیرا، بہاری لعل،اور دیگر تمام دوستوں کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے نہ صرف تحقیق کے دوران میری مدد کی بلکہ مشکل وقت میں میرا ساتھ دیا اور مجھے کبھی بھی اکیلا پن محسوس نہیں ہونے دیا،ان تمام دوستوں اور اساتذہ کا میں تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

پرشوتم سنگھ

ریسرچ اسکالر

شعبۂ اردو، یونی ورسٹی آف حیدرآباد، حیدرآباد

باب اول

جموں کا پس منظر

(جموں میں اردو کا آغاز اردو کو سرکاری زبان کا درجہ)

جموں کا پس منظر:

ریاست جموں وکشمیر ہندوستان کی ایک بلند ریاست ہے۔اس ریاست کو پہاڑی علاقہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس پہاڑی علاقے کی سرحدوں کے دائرے پر غور کریں تو بہت سارے محققین نے اس کا دائرہ مختلف طریقے سے بیان کیا ہے،موجودہ دور کی تحقیق کے مطابق اس کا دائرہ 222236 اسکوائر کلومیٹر تحریر کیا ہے۔اس ریاست کو کئی محققین نے صرف کشمیر کے نام سے موسوم کیا ہے۔ حالاں کہ اس ریاست میں تین خطے ہیں (1) جموں (2) کشمیر (3) لداخ۔ریاست جموں وکشمیر کی جغرافیائی کہانی بھی تمام ریاستوں کی طرح سے تاریخی اعتبار سے بہت قدیم ہے۔اس حوالے سے ہمارے اردو ادب میں مختلف روایتیں ملتی ہیں،ان میں ایک روایت یہ بھی ہے کہ شری رام چند جی جو ہندو دھرم میں اوتار''پرشوتم'' کے نام سے جانے جاتے ہیں۔انھوں نے کشمیر کو فتح کیا تھا۔وہاں رام کنڈ، سیتا کنڈ، لچھمن کنڈ اور ہنومان کنڈ کے چشموں کا پتہ بھی چلتا ہے جو قدیمی آثار سے تعلق رکھتے ہیں۔راقم الحروف نے اس ریاست کی تاریخ میں ان شواہد کو تلاش کیا تو معلوم ہوا کہ یہ سب کنڈ قدیم زمانے میں اس ریاست میں واقع تھے۔مگر شری رام چندر جی کے نام کا کشمیر میں ایک بہت بڑا مندر ابھی بھی موجود ہے۔

ریاست کے مختلف علاقوں اور خطوں کے جغرفیائی مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اپنی اپنی شناخت ہے۔ اس میں چاہے وہ لداخ ہو، جموں ہو یا پھر کشمیر ہو۔علاقۂ پنجاب کی سرحد ختم ہوتے ہی ریاست کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا منظر دکھائی دیتا ہے،اوران پہاڑیوں کی خوبی یہ ہے کہ رقبے میں کافی دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ان پہاڑیوں کی اونچائی کی بات کریں تو تقریباً دو سے چار ہزار فٹ معلوم ہوتی ہے۔اس علاقے میں ایک طرف سے مشرق کی طرف سے دریائے راوی بہتا ہے اور دوسری طرف سے مغربی علاقے سے دریائے جہلم بہتا ہوا نظر آتا ہے۔یہ نظارہ بھی دیکھنے والے کو کافی متاثر کرتا ہے۔

خطۂ جموں ریاست کی راجدھانی ہے اور گورنمنٹ کے دفتری کام کاج گرمی کے مہینے میں نومبر تا اپریل جموں میں ہوتے ہیں اور اپریل تا اکتوبر سری نگر میں ہوتے ہیں۔اس خطے کی خوبصورتی کچھ کم نہیں ہے۔ یہاں پر مختلف مذاہب کے لوگ آپس میں مل جل کر رہتے ہیں،اورامن و بھائی چارے کی روایت کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔علاقہ جموں دریائے توی کی پہاڑیوں سے شروع ہوتا ہے،اور دریائے چناب ان پہاڑیوں سے گزر کر جموں سے آگے ایک علاقہ اکھنور آتا

ہے جو کافی میدانی ہے وہاں سے یہ چناب بہتا ہوا ہندوستان کی دوسری ریاستوں میں داخل ہوتا ہے۔ ضلع جموں کے علاوہ اس سے جڑا ہوا ایک علاقہ میر پور بھی ہے۔ ضلع جموں کی بلندی پر اگر ہم نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ تقریباً 1000 فٹ کے آس پاس ہوگی۔

ضلع جموں کو بہت سارے لوگوں نے مندروں کا شہر بھی کہا ہے، اس لیے کہ یہاں مندروں کی کثرت ہے جس کی وجہ سے ''مندروں کا شہر'' کے نام سے مشہور ہے۔ ڈوگرہ حکمرانوں نے اپنے دور میں ریاست جموں میں اپنی حکومت کر کے مذہبی روایت کو بھی قائم رکھا اور کئی فن تعمیر میں نام بھی کمایا، اس کے علاوہ کئی محلات اور مندر بھی بنوائے تھے۔ ان میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کا تعمیر کردہ رگھوناتھ مندر بہت ہی شاندار ہے۔ اس کا کلس اور گنبد سونے کا بنا ہوا ہے۔ اس کے چاروں طرف رونق ہی رونق نظر آتی ہے۔ لاکھوں لوگ سیر و تفریح کے لیے یہاں آتے ہیں اور مندر میں درشن بھی کرتے ہیں۔ نوراتروں میں اس مندر میں کافی بھیڑ رہتی ہے، اور ریاست و بیرون ریاست سے کافی تعداد میں لوگ جمع ہوتے ہیں۔ جموں کے علاقے میں دیگر علاقوں سے کافی تعداد میں لوگ موجود ہوتے ہیں۔ جموں سے جڑے دیگر مقامات بھی شامل ہیں۔ جیسے رام کوٹ، بسولی، رام نگر، کھٹوعہ، ادھم پور، بھمبر وغیرہ، بھمبر ریاست چھال کا دارالحکومت رہا ہے۔ مغل حکمرانوں کے کشمیر کے دوروں کے لیے بھمبر وادی ہی گزرگاہ تھی، اسی وجہ سے بھمبر کو باب کشمیر یعنی کشمیر کا دروازہ کہا جاتا ہے۔ راجوری اور پونچھ کا علاقہ خطے جموں میں شمار ہوتا ہے۔ کشمیر جاتے ہوئے ان علاقوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہاں پر بھی مختلف مذہب کے لوگ رہتے ہیں یہاں پر زیادہ آبادی گجروں کی ہے، تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ گجر قبیلہ گجرات سے ہجرت کر کے راجوری اور پونچھ میں آباد ہو گئے تھے۔

جموں کی قدیم روایتوں میں سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ، جموں میں اگنی گر کے فرزندوں میں سے ایک فرزند بایوشرب ہوئے، انھوں نے اپنی بہادری سے پورے علاقوں کو فتح کر لیا اور سارے بھائیوں نے مل کر اپنے والد کی ریاست کو اجاگر کیا اور اپنے خاندان کا نام روشن کیا۔ اسی طرح سے یہ سلسلہ چلتا گیا اور دریائے توی تک ان کا قبضہ ہوتا گیا۔ اس خاندان کے کئی حکمرانوں نے لاکھوں کی تعداد میں اپنے سپاہیوں کے ساتھ مل کر ہر ملک کو فتح کرنا چاہا۔ اس خاندان کے کئی طاقت ور اور مشہور حکمران تھے ان میں پورن سنگھ، لاکھو، گھاتجوشن، اگنی گربھ وغیرہ خاندان کے ایک کے بعد ایک خاندانی روایت کے مطابق حکمران بنتے گئے۔ ہر حکمران سے راجہ اگنی گربھ کے اٹھارہ بیٹے تھے۔ وہ حکمران اپنی پدری روایت کو قائم کرنے کے لیے اپنی اولاد کو بڑھاتے تھے۔

راجہ اگنی گربھ کے بڑے بیٹے باہولوچن اپنے والد کے بعد حکمران بنا،اور حکومت کی باگ ڈور اسی نے سنبھالی۔ اس نے بہت سی عمارتیں اپنے نام کے ساتھ موسوم کیں اور ایک اپنے نام کا مشہور قلعہ بھی بنوایا تھا۔اس کے بعد اس نے اپنے کچھ سپاہی وہاں تعینات کر دیے کیوں کہ یہ جگہ بہت ہی خوب صورت تھی۔اس لیے رفتہ رفتہ اس نے وہاں پر شہر آباد کر دیا۔اس شہر کا نام باہو رکھا۔اس کے نام کا قلعہ آج بھی شہر جموں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔حالاں کہ اب وہ بہت پرانا ہو چکا ہے مگر آج بھی موجود ہے۔شہر جموں کے توی کے کنارے پر یہ قلعہ واقع ہے۔اچانک ایک روز پنجاب کے راجہ نے باہولوچن پر حملہ کر دیا اور لڑائی میں اس کی شکست ہوگئی۔پنجاب کے راجہ چندر ہاس والی نے جموں پر اپنا قبضہ کرنا چاہا مگر بدقسمتی سے باہولوچن کی کوئی اولاد نہ تھی اس لیے اس نے اپنے چھوٹے بھائی کو مرنے سے پہلے راج گدی سونپ دی۔ اس نے حکومت کو سنبھالتے ہی سپاہیوں کو جمع کر کے اپنے بھائی کا بدلہ لینے کے لیے پنجاب کے راجہ چندر ہاس والی پر حملہ کر دیا اور پنجاب کو فتح کر کے اپنے قبضہ میں لے لیا۔

قدیم روایتوں کے مطابق یہ بھی سامنے آیا ہے کہ راجہ جامبولوچن کو شکار کھیلنے کا بہت شوق تھا۔وہ دریائے توی کے کنارے ہر روز شکار کھیلنے جاتا تھا۔اسی دوران اس کی نظر اچانک ایک پہاڑی پر پڑی جس کی خوب صورتی کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔اس نے وہاں ایک شیر اور بکری تالاب میں پانی پیتے دیکھے جو ایک بھائی چارے کی مثال تھی۔اس کے بعد اس نے اپنی ساری فوج وہاں لگا دی اور اس پہاڑی پر اپنا قلعہ بنوایا۔اس کے بعد آہستہ آہستہ اس نے پہاڑی کے پورے جنگل کو صاف کر کے وہاں شہر آباد کر دیا۔جس کا نام اس نے اپنے نام جامبو سے موسوم کیا اور بعد میں یہی نام آج جموں سے جانا جاتا ہے۔اس کے بعد اس کا بیٹا پورن کرن راجہ بنا۔وہ جموں کا پہلا راجہ تھا۔اس کے دو بیٹے تھے۔ایک ''دیا کرن'' دوسرا ''دھرم کرن''۔دراجہ پورن کرن نے اس وقت برہمنوں اور کشمیریوں کے ساتھ مل کر اپنے بڑے بیٹے دیا کرن کو کشمیر کی طرف روانہ کر دیا۔انھوں نے کشمیری قوم کو چالاکی سے بہلا پھسلا کر ان پر حکومت کرنی شروع کر دی۔اسی کے بعد کچھ ہی عرصہ میں کشمیر کو اپنے قبضے میں لے لیا۔یہ حکومت تقریباً تین پشتوں تک قائم رہی اس دور میں انھوں نے بہت ترقی بھی کی۔اور ساتھ ہی ساتھ حکومت کو بھی چلاتے رہے۔یہ حکومت تقریباً 55 سال تک چلتی رہی لیکن آخر کار کورو اور پانڈو میں جنگ ہوئی اور اس حکومت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

جموں خطۂ ریاست کی سرمائی راجدھانی ہے۔جموں کی سرحدیں پنجاب سے ملتی ہیں۔سکھوں کا دور ریاست میں تقریباً تیس برس رہا۔جب انگریزوں سے مقابلہ نہ کیا جانے لگا تو مہاراجہ گلاب سنگھ جو سکھ دور حکومت کا ایک طاقتور راجہ تھا اس نے انگریزوں کے ساتھ مشورہ کر کے ان سے ریاست کو 1846 میں پچھتر لاکھ روپے میں خرید لیا۔ایک شرط بھی

رکھی کہ وہ اپنی سالانہ آمدنی میں سے کچھ خرچ انگریزوں کے سپرد کرتے رہیں، اسی طرح سے مہاراجہ گلاب سنگھ نے جموں اور کشمیر کو ایک ریاست بنا دیا۔

ڈوگرہ عہد میں مہاراجہ گلاب سنگھ جموں کے ڈوگرہ راجپوت حکمرانوں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مورخین اور محققین کی رائے کے مطابق ڈوگرہ خاندان کا سلسلۂ شری رام چندر جی تک جا ملتا ہے۔ ریاست میں مہاراجہ گلاب سنگھ کا دور ایک ترقی یافتہ دور تھا۔ ان سے پہلے رنجیت سنگھ کا دور تھا۔ ان کے بعد مہاراجہ گلاب سنگھ نے اپنی سلطنت کے حدود کو اسکردو، لداخ، کشتواڑ، جہلم ضلع اور راولپنڈی کے قریب تک پھیلا دیا اور اپنی فوجیں تعینات کر دیں۔ اس دور میں بہت سی زبانیں بولی جاتی تھیں مگر فارسی کا زیادہ چلن تھا کیوں کہ یہی دفتری زبان بھی تھی۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کو پہاڑی علاقوں کے حکمران سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔

جموں کا علاقہ چوں کہ ڈوگرہ علاقہ کہلاتا تھا اور وہاں کی زبان ڈوگری ہے، جو پنجابی سے قریب ہے اور اردو زبان کے ساتھ بھی ہم رشتہ زبان ہے یعنی ڈوگری کے بہت سارے الفاظ اردو میں شامل ہیں، اور اردو اور ڈوگری کا اچھا تعلق ہے۔ اردو چوں کہ اس وقت ایک گری پڑی زبان تھی مگر عوام میں رائج تھی اور اس نے ہندوستان کے سیاسی اور ثقافتی تعلقات سے بہت جلد اپنے اثرات رائج کر دیئے تھے، عوام نے بھی تیزی سے اردو کے اثرات قبول کرنے شروع کر دیئے تھے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کے دورِ حکومت میں بہت سے معاملات کی ترقیوں میں رکاوٹ آ گئی تھی کیوں کہ تمام ریاستوں کی طرح یہاں بھی جدو جہد شروع ہوگئی تھی۔ اس کا اثر تہذیبی اور ادبی زندگی میں پڑا۔ اس دور میں فارسی اپنا دم توڑنے لگی تھی کیوں کہ جو فارسی سے واقف بھی تھا وہ بھی اب اردو زبان ہی کو اپنانے لگا تھا، اور اچھی خاصی تعداد میں ریاست میں عوام کی وابستگی اردو کی طرف ہوگئی تھی۔ اس کی خاص وجہ یہ بھی رہی کہ اس قوت پورے برصغیر میں اردو کا ہی چلن تھا۔ خاص طور پر پورے ہندوستان میں ولؔی، میؔر، آتش، غالؔب وغیرہ کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ اور دوسری طرف فورٹ ولیم کالج سے جڑے ادیبوں نے نئی نثر کی بنیاد ڈال دی تھی ان میں میر امن اور حیدر بخش حیدری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ چنانچہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دور حکومت میں علم و ادب نے بہت زیادہ ترقی حاصل کی۔

1856ء میں مہاراجہ گلاب سنگھ نے حکومت اپنے بیٹے رنبیر سنگھ کے ہاتھوں سونپ دی۔ جب رنبیر سنگھ تخت نشین ہوا تو خود مہاراجہ کشمیر میں جا کر آباد ہو گئے اور وہاں گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ اسی دوران ان کی صحت خراب ہوتی رہی اور آخر میں 1857ء میں وہیں پر ان کا انتقال ہو گیا۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کے انتقال کے بعد مہاراجہ رنبیر سنگھ نے حکومت سنبھالی

اوراس دور میں اردو زبان وادب کو بہت فروغ ملا۔انھوں نے ریاست میں کئی اصلاحیں کیں۔نظم ونسق کے لیے نئی نئی راہیں ہموار کیں۔ بہت سی نئی عمارتیں تعمیر کروائیں غرض کہ ہر طرح کی مالی مدد فراہم کی۔اور عوام کو، ریاست میں ایک قانونِ فوج داری میکالے کے ہندوستانی نمونے کی بنیاد پر بنایا گیا تھا اور وہ سب کچھ اردو زبان میں ہے۔اس کو ''رنبیر ڈنڈ بدھی'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔اس کا ذکر سب سے پہلے ریاست کے مشہور صحافی پنڈت سالگ رام سالک نے کیا ہے۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ نے سب سے زیادہ تعلیم پر زور دیا تھا۔کیوں کہ وہ چاہتے تھے کہ جب تک لوگوں میں علم نہ ہوگا تب تک عوام میں اور سماج میں ترقی نہیں ہوسکتی ہے۔انھوں نے ریاست بھر میں کئی تعلیمی ادارے، مدرسے اور پاٹھ شالائیں وغیرہ بنوائیں اور اپنے مذہب کو قائم رکھتے ہوئے دوسرے مذاہب کو بھی فروغ دیا۔اسی دور کا رگھوناتھ مندر جموں میں تعمیر ہوا جو آج بھی موجود ہے۔انھوں نے سنسکرت کی کتابوں کے لیے ایک دارالترجمہ بھی قائم کیا تھا۔اس دور میں اردو زبان نے بھی کافی ترقی کی اور اہم رول ادا کیا۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کا انتقال 1885ء میں ہوا۔ان کے بعد ان کا بیٹا سری پرتاب سنگھ تخت نشین ہوا تقریباً 40 برس تک برسرِ حکومت رہا۔سری پرتاب سنگھ کے عہد میں ریاست میں پہلی بار رزیڈنٹ کا تقرر عمل میں آیا تھا،اس دور میں اردو زبان لسانی اعتبار سے اور رابطے کے اعتبار سے کافی فروغ پا چکی تھی۔ پوری ریاست میں اس نے خاصی شہرت ومقبولیت حاصل کر لی تھی۔ یہاں تک کہ ریاست کی سماجی اجتماعی اور سرکاری زندگی میں بھی اردو زبان اہم رول ادا کر رہی تھی۔یہی وجہ رہی کہ مہاراجہ پرتاب سنگھ نے اس کو اپنے دورِ حکومت 1889 میں سرکاری زبان کا درجہ دے دیا۔اور یہ زبان تعلیمی اداروں، سرکاری محکموں، عدالتوں اور عوامی رابطے میں رائج ہوگئی۔علاقہ جموں میں اسی زمانے میں ڈوگروں نے ایک ڈوگرہ سبھا قائم کی تو دوسری طرف ان کو دیکھ کر مسلمانوں نے بھی اسلامی اصلاح کے مقصد سے ایک مجلس منعقد کی۔ان دونوں کا مقصد اپنے اپنے مذہب کو فروغ دینا تھا۔

مہاراجہ پرتاب سنگھ کا انتقال 1925ء میں ہوا۔ان کے بعد امر سنگھ کا بیٹا ہری سنگھ تخت نشین ہوا۔حالاں کہ مہاراجہ پرتاب سنگھ چاہتے تھے کہ ان کی وفات کے بعد پونچھ کے مہاراجہ کے لڑکے جگت دیو جانشین بنے اور اسی کو تخت نشین بھی کروانا چاہتے تھے۔مگر یہ بات سری امر سنگھ کو ناگوار گزری انھوں نے اس بات کی مخالفت کی،تاہم ہری سنگھ کو تخت نشین کر دیا گیا۔مہاراجہ ہری سنگھ چوں کہ تخت نشین ہونے سے پہلے اپنی تعلیم بیرون ریاست سے حاصل کر چکے تھے، اور

دہرادون میں فوجی تربیت بھی حاصل کر چکے تھے۔ان کی قابلیت کو دیکھتے ہوئے مہاراجہ نے انھیں بیس سال کی عمر میں ہی کمانڈران چیف بنا دیا تھا۔اور ساتھ ہی ساتھ وہ ریاست کے سینئر رکن کونسل بھی رہے چکے تھے۔مہاراجہ کا تعلق زیادہ تر انگریزوں سے رہا تھا اس لیے ان سے بھی انھوں نے بہت کچھ استفادہ کر لیا تھا۔یہی وجہ رہی کہ پہلی جنگ عظیم کے دوران مہاراجہ ہری سنگھ نے انگریزوں کی خوب مدد کی تھی اور اسی بنا پر ان کے تعلق انگریزوں سے گہرے ہوتے گئے تھے۔انگریزوں کو بھی ان پر پورا یقین ہو گیا تھا۔

مہاراجہ ہری سنگھ نے ایک بار پوری ریاست کا دورہ کیا اور تمام حالات کا جائزہ لیا۔ان کی ہی کوشش تھی کہ ریاست کا ماحول پر امن تھا۔انھوں نے عوام کی خواہشات واخراجات کو پورا کرنے کے لیے بے پناہ کام انجام دیے ۔مہاراجہ ہری سنگھ نے عوام کی حمایت میں قانون پاس کیا تھا اور اس میں انھوں نے بچوں کی ابتدائی تعلیم کی اہمیت، کمسنی میں شادی کی ممانعت، زمین داری کرنے کا حق وغیرہ اہم نکات شامل تھے۔

جموں کا جغرافیائی، تہذیبی وثقافتی ماحول:

جموں خطے میں مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں۔ جو امن و بھائی چارے کی اچھی مثال ہے۔تہواروں میں چاہے دیوالی، ہولی ہو، عید یا بندگی، نانک کا جنم دن وغیرہ تمام لوگ آپس میں ان تہواروں میں شریک ہوتے ہیں، اور ایک دوسرے کے ساتھ خوشیاں مناتے ہیں۔یہی وجہ رہی ہے کہ جموں خطے میں مختلف لوگوں کے تعاون سے امن و بھائی چارہ قائم ہے۔اس کے علاوہ تہذیب وثقافت کے حوالے سے بھی لوگوں میں کافی اہم رول رہا ہے۔ بانہال سے لکھن پور اور کشتواڑ سے پونچھ تک پھیلا ہوا یہ علاقہ اپنی تہذیب وثقافت کی وجہ سے ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔اور یہاں کے مختلف رسم ورواج، روایات اور طرز حیات مل کر ایک مشترکہ تہذیب کی مثال پیش کرتے ہیں۔ یہاں کی بولیوں نے چاہے وہ کشمیری، ڈوگری، بھدرواہی، سرازی، پہاڑی وغیرہ نے مل کر اس خطے میں تہذیب وثقافت میں ایک کشش سی پیدہ کر دی ہے۔

پیر پنچال سلسلۂ کوہ کے جنوب میں پھیلا ہوا یہ علاقہ ایک تین منزلہ مکان کی طرح ہے۔جس کے اردگرد مختلف جغرافیائی ماحول دیکھنے کو ملتے ہیں۔اس تین منزلہ مکان کا بیرونی حصہ جموں، ادھم پور، کٹھوعہ، سانبہ وغیرہ کے میدانی علاقوں سے شروع ہو کر کوہِ شوالک کے سلسلے تک پہنچتا ہے۔ان علاقوں میں خشک مٹی ہوتی ہے،اور اسی لیے اس علاقے کو کنڈی سے تعمیر کیا گیا ہے۔کیوں کہ یہاں پتھریلی زمین ہے، جس کی وجہ سے اس علاقے میں کبھی کبھی پانی کی قلت

پڑ جاتی ہے۔ جو اکثر گرمی کے موسم میں ہوتی ہے۔لہٰذا ان سب باتوں کا ذکر یہاں کے لوک گیتوں میں دیکھنے کوملتا ہے۔ جو اکثر لوگوں کی زبان پر شادی، بیاہ اور دوسری تقریبات کے مواقع پر گنگنائے جاتے ہیں۔ کنڈی یا پہاڑی علاقے کی عکاسی ایک لوگ گیت میں کی گئی ہے۔ جس کو پیش کیا جارہا ہے تا کہ اس سے اندازہ لگایا جا سکے کہ ان کا گزر بسر کیسا ہوتا تھا۔

''کنڈی علاقے کی زندگی بھی ایک مشکل کے مترادف ہے۔صبح سویرے اٹھ کر دور سے پانی لانا پڑتا ہے''(1)

واقعی ہی پہاڑی علاقے میں بسنے والوں کا مشکل سے گزارا ہوتا ہے۔ کھانے پینے اور رہنے کے معاملے میں ان کو بہت ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جب برف پگھل کر تھوڑی کم ہو جاتی ہے تو لوگ صبح سویرے اٹھ کر''گھراہٹ'' جاتے ہیں۔ گھراہٹ یعنی پہاڑی علاقے میں ایک قسم کی پن چکی جس میں مکی یا گندم ڈال کر پیسا جاتا ہے۔صبح سویرے لوگ اپنے اپنے گھروں سے جمع ہو کر ہجوم کی شکل میں گھراہٹ جاتے ہیں۔ حالاں کہ موجودہ دور میں بجلی سے چلنے والی مشینوں کی وجہ سے گھراہٹ کے استعمال میں بہت کمی آ گئی ہے،لیکن اس کے باوجود آج بھی لوگوں میں یہ شوق باقی ہے۔

علاقہ کشتواڑ کے لوگوں میں بھی ایک ملی جلی اور مشترکہ تہذیب دیکھنے کوملتی ہے۔ ان لوگوں کا المیہ یہ رہا ہے کہ قدرت نے اس خوب صورت اور حسین علاقے کو اس امر کے باوجود آبی وسائل سے محروم رکھا ہے۔

کشتواڑ کے لوگوں کی تہذیب وثقافت کی بات کریں تو یہاں کی تہذیب کشمیری تہذیب سے ملتی جلتی ہے۔ اس بات کا ذکر پروفیسر عبدالقادر سروری کی کتاب ''کشمیر میں اردو'' سے ملتا ہے۔ کیوں کہ کشمیر میں لوگوں کا لباس، کھان پان اور شکل وصورت کے لحاظ سے بھی کچھ چیزیں کشتواڑ اور کشمیر میں مماثلت رکھتی ہیں۔

صوبۂ جموں کے کھنڈرات میں کرمچی، سدھ مہادیو، بلاور، شری ماتا ویشنو دیوی کٹرہ وغیرہ کے مندر قدیم نمونوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کرمچی کا مندر آریائی طرز کا بنا ہوا ہے، جن کا عہد صدی بھونیشور کے تلک راج مندر سے مطابقت رکھتا ہے۔ اگر چہ بلاور میں مندر بناوٹ کے لحاظ سے قرون وسطہ سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر اس کا تعلق پانڈو عہد کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ اسی طرح سے سدھ مہادیو کا مندر ڈوگرہ سرزمین کا ایک اہم تیرتھ استھان ہے۔ یہاں پر ایک ترشول بہت قدیم ہے تقریباً ساتویں صدی کا لگایا ہوا ہے۔ ضلع ریاسی کٹرہ میں شری ماتا ویشنو دیوی کا تھیر تھ استھان بھی بہت پرانا

ہے، اور یہاں پر بھی لوگ لاکھوں کی بھیڑ میں آتے رہتے ہیں۔ خاص طور پر نوراتروں میں یہاں بہت زیادہ تعداد میں لوگ جمع ہوتے ہیں۔

جموں میں اردو ادب کا مختصراً جائزہ

صوبہ جموں میں اردو زبان کی تاریخ اتنی پرانی نہیں ہے جتنی کہ اردو ادب کی تاریخ ہے۔ بہت سے محققین نے مختلف انداز میں جموں میں اردو زبان وادب کی تاریخ کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں اکثر کی رائے مماثلت رکھتی ہیں اور کچھ میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے، جس کی نشاندہی راقم نے آنے والے صفحات میں تفصیل سے کی ہے۔

اس بات کا اندازہ لگانا تو بہت مشکل ہے کہ جموں میں اردو کی داغ بیل کب پڑی مگر اتنا ضرور ہے کہ دیگر ریاستوں میں جس طرح اردو زبان رائج ہوتی گئی، اس کا اثر ریاست جموں وکشمیر میں بھی بڑھنے لگا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ پنجاب میں اردو کے ارتقا کا اثر بھی پڑتا رہا، 18 ویں صدی سے ہی جموں میں کچھ شعرا وادباء کا ذکر مل جاتا ہے۔ جن کے ہاں اردو کا اکّا دکّا شعر یا کوئی تحریر مل جاتی ہے لیکن باضابطہ طور پر مہاراجہ گلاب سنگھ کے دورِ حکومت جموں میں اردو زبان وادب کی داغ بیل پڑی، اور اسی بات کو تقریباً جموں وکشمیر کے محققین نے اپنی اپنی تحریروں میں قلم بند کیا ہے۔ اس طرح کے کئی شواہد جموں وکشمیر میں مورخین نے اپنی تصانیف میں پیش کیے ہیں۔ اسی مضمون میں ڈاکٹر منظر اعظمی نے لکھا ہے کہ 1862 میں طبقات الارض کے ماہر فریڈرک ڈریو نے جو یہاں طبقات الارضی خدمات انجام دینے آیا تھا۔ اس نے مہاراجہ کے متعلق اپنی بات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے:

> ''ہندوستان سے آنے والے ملازم لوگ بلاشبہ ہندوستانی (اردو) بولتے ہیں اور مقامی لوگ اسے سمجھ لیتے ہیں''۔(2)

اب تک کی تحقیق کے مطابق یہ ثابت نہیں ہوسکا ہے کہ اردو زبان مکمل طور پر جموں میں کب اور کن حالات میں رائج ہوئی۔ صرف اس بات کو ہی بنیاد بنایا جاتا ہے کہ مختلف ریاستوں کے لوگ سیر وتفریح کے لیے جموں میں بھی آیا کرتے تھے اور اسی لین دین اور سیر وتفریح کی وجہ سے اردو زبان صوبۂ جموں میں اپنی جڑیں مضبوط کرنے لگی۔ صوبۂ جموں کو شروع سے ہی ریاست پنجاب کے ساتھ گہرا لگاؤ رہا سندھ اور پنجاب سے کثیر تعداد میں لوگ سیر وتفریح کے لیے جموں میں آیا جایا کرتے تھے۔ اسی دوران لوگوں کے میل ملاپ اور خرید وفروخت کے موقعوں سے بھی اردو کو فروغ حاصل ہوا۔ جس کی بنا پر کئی زبانوں کے الفاظ ایک دوسرے سے جڑنے لگے۔ جموں کی مقامی زبان ڈوگری اور ڈوگری کے بہت

سے الفاظ اردو زبان میں شامل ہوتے گئے۔اس بات سے بھی اتفاق رائے قائم کی جاسکتی ہے کہ مختلف زبانوں کے ملنے سے یہاں کی تہذیب وثقافت پر بھی اثر ہوا ہے۔قدیم دور سے ہی سندھ اور پنجاب سے صوبہ جموں کے کیا تعلقات رہے اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے:

''سیاسی سطح پر جموں بالواسطہ یا بلا واسطہ طور پر شروع ہی سے ہندوستان کا حصہ رہا ہے اور اس کے دروازے ان سیاسی، سماجی، مذہبی اور ادبی لسانی تحریکوں کے لیے ہر وقت کھلے رہے ہیں۔جو وقتاً فوقتاً ملک کے دوسرے حصوں میں پراوان چڑھتی رہیں۔انھیں سیاسی، سماجی اور مذہبی تحریکوں نے وقتاً فوقتاً اس خطہ کو ملک سے جوڑے رکھا اور ایسے ہی آئے دن روابط نے قدیم ادبی اور مذہبی سطحوں پر گراں قدر اضافے کئے''۔(3)

اس خطے میں لکھی گئیں قدیم عہد کی تصانیف بھی اس سلسلے کی اہم کڑی کا درجہ رکھتی ہیں۔جن سے اس پہاڑی خطے کی ملک کے دوسرے حصوں سے تعلق قائم ہوتے گئے۔یہ بھی پتا چلتا ہے کہ آئے دن ملک میں ہونے والے نئے نئے تجربات سے بھی خطۂ جموں متاثر ہوتا رہا۔

اس مشترکہ زبان کا جنم آٹھویں صدی عیسوی میں ہوا۔اس دور میں اردو زبان کی بہت ترقی ہوئی۔حالاں کہ اس وقت تک یہ زبان عوام میں پوری طرح سے رائج نہیں ہوئی تھی۔تاہم آہستہ آہستہ ہی اپنی جڑیں مضبوطی سے پھیلانا شروع کیں کہ دیکھتے ہی دیکھتے عوام کا مرکز بن گئی۔آٹھویں صدی کا دور اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ اس عہد میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل جل کر اس زبان کو فروغ دینے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔اگرچہ سیاسی حالات کی وجہ سے زبان کی لسانی اور تہذیبی سطحوں کو اس دور میں کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا مگر پھر بھی عوام سے اس زبان نے اپنا رشتہ قائم رکھا۔

اردو زبان جو ملکی اور غیر ملکی عناصر کے اشتراک کے نتیجے میں ہندوستان میں قائم ہوئی اس نے بہت سی منزلیں طے کی تھیں۔بقول صابر مرزا:

''ہندوستان میں اردو زبان کو تین حصوں میں تقسیم کیا جانا چاہیے:

(1) سندھ ملتان میں اردو

(2) لاہور میں اردو

(3)دہلی میں اردو‘‘۔(4)

چوں کہ سندھ اور ملتان میں ہی سب سے پہلے مسلمان وارد ہوئے تھے۔انھوں نے یہاں آباد ہوکر سیاسی بالا دستی سے پیدا ہونے والی صورت حال کو اردو کی ترقی میں بہت اضافہ کیا۔مسلمان سندھ اور پنجاب میں تقریباً چار سو سال تک اپنا قبضہ جمائے رہے۔اس کے بعد جب تعداد بڑھتی گئی تو انھوں نے تجارتی سفر یا سیر وتفریح کی غرض سے سندھ اور ملتان سے باہر جانا پسند کیا۔اور چھوٹے چھوٹے گروہوں میں اپنی ریاستیں قائم کرنا شروع کیں۔ان میں سے کچھ گروہ دہلی تک پہنچ گئے۔صوفیا کی عارفانہ شعری لطافتوں سے زبان میں کافی ترقی اور فروغ حاصل ہوا۔یعنی یوں کہا جائے کہ صوفیوں کی وجہ سے یہ زبان عوام الناس کی زبان بنی تو غلط نہ ہوگا۔

اردو زبان میں صوفیا اور اولیائے کرام کا بہت بڑا حصہ رہا ہے وہ اس کی ترقی میں پیش پیش رہے ہیں۔ان میں دونوں مذاہب (ہندو اور مسلمان) کے لوگ تعلق رکھتے ہیں۔جیسا کہ راقم نے مذکورہ بالا اقتباس میں اس بات کا بیان کیا کہ صوفیا اور اولیائے کرام نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے دلوں میں اپنا گھر بنالیا تھا۔انھیں کی یہ سب کوششوں کی وجہ سے دونوں قوموں میں میل جول پیدا ہوا۔اردو زبان نے نہ صرف ترقی کی منزلیں طے کیں بلکہ مشترکہ تہذیب، آپسی میل ملاپ، بھائی چارہ کو قائم کرتے ہوئے یہ زبان شمالی ہندوستان کے علاقوں تک پھیلتی گئی۔

اس میل جول اور لین دین کی وجہ سے پنجاب سے قریب تر ہونے کے سبب جن صوفیا اور اولیاء حضرات نے اس زبان کو فروغ دیا ان کے قدم خطۂ جموں میں بھی پڑے۔ان کا ارادہ اس پہاڑی خطے میں بھی اسلام پھیلانا تھا۔چنانچہ اس کے بعد ان صوفیائے کرام میں سب سے پہلے حضرت روشن شاہ ولی خطۂ جموں میں داخل ہوئے۔جن کے بارے میں مختلف آرا ملتی ہیں۔ان میں سے ایک رائے تاریخِ جموں کے نامعلوم مؤرخ کے حوالے سے پروفیسر ظہور الدین نے دی ہے:

> ’’راجا سری دھر کے عہد میں روشن شاہ ولی رحمہ اللہ جموں پہنچے اور انھوں نے راجا کو گھوڑا پیش کیا۔راجا نے انھیں ان کے آبائی وطن سے متعلق پوچھا کہ وہ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ حضرت بابا روشن شاہ ولی نے جواب دیا! کہ عرب کے شہر مکہ جہاں وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی کرامتوں اور کرشموں سے اسلام پھیلاتے رہے ہیں۔وہیں سے تشریف لائے ہیں۔راجہ نے پھر انھیں مذہبِ اسلام کے مبلغوں کے بارے میں پوچھا جس کے جواب میں

انھوں نے حضرت معاویہ، حضرت ابراہیم، حضرت یعقوب، حضرت یوسف، حضرت ایوب اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے نام لیے۔ حضرت روشن شاہ ولی نے یہ بھی فرمایا کہ عبداللہ کے تمام بیٹوں کو اللہ تعالیٰ نے کرامتوں سے نوازا تھا اور ساتھ میں یہ بھی کہا کہ ان کے والد کے یہاں بارہ لڑکے پیدا ہوئے تھے جن میں سے کوئی بھی ان (حضرت روشن شاہ ولی) جیسا نہ ہوسکا۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ دنیا کے متعدد ممالک کا سفر کرنے کے بعد جموں پہنچے ہیں۔ راجا نے اس کے بعد حضرت روشن شاہ ولی کو اپنے ساتھ ٹھہرنے کی درخواست کی جو انھوں نے بخوشی قبول کر لی۔ راجا نے ان کی خاطر مدارت میں کوئی بھی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ کچھ عرصہ گذارنے کے بعد ایک دن حضرت بابا راجا کے پاس آئے اور انھوں نے اس سے کہا کہ وہ اس سے بہت ہی خوش ہیں اور آج وہ اسے ہمیشہ کے لیے الوداع کہنے کے لیے آئے ہیں۔ انھوں نے یہ پیشین گوئی بھی کی کہ وہ ان کے بعد آنے والے صوفیائے کرام اور اولیاء اللہ ملک میں امن وامان قائم کرنے کی کوشش کرتے رہیں گے۔ تاہم اس کے باوجود اگر اسے (راجا کو) کسی قسم کی کوئی مشکل درپیش آئے تو وہ ان (حضرت شاہ روشن ولی) کو یاد کرتے ہوئے ان کے نام پر لوگوں کو شربت پلاتا رہے ان کے مقبرے کو منور رکھے۔ یہی کام اس کی تمام مشکلات کو حل کردے گا اس کے بعد حضرت روشن شاہ ولی چلے گئے اور گمٹ گیٹ پر پہنچنے کے بعد سر سے پاؤں تک چادر اوڑھ کر لیٹ گئے۔ کچھ دیر بعد جب کسی شخص نے چادر اٹھائی تو کیا دیکھا کہ حضرت روشن شاہ ولی غائب ہیں۔ راجا سری دھر نے اسی مقام پر چادر کے طول وعرض کے مطابق مقبرہ تعمیر کروا کے اس پر گنبد بنوا دیا۔ بعد کے راجا اس میں ترمیم واضافہ کرتے رہے۔ اس روایت کی توثیق اور کسی وسیلے سے نہیں ہوتی۔"
(5)

راجا سرپلا دھر نے پچاس سال تک حکومت کی۔ اس نے اپنی حکومت کے دوران کبھی کسی انسان کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔ اس کی حکومت کے بعد اس کے جانشین راجا کیرتی دھر نے حکومت سنبھالی۔ راجہ کیرتی دھر نے تقریباً ساٹھ (60) سال تک حکومت کی۔ راجہ کیرتی دھر کے عہد میں حضرت بابا روشن شاہ ولی کے بعد صوفیائے کرام کی ایک خاص تعداد اس خطے میں داخل ہوئی۔ تاریخی اعتبار سے اگر اس کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں ان کے بارے میں کوئی شواہد

نہیں ملتے ہیں۔ یہ ہمارے لیے بڑے افسوس کی بات ہے کہ بابا روشن شاہ ولی کے بعد جو صوفیائے کرام کثیر تعداد میں خطۂ جموں میں اپنی شان وشوکت کے ساتھ وارد ہوئے ان کے بارے میں کہیں ذکر نہیں ملتا ہے۔ اور خاص طور پر ان صوفیا کے بارے میں جو بارہویں، تیرہویں صدی کے بعد اس خطے میں داخل ہوئے تھے۔ حضرت پیر روشن شاہ ولی رحمہ اللہ کے بعد جو دوسرے صوفیائے کرام خطۂ جموں میں وارد ہوئے تھے اس میں بہت سارے یکے بعد دیگرے اس پہاڑی خطے میں داخل ہوتے گئے اور اپنا مقام بناتے گئے ان کے بارے میں جو معلومات فراہم ہوتی ہیں مندرجہ ذیل ہیں:

(1) پیر بڈھن علی شاہ جموں

(2) پیر جیون شاہ جموں

(3) شاہ اسرارالدین کشتواڑ

(4) بابا غلام شاہ بادشاہ شاہدرہ شریف

(5) پیر صوفی شاہ جموں

(6) پیر علی شاہ مردان جموں

(7) پیر لکھ داتا جموں

(8) شاہ فریدالدین بغداد کشتواڑ

(9) پیر ظاہر ولی جموں

(10) پیر ہوں شاہ جموں

(11) پیر محبت علی شاہ جموں

(12) پیر بکر شاہ جموں

ان مذکورہ بالا صوفیائے کرام کے آنے سے خطۂ جموں میں اردو زبان کو بہت ترقی ہوئی۔ اس عہد میں ایک طرف تو دونوں قوموں کے مذاہب کو ترویج کا موقع ملا تو دوسری طرف مقامی زبانوں اور بولیوں کے پھلنے پھولنے اور ان کی ترقی کے دروازے کھل گئے۔ صوفیائے کرام نے اردو زبان کے علاوہ کسی دوسری زبان کو نہیں اپنایا تھا۔ اسی زبان کو انھوں نے وسیلۂ اظہار بنایا۔ یہی وجہ رہی کہ مقامی بولیوں نے بھی اپنی جڑیں مضبوط کرنا شروع کیں۔ اور اردو زبان

سے استفادہ کرتے ہوئے عوام نے اپنی مقامی بولیوں کوفروغ دینے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ بزرگان دین نے اپنے دین و مذہب کی باتیں اپنی اپنی بولیوں اور زبانوں میں شعر وشاعری یا دیگر اصناف ادب کے ذریعے بیان کیں۔اس دور میں صرف اردو زبان میں ہی ادب تخلیق نہیں ہوتا تھا بلکہ صوفیائے کرام جس کو جو زبان یا بولی پسند آئی اس نے اسی بولی کا سہارا لیتے ہوئے اردو رسم الخط میں ادب تخلیق کیا۔مگر بنیادی زبان اردو ہی رہی۔اس دوران کئی ایسے مقامی بزرگان دین، شعرا و ادباء کے نام خاص طور پر جانے جاتے ہیں جنھوں نے اردو زبان کو بنیاد بنا کر ادب تخلیق کرنا شروع کیا۔ان کا ذکر مندرجہ ذیل ہے۔

(1) سائیں ولی داد بٹھیاں، راجوری

(2) بابا سائیں گنجی

(3) بابا سائیں فقر دین پونچھ

(4) شاہ سخی سرور مہینڈر

(5) چھوٹے شاہ مہینڈر

(6) پیر سید فاضل بھیمبر گلی راجوری

(7) سائیں لال دین، مراگاں راجوری

(8) پیر صالحہ دھونور، راجوری

(9) میاں لال دین، سوڑہ پانی، راجوری

(10) سائیں سوڑیا، جڑواں ولی گلی، سرنکوٹ

(11) پنج پیر راجوری

(12) سلطان پہور راجوری

(13) پیر ذکریا منگوٹہ، تھنہ منڈی

(14) صابر شاہ، بدہ کنہ، راجوری

(15) پیر ملتانی آملی مٹی، راجوری

(16) پیر چہلا پلولیا، راجوری

(17) سائیں جلیاں والے، ساج راجوری

(18) رتن پیر تھنہ منڈی

(19) حضرت شیخ احمد کریم، پیر پنچال

ان مذکورہ بالا صوفیائے کرام کے علاوہ بھی بہت سارے صوفیا اور اولیاء گزرے ہیں جنھوں نے اردو زبان کو اپنے عہد میں فروغ دیا مگر ان حضرات کے متعلق معلومات ابھی تک فراہم نہ ہوسکی کہ جس کے بارے میں تفصیلات بیان کی جاسکیں۔

1193 میں دہلی کو مسلمانوں نے فتح کیا اور دہلی ہندوستان کا دارالخلافہ بنا۔ اسی وجہ سے مسلمانوں کا وہاں آنا شروع ہوا۔ انھوں نے دہلی پہنچ کر نہ صرف اپنی حکومت قائم کی بلکہ زبان وادب کو بھی دہلی میں فروغ دیا۔ یہ وہی زبان تھی جو سندھ اور پنجاب میں تقریباً 400 سال تک پلتی رہی اور مقامی زبانوں کے ٹکراؤ سے اپنی شکل قائم کرنے میں کامیاب ہوئی۔ اُس وقت دہلی اور گردونواح میں بولی جانے والی زبان کھڑی بولی کہلاتی تھی اور وہ زبان جو مسلمانوں کے ساتھ سندھ اور پنجاب سے ہوکر اپنا سفر طے کرکے دہلی پہنچی تھی، اس نے مقامی زبان یعنی کھڑی بولی سے مل کر ایک نئے اشتراک عمل کی بنیاد رکھی اسی بنا پر جو مسلمانوں کے ساتھ زبان دہلی میں وارد ہوئی اس کو پھلنے اور پھولنے کے زیادہ مواقع ملے۔ اور یہی زبان آگے چل کر مختلف مراحل طے کرنے کے بعد اتحاد و یک جہتی کی علم بردار ثابت ہوئی۔ اس زبان کا اثر نہ صرف دہلی میں دکھائی دیا بلکہ دہلی سے باہر یعنی دہلی کے گردونواح میں بھی اسکے اثرات دکھائی دیئے۔ پنجاب سے جن لوگوں نے دہلی کا سفر اختیار کیا ان میں سے کچھ صوفیائے کرام پورے ہندوستان میں پھیلتے گئے اور انہی صوفیاء میں سے ایک گروہ اس پہاڑی خطے میں بھی داخل ہوا۔

صوبۂ جموں پر عموماً مسلمان حکمرانوں اور خصوصاً مغلوں کے حملے آئے دن کشتواڑ، کشمیر اور کانگڑہ وغیرہ پر ہوتے رہتے تھے۔ اور یہاں تک کہ اکبر کے عہد میں جموں کے قلعے پر فوج کشی کی گئی۔

مسلمانوں نے نہ صرف کشتواڑ اور جموں کے علاقے پر حملے کیے بلکہ کشمیر کے علاقے پر بھی دن بدن حملے کرتے

گئے اور وادیٔ کشمیر 1586ء میں مغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے ہاتھوں ملک کا ایک حصہ بن گئی۔اس تاریخی واقعے کا بہت ساری تصانیف میں ذکر ملتا ہے۔ان میں سے ایک اشارہ یورپی اسکالر فرڈرک ڈریو کی انگریزی کتاب سے ماخوذ ہے جس کا ڈاکٹر صابر مرزا نے اردو ترجمہ کیا ہے:

''اکبر کے ہاتھوں کشمیر کی فتح دوسری بڑی تبدیلی تھی۔سارے ملک کی دیکھ بھال نظم ونسق کے معاملات ومسائل اکبر کے سامنے تھے۔اس پر یہ بھی کہ 1586ء سے اس وقت تک کشمیر یوں پر تین مرتبہ غیر ملکی حکومت کر چکے تھے۔اس طرح ان کے آقاؤں میں تبدیلی آرہی تھی۔ اس وقت کشمیریوں کی نہ تو اپنی آواز تھی، نہ ہی کچھ اثر ورسوخ تھا جس کے بل بوتے پر وہ تبدیلی لا سکتے تھے۔مغلیہ حکمران جن کا اس وقت وطن ہندوستان اور پایۂ تخت دہلی یا آگرہ تھا، دہلی یا آگرہ میں بیٹھ کر ڈیڑھ صدی تک اس ریاست پر حکومت کرتے رہے۔مغلیہ عہد میں ملک پر ان کا کوئی نمایندہ ہی حکومت کرتا تھا جسے صوبے دار یا صوبا کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ بادشاہ خاص طور پر گرمیوں کے موسم میں ملک کے بعض حصوں کی دیکھ ریکھ کی خاطر سفر کرتا تھا۔عدلیہ کا یہ سفر کشمیر کا نام لب پر آتے ہی شروع ہو جاتا تھا۔کیوں کہ یہ وہ وقت تھا جب کشمیر کے حسین وجمیل نظاروں اور فطری مناظر کی دل کشی کی شہرت یورپ تک پہنچ چکی تھی۔ شاہجہاں اور اورنگ زیب نے محلات و باغات بنوا کر کشمیر کے حسن کو اور بھی جلا بخشی۔ یہ محلات وباغات فطری مناظر اور تازہ ہواؤں کا مرکز تھے۔مغلیہ حکمرانوں کے اس فن تعمیر میں دلچسپی نے نہ صرف حوصلہ افزائی کی بلکہ ان کے ہاتھوں انجام پانے والے فن پاروں نے ساری دنیا کا دل جیت لیا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف عدلیہ بلکہ دوسرے لوگ بھی جوق در جوق قافلوں کی شکل میں وادی میں آنے لگے''۔(6)

جموں کے راجاؤں کا شروع سے ہی یہ شیوا رہا ہے کہ جو بھی سیلانی یا صوفیا حضرات باہر سے آتے ان کو کبھی غیر کی نظروں سے نہ دیکھتے بلکہ ان کی خوب خدمت کرتے اور اپنے تعلقات ان کے ساتھ استوار رکھتے۔اسی ربط وضبط کے باہمی اختلاط کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو زبان اس پہاڑی خطے میں پنپنے لگی جیسا کہ پہلے بھی اس بات کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ اردو زبان کو پہاڑی خطے میں داخل کرنے کی وجہ مغلیہ حکمران تھے۔اس زبان کے ارتقا میں خاص طور پر مغلیہ عہد کے آخری حکمرانوں کا زیادہ عمل دخل رہا۔درحقیقت اردو زبان وادب کو فروغ دینے میں مغل حکمران ہی تھے جو اپنے

ساتھ زبان اور تہذیب جموں خطے میں لائے۔

بادشاہ اکبر کے ہندوستان پر تخت نشین ہونے اور کشمیر کی سیر وسیاحت کا آغاز اردو زبان کے ارتقا کا ایک اہم موڑ تھا۔ بادشاہ اکبر اپنے عہد میں صرف تین بار کشمیر میں آیا۔ اس کے بعد جہاں نگیر، شاہ جہاں اور نگ زیب نے کشمیر کی کئی بار سیر کی۔ مورخین ومفکرین کے مختلف نظریات کے مطابق اکبر کے شاہی دربار کے کیمپ میں لاکھوں افراد شامل تھے۔ جنھوں نے بادشاہ اکبر کو اپنا حکمران تسلیم کیا تھا۔ وہ لوگ اپنی الگ الگ زبانیں بولتے تھے مگر اس کے باوجود بھی وہ ایک مشترکہ زبان کو اپناتے اور اسی میں زیادہ تر گفتگو کرتے تھے۔ چنانچہ اُسی زبان نے آہستہ آہستہ عوام میں اپنی جڑیں مضبوط کرلیں۔

مغل شہنشاہ ڈوگرہ دیش، نوشہرہ، بھمبر، راجوری بہرام گلا سے ہوتے ہوئے پیر پنچال کے راستے سے گزر کر کشمیر پہنچے۔ انھوں نے اس دوران جو سفر طے کیا اس سفر میں نہ صرف اردو زبان کو پھیلایا بلکہ دوران سفر ہر علاقے میں اپنی تہذیب کا بیج بھی بوتے چلے گئے۔ جہانگیر نے اپنے سفر کے دوران بہت ساری سرائیں بھی تعمیر کروائیں جو آج کھنڈروں میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ جس راستے سے جہاں نگیر کشمیر میں داخل ہوا تھا اس راستے کو آج مغل روڑ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ ایک پہاڑی علاقہ ہے اور اکثر اس سڑک پر لوگوں کا آنا جانا صرف موسم گرما میں رہتا ہے باقی تمام مہینے یہ راستہ برف کی چادر سے ڈھکا رہتا ہے۔

جموں خطے میں اردو کے عمل دخل کا ثبوت ہمیں سب سے پہلے اس وقت ملتا ہے، جب جہانگیر نے اس راستے سے کشمیر کا رخ کیا تھا۔ اس عہد میں کشتواڑ کے راجا کو گرفتار کر کے جہانگیر کے سامنے پیش کیا گیا۔ کشتواڑ کا راجا بہت سی زبانیں جانتا تھا خاص طور پر کشمیری اور ہندی میں زیادہ ماہر تھا۔ اسی دوران دوسرا ثبوت زبان کے ابتدائی نقوش کے متعلق ہمیں تب ملتے ہیں، جب پیر پنچال کے راستے سے گزرتے ہوئے جہانگیر نے اس بات کا ذکر کیا تھا کہ یہاں جس زبان کا زیادہ عمل دخل ہے وہ ہندی ہے جو یہاں سے دلی تک تھوڑے تھوڑے فرق اور مماثلت کے ساتھ استعمال ہوتی ہے۔

کشتواڑ کا علاقہ خوب صورتی کے لحاظ سے کشمیر سے مماثلت رکھتا ہے جو سری نگر سے تقریباً ساٹھ کوس پیر پنچال کی دوسری طرف واقع ہے۔ جب جہاں نگیر نے کشمیر کا سفر طے کیا تھا تو اس عہد میں اردو زبان موجود تھی چاہے اس کی ابتدائی نوعیت کیسی بھی کیوں نہ رہی ہو۔ اس کی واضح مثال خود راجہ کشتواڑ تھا جس کو ہندی (یعنی قدیم نام اردو) اور کشمیری

زبانوں پر مہارت حاصل تھی اور آج بھی وہی زبان پورے پیر پنچال کے علاقے میں بولی جاتی ہے۔

جہانگیر کا کشمیر جانے کا راستہ اکثر پیر پنچال سے ہوکر تھنہ منڈی اور بہرام گلہ کا ہوا کرتا تھا۔ یہ سارا علاقہ گھنے پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے، جس کی وجہ سے یہاں کم لوگ بستے ہیں جن کی آبادی بہت مختصر ہے۔ جہانگیر کے زمانے میں ان علاقوں میں کشمیری، فارسی اور ہندی زبانیں بولی جاتی تھیں۔ اس وقت اردو کا قدیم نام ہندی تھا۔ جہانگیر نے بھی خود جس زبان کو اپنایا تھا وہ بھی ہندی تھی۔ یہ وہی ہندی زبان تھی جس کی وجہ سے مشترکہ زبان اور تہذیب قایم ہوئی اور مسلمانوں کے عمل دخل کی وجہ سے ملک بھر میں مشترکہ زبان کا درجہ رکھ کر اردو کے نام سے جانی جاتی ہے۔

قدیم علاقائی ناموں میں آج بہت تبدیلی آچکی ہے۔ اسی طرح سے جو قدیم محل سرائیں یا دوسرے قلعے تھے وہ آج کھنڈروں کی شکل میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ تھنّہ کا نام اب تھنہ منڈی سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جو کافی مشہور نام ہے کیوں کہ جہانگیر جب اس راستے سے گزرتا تھا تو کچھ دنوں کے لیے یہاں ضرور رکتا تھا۔ تھنّہ منڈی ہندو پاک کے درمیان کی ایک سرحد ہے جو شمال مغرب میں جموں سے تقریباً 178 کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔ یہ علاقہ قدرتی نظاروں اور آب وہوا کے لحاظ سے بہت خوب صورت ہے۔ اس علاقے میں جو لوگ رہتے ہیں انھوں نے اپنی تہذیب کے ساتھ ساتھ زبانوں کو بھی پھیلانے کی کوشش کی جن میں خاص طور پر عربی، فارسی بہت ہی اہمیت کی حامل ہیں۔ کیوں کہ عوام الناس کو یہ دو زبانیں بہت پسند تھیں۔ انھوں نے عربی و فارسی زبان کو پروان چڑھانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ کیوں کہ عربی مسلمانوں کی مذہبی زبان تھی اور فارسی زبان میں سارے دفتری کام کاج ہوا کرتے تھے۔ اس طرح سے عوام الناس اور دربار کے مابین رابطے کی زبان کا درجہ فارسی کو حاصل تھا۔ مگر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اور اردو زبان کی جڑیں مضبوط ہونے لگیں تو عربی و فارسی زبانوں کا رشتہ بھی عوام الناس اور دربار سے کٹنے لگا۔ آخر کار ان دونوں زبانوں کی جگہ اردو زبان نے لے لی۔ اور فارسی کی جگہ درباری زبان ''اردو'' کہلائی۔ اب اس میں کوئی بھی شک وشبہ والی بات نظر نہیں آتی کہ ان دونوں زبانوں کے عمل دخل سے یا ان کے میل ملاپ اور علاقائی یا مقامی بولیوں کے علاوہ اردو زبان ہی عوام کی دلچسپی کا باعث بنی ہوگی۔ کیوں کہ عربی فارسی کے بعد اگر کسی زبان کو بڑا درجہ حاصل ہوا ہے تو وہ اردو زبان ہی ہے۔ جس کے اندر روزمرہ اور مقامی بولیوں کے علاوہ عربی، فارسی کے بہت سے الفاظ کا ذخیرہ موجود ہے۔ اردو زبان نے بہت سے مترادف الفاظ دوسری زبانوں سے مستعار لیے ہیں۔ اسی وجہ سے اردو زبان کئی زبانوں کا رس کہا جاتا ہے۔

فارسی زبان کا آخری دور مغلیہ عہد تھا۔ کیوں کہ مغلیہ عہد کے زوال کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کا بھی زوال شروع ہوگیا تھا، جس کی وجہ سے عوام الناس سے اس کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ فارسی کے زوال کے بعد مغل عدلیہ کے پاس صرف ایک ہی راستہ تھا کہ وہ اردو زبان کو ہی اپنا ذریعۂ اظہار بنائیں۔ وہ دور تھا جب اردو زبان پوری طرح سے عوام الناس میں مقبول نہیں ہوئی تھی بلکہ چند گنے چنے علاقوں میں ہی رائج تھی۔

1846 کے بعد مہاراجہ گلاب سنگھ کا دور شروع ہوتا ہے۔ چناں چہ 1846ء میں مہاراجہ گلاب سنگھ کے ہاتھوں اس خطے میں ڈوگرہ راج کا قیام عمل میں آیا۔ اس وقت یعنی مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہدِ حکومت میں شروع میں فارسی کو ہی درباری زبان کا درجہ حاصل ہوا۔ کیوں کہ ڈوگرہ حکمران زیادہ تر فارسی میں ہی مغل حکمرانوں سے بات چیت اور لین دین کیا کرتے تھے۔ ڈوگرہ حکمران مغل دربار سے بہت ہی متاثر تھے۔ اسی وجہ سے انھوں نے مغلیہ دربار کی تمام روایات کو پوری طرح سے فروغ دینے میں جا بجا کوششیں کیں۔ انھوں نے مغلیہ دربار کے ہر شعبے کو اپنا سمجھ کر ان کی کمزوریوں کو درست کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈوگرہ دربار ایک طرح سے مغلیہ دربار کا چربہ نظر آنے لگا تھا یہ سب کام مہاراجہ گلاب سنگھ کے دورِ حکومت میں ہوا تھا۔ اس دور میں نہ صرف عوامی سطح پر ان کی پیروی ہوئی بلکہ سرکاری سطح پر منائے جانے والے کئی ایسے تہواروں میں مثلاً نوروز، پھولوں کی سیر کے علاوہ بہت سارے ایسے تہواروں کی پیروی کی جانے لگی جس سے ڈوگرہ دربار میں پورا ماحول مغلیہ دربار جیسا معلوم ہوتا تھا۔

نوروز پر دوسرا سالانہ تیوہار فارسی تہوار کی شکل میں مسلمان حکمرانوں نے متعارف کروایا اور اب ہندو انتظامیہ بھی اسے متعارف کروا رہی ہے۔ یہاں بھی اسے انداز اور طور طریقے سے منایا جاتا ہے، جیسے بسنت پنچویں منائی جاتی ہے۔ بسنت پنچویں ایک ہندوؤں کا تہوار ہے اس دن سرسوتی کی پوجا ارچنا کی جاتی ہے اور یہ تہوار اکثر جنوری اور فروری کے مہینے میں آتا ہے۔ اس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ سردی کا موسم ختم ہونے کے بعد موسم بہار آتی ہے، اور اس دن ہندوؤں میں کثیر تعداد میں لڑکیاں پیلے رنگ کا لباس پہنتی ہیں اور سرسوتی کی پوجا کرتی ہیں۔ لڑکیوں کے پیلے لباس کا مقصد آنے والی قدرتی نظاروں سے ماخوذ ہوتا ہے تاکہ ہر انسان کی زندگی میں خوشیوں کا ماحول بنا رہے۔

دوسرا تہوار ''سیر'' کہلاتا ہے۔ یہ تہوار اکثر موسم خزاں میں منایا جاتا ہے اور کافی دنوں تک اس کی دھوم دھام رہتی ہے اس تہوار میں ہر طبقے کے لوگ شمولیت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ خوشیاں بانٹتے ہیں۔ اس تہوار میں نہ صرف سرکاری ملازمین شرکت کرتے ہوئے دکھائی دیتے تھے بلکہ گاؤں اور قصبے کے کئی افراد جیسے بیوپاری، مہاجن،

دوکاندار، مزدور کسان، پٹواری، سیٹھ، ڈ ھپالی، لوہار وغیرہ اور کئی دور دور کے لوگ میلوں کا سفر طے کرکے اس تہوار میں شامل ہوتے ہوئے اپنے کاروبار کی منتیں مانگتے، چڑھاوے چڑھاتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس روایت کو صدیوں سے لوگ کرتے آ رہے ہیں۔ جو آج بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔

مغلیہ دور میں رسم ورواج، تہذیب وثقافت، تہواروں کے جشن اور سرکاری تعلقات کی وجہ سے فارسی زبان کی مٹھاس اور عوامی برتاؤ جموں کے راجاؤں کے دلوں میں ہمدردی اور محبت کی جگہ قائم کر گئی۔ جموں کے راجاؤں کو مغلیہ حکومت کی ہر شے سے محبت ہونے لگی۔ انھوں نے بھی اس زبان کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے اس کو اپنا لیا۔ اسی زبان کی وجہ سے بعد میں اردو زبان کو کافی فروغ ملا۔ مہاراجہ گلاب سنگھ نے اگر چہ ابھی تک اردو کو سرکاری زبان کا درجہ نہیں دیا تھا مگر یہ بھی درست ہے کہ یہ زبان عوام الناس اور بڑے طبقے یعنی پڑھے لکھے طبقوں میں عام بول چال کی زبان بن چکی تھی۔ یہی سبب رہا کہ آگے چل کر یہ زبان اس قدر ہر دل عزیز ہوگئی کہ انیسویں صدی کی نصف اول میں یہ زبان جموں خطے میں گورنمنٹ کے نچلے دفاتر میں عام ہوگئی۔ اور یہاں تک کہ دفاتر کا سارا کام کاج بھی اسی زبان میں انجام دیا جانے لگا۔

آج جب ہم تحقیق کے مسئلے یا کسی دوسری کھوج کے لیے ان دفاتر میں جاتے ہیں تو تمام پرانے کاغذات ہمیں اردو زبان میں ہی حاصل ہوتے ہیں۔ محکمۂ مال سے متعلق تمام پرانے کاغذات بھی اسی زبان میں دستیاب ہیں۔ محکمۂ مال کے علاوہ پرانے جتنے بھی ریکارڈ ملتے ہیں (جن کو آج پڑھنا آسان نہیں ہے) وہ سب اردو زبان میں ہیں اور ان کو محافظ خانہ جموں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان تمام شواہد کے مطابق اس بات کا آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انیسویں صدی کے نصف اول میں اردو زبان خطۂ جموں کی ایک ایسی زبان بن چکی تھی جسے سرکاری زبان کا درجہ دیے بغیر اور کوئی چارہ نہ تھا۔ نچلے طبقے کے دفاتر خصوصاً محکمہ مال، عدلیہ اور قانون وغیرہ کے علاوہ دیگر محکمہ جات کا سارا دفتری کام کاج اسی زبان میں ہوا کرتا تھا۔ مگر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ابھی تک بڑے طبقے کے دفاتر میں اس زبان کو اردو کا درجہ حاصل نہیں ہوا تھا۔ محافظ خانہ سے دستیاب ہونے والے بہت سے ایسے ریکارڈ ہیں جن سے آسانی سے اردو زبان کی شروعات کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ محافظ خانہ میں سب سے زیادہ ریکارڈ ڈوگرہ انتظامیہ کا سرکاری ریکارڈ ہے جو آج بھی وہاں دستیاب ہے۔ حالاں کہ اس مواد کو پڑھنے میں کافی دشواری پیش آتی ہے۔ راقم الحروف نے محافظ خانہ کا ایک بار دورا کیا جس سے چند کاغذات کو پڑھنے کا موقع ملا مگر قلم سے لکھی ہوئی پرانی تحریر کو پڑھنے میں کافی دشواری پیش آئی۔

جموں میں فارسی اور انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو سرکاری زبان کے طور پر استعمال کی جاتی تھی۔ ڈوگرہ عہد میں

نہ صرف شاہی فرمان اردو زبان میں ہوتے تھے بلکہ فارسی اور انگریزی میں بھی لکھے جاتے تھے۔سرکاری خطوط جو کبھی انگریزی اور کبھی فارسی زبان میں دستیاب ہوتے تھے ان کا ترجمہ اردو میں کیا جاتا تھا۔اس کے بعد ان کی اصل تحریر کو بھی تراجم کے ساتھ ملا کر ایک مخصوص جگہ پر رکھا جاتا تھا۔مہاراجہ ملکی نظم ونسق کی بہتری کے لیے ہر ممکن کوشش کو بروئے کار لائے۔مگر اس کے باوجود ملکی نظام میں کوئی بہتری نہیں ہوسکی اس وجہ سے زبان وادب کے لیے کوئی خاص تبدیلی رونما نہ ہوئی اور نہ ہی عوام کی فلاح و بہبود پر توجہ کو مرکوز رکھ سکے۔

اس عہد میں پورے ہندوستان میں جموں وکشمیر کے علاوہ بہت سی ریاستوں میں اردو زبان وادب کی دھوم مچی ہوئی تھی۔خاص طور پر دہلی جو اس زبان کا مرکز تھا۔شعرا وادباء میں خاص طور پر غالبؔ،مومنؔ،ذوقؔ وغیرہ جیسی عظیم واعلیٰ شخصیتوں نے اردو زبان وادب میں نام روشن کر لیا تھا اور اپنے کارناموں کو پورے ہندوستان میں پھیلا دیا تھا۔ظاہر سی بات ہے کہ ان بلند آوازوں نے خطۂ جموں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔چاروں طرف غالبؔ،مومنؔ،اور ذوقؔ کو دیکھ کر شعرا وادباء اس زبان میں طبع آزمائی کر رہے تھے۔خطۂ جموں میں بھی دوسری ریاستوں کی طرح اس خطے میں نئے شعرا و ادباء اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارنے کے لیے اردو زبان کا سہارا لے کر اپنی اہمیت کو اجاگر کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔جس کا ذکر تفصیل سے ڈاکٹر ظہور الدین نے اپنی کتاب ’Development of Urdu language and literature in Jammu Region‘‘ میں کیا ہے۔مہاراجہ گلاب سنگھ کے دور میں اردو زبان کو اُتنی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی تھی جتنی مہاراجہ گلاب سنگھ کے بعد ان کے بیٹے مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دورِ حکومت میں ہوئی۔اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ خود بھی اردو زبان اور ادب وفنون کا دلدادہ تھا۔مہاراجہ گلاب سنگھ کا دور تقریباً1856ء میں ختم ہو جاتا ہے۔اس کے بعد مہاراجہ رنبیر سنگھ کا دور 1856ء سے 1885ء تک کا ہے۔مہاراجہ رنبیر سنگھ نے اپنے عہد میں نہ صرف مدرسے،کالج اور عمارتیں تعمیر کروائیں بلکہ مختلف زبانوں کو بھی فروغ دیا جن میں اردو زبان بھی اہمیت کی حامل تھی۔ان زبانوں کے لیے طرح طرح کے مراکز قایم کروائے۔ریاست کے اندر تو بہت سے شعرا وادباء پیدا ہو رہے تھے،مگر بیرون ریاستوں سے بھی غیر معمولی حیثیت کے عربی،فارسی کے ماہرین ادباء وشعرا کو دعوت دی جس سے اردو زبان کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کو بھی بیرون ریاست کے ماہرین سے اس خطے کو زیب وزینت ملی۔مہاراجہ رنبیر سنگھ نے مختلف النوع امور سے متعلق تعلیم کو عوام میں متعارف کروایا،مختلف قسم کے کتب خانے کھلوائے گئے۔ان کتب خانوں کا تعلق آرٹ،سائنس،حساب،قانون وزبان وادب وغیرہ سے تھا۔ان سب کے تراجم کے لیے مہاراجہ نے بیرون ریاستوں کے مترجم کو بلوایا اور ان کتابوں کے تراجم اردو،ڈوگری،اور ہندی زبانوں میں کروائے۔یہ ایک بہت

بڑا اور اہم قدم تھا کہ عوام الناس میں ان سب چیزوں سے واقفیت ہو جائے جس کی ضرورت انھیں آنے والے وقت میں درپیش آسکتی تھی۔ اس لیے مہاراجہ رنبیر سنگھ نے عوام کی ضروریات کے مطابق علوم وفنون میں زیادہ دلچسپی لی۔ جس سے خطۂ جموں کی عوام کو زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہو سکے۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ نے اپنے دورِ حکومت میں عوام کی حمایت میں اچھے اقدام اٹھائے جن کی شان وشوکت آج بھی برقرار ہے۔ ان میں ایک کام یہ بھی تھا کہ انھوں نے اپنے عہد میں رگھوناتھ مندر بنوایا تھا جس کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے۔ یہاں صرف اس کے متعلق اتنا ذکر کرنا ہے کہ یہی مندر آگے چل کر تعلیم و تربیت تحقیق اور سنسکرت کالج کا گہوارہ بنا۔ مندر میں ایک بہت بڑی لائبریری بھی تھی۔ مہاراجہ نے کتابوں کے تراجم کے لیے مترجمین کو بیرون ریاست سے بلوایا۔ جس میں سنسکرت اور فارسی زبانوں میں لکھی گئی کتابوں کا ترجمہ ڈوگری، ہندی اور اردو میں کیا گیا۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دور میں اردو زبان میں کیے گئے تراجم کا کام بہت ہی اہمیت کا حامل ہے، مہاراجہ کی سرپرستی کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ ان کے عہد میں ہی اردو زبان کو اس قدر مقبولیت حاصل ہوگئی تھی کہ عوام وخواص میں ہر طبقے کے لوگ بآسانی اردو زبان بول اور سمجھ لیتے تھے۔ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ اگر یہ زبان ایسے اچھوتے دلکش اور دل نواز اوصاف حمیدہ کی مالک نہ ہوتی تو نہ ہی اس کا اتنا زیادہ چلن ہوتا اور نہ ہی مہاراجہ رنبیر سنگھ کو اس زبان کو فروغ دینے میں کوئی موقع ہاتھ آتا۔ اس بات سے تو ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو زبان عام بول چال اور دفتری یا سرکاری ہونے کا درجہ رکھتی ہو اس کو فروغ دینے میں عوام کا ہی ہاتھ ہوتا ہے۔ مہاراجہ نے بھی ان چیزوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اردو زبان کو بام عروج تک پہنچایا۔ ان ہی سرگرمیوں کے ساتھ جب ریاست میں اخبارات ورسائل کی ضرورت پڑی تو سب سے پہلے اردو زبان میں اخبارات ورسائل کو ذریعۂ اظہار بنایا گیا۔ اس بات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کا اردو کے تئیں بہت ہی مثبت رویہ تھا۔ جس کی بنیاد پر خطۂ جموں میں اردو زبان وادب کا سلسلہ ایک خوش گوار انداز میں شروع ہوا۔ اس زبان میں دونوں سطح پر چاہے وہ سرکاری ہوں یا غیر سرکاری تمام طور پر ان سرگرمیوں کو ایک بہترین انداز میں انجام دیا جانے لگا۔

مہاراجہ نے ادبی سرگرمیوں کو اردو زبان ہی کے ذریعے پروان چڑھایا۔ اردو زبان وادب کے متعلق مہاراجہ رنبیر سنگھ نے ایک ادبی وتہذیبی سوسائٹی 1882 میں قائم کی جس کو ''بدیا بلاس سبھا'' کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اس سبھا میں بہت سی زبانیں مثلاً عربی، فارسی، سنسکرت، اردو، ہندی، ڈوگری شامل تھیں۔ ''بدیا بلاس سبھا'' میں ان سب زبانوں کے

محققین ومفکرین بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔''بدیابلاس'' کی نشستیں ہفتہ وار ہوا کرتی تھیں اور ہفتہ میں ہر منگل وار کو اس کی نشست ہوتی تھی۔اس بات کا ذکر ڈاکٹر صابر آفاقی مرزا نے بھی اپنی کتاب میں بڑے بہترین انداز میں کیا ہے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''بدیابلاس سبھا'' کے زیر اہتمام مہاراجہ کی عدالت میں ہفتہ وار نشستیں ہر منگل وار کو منعقد ہوا کرتیں ایسی ادبی نشستوں نے اردو زبان وادب کو اور بھی جلا بخشی جو علما و محققین ومفکرین ''بدیابلاس'' کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے''(7)

''بدیابلاس سبھا'' کے متعلق اور بھی کئی تصانیف میں مختلف طریقے سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔ڈاکٹر منظر اعظمی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

> ''1857ء میں''بدیابلاس سبھا'' کے قیام سے اردو زبان وادب کو بڑھاوا ملا۔اس لیے کہ اس کے زیر اہتمام اردو میں بہت سی کتابیں ترجمہ کی گئیں۔اور اس طرح دھیرے دھیرے اردو شعر وادب کا جادو اس ریاست پر بھی اپنا اثر دکھانے لگا''۔(8)

مذکورہ بالا اقتباس کا جائزہ لیتے ہوئے راقم نے دیگر تصانیف کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ''بدیابلاس سبھا'' کے متعلق تاریخ میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے ہر محقق ومورخ نے اپنے نظریے کے مطابق''بدیابلاس سبھا'' کی تاریخ کو الگ طریقے سے بیان کیا ہے مگر کچھ تصانیف میں اس تاریخ کی مماثلت بھی ملتی ہے۔اب نئی تحقیق کے مطابق یہ ثابت ہو چکا ہے کہ''بدیابلاس سبھا''1882ء میں قائم ہوئی تھی۔جس میں بہت سے شعرا اور ادباء کی شمولیت کے ساتھ ساتھ ہندو مسلم دونوں قوموں کے لوگ بڑھ چڑھ حصہ لیتے تھے۔اس کا تذکرہ ہمیں جدید تحقیق کے حوالے سے پروفیسر حامدی کاشمیری کا ملتا ہے۔جن کا شمار دور حاضر میں ریاست جموں وکشمیر کے بڑے نقادوں اور محققین میں ہوتا ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''1882ء میں جموں میں''بدیا بلاس'' پریس قائم ہوا تھا۔اس پریس کے زیر اہتمام ''بدیابلاس'' کے نام سے ایک اردو ہندی گزٹ شائع ہونے لگا تھا۔اس زمانے میں دوسرا اقدام یہ کیا گیا تھا کہ ایک دارالترجمہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔اس کے زیر اہتمام بعض کتابیں اردو میں شائع ہوتی رہیں''۔(9)

''بدیابلاس سبھا''میں کچھ بیرونی ریاست سے بھی محققین ومفکرین شامل ہوتے تھے جن میں قابل ذکر نام حسبِ

ذیل ہیں:

(1) پنڈت برج لال جے پوری

(2) پنڈت بنکت رام شاستری

(3) بنارس سے پنڈت آسانند

(4) پنڈت جگ دھر گلاب رائے

(5) غلام غوث ہوشیار پوری

(6) پنڈت دیوان کرپا رام

(7) جوتشی بشیشور وغیرہ

مذکورہ بالا محققین و مفکرین نے جموں کے شعرا اور ادباء سے مل کر اس سبھا کو بام عروج بخشا۔ مہاراجہ خود بھی اس سبھا کی روزمرہ سرگرمیوں میں انفرادی دلچسپی لیتے تھے اور انھوں نے خود اس سبھا کے اراکین کے لیے ادبی اور تہذیبی و معاشی خدمات کے لیے ہر ضروری شے کو فراہم کروایا تھا۔ تاکہ اس سبھا میں کسی بھی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ مہاراجہ نے قدیم علمی و ادبی سرمایے نیز بدیا بلاس سبھا میں پڑھے اور لکھے گئے مضامین و شعری سرمایے کو شایع کرنے کے لیے ایک بدیا بلاس پریس بھی قایم کیا۔ جس سے اس ادبی سوسائٹی کے ترجمان کے طور پر ''بدیا بلاس'' کے عنوان سے ہی ایک ایک ہفتہ وار اخبار جاری کیا جو وقتاً فوقتاً اردو اور ہندی میں نکلتا رہتا تھا۔ اس اخبار کی وجہ سے اس سوسائٹی کی سرگرمیوں میں کافی اضافہ ہوا۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں اردو زبان نہ صرف دفتروں، عدالتوں اور درباروں میں اہمیت کی حامل ہوئی بلکہ اس دور میں علمی ادبی سرمایہ بھی اردو زبان میں لکھا جانے لگا۔ اس خطے میں یہ زبان ادبی ہونے کی حیثیت سے اتنا بلند درجہ حاصل کر چکی تھی کہ بیرون ریاست کے ادیبوں کے روابط میں اضافہ بھی اسی زبان کے سبب ہوا۔ ریاست میں اس زبان کی دھوم دھام دیکھ کر مختلف ریاستوں سے ادیب جموں کی ادبی محفلوں میں شرکت کرنے لگے۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے بعد مہاراجہ پرتاپ سنگھ کا دور 1885 سے 1924 تک ہے۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے اپنے دور میں پیش رو کی طرح اردو کی ترقی کے لیے کوئی نمایاں کام انجام نہیں دیا۔ کیوں کہ اس سے پہلے مہاراجہ رنبیر سنگھ اپنے عہد میں اردو زبان و ادب کے لیے بہت سے اہم کام کر چکے تھے۔ اگر مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دور حکومت کو اردو زبان و

ادب کا زریں دور کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد میں اردو زبان کو ایک نیا درجہ حاصل ہوا یعنی اردو زبان کو سرکاری زبان کا درجہ مہاراجہ ہی کی کوششوں کی وجہ سے 1888 میں حاصل ہوا۔ جو آج تک برقرار ہے۔ حالاں کہ 1888 میں ہی اردو زبان کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہونے میں مختلف آرا اور بہت سی تصانیف میں مختلف قسم کے اور الگ الگ شواہد ملتے ہیں مگر اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ بیشتر تصانیف میں 1888 یا 1889 کی تاریخ کو درست مانا گیا ہے اس سلسلے میں ایک اقتباس حامدی کاشمیری کا ملاحظہ ہوں:

> ''1889 میں مہاراجہ پرتاب سنگھ نے ریاست میں اردو زبان کو روز افزوں مقبولیت کے پیش نظر اسے سرکاری زبان کا درجہ عطا کیا اور فوراً بعد ریاست کے اسکولوں، عدالتوں اور محکمۂ مال میں اردو کا چلن ہوا۔'' (10)

مہاراجہ پرتاب سنگھ کی دلچسپیاں محدود درجہ کی تھیں حکومت کی سطح پر وہ نظم ونسق کو قائم نہ رکھ سکے۔ اس وقت دربار میں بہت ساری اندرونی سازشیں رچی جارہی تھیں۔ جس کی وجہ سے 1889 میں مہاراجہ پرتاب سنگھ کے سارے اختیارات کو ختم کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ حکومت اور نظم ونسق کے لیے ایک اعلیٰ انتظامی کونسل قائم کی گئی۔ حکومت کے سارے نظام کو توڑ پھوڑ کر ریزڈنٹ نے مختلف سطحوں پر عملی شکل دی۔ یہ ساری چال مہاراجہ کے چھوٹے بھائی راجا امر سنگھ کی تھی۔ اس نئی کونسل کا صدر بھی راجا امر سنگھ کو بنایا گیا۔ دونوں بھائیوں میں آپسی اختلاف پیدا ہوا۔ مہاراجہ پرتاب سنگھ کو جب اس بات کا علم ہوا کہ یہ سارا کیا کرایا اس کے چھوٹے بھائی کا ہے تو اس کو بہت بڑا صدمہ ہوا۔ مہاراجہ پرتاب سنگھ ہر دن بے چین رہنے لگا یہاں تک کہ کھانا پینا اور سونا بھی اس کے لیے حرام ہو گیا۔ اس اعلیٰ کونسل میں نہ صرف مہاراجہ کا چھوٹا بھائی امر سنگھ شامل تھا بلکہ موتی سنگھ پورب کے تجربہ کار افسران کے علاوہ رائے بہادر پنڈت سورج کول، بھاگ رام وغیرہ بھی شامل تھے۔

اسی وجہ سے اس عہد میں دفتری اور درباری کام سارا بگڑ گیا۔ چاروں طرف دھاندلیاں شروع ہوگئیں۔ جس کی نتیجے میں خزانہ سارا خالی ہو گیا۔ ہر عہدہ دار اپنی من مانی کرنے میں مشغول تھا۔ رشوت ستانی اور مکاری کا چاروں طرف بازار گرم ہو گیا۔ ہر محکمے میں حکم عدولی سے کام لیا جانے لگا۔ یہ معاملہ جب حد سے زیادہ بڑھنے لگا تو ریاست اور بیرون ریاست سے مہاراجہ کی طرف داری میں ہر طرف آوازیں بلند ہونے لگیں۔ رسائل اور اخبارات میں بھی مہاراجہ کی موافقت کی جانے لگی۔ ایک طرف مہاراجہ کے حقوق بحال کرنے کے لیے آوازیں بلند ہونے لگیں تو دوسری جانب کشمیر

کے عوام کی بے اطمینانی دیکھ کر حکومت نے مثبت اقدامات اٹھائے۔ مہاراجہ پرتاب سنگھ کے اختیارات کے حقوق کا مسئلہ ریاست اور بیرون ریاست کے پنڈتوں کی تنظیموں اور مسلمانوں نے بڑے جوش وخروش کے ساتھ اٹھانا شروع کیے۔ جس کی وجہ سے انگریزی سرکار بوکھلا گئی۔ مہاراجہ کے حقوق کے لیے عوام کی طرف سے جا بجا احتجاج ہونے لگے یہاں تک کہ ریاست اور بیرون ریاست کے شعراء ادباء نے بھی اپنے قلم کی طاقت سے مہاراجہ کی حمایت کی۔ جس میں قابل ذکر ادیبوں کے نام حسبِ ذیل ہیں:

پنڈت برج نرائن چکبست، پنڈت رتن ناتھ سرشار کے علاوہ استادالشعرا منشی امیرالدین نے اپنے قلم کا سہارا لیتے ہوئے مہاراجہ کے اختیارات کے سلب ہونے اور حکومت کے لیے نئی کونسل بنانے پر اپنی ایک نظم تحریر کی جس کا ایک شعر اس طرح سے ہے

تخت ایوانِ حلالت کی نہ کچھ پوچھ امیرؔ
راجہ اٹھا بھی نہ تھا خیر سے بیٹھی کونسل

اس طرح سے بہت سے شعراء وادباء نے علامتی انداز میں ادب کا سہارا لے کر مہاراجہ کو حقوق دلانے کے لیے کچھ نہ کچھ تحریر کیا۔ اخبارات اور رسائل کی ہلچل کی وجہ سے مہاراجہ پرتاب سنگھ کے کچھ اختیارات بحال ہو گئے۔ لیکن پوری طرح سے مہاراجہ کو اختیارات ان کی آخری عمر تک حاصل نہ ہو سکے، البتہ ان کی وفات کے تقریباً تین سال قبل 1921 میں تمام اختیارات لوٹا دیے۔

مذکورہ بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مہاراجہ پرتاب سنگھ کے دور حکومت میں کئی خامیوں کی وجہ سے اگر چہ مہاراجہ کو وہ درجہ حاصل نہ ہو سکا جو مہاراجہ رنبیر سنگھ کو حاصل ہوا تھا مگر پھر بھی انھوں نے تعلیمی نظام کو سائنسی سطحوں پر نئی جہتوں سے روشناس کرایا۔ جس کی وجہ سے طلبا و مدرسین کے سائنسی علوم کی راہیں ہموار ہوئیں۔ ادبی سطح پر اگر ہم بات کریں تو مہاراجہ پرتاب سنگھ کے عہد میں تقریباً ساری سرگرمیاں سنسکرت زبان میں ہوتی رہیں۔ سنسکرت زبان کے بہت سارے ادارے، کیٹلاگ، کتابیں اور دیگر دستاویزات اسی عہد سے منسوب ہیں۔ یہ سب مواد آج بھی رگھوناتھ مندر کے موجودہ کتب خانے میں محفوظ ہے۔ مہاراجہ پرتاب سنگھ کو اردو زبان وادب میں کم اہمیت ملنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مہاراجہ کو اس زبان سے بہت کم دلچسپی تھی۔ مگر ان کا ایک کارنامہ بہت اہمیت کا حامل ہے کہ انھوں نے اردو کو سرکار نمبر 3 آف 15 پھاگن سمت 1945 میں عدلیہ کی زبان قرار دیا۔ مہاراجہ پرتاب سنگھ کی عدلیہ کی زبان اردو اور سنسکرت

ہونے کے باعث اس کا ہر فیصلہ صرف صوبۂ جموں کی عدالتوں تک ہی محدود رہا بر خلاف وادئ کشمیر میں اس کا کوئی اثر نہیں ہوا، کیوں کہ اس وقت کشمیر کی عدالتوں میں سارا دفتری کام فارسی زبان میں ہی ہوتا تھا۔ مہاراجہ پرتاب سنگھ کے عہد میں یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وادئ کشمیر کے بجائے صوبہ جموں میں اردو زبان و ادب کو زیادہ فروغ ملا۔

مہاراجہ کے اس عمل سے نہ صرف عدلیہ بل کہ دیگر بہت سے محکموں میں بھی اردو زبان کا استعمال ہونے لگا۔ اب یہ زبان صرف دفتروں تک ہی محدود نہ رہی بلکہ سارے جموں صوبہ میں پھیل گئی۔ محکمۂ عدلیہ کو دیکھ کر دوسرے محکمے بھی باقی تمام زبانوں کو ترک کر کے اسی زبان کو اپنانے لگے۔ مہاراجہ پرتاب سنگھ شروع میں اس زبان سے زیادہ متاثر نہ ہوئے مگر بعد میں انھوں نے اپنے والد مہاراجہ رنبیر سنگھ کی طرح اردو اور فارسی زبان کے ماہرین شعراء و ادباء کو بیرون ریاست میں دعوتیں بھیجیں۔ وہاں سے آنے والے ادیبوں کو اچھے عہدوں پر فائز کیا اور ان کی ضروریات کو پورا کرنے کی کوششیں کی۔ مہاراجہ کا بیرون ریاست کے ادیبوں کو دعوت دینے کا یہ مقصد تھا کہ جلد از جلد خطۂ جموں میں اچھے ادیب پیدا ہوسکیں۔ بیرون ریاست سے آنے والے ادیبوں میں خوشی محمد ناظر، جعفر علی خان، اثر لکھنوی، پنڈت داتا تریا کیفی وغیرہ شامل تھے۔ ان بیرون ریاست سے آنے والے حضرات نے نہ صرف خود اس زبان کو جموں میں آکر فروغ دیا بلکہ ریاست کے بہت سارے ایسے ادیبوں شاعروں کی بھی اصلاح کی جن کی بدولت اردو زبان جموں خطے میں بہت مقبول ہوئی۔

مہاراجہ پرتاب سنگھ نے مردم شماری مہم کا آغاز 1891 میں کیا تھا۔ اس دور کی روایت کا سلسلہ آج بھی ریاست جموں وکشمیر میں چلتا رہا ہے۔ اس مردم شماری کو ہر دس سال کے بعد دوبارہ کیا جاتا ہے۔ مہاراجہ کے عہد میں مردم شماری تین دفعہ عمل میں آئی تھی پہلی بار 1891 دوسری بار 1901 اور تیسری بار 1921 میں عمل میں آئی تھی ان کی وفات کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ مردم شماری سے ڈوگرہ عہد میں بہت سی چیزوں کی واقفیت ہو جاتی تھی۔ آج کے دور اور قدیم دور کا تقابل کریں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ٹیکنالوجی کی وجہ سے بہت سی چیزوں کا آسانی سے پتہ لگ سکتا ہے۔ مگر ڈوگرہ عہد میں ان سب چیزوں کا رواج نہ تھا تاہم اس مردم شماری سے ڈوگرہ عہد کے لسانی تجربات اور ریاست میں اردو زبان کی وسعت کے بارے میں معلومات دریافت کی جاتی تھی۔

مہاراجہ پرتاب سنگھ کے بعد مہاراجہ ہری سنگھ کا دور آتا ہے۔ اس دور میں مہاراجہ نے اردو زبان کے لیے ریاست میں اچھے اقدامات اٹھائے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے اردو زبان کے لیے ریاست میں اچھی پالیسی اختیار کی اور وفور رقومات بھی مہیا کیں۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے نہ صرف اسکولوں کالجوں میں اردو زبان کی تعلیم کا خاطر خواہ بندوبست کیا بلکہ

اس کی ترقی کا جائزہ لینے کے لیے بہت سے اچھے آفسران بھی مقرر کیے تا کہ وہ اس بات کو آسانی سے دیکھ سکیں کہ اردو زبان کی تعلیم صحیح معنوں میں دی جارہی ہے یا نہیں اور اس کی رپورٹ وقتاً فوقتاً مہاراجہ کی پاس پہنچائی جائے۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے بھی اپنی خاندانی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اردو زبان کو وسعت دینے میں کوئی کسر باقی نہ رکھی۔

مہاراجہ ہری سنگھ کا عہد تقریباً 1925ء سے شروع ہوتا ہے۔ یہ دور ڈوگرہ حکومت کا آخری دور بھی مانا جاتا ہے۔ 1941ء سے مہاراجہ ہری سنگھ کے عہد میں مردم شماری سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ اس عہد میں اردو کی سرگرمیاں ریاست کے وسیع وعریض خطے میں پوری شد ومد سے جاری تھیں۔ اردو زبان کے ساتھ ابتدا سے ہی اس کے خلاف سازشیں ہوتی رہی ہیں۔ اکثر لوگوں نے اس زبان پر بہت سے الزامات صادر کیے ہیں۔ اس کے باوجود اس زبان پر کوئی خاص اثر دکھائی نہیں دیا۔ اردو زبان کو بیشتر لوگوں نے مسلمانوں کے ساتھ جوڑا ہے مگر دیگر ریاستوں کی طرح جموں و کشمیر میں بھی ہندو اور مسلم دونوں قوموں نے مل کر اس میں حصہ بھی لیا اور اس زبان کو فروغ دینے میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ 1945ء کے بعد جس طرح سے ریاست کے باہر حکومت کے خلاف احتجاج ہونے لگا اسی طرح سے ریاست جموں وکشمیر میں بھی شخصی حکومت کے خلاف جدوجہد کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ریاست میں ہر طرف کاروباری، درباری اور دفتری کام کاج بکھر گیا۔ زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب برپا ہوگیا۔ اسی دور میں زبان کے معاملے میں عوام کا ردعمل بڑھتا گیا جس کے نتیجے میں وادیٔ کشمیر میں جب شیخ محمد عبداللہ کو جیل سے رہا کیا گیا تھا تو اس کے کچھ عرصے بعد ہی شیخ محمد عبداللہ کی قیادت میں نیشنل کانفرنس نے نیا کشمیر کا آئین مرتب کیا۔ جس میں اردو زبان کو ریاست کی واحد رابطے کی زبان قرار دیا گیا۔ جو آج تک ریاست جموں وکشمیر میں رابطے کی زبان کا درجہ حاصل کیے ہوئے ہے۔

1947ء میں ملک آزاد ہوا تو اس کے بعد دستور ہند نے ریاستی آئین کو ملحوظ رکھتے ہوئے ریاست ہی کا علاقہ اسے تفویض کیا جس سے اس کی حیثیت قدرے مسلم ہوگئی۔ تقسیم وطن کے بعد ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں فسادات روز بروز بڑھتے گئے اس کا اثر ریاست جموں وکشمیر میں بھی ہوا۔ اسی دور میں اردو زبان کو مسلمانوں کے ساتھ منسوب کر دیا گیا۔ حالاں کہ اس بات کو بعد میں ہر فرد نے ماننے سے انکار کر دیا کہ زبان کو کسی مذہب یا قوم کے ساتھ جوڑنا قطعی صحیح نہیں ہوسکتا۔ ان تمام باتوں کا اردو کے فروغ میں کافی حد تک اثر دکھائی دینے لگا۔ باوجود ان تمام مشکلات کے اردو زبان کا سفر جاری وساری رہا۔ ہندوستان میں باقی ریاستوں کی طرح خطۂ جموں سے بھی وقتاً فوقتاً اخبارات و رسائل نکلتے رہے اور ساتھ ہی ساتھ سرکاری اداروں میں بھی کچھ نہ کچھ کام چلتا رہا۔ یہاں تک کہ ریڈیو، ریاستی کلچرل اکیڈمی اور دوسری سرکاری اور غیر سرکاری دفتروں میں یہ زبان ترقی کی راہ پر گامزن ہوتی گئی۔ آزادی کے بعد جب شانتی

اورامن کا ماحول ہوا تو خطے جموں میں بھی باقی ریاستوں کی طرح دفتری کامکاج شروع ہوگیا۔ریاست جموں وکشمیر میں ہر دفاتر میں اردوزبان کوہی ذریعہ ابلاغ وترسیل بنایا۔1965ء میں جموں یونی ورسٹی کے تحت شعبۂ اردو کا قیام عمل میں آیا۔اس شعبے نے بہت سے شعراوادباء پیدا کیے جن کی بدولت جموں میں آج اردوزبان ایک مشترکہ زبان اورامن کی زبان کہلاتی ہے۔تقسیم وطن کے بعد ریاست میں شیخ محمد عبداللہ کا اردوزبان کے متعلق ایک اہم رول رہا ہے۔کیوں کہ 1975ء میں جب انھوں نے حکومت کی باگ وڈور سنبھالی تو اردوزبان کے ساتھ ان کا بہت زیادہ لگاؤ ہونے لگا۔حالاں کہ ان کی شروع سے ہی اس زبان میں دلچسپی تھی مگراب ان کے پاس حکومت چلانے کے ساتھ ایک بڑاموقع بھی تھا کہ وہ اس زبان کوفروغ دینے میں ہرممکن کام کوانجام دیں۔اس طرح سے سرکاری سطح پراردوکوبہت ہی ترقی اور بلندی حاصل ہوئی۔جس کی ایک خاص وجہ شیخ محمد عبداللہ کی کوششیں تھیں جس نے سرکاری نوکریوں میں بھی اردوزبان کی راہیں کھولیں۔

شیخ محمد عبداللہ کے بعد حکومت کی دیکھ بھال ان کے بیٹے فاروق عبداللہ نے سنبھالی ان کے دورِحکومت میں بہت سی پالیسیاں بنائی گئیں تھیں جن پر آج تک عمل ہوتا چلا آرہا ہے۔جموں صوبہ میں اردوزبان کے متعلق راقم اتنا ضرور کہنا چاہے گا کہ جہاں ایک طرف اس خطے میں اردوزبان نے رابطے کی زبان ہونے کا درجہ حاصل کیا تو وہیں دوسری طرف ابتدا سے ہی یہ زبان انسان دوستی اورامن کی ایک پہچان بنی ہوئی ہے۔خاص طور پر خطۂ چناب میں یہ روایت جاری ہے کہ جب بھی اردوزبان کے متعلق کوئی ادبی محفل یا سیمینار وغیرہ ہوتا ہے تو اس میں ہندومسلم دونوں قوموں کے ادیب بخوبی حصہ لیتے ہیں۔یہی وجہ رہی ہے کہ اس زبان نے صدیوں سے ہماری تہذیب کواپنے دامن میں سمیٹے ہوئے رکھا ہے۔ہندوستان کی باقی تمام ریاستوں کوچھوڑکر جموں وکشمیر کی ایک واحد ریاست ہے جس کی اپنی آئینی حیثیت ہے۔اس آئینی حیثیت کے کچھ اصول ہیں جن کی بناپر ریاست کا کاروبار چلتا ہے۔ان کا مختصراًذکر یہاں بے حد ضروری ہے۔

مغلیہ عہد کے زوال کے ساتھ ساتھ فارسی زبان بھی ختم ہونے لگی۔یعنی اگر یوں کہا جائے کہ مغلیہ دور کے زوال کے بعد فارسی زبان کوبھی زوال ہوا تو بجانہ ہوگا۔اس دور میں نہ صرف جموں خطہ بلکہ ملک بھر میں کوئی ایسی زبان نہ تھی جو ملک کی سرگرمیوں کو چلانے میں مدد کرسکتی تھی۔ملک کی ذمہ داریوں کونبھانے کے لیے علاقائی زبانوں کا سہارا نہیں لیا جا سکتا تھا۔کیوں کہ علاقائی زبانیں صرف اپنے حدود میں ہی سمٹ کررہ گئی تھیں۔لہٰذا چھوٹی چھوٹی زبانوں میں کسی بھی زبان میں اتنی طاقت نہ تھی جو مرکزی زبان کوفریضہ انجام دے سکتی تھی۔چناں چہ ایسے حالات میں اردوزبان جو اس

وقت گری پڑی زبان سمجھی جاتی تھی اس پر نظر پڑی۔ اگر چہ اس دور میں اردو زبان کو اتنی زبان مقبولیت حاصل نہ ہو سکی تھی تاہم ملک بھر میں یہ زبان بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ اسی وجہ سے خطۂ جموں میں اس زبان کو رابطے کی زبان بنانے میں کوئی زیادہ دشواری نہ آئی۔

ریاست جموں وکشمیر کے علاوہ ہندوستان میں 1835ء میں ہی اردو کو سرکاری زبان کا درجہ مل چکا تھا مگر ابھی تک جموں میں دفتری ودرباری زبان فارسی ہی تھی۔ مہاراجہ نے جن اصولوں کے تحت اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا تھا اس حکم نامے کے تحت انھوں نے جو تحریر کیا تھا حسبِ ذیل ہے۔ جس کا ذکر ڈاکٹر صابر مرزا نے بھی کیا ہے:

''چند عدالت ہای جوڈیشل میں کاروائی مقدمات بزبان اردو میں ہے دیگران میں بزبان فارسی اور یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ فارسی قلمرو جموں کی زبان نہیں ہے اور نہ رعایا علاقہ جموں اس کو سمجھ سکتی ہے جب گورہان کے اظہار بذریعہ سوالات اردو لکھے جاتے ہیں یہ ضرور ہے کہ ایسے اظہارات کے لکھنے میں قریب قریب وہی کلام جو گواہ یا مدعی یا ملزم کی زبان سے نکلتا ہے لکھا جاوے۔ اس میں یہ بڑا فائدہ ہے کہ اظہار یا بیان مذکور آسانی سے بعد قلم بند کرنے کے اظہار دہندہ بتایا جا سکتا ہے۔ فیصلہ عدالت یہی جہاں تک ممکن ہو، زبان مروجہ ملک میں ہونا چاہی تا کہ رعایا اس کے مضمون کو اچھی طرح سے سمجھ سکے۔ علاوہ اس کے یہ ضروری ہے کہ کل عدالت ہائی کی کاروائی جو صدر عدالت جموں کی ماتحت یہ ایک ہی طریق پر ہو۔ نظر براں میں سفارش کرتا ہوں کہ بابت عدالت ہائی قلمرو جموں کے اجازت دی جاوے کہ کاروائی اردو میں ہوا کرے نسبت قلمرو سری نگر کے احکام سابق میں مداخلت ممکن نہیں کیوں کہ وہاں اردو زبان کو نہیں سمجھتے اور فارسی کا رواج جاری ہے لہٰذا رپورٹ ہٰذا بمراد صدور حکم ارسال ہے سکریٹری کونسل کے پاس واسطے پیشی کے بھیجی جائے۔''

پیش گاہ سرکار والا منظور ہے۔

احکام باضابطہ جاری ہوں۔ 10 پھاگن 1945 سمبر(11)

مہاراجہ پرتاب سنگھ کے اس مذکورہ بالا حکم نامے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اس حکم نامے کا اثر صرف صوبہ جموں میں ہی ہوا تھا۔ وادیٔ کشمیر کے دفاتر اور عدالتی سطح پر ابھی تک فارسی زبان کو ہی مرکزی اہمیت حاصل تھی۔ مہاراجہ

پرتاب سنگھ کے حکم نامے کے بعد ہی صوبہ جموں میں سرکاری کام کاج اردو زبان میں زور وشور سے ہونے لگا۔

ریاست میں اردو کی آئینی حیثیت تو مہاراجہ پرتاب سنگھ کے دورِ حکومت میں حاصل ہو چکی تھی مگر اس آئینی حیثیت کو فروغ دینے میں سب سے بڑا کام شیخ محمد عبداللہ نے کیا۔انھوں نے 1944 میں جب نیشنل کانفرنس کی قیادت سے کشمیر کا آئین مرتب کیا تو ریاست جموں و کشمیر کے مستقبل کے لیے ایک نئی راہ نکالی۔ ریاست کی عوام کے لیے انھوں نے نیا کشمیر کا آئین مرتب کرکے اردو زبان وادب کو بام عروج تک پہنچا دیا۔تب سے کشمیر میں اردو زبان وادب کی داغ بیل پڑی۔شیخ محمد عبداللہ نے کشمیر کے آئین کے تحت اردو زبان کو جو درجہ دیا اس کا ذکر مندرجہ ذیل ہے۔

سرکاری زبان:

1دفعہ 22:

''ریاست کی سرکاری زبان اردو ہوگی یہ ریاست کے مختلف خطوں اور طبقوں کے درمیان رابطے کی زبان ہوگی ریاست کی دوسری سرکاری زبانیں ان مقاصد کے لیے استعمال ہوں گی جن کا تقرر کیا جائے گا۔ان زبانوں میں کشمیری، ڈوگری، پنجابی، ہندی، گوجری، پہاڑی، بھدراواہی، دردی اور بلتستانی ہوں گی۔

اس زبان کو زیادہ حیثیت اس وقت ہوئی جب دستور ہند میں بھی اردو زبان کو یہی علاقہ جاگیر کے طور پر دیا اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ ریاست جموں کشمیر کے علاوہ کسی بھی دوسری ریاست کو سرکاری زبان اردو کا درجہ حاصل نہیں تھا۔دستور ہند کے فیصلے کو مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے دفعہ (1)344 اور دفعہ 351 کو دیکھا جا سکتا ہے۔جس میں دستور ہند نے زبانوں کے علاقوں کو اپنی خواہشات کے مطابق ہر علاقے میں اسی زبان کو بلند درجہ دیا گیا۔جس علاقے میں وہ زبان اچھی طرح سے بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ریاست جموں وکشمیر میں آئینی حیثیت کے ساتھ ساتھ عدالت عالیہ نے بھی اردو زبان کو فروغ دینے کے لیے اپنے کچھ اصول مرتب کیے۔تاکہ مستقبل میں اس زبان کے بارے میں کسی کو کوئی شکوک وشبہات کا سامنا نہ کرنا پڑے اس سلسلے میں عدالت عالیہ نے ایک آرٹیکل نمبر 145 جاری کیا۔جو صرف اردو زبان کے متعلق ہے۔ریاست کی سرکاری زبان کا درجہ۔''ریاست کی سرکاری زبان

اردو ہوگی'، لیکن انگریزی زبان، جب تک مجلس قانون ساز کوئی اور حکم جاری نہیں کرتی، اسی طرح دفتری کام کاج کے لیے استعمال ہوتی رہے گی جیسے کہ اس آئین کے نفاذ سے پہلے ہو رہی ہے۔''(12)

ریاست جموں وکشمیر کا ہندوستان کے ساتھ ایک اٹوٹ رشتہ ہے۔مگر اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ یہ ریاست ہندوستان سے ایک الگ وجود رکھتی ہے۔اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اس ریاست کا اپنا آئین ہے۔ مہاراجہ ہری ریاست جموں وکشمیر کو آزاد ریاست رکھنا چاہتے تھے۔اگر چہ آج ریاست کا رشتہ ہندستان کے ساتھ ایک اٹوٹ بن گیا۔

صوبہ جموں میں اردو زبان نے سرکاری ہونے کے ساتھ ساتھ ہندومسلم اتحاد اور صدیوں پرانی تہذیب وثقافت کو برقرار رکھا ہے، اوریہی زبان امن اور رابطے کا باعث بنی ہوئی ہے۔

صوبۂ جموں میں اردو ادب کا ارتقا:

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ جموں میں اردو ادب کی داغ بیل اس وقت پڑی جب مہاراجہ گلاب سنگھ کی قیادت میں ''بدیا بلاس سبھا'' کا قیام عمل میں آیا تھا۔کسی بھی زبان کو ادب میں منتقل کرنے کے لیے اس زبان کو عوام میں مکمل طور پر واقفیت ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔ ہندوستان کی دیگر ریاستوں کے بہ نسبت جموں وکشمیر میں اردو زبان کی ترقی میں زیادہ مشکلات درپیش نہ آئیں۔اس کی خاص وجہ یہ رہی کہ جب جموں میں اردو زبان وادب کی ابتدا عمل میں آئی تو ملک بھر میں اردو زبان بام عروج پر پہنچ چکی تھی۔1850 تک ہندستان میں اردو زبان کا بے پناہ ادبی سرمایہ تخلیق ہو چکا تھا۔اور کثیر تعداد میں شعرا وادباء پیدا ہو رہے تھے۔چناں چہ جموں کے ادیبوں کو بیرون ریاست کے ادیبوں سے بہت فائدہ ہوا۔یہاں کے ادیبوں کو ادب تخلیق کرنے میں کسی دوسری زبان کی پیروی نہیں کرنی پڑی۔کیوں کہ ان کے سامنے اردو ادب کا بے شمار خزانہ موجود تھا۔

صوبہ جموں میں اردو زبان وادب کی ترقی کے لیے بہت سے ایسے علمی مراکز قائم کئے گیے، جن میں فارسی زبان کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ اردو ادب کو تخلیق کرنے میں بھی آسانی ہوئی۔اردو زبان کے مطالعے کے سلسلے میں صوبۂ جموں کے جن علاقوں نے ادبی مراکز کا خصوصی رول ادا کیا ان میں قابلِ ذکر علاقے جموں، کشتواڑ، پونچھ، ڈوڈہ، مظفرآباد وغیرہ ہیں۔ان مراکز نے نہ صرف عوامی سطح پر ادبی ذوق کو پروان چڑھایا بلکہ اس کی اطمینان اور تشفی بخش راہیں بھی ہموار

کیں۔ یہ مراکز چوں کہ اردو کے اہم ملکی مراکز سے بہت دور تھے اور پھر اشاعت کی سہولیات بھی اتنی نہ تھیں کہ ضرورت کے مطابق کتابیں حاصل کی جاسکتیں، ادبی ذوق کی تسکین کے لیے لوگوں نے اہم اور ضروری کتابوں کی نقلیں ایک دوسرے سے مل جل کر تیار کیں۔ اور بعد میں انہی کو استعمال میں بھی لاتے رہے اس کے شواہد کے طور پر ہم قلمی بیاضوں میں وہ سب چیزیں دیکھ سکتے ہیں جوان مراکز سے وابستہ لائبریریوں، اور لوگوں کے نجی کتب خانوں میں موجود ہیں۔ لوگوں نے قلمی مواد اور اپنی چھوٹی چھوٹی لائبریریوں میں تقریباً سترہویں صدی سے تھوڑا تھوڑا مواد اکھٹا کرنا شروع کیا تھا۔

خطۂ جموں میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ ملنے سے قبل یعنی 1880 سے 1900 تک جو ادب تخلیق ہوا اس کو دریافت نہیں کیا جا سکا اور یہ امر ابھی تک مبہم ہے کہ اس دور میں جن حضرات نے ادب تخلیق کیا تھا وہ مواد موجود ہے بھی یا نہیں۔ البتہ کچھ ادیبوں کی اِکّا دُکّا تحریریں ہی اُس دور کی حاصل ہو پائی ہیں۔ اس ضمیمے میں نثر کے برعکس شاعری اور تراجم کی چند ایسی کاوشیں ضرور جموں کے کتب خانے میں دیکھنے کو ملتی ہیں مگر وہ یا تو ناقص الاوّل ہیں یا ناقص الآخر۔

ہندستان میں انیسویں صدی کے اواخر میں سیاسی، سماجی، مذہبی اور ادبی تحریکات کا زیادہ عمل دخل رہا۔ باقی تمام ریاستوں کی طرح سیاسی، سماجی و ادبی تنظیموں کے اثرات جموں خطے میں بھی پڑے۔ اس وقت تک اردو زبان وادب میں پہلے سے زیادہ ترقی ہو چکی تھی۔ جنھوں نے اردو ادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی اور اس زبان کے لیے جا بجا کوششوں سے جموں خطے میں نئی نئی راہیں ہموار ہوئیں۔ اس دور میں شعرا و ادباء کی خاصی تعداد نے مل کر ایک ادبی تنظیم بنائی جس کو ''بزم سخن جموں'' کے نام سے موسوم کیا گیا۔ جموں میں اس تنظیم کا آغاز 1910 میں ہوا۔ اردو ادب کو فروغ دینے میں اس بزم سخن کی خدمات بڑی اہمیت کی حامل ہیں جن کو تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ جموں میں یہ پہلی ادبی تنظیم تھی جس کی وجہ سے مختلف اصناف ادب کے ادباء اس سے منسلک ہوئے۔ جموں میں اردو ادب کے ارتقا کے سلسلے میں انجمن کی کارگردگی بنیادی حیثیت کا درجہ رکھتی ہے۔

جموں میں اس انجمن نے سب سے پہلے مشاعرے منعقد کروائے۔ ابتدا میں اس کی اہمیت بہت کم تھی مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس بزم میں ادب کا ایک پیش بہا خزانہ جمع ہو گیا۔ اس ادبی انجمن میں ریاست اور بیرون ریاست کے شعرا و ادباء نے حصہ لیا۔ بعد میں ریاست کے دیگر حضرات نے بیرون ریاستوں سے آئے ہوئے ادیبوں سے بہت استفادہ کیا۔ نامور ہستیاں خطۂ جموں میں پیدا ہوئیں جن کی وجہ سے اس روایت کو فروغ ملا اور ساتھ ہی نئے

لکھنے والوں کو ترقی کے مواقع فراہم ہوئے۔اس بزم کی سالانہ نشستوں میں خصوصاً ملک کے جونا مور شعرا شریک ہوتے تھے ان میں قابل ذکر جگرؔ مرا آبادی، جوشؔ ملیح آبادی، حسرتؔ موہانی، دتا تریہ کیفیؔ، وفاؔ، جوشؔ ملسانؔی وغیرہ جیسے کئی بڑے شعرا وادباء کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

جموں میں 1910 کے بعد مختلف قسم کے اخبارات ورسائل نکلتے رہے۔اس حوالے سے چار مقامی اخبارات و ادبی رسائل کو بہت ہی زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے جن کا ذکر مندرجہ ذیل ہے:

(1) رنبیر 1924

(2) رتن 1939

(3) چاند.......

(4) پریم 1943

اہم ہیں۔ان اخبارات میں جموں کے شعرا وادباء کی تحریروں کو وقتاً فوقتاً منظر عام پر لایا جاتا۔اخبارات کے آغاز کا سہرا لالہ ملک راج صراف کے سر ہے۔ملک راج صراف سے پہلے کسی بھی صحافی کو جموں سے کوئی بھی اخبار یا رسالہ نکالنے کی حکومت کی طرف سے اجازت نہ تھی۔مگر ریاست کے دیگر ادباء اپنے رسائل واخبارات کو حکومت کی اجازت حاصل نہ ہونے کی وجہ سے لاہور جا کر صحافت کے فرائض انجام دیتے اور اپنے رسائل و اخبارات کے صفحۂ اول کی سُرخیوں میں ریاست جموں وکشمیر کے حالات کو پیش کرتے تھے۔جموں میں صحافی ملک راج صراف کو مہاراجہ رنبیر سنگھ سے 1924 میں پہلی بار اخبار نکالنے کی اجازت ملی اور پھر انھوں نے راجہ کے نام ''رنبیر'' سے منسوب کرتے ہوئے جموں کے پہلے اخبار کا اجرا کیا۔اسی وجہ سے ملک راج صراف کو جموں کا پہلا صحافی کہا جاتا ہے۔پھر بعد میں انھوں نے دوسرا اخبار ''رتن'' کے نام سے 1939 میں نکالنا شروع کیا۔ان دونوں اخباروں میں زیادہ تر ڈوگرہ حکومت کی تعریف کی جاتی تھی۔بعدازاں نرسنگھ داس نرگس کا نام بھی اس حوالے سے قابل ذکر ہے انھوں نے بھی اپنے دو اخبارات ''پریم'' اور ''چاند'' نکالے۔

متذکرہ اخبارات سے نہ صرف اردو زبان وادب کو فروغ حاصل ہوا بلکہ جموں کے کئی علاقوں سے جا بجا نئے لکھنے والوں کی کوششیں بھی منظر عام پر آئیں۔ان اخبارات کی وجہ سے جموں میں اردو ادب کے دو اسکول بھی وجود میں آئے جس میں ایک ''رنبیر اسکول'' (اس میں ادیبوں و دانشوروں کو شامل کیا گیا) اور دوسرا ''کشمیر اسکول'' کے نام سے

موسوم ہوا۔ان دونوں اسکولوں میں اردو ادب کے حوالے سے اچھا کام ہوتا رہا۔ان میں صرف اُن حضرات کو جگہ مل سکتی تھی جو اردو زبان میں مہارت حاصل کرنا چاہتے تھے چناں چہ انہی دو اسکولوں کے نتیجے میں جموں خطے کے ادیبوں کی تخلیق کے کارنامے اردو ادب کے ارتقا میں معاون ثابت ہوئے۔

جموں کے ادبی اداروں کی کوششوں کے نتیجے میں اردو ادب کی ہر دو اصناف نظم ونثر کو کافی فروغ ملا۔اس کے بعد اردو کی اصناف میں شعرا و ادباء طبع آزمائی کرنے لگے جس سے خطے میں اردو کا خاصا سرمایہ وجود میں آ گیا۔خطۂ جموں میں اردو زبان وادب کی جن اصناف میں زیادہ ادب تخلیق ہوا ان میں خاص طور پر غزل،نظم،افسانہ،ناول،ڈرامہ اور تنقید وتحقیق وغیرہ شامل ہیں جن کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔اگر چہ ان اصناف ادب کے علاوہ بھی ادیبوں نے دیگر اصناف سخن میں طبع آزمائی کی مگر وہ سرمایہ وافر مقدار میں موجود ہے۔اس عہد کے شعرا کی تخلیقی سرگرمیوں کی فہرست بہت زیادہ ہے۔کیوں کہ یہ دور تقریباً آزادی کے آس پاس کا تھا۔اور اس دور میں ترقی پسند تحریک بھی بام عروج پر تھی تو ظاہر سی بات ہے کہ ترقی پسند تحریک کے اثرات دیگر ریاستوں کی طرح جموں خطے میں بھی پڑنے لازم تھے۔

*****

حوالہ جات

(1) ریاست جموں وکشمیر کی سماجی اقتصادی اور ثقافتی ترقی کا آئینہ، رسالہ ''تعمیر'' ص، 124

(2) مضمون، جموں وکشمیر میں اردو ادب کی تاریخ ایک سرسری جائزہ، از ڈاکٹر منظر اعظمی

(3) صوبہ جموں کے علاقائی ادب پر اردو کے اثرات، از ڈاکٹر صابر مرزا، ص

4) صوبہ جموں کے علاقائی ادب پر اردو کے اثرات، از ڈاکٹر صابر مرزا، ص20

(5) Development of urdu language andliterature in jammu region By Zahur Ud Din,page no.27

(6) ڈاکٹر صابر مرزا، صوبہ جموں کے علاقائی ادب پر اردو کے اثرات، ص، 23

(7) ایضاً، ص، 33

(8) ''مضمون'' جموں وکشمیر میں اردو ادب کی تاریخ ایک سرسری جائزہ، از ڈاکٹر منظر اعظمی، ص، 124

(9) ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب، از حامدی کاشمیری، ص، 78

(10) ایضاً، ص78

(11) ڈاکٹر صابر مرزا، صوبہ جموں کے علاقائی ادب پر اردو کے اثرات، ص،

(12) ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب، از حامدی کاشمیری، ص78

باب دوم

جموں میں فکشن نگاری

(افسانہ، ناول، ڈراما اور ریڈیو ڈراما نگاری)

جموں میں فکشن نگاری:

جموں میں اردو ادب کی داغ بیل اس وقت پڑی جب مہاراجہ گلاب سنگھ کی قیادت میں ''بدیابلاس سبھا'' کا قیام عمل میں آیا تھا۔ادب کے میدان میں زبان ایک دم سے وجود میں نہیں آتی ہے، بلکہ بہت سے مرحلے طے کرنے کے بعد زبان کو ادب میں شامل کیا جاتا ہے۔اردو زبان کے ساتھ بھی برصغیر میں یہی کچھ ہوا۔ابتدا میں اسے زبان کا مزہ بدلنے کے لیے استعمال کیا جاتا رہا۔پھر آہستہ آہستہ اس نے عوام اور دربار میں اپنی شناخت قائم کرنی شروع کی۔جب اس زبان کی استعداد پر یقین واعتماد بڑھا تو اس کو ادب میں جگہ دی جانے لگی۔دہلی کے گردنواح میں اردو زبان کے ادبی ارتقا کی تاریخ سے اس حقیقت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ہندوستان کی دیگر ریاستوں کے بہ نسبت جموں وکشمیر میں اردو زبان کی ترقی میں زیادہ مشکلات درپیش نہ آئیں۔اس کی خاص وجہ یہ رہی کہ جب جموں میں اردو زبان وادب کی ابتدا عمل میں آئی تو ملک بھر میں اردو زبان بام عروج پر پہنچ چکی تھی۔1850ء تک ہندستان میں اردو زبان کا بے پناہ ادبی سرمایہ تخلیق ہو چکا تھا۔اور کثیر تعداد میں شعرا وادباء اردو کی طرف راغب ہو رہے تھے۔چنانچہ جموں کے ادیبوں کو بیرون ریاست کے ادیبوں سے بہت فائدہ ہوا۔یہاں کے ادیبوں کو ادب تخلیق کرنے میں کسی دوسری زبان کی پیروی نہیں کرنی پڑی۔کیوں کہ ان کے سامنے اردو ادب کا بے شمار خزانہ موجود تھا۔

صوبہ جموں میں اردو زبان وادب کی ترقی کے لیے بہت سے ایسے علمی مراکز تیار ہوئے تھے،جن میں فارسی زبان کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اردو ادب کو تخلیق کرنے میں بھی آسانی ہوئی۔اردو زبان کے مطالعے کے سلسلے میں صوبۂ جموں کے جن علاقوں نے ادبی مراکز کا خصوصی رول ادا کیا ان میں قابلِ ذکر علاقے کشتواڑ، پونچھ، ڈوڈہ، مظفرآباد وغیرہ ہیں۔ان مراکز نے نہ صرف عوامی سطح پر ادبی ذوق کو پروان چڑھایا بلکہ مزید اطمینان اور تشفی بخش راہیں بھی ہموار کیں۔یہ مراکز چونکہ اردو کے اہم مراکز سے بہت دور تھے اور پھر اشاعت کی سہولیات زیادہ میسر نہ تھیں کہ ضرورت کے مطابق کتابیں حاصل کی جاسکتیں، چنانچہ ابتدا میں ادبی ذوق کی تسکین کے لیے لوگوں نے اہم اور ضروری کتابوں کی نقلیں ایک دوسرے سے مل جل کر تیار کیں۔اور بعد میں انہی کو استعمال میں بھی لاتے رہے،اس کے شواہد کے طور پر ہم قلمی بیاضوں میں وہ سب چیزیں دیکھ سکتے ہیں، جو ان مراکز سے وابستہ لائبریریوں،اور لوگوں کے نجی کتب خانوں میں موجود ہیں۔لوگوں نے قلمی مواد اور اپنی چھوٹی چھوٹی لائبریریوں میں تقریباً سترہویں صدی سے تھوڑا تھوڑا مواد اکھٹا کرنا

شروع کر دیا۔موجودہ دور میں ایسے کئی مخطوطات جموں یونی ورسٹی کے کتب خانے میں دیکھے جا سکتے ہیں،جن میں سے کچھ کوتو پہچاننے میں بھی دشواری آتی ہے۔ان ادبی مراکز کی سرگرمیوں نے تخلیقی کاموں کو آگے بڑھانے میں بہت مدد دی۔

جموں میں ایک ادبی تنظیم بنائی جس کو''بزم سخن جموں'' کے نام سے موسوم کیا گیا۔جموں میں اس تنظیم کا آغاز 1910ء میں ہوا۔اردو ادب کو فروغ دینے میں اس بزم کی خدمات بڑی اہمیت کی حامل ہیں،جن کو تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔جموں میں یہ پہلی ادبی تنظیم تھی جس کی وجہ سے مختلف اصناف ادب کے ادباء اس سے منسلک ہوئے۔جموں میں اردو ادب کے ارتقا کے سلسلے میں انجمن کی کارگردگی بنیادی حیثیت کا درجہ رکھتی ہے۔جموں میں اردو فکشن کے حوالے سے جن قلمکاروں نے اہم رول ادا کیا ہے،ان کے نام اس طرح ہیں۔نرسنگھ داس نرگس، بی۔ڈی۔ مل شرما،نشاط کشتواڑی،عشرت کاشمیری،قدرت اللہ شہاب،جگدیش چندر کنول،ٹھاکر پونچھی،اندر جیت لطف،موہن یاور،اقبال نرگس،کشوری منچندہ،او۔پی۔شرما،کرن کشمیری(دیوراج چوپڑا)بشیر بھدروائی،مالک رام انند،شہباز راجوروی،بہار راجوروی،جوتیشور پتھک،سروال بھلیسوی،نادم کوتالوی،گلزار احمد فدا،اقبال نازش،عبدالمجید نظامی،تنویر بھدروائی،الفت کاشمیری،دینا ناتھ رفیق،نند گوپال باوا،دھرم چند پرشانت،جگدیش کمل،پشکر ناتھ،برج پریمی،لیش سروج،مدن سنگھ ٹھاکر،مدن موہن شرما،سومناتھ ڈوگرہ،خیراتی لال،ارجن دیو رشک،برج کتیال،وجے سوری،رام کمار ابرول،ویدراہی،پروفیسر ظہورالدین،او۔پی شرما سارتھی،شاد فرید آبادی،رند بھدرواہی تسکین بڈانوی،قیصر کشتواڑی، راز بھدرواہی،ڈاکٹر عبدالمجید،تمنا منشی،محمد اسلم شہزاد،کرشن چندر،آنند لہر،خالد حسین،اوم پرکاش شاکر،پریمی رومانی، مشتاق بھدروائی،جسونت منہاس،بلراج بخشی،نصیر احمد قریشی،(امین بنجارا) شیخ خالد کرار, مشتاق احمد وانی،طالب حسین رند،زنفر کوکھر, ڈاکٹر سیدہ نکہت فاروق،راز مناوری،نثار راہی،سہاز راجوری،سونتر دیو کوتوال،شام طالب، عبدالسلام بہار،کے۔ڈی۔مینی،اسلم مرزا،اقبال نازش،اقبال شال،مہر طلعت،چاند نارائن چاند،شاہ محمد خان،ایوب شبنم،شیخ آزاد احمد،امتیاز جانی،الطاف کشتواڑی،نواب دین کسانہ،نصرت چودھری،ضیاء الدین وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

جموں میں اردو افسانہ:

جموں میں آزادی سے پہلے کے ادیبوں نے اردو نثر کی اصناف جیسے افسانہ،ناول،ڈراما،تحقیق وتنقید،سفر نامہ اور

صحافت وغیرہ میں طبع آزمائی کر کے پورے ملک میں اپنی ایک الگ پہچان بنالی۔ ریاست جموں وکشمیر میں جب ہم اردو کے پہلے افسانے نگار کا ذکر کرتے ہیں تو اس میں ہمیں بہت سارے اختلاف دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جن سے بہت سارے محققین ومورخین کی مختلف آراء کا اظہار ملتا ہے۔ ان میں کسی نے پہلا افسانہ نگار پریم ناتھ پردیسی کو کہا ہے اور کسی نے ریاست کا پہلا افسانہ نگار محمد الدین فوق کو کہا ہے۔ راقم الحروف نے اس بات کو معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ آخر ہم ریاست کا پہلا افسانہ نگار کس کو مانیں۔ یہ معاملہ بھی اسی طرح الجھا ہوا تھا جس طرح سے اردو کا پہلا افسانہ نگار کا تھا۔ مگر جیسے جیسے اردو تحقیق کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے اردو ادب میں نئی چیزیں جو ابھی تک پوشیدہ تھیں انہیں منظر عام میں لایا جاتا ہے۔ اسی طرح سے ایک زمانے تک پریم چند کو اردو کا پہلا افسانہ نگار ہونے کا شرف حاصل تھا۔ مگر نئی تحقیق کے مطابق اس بات کو درست مانا گیا ہے کہ اردو کا پہلا افسانہ نگار پریم چند نہیں بلکہ راشد الخیری ہے۔ اسی لیے تحقیق میں کبھی بھی کوئی بھی چیز تلاش کر کے سامنے لائی جاسکتی ہے۔ اگر ہم ریاست جموں وکشمیر کے باقاعدہ طور پر افسانہ نگار کی بات کریں تو پریم ناتھ پردیسی کا نام قابل ذکر ہے۔ مگر اس بات پر فیصلہ کرنا بے حد مشکل ہوجاتا ہے کہ ریاست جموں وکشمیر میں پہلا افسانہ نگار کس کو کہا جائے۔

راقم نے اپنی تحقیق میں اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ صوبہ جموں کا پہلا افسانہ نگار کس کو ماننا درست ہوگا۔ جموں میں اگر ہم اردو افسانے کی بات کریں تو اردو افسانے کے ابتدائی نقوش منشی محمد الدین فوق کے لکھے ہوئے مختلف قصوں میں نظر آتے ہیں، اگر چہ ان قصوں کو پوری طرح افسانے کے زمرہ میں نہیں رکھا جاسکتا ہے لیکن پھر بھی ان میں ہلکی سی افسانوی جھلک محسوس ہوتی ہے۔ اگر چہ فنی اعتبار سے پورے نہیں اترتے تاہم اس بات سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے ہی سب سے پہلے افسانہ نگاری میں طبع آزمائی کی۔ اس حوالے سے ریاست جموں وکشمیر کا پہلا افسانہ نگار محمد الدین فوق کو کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اس حوالے سے پروفیسر قدوس جاوید سابق صدر شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی نے دلائل کے ساتھ ریاست جموں وکشمیر کا پہلا افسانہ نگار محمد الدین فوق کو ثابت کیا ہے۔ مگر اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے، کہ باقاعدہ طور پر پریم ناتھ پردیسی سے ریاست میں افسانے کا آغاز ہوتا ہے۔ پروفیسر قدوس جاوید نے محمد الدین فوق کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> ''محمد الدین فوق ریاست جموں وکشمیر کے پہلے افسانہ نگار ہیں۔ لیکن اس دعوے کو ثابت کرنے اور اس پر یقین کرنے کے لیے دلائل وشواہد کی ضرورت پیش آئے گی۔ کیوں؟ اس لیے کہ ریاست جموں وکشمیر میں اردو افسانے نگاری کا آغاز ابھی تک کسی بھی ادبی محقق یا

مورخ نے کچھ نہیں لکھا ہے۔عبدالقادر سروری اور حبیب کیفی سے لے کر محمد یوسف ٹینگ، حامدی کاشمیری اور غلام نبی خیال جیسے مستند دانشوروں کا قلم بھی اس مسئلے پر خاموش ہی نظر آتا ہے......لیکن نہ جانے کیوں محمد الدین فوق کے افسانوں تک ان کی رسائی نہیں ہو سکی.......

لیکن مطالعے کی آسانی کے لیے یہ طے کرنا ضروری بھی ہے کہ ریاست جموں و کشمیر میں اردو افسانے کا نقطۂ آغاز کہاں اور کیسا ہے؟ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں، کشمیر کے مشہور مورخ، محقق، صحافی، شاعر اور فکشن نگار محمد الدین فوق نے اہل کشمیر میں، حب الوطنی، انسان دوستی، اعلیٰ اخلاقیات اور سیاسی بیداری کے جذبے پیدا کرنے کے لیے ''حکایت'' (افسانچہ یا منی افسانہ) کی ہئیت میں جو افسانے لکھے انہیں ریاست جموں و کشمیر کے ابتدائی افسانے کہہ سکتے ہیں۔لیکن یاد رہے کہ فوق کے یہ افسانے اردو کے اولین افسانوں ''نصیر اور خدیجہ'' (راشد الخیری، مطبوعہ مخزن، لاہور، دسمبر 1903ء)، ''تصویر غم'' (دردمند اکبر آبادی، مخزن لاہور، فروری 1904)............ وغیرہ کی طرح ہی مختصر افسانہ (Short-story) کے فنی و تکنیکی پیمانوں پر سو فیصد پورے نہیں اترتے۔ راشد الخیری، سلطان حیدر جوش اور پریم چند کے ابتدائی افسانوں کی طرح ہی فوق کی ان تحریروں کو مختصر افسانہ (فنی افسانہ یا افسانچہ) کا نام دیا جا سکتا ہے۔............فوق کے مختصر ترین افسانے بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں میں ہی مختلف اخبارات ورسائل میں شائع ہو رہے تھے لیکن انھوں نے اپنے ان افسانوں کا پہلا مجموعہ ''حکایات کشمیر'' کے نام سے 1928ء میں شائع کروایا''۔(1)

مشتاق احمد وانی اپنے ایک مضمون میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''یہ بات مصدقہ ہے کہ صوبہ کشمیر میں اردو افسانے کا باقاعدہ آغاز پریم ناتھ پردیسی کے ہاتھوں ہوا۔لیکن یہ امر محقق طلب ہے کہ صوبہ جموں کا پہلا افسانہ نگار کون ہے؟ تاریخی شواہد سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مولوی محمد الدین فوق کا تعلق صوبہ جموں کے ایک ضلع پونچھ سے رہا ہے۔جنھوں نے ''تاریخ اقوام پونچھ'' لکھی ہے۔فوق ایک ہمہ جہت ادبی شخصیت رہے

ہیں۔ وہ محقق، نقاد، تاریخ نویس ہونے کے علاوہ ناول نگار اور افسانہ نگار بھی تھے۔فوق کے
بعد قدرت اللہ شہاب ہیں..........وغیرہ''۔(2)

مذکورہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ منشی محمد الدین فوق کو جموں کا پہلا افسانہ نگار کہا جا سکتا ہے۔محمد الدین فوق کی پیدائش 25/فروری 1877ء میں ہوئی تھی۔اردو زبان کے مشہور شاعر، نقاد، انشا پرداز، اخبار نویس اور مورخ تھے۔ان کی ابتدائی تعلیم سیالکوٹ میں ہوئی۔ابتداء سے ہی تاریخ سے لگاؤ ہو گیا تھا اور تاریخ کی وجہ سے ہی بعد میں شہرت حاصل کی۔انھوں نے متعدد کتابیں اپنی یادگار چھوڑیں ہیں۔جن میں خاص طور پر تاریخ اقوام کشمیر، تاریخ اقوام پونچھ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

فوق صاحب کا پیدائشی نام محمد دیندار تھا۔مگر بعد میں محمد الدین فوق کے نام سے مشہور ہوئے۔ان کے دادا حسن ڈار کشمیر سے ہجرت کر کے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد حکومت میں پنجاب آئے اور سیالکوٹ کے موضع گھڑتل میں آباد ہو گئے تھے۔محمد الدین فوق لاہور میں مڈل کی تعلیم سے مزید آگے نہ پڑھ پائے۔1894ء میں وہ اپنے والد کی نگرانی میں پٹوار خانے کے نام سیکھنے لگے اور چند مہینوں بعد وہ جموں چونگی میں رہے جہاں انہیں جموں صوبہ سے کافی لگاؤں ہو گیا تھا۔

محمد الدین مورخ سے زیادہ صحافی ثابت ہوئے ہیں۔اس وجہ سے انہیں لاہور کی مشہور شخصیات میں کشمیر کا پہلا نوجوان صحافی ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہوا تھا۔انھوں نے 1896ء سے صحافت کے میدان میں قدم رکھا تھا اس وقت ان کی عمر صرف 19 سال کی تھی جب انھیں لاہور کے مشہور پیسہ اخبار میں ملازمت ملی۔فوق کشمیری صحافیوں میں خشت اول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ایسے دور میں جب ڈوگرہ حکومت کے سامنے کوئی سر اٹھا کر نہیں چل سکتا تھا اس دور میں محمد الدین فوق نے ریاست جموں وکشمیر کی عوام کی حمایت میں لوگوں کی مدد کی اور انھیں انصاف دلانے کی پوری کوشش کرتے رہے۔

انھوں نے اپنے پہلے منی افسانوں کے مجموعے کا نام ''حکایات کشمیر'' تجویز کیا تھا۔ان کے افسانوں کے تین مجموعے اب تک منظر عام پر آچکے ہیں جن میں حکایات کشمیر، سبق آموز کہانیاں اور دستان اخلاق قابل ذکر ہیں۔ حکایات کشمیر میں کل 32 کہانیاں شامل ہیں۔جن میں فوق نے کشمیر کے راجوں، مہاراجوں اور مسلمان بادشاہوں کی زندگی اور زمانے کے دلچسپ واقعات کی عکاسی کی ہے۔

اس افسانوی مجموعے کے حوالے سے لاہور کالج کے ایک ممتاز شخصیت ڈاکٹر محمد اجمل خان نیازی نے اپنے مقالے میں اپنے خیالات کا اظہار کچھ یوں کیا ہے کہ:

> ''فوق نے اس کتاب کے آغاز میں ''کشمیر جنت نظیر'' کے نام سے ایک مختصر دیباچہ لکھا ہے جس میں کشمیر کا حسن، اس کا حدود اربعہ اور مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے۔ ان حکایات کے ذریعے انھوں نے کشمیر کے ساتھ اپنی وابستگیوں کو لوگوں کے دلوں میں جاگزیں کرنے کی کوشش کی ہے''۔(3)

فوق صاحب کا تعلق کشمیر سے تھا اور کشمیر سے انہیں بے حد عشق تھا وہ اہل کشمیر کے دلوں میں قومی تشخص اور حب الوطنی کے اوصاف کو مزید بیدار اور مستحکم کرنا چاہتے تھے اس طرح راقم نے پچھلے چند صفحات میں بھی اسی بات کا ذکر کیا کہ فوق صاحب کی شاعری، صحافت اور تحقیق وتنقید کی طرح ہی ان کے افسانوں کے مرکزی کردار میں حب الوطنی کا جذبہ کار فرما ہے ان کا ایک افسانہ جس کا عنوان ''راجہ ماتر گپت اور ایک فوجی سالار پرورسین'' ہے اس افسانے میں مصنف نے بہترین انداز میں کشمیر کی عکاسی کی ہے اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''پرورسین نے پنجاب کا بہت سا علاقہ فتح کرلیا، اس کے بعد اس کے اصلاح کاروں نے اس کو مشورہ دیا کہ اپنے آبائی ملک کشمیر پر حملہ کیا جائے۔ اس نے جواب دیا کہ ''دو باتیں ہیں جو مجھے اپنے آبائی ملک پر حملہ کرنے سے روک رہی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ماتر گپت ایک شاعر ہے اس پر حملہ کرنا ایک ایسے شخص کی شان سے بعید ہے جس کی رگوں میں نسلاً بادشاہی خون حرکت کر رہا ہے۔ دوسرا یہ کہ کشمیر میرا وطن ہے، میرا ملک ہے، اگر میں نے وہاں حملہ کیا تو میرے اہل وطن ہلاک ہوں گے۔ ان کی نسلیں تباہ ہوں گی، وہ فاقہ کشی کے شکار ہوں گے اور کئی لوگ بے موت مر جائیں گے''۔(4)

محمد الدین فوق کی کئی کہانیوں میں اسی طرح کی باتیں دیکھی جا سکتی ہیں جس میں انھوں نے کشمیر سے مسلمان بادشاہوں کی انسان دوستی، محبت وامن اور وسیع المشربی وغیرہ کی کئی مثالیں دیں ہیں۔ اسی موضوع پر ان کا لکھا ہوا ایک اور افسانہ قابل ذکر ہے جو انھوں نے ''ہر دل عزیز سلطان، زین العابدین'' کے عنوان سے لکھا ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے کشمیر کے حکمرانوں میں سلطان زین العابدین کے جیسا انسان دوست اور انصاف پسند بادشاہ کو مرکزی

کردار کے طور پر پیش کیا ہے۔اس لیے کشمیر کی تاریخ میں اس نام یعنی سلطان زین العابدین کو بہت ہی اہمیت دی جاتی ہے۔اس نام کو کشمیر میں ''بڈشاہ'' (یہ کشمیر زبان کا لفظ ہے جس کے معنیٰ ''عظیم باشاہ'' کے ہیں) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔اس نام سے آج بھی کئی جگہوں پر بڈشاہ کے نام کے چوراہے اور دیگر چیزوں میں بڈشاہ کا نام دے کر یاد کیا جاتا ہے۔ملاحظہ ہو اس افسانچے کا ایک اقتباس:

''اس سلطان نے ہندوں کے واسطے جو کچھ کیا وہ ہندوؤں کے لیے کسی ہندو راجہ سے بھی نہ کرسکا مگر اس نے جلاوطن ہزاروں کو واپس بلایا، اور انھوں نے جائدادیں دیں، عہدے دیے اور جزیہ معاف کردیا''۔(5)

محمد الدین فوق کی افسانہ نگاری میں پریم چند کا بہت گہرا اثر تھا اسی نوعیت کے افسانے پریم چند نے بھی لکھے تھے۔اس حوالے سے پریم چند کے افسانوں میں ''رنجیت سنگھ، رانی سارندھا، وکرمادتیہ، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ پریم چند کے ان افسانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اگر محمد الدین فوق کے افسانوی مجموعے ''حکایات کشمیر'' کا مطالعہ کیا جائے تو اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ محمد الدین فوق کی کہانیاں افسانے، افسانچے کہلانے کے قابل نہیں ہیں۔اگر ہم پریم چند کے مذکورہ بالا افسانوں کو افسانے مان سکتے ہیں تو اس میں کوئی دورائے نہیں ہونی چاہیے کہ محمد الدین فوق کی ان کہانیوں کو بھی افسانہ میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔''حکایت کشمیر'' میں شامل دیگر افسانے ''راجہ عجب دیو کا انصاف''، ''عیش پرست بادشاہ کا انجام''، ''مہاراجہ رنبیر سنگھ کی علم نوازیاں''، ''جانثار وزیر'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

محمد الدین فوق کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ تقریباً 1935ء میں شائع ہوا یہ دور پورے ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کا دور تھا اور ملک بھر کے ادباء وشعراء اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔اسی دوران فوق صاحب نے اپنی کہانیوں کا مجموعہ ''سبق آموز کہانیاں'' کے عنوان سے لاہور سے شائع کیا۔اس مجموعے میں انھوں نے تقریباً 32 کہانیوں کو پیش کیا ہے۔

مذکورہ بالا شواہد سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ محمد الدین فوق کے افسانے کامیابی حاصل کر چکے ہیں۔اس بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ فوق کے افسانوں میں ان کی زبان سادہ سلیس اور عام فہم ہے جس کی وجہ سے قاری کو ان کی تخلیقات کا مطالعہ کرنے میں اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔

محمد الدین فوق کے بارے میں ایک اور اہم بات یہ سامنے آتی ہے کہ منی افسانہ یا افسانچہ کی شروعات بھی سب

سے پہلے ان ہی کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ کیوں کہ آج تک مورخین ومحققین کی تلاش کے مطابق سعادت حسن منٹو کو سب سے پہلا منی افسانہ لکھنے کا شرف حاصل تھا۔مگر جدید تحقیق کے مطابق سب سے پہلے منی افسانے لکھنے والے منٹو نہیں بلکہ محمد الدین فوق تھے اور یہ بات قابل ذکر ہے کیوں کہ افسانچہ نگاری کی ابتدا منٹو کے افسانچوں کے مجموعے ''سیاہ حاشئے'' کو دیا جاتا تھا مگر اس مجموعے کی اشاعت 1947ء کے بعد ہوئی جب کہ محمد الدین فوق کے منی افسانوں کا مجموعہ حکایات کشمیر' 1928ء میں منظر عام پر آیا۔ اس سند پر ہم محمد الدین فوق کو پہلا افسانچہ یا منی افسانہ نگار کہہ سکتے ہیں۔ اس جواز سے پروفیسر قدوس جاوید اپنے ایک اقتباس میں رقمطراز ہیں کہ:

> ''عظیم راہی کے مطابق اردو میں افسانچہ نگاری کی ابتداء سعادت حسن منٹو کے ''سیاہ حاشئے'' سے ہوئی ہے۔ ان کی اس تحقیق کی قدر و قیمت اپنی جگہ ہے لیکن اگر یہ دیکھیں کہ ''سیاہ حاشئے '' کی اشاعت 1949ء کے بعد عمل میں آئی جب کہ محمد الدین فوق کے چھوٹے چھوٹے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''حکایات کشمیر 1928ء میں اور دوسرا مجموعہ ''سبق آموز کہانیاں'' 1935ء میں شائع ہوا تھا۔ لہٰذا اس بنیاد پر افسانچہ یا منی افسانہ کا بنیاد گزار منٹو کے بجائے محمد الدین فوق کو قرار دینے پر بھی غور کیا جاسکتا ہے''۔(6)

محمد الدین فوق کے بارے میں اگر یوں کہا جائے کہ انھوں نے اپنی پوری زندگی کشمیری عوام کی حمایت کرنے میں گزار دی تو بیجا نہ ہوگا۔ فوق صاحب کی وفات 14/ستمبر 1945ء کو لاہور (پاکستان) میں ہوئی تھی اور وہیں مدفن ہوئے۔

عشرت کشمیری:

ان کا اصل نام غلام مصطفیٰ تھا مگر اردو ادب میں وہ عشرت کشمیری کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ان کی پیدائش 23/دسمبر 1916ء میں ہوئی۔ عشرت کشمیری نے نہ صرف شاعری میں طبع آزمائی کی تھی بلکہ اردو ادب کی دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی تھی، انھوں نے شاعری کے علاوہ افسانے بھی لکھے۔ مگر آج ان کی تحریروں کا مواد کہیں سے بھی دستیاب نہیں ہوتا ہے۔ انھوں نے کشتواڑ کی تاریخ میں ایک اہم کارنامہ انجام دیا تھا جس کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے ''تاریخ جدید کشتواڑ'' لکھ کر اپنی سرزمین اور اردو ادب کے لیے ایک وسیع کام یادگار چھوڑا ہے۔ اس کتاب کو انھوں نے 1972ء میں شائع کیا۔ پروفیسر ظہور الدین ان کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ:

"Ishrat was not only a poet and a short story writer but also a good connoisseur of art and a historian. His "Tareekh-e-Jadeed Kishtwar" was published in 1972. His literary contribution consists of Ghazals, Nazams, Qitat and Rubaiyat and a good number of short stories".(7)

عشرت کاشمیری کو بچوں کی تعلیم سے بھی گہری محبت تھی۔انہوں نے بچوں کے لیے بہت سی کہانیاں لکھی ہیں۔ جو بعد میں اکٹھا کر کے مجموعے کی شکل میں شائع کی گئیں۔اس حوالے سے ان کے تین مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔جن میں ''پرستان کی شہزادی''، ''کتاب کی کہانی'' اور ''زمین کا ناچ'' ہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے آریہ سماج پر بھی ایک مختصر کتابچہ تحریر کر کے شائع کیا تھا۔عبدالقادر سروری صاحب عشرت کاشمیری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''عشرت کو شعر وادب سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ چناں چہ تین کتابیں ''پرستان کی شہزادی''، ''کتاب کی کہانی'' اور ''زمین کا ناچ'' بچوں کے لیے لکھ کر شائع کیں۔''تاریخ کشتواڑ'' اور ''تذکرہ فریدیہ'' ان کی دیگر اہم تالیفات ہیں۔''تاریخ کشتواڑ'' اس علاقے کی اہم تاریخوں میں سے ہے اور پنڈت شیو جی در کی تصنیف ہے۔جو مہاراجہ رنبیر سنگھ کے زمانے میں یہاں کلکٹر مقرر ہوئے تھے۔تاریخ فارسی میں ہے۔عہد قدیم سے لے کر ڈوگروں کے ابتدائی دور کے حالات اور واقعات پر مشتمل ہے۔عشرت نے اسے اپنے مقدمے کے ساتھ مرتب کیا اور کتاب کلچرل اکادمی کی جانب سے شائع ہوئی۔''(8)

مذکورہ بالا اقتباس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ شاید عبدالقادر سروری صاحب کو کسی وجہ سے غلط فہمی ہوئی ہے جس کی وجہ سے انہوں نے شیو جی کی تصنیف اور عشرت کاشمیری کی تاریخ کشتواڑ کو اکٹھا کر کے دکھایا ہے۔ولی محمد اسیر کشتواڑی صاحب نے بھی اس کی نشاندہی کی ہے اور لکھا ہے:

''پروفیسر صاحب نے غلطی سے شیو جی در اور عشرت کی دو الگ الگ تاریخی کتب کو اکٹھا دکھایا ہے۔جس کی تفصیلات پہلے ہی درج کی گئی ہیں۔لہذا غلط فہمی میں مبتلا ہونے کا کوئی جواز نہیں ہے۔''(9)

کرشن چندر:

کرشن چندر نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز اپنے پہلے افسانہ ''یرقان'' سے کیا تھا جو انھوں نے یرقان کے مہلک عارضے کی وجہ سے اسپتال میں بیٹھے بیٹھے لکھا تھا۔ان کا یہ افسانہ ''ادبی دنیا'' (لاہور) کے شمارے 1936ء میں منظرعام پر آیا تھا۔مگر اس حوالے سے بہت سارے لوگوں نے اپنی رائیں دی ہیں۔جس میں کرشن چندر کا پہلا افسانہ ''جہلم پرناؤ'' کو بتایا گیا ہے ''جہلم پرناؤ'' میں کشمیر کی عکاسی کی گئی ہے۔اس افسانے کے منظرعام پر آنے سے اردو ادب میں دھوم مچ گئی تھی۔چوں کہ یہ افسانہ کرشن چندر کے بہترین افسانوں میں سے ایک ہے۔

کرشن چندر نے اپنے ابتدائی دور کے افسانوں میں رومانیت کے ساتھ ساتھ کشمیری ماحول اور سیاست کو بھی بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔اس حوالے سے ان کے افسانے خاص طور پر ''زندگی کے موڑ پر''، ''نغمے کی موت''، ''پرانے خدا'' وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

کرشن چندر اور کشمیر کا تعلق بہت ہی گہرا تھا ان کے افسانوں اور ناولوں میں کشمیر کی تہذیب وتمدن اور کلچر کی اکثر مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔اور اسی کے ساتھ کشمیر میں بسنے والے لوگ اور محنت کش عوام کی بھرپور نمائندگی دکھائی دیتی ہے۔ ان کی کہانیوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کی ان کہانیوں کا اصل مقصد کشمیر کا فطری حسن اور وہاں کے رہنے والے غریب طبقے کے مسائل کو پیش کرنا ہے۔پریمی رومانی اپنی کتاب میں ایک جگہ کرشن چندر کی فکشن نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> ''کرشن چندر نے اپنے افسانوں میں کشمیر کے لوگوں کا دکھ درد بڑے دلنشین انداز میں پیش کیا ہے۔انھیں یہاں کے بے بس عوام سے اس لیے دلچسپی تھی کہ یہ نہایت ہی محنت کش اور ہنرمند ہیں۔لیکن انھیں اس بات کا نہایت افسوس تھا کہ اتنی محنت کرنے کے باوجود بھی یہ لوگ افلاس اور ناداری کی زندگی گزارتے ہیں''۔(10)

کرشن چندر کے جن افسانوں میں کشمیر کا ماحول، وہاں کی تہذیب و کلچر، افلاس ناداری وغیرہ دیکھے جا سکتے ہیں ۔ان میں خاص طور پر ''طلسم خیال''، ''تالات کی حسینہ''، ''صرف ایک آنا''، ''جھیل سے پہلے جھیل کے بعد''، ''پل''، ''پہلی اُڑان''، ''نئے غلام''، ''کشمیر کو سلام''، ''سڑک کے کنارے''، ''کتاب کا کفن'' وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔کرشن چندر کے افسانے فنی لوازمات سے بھرے پڑے ہیں۔ان کی افسانہ نگاری میں پلاٹ، کردارنگاری، منظرنگاری، جذبات

نگاری وغیرہ بہترین انداز میں دیکھنے کوملتی ہے اور قاری کو ان کی کہانیاں پڑھنے میں بہت مزا آتا ہے، ان کی کہانیوں میں قاری اس تجسس میں رہتا ہے کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔اورآخر تک ان کی کہانیوں میں قاری کھویا رہتا ہے۔وہ جس انداز میں کسی موضوع پر لکھتے ہیں یہی ہنر اور اسلوب انھیں منفرد مقام عطا کرتا ہے۔

جذبات نگاری کے حوالے سے ان کے بہت سارے افسانے قابل ذکر ہیں۔مثال کے طور پر ان کے افسانے ''تالاب کی حسینہ'' سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ''فروز نے ایک آہ بھر کر کہا'' یہ کیونکر بتاؤں کہ یہ کیسے ہوا، کس طرح میرا ننھا منا لال آنکھوں دیکھتے دیکھتے ہمیشہ کے لیے نظروں سے اوجھل ہو گیا، میں ابھی تک اس امر کو سمجھ نہیں سکا کہ اسے موت کیونکہ آ گئی، بھلا یہ بھی کوئی موت ہے اگر اسے مرنا ہی تھا تو پہلے بیمار ہوتا میں اس کا علاج کرتا، اسے ڈاکٹروں، حکیموں، عطائیوں، پنساریوں کے پاس اٹھائے پھرتا ان سے ہاتھ باندھ کر عرض کرتا، خدارا میرے بچے کا اچھی طرح علاج کرو'۔(11)

اسی طرح سے ان کے افسانوں میں کشمیر کی منظر کشی عمدہ انداز میں دیکھنے کوملتی ہے۔اس حوالے سے اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ''گاٹیالیاں اور شہر جہلم کے درمیان دریائے جہلم نہائے ہے اس لیے شہر جہلم کو جانے کے لیے گاٹیالیاں کی چونگی پر عموماً ہر وقت بھیڑ سی لگی رہتی ہے ریاست جموں کو جاتے ہوئے لمبے لمبے مجھولے ایک چھوٹی سی بندرگاہ کا نظارہ پیش کرتے ہیں''۔(12)

کرشن چندر کا لکھا ہوا افسانہ ''پل'' بھی کشمیر کے پس منظر کی ایک بہترین مثال ہے جس میں مصنف نے کشمیر کے محنت کش لوگوں کے حالات کو قلم بند کیا ہے۔''پہلی اڑان'' میں کرشن چندر نے کشمیر کے ماضی کے مناظر اور کشمیر کی سماجی اور اقتصادی حالات کو پیش کیا ہے۔''جھیل سے پہلے جھیل کے بعد'' کرشن چندر کے مشہور افسانوں میں سے ایک ہے، اس میں انھوں نے کشمیر کے ایک خوبصورت علاقہ کلمرگ کے خوبصورت اور حسین مناظر کو دکھایا ہے اور ساتھ ہی ساتھ وہاں رہنے والے غریب لوگوں کے مسائل کو بھی اس افسانے میں ابھارنے کی کوشش کی ہے۔منظر نگاری او رجذبات نگاری کے حوالے سے بھی یہ ایک اہم افسانہ ہے۔''بالکنی'' بھی کرشن چندر نے کلمرگ کے پس منظر میں لکھا ہے ۔اس میں مرکزی کردار عبداللہ ہے جو ایک کسان ہے اور اس کی زمین قدرتی آفت کی وجہ سے برباد ہو جاتی ہے اور اسی

طرح سے اس کا سارا خاندان بھی تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔مگر اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود بھی وہ ہمت نہیں ہارتا ہے اور ان تمام مشکلات کا سامنے کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔اور آخر میں وہ اپنی محنت اور لگن کی وجہ سے کامیابی حاصل کرلیتا ہے۔

کرشن چندر ترقی پسند بھی تھے ان کی اکثر تحریروں میں انسان دوستی، امن و بھائی چارہ کی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ان کے جن افسانوں میں کشمیر کے محنت کش لوگوں کی مجبوری، بے بسی، افلاس کے مناظر دیکھے جاسکتے ہیں ان میں خاص طور پر ''کشمیر کو سلام''،''سڑک کے کنارے''،''پورے چاند کی رات''،''اندھا چھتر پتی''،''جانور''وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

قدرت اللہ شہاب:

قدراللہ شہاب کی پیدائش 26/فروری 1917ء کو گلگت میں ہوئی تھی۔1926ء کو وہ جموں میں قیام پذیر ہوئے۔یہیں پر قدرت اللہ شہاب کی ابتدائی تعلیم اکبر اسلامیہ ہائی اسکول میں مکمل ہوئی۔اس کے بعد انھوں نے اپنی دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔

1934-35ء میں قدرت اللہ شہاب نے ایف۔ایس۔سی کے امتحان میں کامیابی حاصل کی اور 1937ء میں انھوں نے بی ایس سی کا امتحان پاس کیا اور اس کے بعد مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے لاہور چلے گئے جہاں سے انھوں نے لاہور گورنمنٹ کالج سے ایم۔اے (انگریزی) میں کامیابی حاصل کی۔اس کے بعد وہ 1941ء میں انڈین سول سروس کے لیے منتخب ہوئے۔اس سے پہلے ریاست جموں وکشمیر میں کوئی بھی مسلمان سول سروس میں نہیں تھا اور ریاست جموں وکشمیر کی تاریخ میں وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے اس مقام کو حاصل کیا۔تقسیم وطن سے پہلے وہ ہندوستان کے کئی عہدوں پر ملازمت کرتے رہے، پھر غدر کے بعد وہ پاکستان منتقل ہو گئے اور پھر آخری عمر تک پاکستان میں ہی رہے۔

1954ء میں انھیں پاکستانی گورنمنٹ کی جانب سے غلام محمد کے سیکریٹری کے طور پر رکھا گیا۔اس کے بعد وہ جنرل اسکندر مرزا اور اسی طرح سے صدر مملکت پاکستان جنرل ایوب خان کے ساتھ بحیثیت سیکریٹری رہے۔مگر جب انھیں جنرل بخشی خان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تو ان کے ساتھ زیادہ دیر تک تعلقات اچھے نہ رہے۔جس کی وجہ سے قدرت اللہ شہاب نے اپنا استعفیٰ دے دیا۔کچھ عرصہ بعد جب پاکستان میں بے نظیر بھٹو صاحبہ کی حکومت نے باگ

ڈور سنبھالی تو قدرت اللہ شہاب کو ایک بار پھر سے بحیثیت سیکریٹری وزارت تعلیم میں تعینات کیا گیا۔ اس طرح سے حکومت پاکستان میں قدرت اللہ صاحب نے کئی اہم کام کیے اور پھر آخر میں 1977ء میں وہ ملازمت سے سبکدوش ہوئے، اور سبکدوش ہونے کے بعد انھوں نے پاکستان میں ''رائٹرس گلڈ'' کی بنیاد بھی ڈالی۔ قدرت اللہ شہاب کا انتقال اسلام آباد پاکستان میں 24/جولائی 1986ء کو ہوا۔

قدرت اللہ شہاب اردو زبان وادب کے ساتھ کافی لگاؤ رکھتے تھے۔ انھوں نے زیادہ تر افسانہ میں طبع آزمائی کی تھی اگرچہ اس حوالے سے انھیں زیادہ شہرت حاصل نہ ہو سکی مگر ان کے افسانوں کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ فن افسانہ نگاری میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ اس حوالے سے ان کے چار افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ جن میں 'نفسانے''، ''ماں جی'' اور ''سرخ فیتہ'' قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ ''یا خدا'' مصنف کا ناولٹ ہے جو 1948ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اردو ادب میں ان سب سے بہترین کارنامہ ان کی خودنوشت ''شہاب نامہ'' ہے جسے اردو ادب میں کافی مقبولیت حاصل ہے۔

قدرت اللہ شہاب نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا تھا ان کا پہلا افسانہ ''چندراوتی'' کے عنوان سے 1938ء میں پہلی بار اختر شیرانی نے اپنی مشہور میگزین ''رومان'' میں شائع کیا تھا۔ یہ افسانہ قدرت اللہ شہاب کی حقیقت بیانی پر مبنی ہے۔ اس افسانے میں مصنف نے اپنی محبت کو جذباتی انداز میں بیان کیا ہے۔ اس محبت کا اظہار انھوں نے ''شہاب نامہ'' میں بالکل کھلے انداز میں کیا ہے۔ اس میں انھوں نے بتایا ہے کہ چندراوتی ان کے ساتھ پڑھتی تھی اور دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔ مگر اچانک ایک دن چندراوتی بیمار ہو جاتی ہے اور اس کے علاج کے لیے شہاب صاحب ٹیوشن پڑھانا شروع کر دیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ چندراوتی کو، ٹی۔ بی ہے جس کی وجہ سے اس کی وفات ہو جاتی ہے۔ اب اس کی یاد میں شہاب صاحب اپنی سائیکل فروخت کر کے اس کے پیسے چندراوتی کی ماں کو دیتے ہیں تا کہ وہ چندراوتی کے پھول گنگا میں بہا دیں یہ ایک المیہ افسانہ ہے۔ جس کو مصنف نے بڑے بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''جب مزید چلنے کی سکت باقی نہ رہی تو مجبوراً میں گورنمنٹ کالج کے لان میں واپس آ گیا اور اپنا پہلا افسانہ لکھنے بیٹھ گیا افسانے کا عنوان ''چندراوتی'' تھا۔
>
> اور اس کا پہلا فقرہ یہ تھا:

''جب مجھے چندراوتی سے محبت شروع ہوئی۔ اسے مرے ہوئے تیسرا روز تھا............''
افسانہ لکھتے لکھتے میں کئی بار رویا، کئی بار ہنسا، مکمل کرنے کے بعد میں نے یہ کہانی اختر شیرانی کی خدمت میں بھیج دی۔ انھوں نے اسے پسند فرمایا اور مجھے بڑا پیارا خط لکھا۔ افسانہ انھوں نے ''رومان'' میں شائع کر دیا''۔(13)

اس افسانے میں انھوں نے اپنی محبت کے بارے میں بتایا ہے کہ انھیں ایک لڑکی سے سچی محبت ہوگئی تھی جس کی وجہ سے وہ کافی بے چین رہتے تھے۔ اس دور میں ان کے ہمعصر افسانہ نگاروں میں خاص نام سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، عصمت چغتائی وغیرہ اہمیت کے حامل تھے۔ حالانکہ ان افسانہ نگاروں کی طرح قدرت اللہ شہاب کو شہرت حاصل نہ ہوسکی مگر پھر بھی ان کے افسانے اہمیت کے حامل ہیں۔

1987ء میں قدرت اللہ شہاب کی خودنوشت ''شہاب نامہ'' کے عنوان سے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ مصنف کی یہ کتاب تقریباً 1198 صفحات پر مشتمل ہے جس کو انھوں نے کل 58 مختلف ابواب میں پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں جن موضوعات کو پیش کیا گیا ہے ان میں ''اقبال جرم''، ''جموں میں پلیگ''، ''نندہ بس سروس''، ''چمکور صاحب''، ''راج کرو گا خالصہ باقی رہے نہ کو''، ''مہاراجہ ہری سنگھ کے ساتھ چائے''، ''چندراوتی''، ''آئی سی ایس میں داخلہ''، ''صاحب، بنیا اور میں''، ''بھاگلپور اور ہندو مسلم فسادات''، ''ایس دی او''، ''نندی گرام اور لارڈ ویول''، ''بملا کماری کی بے چین روح''، ''پاکستان کا مطلب کیا''، ''کچھ یا خدا کے بارے میں''، ''آزاد کشمیر''، ''جنرل ایوب خان''، ''ماں جی کی وفات''، ''پاکستان کا مستقبل'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس سے پہلے اس تصنیف کے چند ابواب ''سیارہ ڈائجسٹ''، ''معاصر''، ''دستاویز''، ''اردو ڈائجسٹ''، ''نیا دور'' اور ''تخلیقی ادب'' وغیرہ جیسے مختلف رسائل وجرائد میں منظر عام پر آ چکے تھے۔ اس کے بعد اسے کتابی شکل میں منظر عام پر لایا گیا۔

اس کتاب کا بہت سارے ادیبوں اور شاعروں نے مطالعہ کیا ہے۔ اس کتاب کا آغاز مصنف نے ''اقبال جرم'' سے کیا ہے اور اس کے بعد ابتداء سے لے کر آخر تک اپنی زندگی کے اہم واقعات اس کتاب میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کا بنیادی مقصد قدرت اللہ شہاب بت شکنی کے بجائے وہ ان واقعات وتجربات کو بیان کرنا تھا جس سے ان کی زندگی میں گہرے تاثرات تھے اور جن تاثرات وتجربات سے وہ اپنی ذاتی زندگی میں سب سے زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ انھوں نے جس طرح سے اپنی زندگی کے واقعات کو اس تصنیف میں پیش کیا ہے واقع ہی قابل تعریف ہے

۔اس کتاب میں مصنف نے جموں کی سرزمین میں رہتے ہوئے وہاں کے گلی کوچوں، وہاں کے رہن سہن اور اس طرح سے سرزمین کشمیر کے واقعات کی انھوں نے بہترین انداز میں عکاسی کی ہے۔اقتباس ملاحظہ ہوں:

''ان دنوں جموں شہر میں ہر روز دس دس پندہ پندرہ لوگ طاؤن سے مرتے تھے۔گلی کوچوں میں چاروں طرف خوف ہی خوف چھایا ہوا نظر آتا تھا۔گاہک دکان کا کن انکھیوں سے جائزہ لیتے تھے کہ کہیں بوریوں اور ڈبوں اور کنستروں کے آس پاس چوہے تو نہیں گھوم رہے۔ دکاندار گاہکوں کو شک وشبہ سے گھورتے تھے کہ ان کے یہاں پلیگ کا کیس تو نہیں ہوا''۔ (14)

دراصل پلیگ ایک قسم کی وبا تھی جو چوہوں کے ذریعے سے انسانوں تک پہنچی تھی اور اس وقت یہ بیماری کافی بڑھ چکی تھی۔اس طرح سے انھوں نے اس تصنیف میں کئی موضوعات پر بحث کی ہے۔ایک جگہ پر انھوں نے پاکستان کی کچھ خامیوں کے بارے میں سوالات کھڑے کیے ہیں اور ان کمیوں کو دور کرنے کے لیے انھوں نے اس میں کچھ اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہوں:

''ہندوستان تو کسی حد تک سمجھ گیا ہے۔اس لیے سنبھل بھی گیا ہے اور اس کی داستان ہر جگہ بڑی آب وتاب سے جاری وساری ہے اب اپنے پاکستان میں ہمارے سمجھنے کی باری ہے۔ قومی سطح پر ہماری سیاسی قیادت کا ایک بڑا حصہ اپنی طبعی یا ہنگامی زندگی گزار کر ہمارے درمیان سے اٹھ چکا ہے۔یا جمود کا شکار ہو کر غیر فعال ہو چکا ہے۔کچھ سیاسی پارٹیوں کے رہنما پیرتسمہ پا کی طرح اپنی اپنی جماعتوں کی گردن پر زبردستی چڑھے بیٹھے ہیں۔ان میں سے چند ایک نے کھلم کھلا یا در پردہ مارشل لا کی آکسیجن سے سانس لے کر سسک سسک کر زندگی گزاری ہے۔ان نیم جان سیاسی ڈھانچوں میں نہ تو کوئی تعمیر سکت باقی ہے اور نہ ہی ان کو عوام کا پورا اعتماد حاصل ہے۔پرانی سیاست کی بساط الٹ چکی ہے۔اب جب کبھی سیاست کا دور دورہ شروع ہوگا تو اس میں فقط ایسی نئی قیادت ابھرے گا جس کا دامن ماضی کے بہت سی آرائشوں سے پاک ہو۔خدا کرے یہ دور جلد سے جلد آئے اور اسے پوری پوری ایمانداری خلوص اور نیک نیتی سے فروغ دیا جائے اگر ایسا نہ ہوا یا اس سے روکاوٹیں پڑتی رہیں۔تو پھر کیا ہوگا؟

اس کے تصور سے دل لرز اٹھتا ہے''۔(15)

قدرت اللہ شہاب اپنی ساری ادبی زندگی کے لمحات کے بارے میں اپنی خودنوشت میں ذکر کیا ہے۔ان کے پہلے افسانہ''چندراوتی'' کے بعد ان کے اور بھی بہت سارے افسانے منظر عام پر آئے جن میں ''پہلی تنخواہ''، ''جسونت سنگھ''، ''آئشہ کی زندگی''، ''شلوار''، ''دورنگا'' اور ''ایک ڈسپیچ'' وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔قدرت اللہ شہاب اپنی ملازمت میں رہتے ہوئے بھی اپنی ادبی زندگی کے لیے کچھ وقت نکال لیتے تھے۔1947ء میں جو فسادات ہوئے ان پر مبنی ان کا ایک اچھا ناولٹ ہے جو''یا خدا'' کے عنوان سے لکھا گیا ہے۔اور یہ ناولٹ ''نیا دور'' میں شائع ہوا تھا۔

قدرت اللہ شہاب کا ایک اور قابل ذکر افسانہ''ماں جی'' ہے جو 1958ء میں ''نقوش'' میں منظر عام پر آیا۔اسی طرح سے''عفت'' بھی ان کا ایک اچھا افسانہ ہے۔

غرض قدرت اللہ شہاب کو اگرچہ ملازمت کے دوران کچھ تخلیق کرنے کا بہت کم موقع ملتا تھا مگر پھر بھی ان کے نثری کارنامے قابل تعریف ہیں،انھیں کئی انعامات واعزازات سے بھی نوازا جا چکا ہے۔حکومت پاکستان کی جانب سے انھیں''ستارہ پاکستان'' کے انعام سے 1968ء میں نوازا گیا تھا۔

کنولؔ:

کنول کا پورا نام جگدیش چندر کنولؔ تھا۔ان کی پیدائش تقریباً1920ء کے آس پاس جموں میں ہوئی تھی۔ان کے بارے میں زیادہ کچھ معلومات تو نہیں ملتی ہیں مگر مورخین نے اپنی کچھ تصانیف میں ان کا ذکر ضرور کیا ہے۔کنول صوبہ جموں کے نہ صرف اچھے افسانہ نگاروں میں شمار کیے جاتے تھے بلکہ ایک اچھے ڈراما نویس بھی تھے۔انھوں نے اپنے ابتدائی زمانے میں لاہور میں زندگی گزاری تھی۔وہاں انھیں کافی ادیبوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کے مواقع میسر آئے۔جموں میں اس وقت کنول صاحب ایک بینک میں ملازمت کرتے تھے۔اسی دوران حکومت نے ان کا تبادلہ لاہور میں کر دیا۔انھیں اردو ادب سے شروع سے ہی لگاؤ تھا اور لاہور میں آنے کے بعد انھیں اردو ادب سے اور دلچسپی پیدا ہو گئی کیونکہ اس وقت پورے لاہور میں ادبی ماحول تھا۔تو ظاہر سی بات ہے کہ کنول نے بھی اس اثر کو قبول کیا ہو۔اسی دوران انھیں افسانہ نگاری میں گہری دلچسپی ہونے لگی۔انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا تھا۔تقسیم ہند کے بعد جگدیش چندر کنول جموں سے ممبئی میں منتقل ہو گئے تھے۔جہاں انھوں نے باقی کی تمام زندگی گزاری۔ان کے بارے میں محققین ومورخین نے بہت کم ذکر کیا ہے۔پروفیسر ظہور الدین نے اپنی کتاب میں گلزار احمد فدا کے مضمون جو''پریم''

اخبار میں جولائی 1945ء میں چھپا تھا کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"Kanwal is influenced by the modern short-story writers of the country. He writes in the embellished language".(16)

ٹھاکر پونچھی:

ان کا اصل نام جگن ناتھ ٹھاکر تھا۔ان کی پیدائش پونچھ کے ایک بڑے گھرانے میں 22/جنوری 1922ء کو محلّہ جورنالی میں ہوئی۔ٹھاکر پونچھی نے اپنی ابتدائی تعلیم وکٹوریہ جوبلی ہائی اسکول پونچھ سے حاصل کی اس کے بعد ''پرنس آف ویلز کالج''،جموں سے اپنی بی۔اے کی تعلیم حاصل کی۔اس کے بعد اپنی ادبی و علمی تحریروں سے اتنی شہر حاصل کی کہ جموں کے بڑے فکشن نگاروں میں شامل کیے جانے لگے۔انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا ہے۔ مگران کو اردو دنیا میں ناول نگار کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔اس حوالے سے ملاحظہ ہو ایک اقتباس جس میں ڈاکٹر ظہورالدین نے ان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے:

"Thakur Poonchi received his early education in the Victoria Jubilee High School, Poonch. After passing his Matriculation Examination he was suet to the prime of Wales College, Jammu, for higher education from where he did his graduation. This period proved highly conductive to his literary career and he started writing short-stories. Although his early efforts were somewhat puerile yet. They marked the beginning of a writer who was destined to leave his imprints in the annals of Urdu literature for all the times to come. His early were published in the reputed weeklies of the region......" 17

اس مذکورہ بالا اقتباس سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ ٹھاکر پونچھی نے اپنی ادبی زندگی کا سفر افسانہ سے شروع کیا

تھا۔مگر ان کی اس تصنیف میں ٹھا کر پونچھی کے پہلے افسانے کے بارے میں کہیں ذکر نہیں ملتا ہے۔

راقم السطور کی تحقیق کے مطابق ٹھا کر پونچھی پر سب سے اہم کام محمد شریف ملک نے ’’ٹھا کر پونچھی فن اور شخصیت‘‘ کے عنوان سے جموں یونیورسٹی میں کیا ہے۔ان کے اس غیر مطبوعہ مقالے کا مطالعہ کرنے سے ٹھا کر پونچھی کے تمام تر کارناموں پر تفصیل سے روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔ٹھا کر پونچھی جموں صوبہ میں اس دور کی ادبی دنیا میں ابھر کر سامنے آئے تھے جب ریاست میں افسانہ نگاری اور ناول نگاری کا رجحان، پریم چند کی تخلیقات کے اثرات سے ابھرنے لگا تھا۔پریم چند کا اثر زیادہ تر افسانوں میں نمایاں دکھائی دیتا تھا۔ٹھا کر پونچھی نے بھی دیگر ادیبوں کی طرح پریم چند کا گہرا اثر قبول کیا تھا۔اس دور میں جب اچھے اور فنی ناول لکھے جاتے تھے،تو ان پر بھی پریم چند کی فکر اور فن کا سایہ پڑتا رہا۔تاہم یہ عہد نئے مسائل کو جنم دینے کا باعث بنا ہوا تھا اور نئے مسائل نئے انداز کا برتاؤ چاہتے تھے۔قدیم نظام زندگی اکتاہٹ، اور ذہنی تسکین کے لیے نئے نئے خیابانوں کی تلاش،اس عہد کے افسانوں کی طرح ناولوں کا بھی خاصہ اثر تھا۔نیا انداز فکر ،نئے انداز کا اظہار اور نئے اسالیب کا بھی متقاضی تھا۔چنانچہ ناول میں بھی نئے اسالیب کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔جس کو پورا کرنے کے لیے ریاست میں ٹھا کر پونچھی جیسے قلمکاروں کی سخت ضرورت تھی۔ٹھا کر پونچھی کو اگر چہ ناول نگاری میں افسانہ نگاری کے برعکس زیادہ شہرت ملی تاہم اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں نے سب سے پہلے افسانہ نگاری سے ہی ادبی دنیا میں شہرت حاصل کی اس کے بعد انھوں نے ناول نگاری میں نام کمایا اور آج ان کو جموں کے مشہور ناول نگاروں میں شامل کیا جاتا ہے۔ٹھا کر پونچھی کے اگر پہلے افسانے کی بات کریں تو لگ بھگ 1950 کے آس پاس ان کا سب سے پہلا افسانہ ’’راجہ‘‘ کے عنوان سے کالج کے رسالے ’’توی‘‘ میں شائع ہوا تھا۔اس افسانے کے بعد انھوں نے کئی ناول اور افسانے لکھتے تھے جن کا ذکر آگے آئے گا۔پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب نے بھی انھیں ناول نگار کی حیثیت سے زیادہ سراہا ہے اور ان کے پہلے افسانے کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے، اقتباس مندرجہ ذیل ہے:

> ’’ریاست کے موجودہ دور کے ادیبوں میں شہرت کی بنیاد ان کے ناول ہیں۔ٹھا کر پونچھی ایک مقام رکھتے ہیں۔یوں انھوں نے افسانے بھی لکھے ہیں اور ان کے افسانے نقادوں کی نظر میں معیاری تسلیم کیے جاتے ہیں۔تاہم ان کی شہرت کی بنیاد ان کے ناول ہیں۔پونچھ کی سرزمین جہاں سے قدآور ادیب پیدا ہوتے رہے ان کا وطن مالوف ہے۔جہاں ان کی ولادت 1925ء کے لگ بھگ ہوئی۔.......... پونچھ میں اپنی تعلیم ختم کر کے ٹھا کر جب جموں آئے اور پرنس آف ویلز کالج میں داخل ہوئے تو ان کے استفادے اور نقل وحرکت کی

فضا وسیع تر ہوگئی۔ یہاں وہ پریم چند سے بہت متاثر ہوئے اور یہ اثر اب تک کبھی کسی نے کسی صورت میں ان کی تخلیقات میں نظر آتا ہے۔ٹھاکر نے افسانے لکھے اور ان کا پہلا افسانہ ''راجہ'' کالج کے رسالے ''توی'' میں شائع ہوا اس کے بعد کئی اور افسانے انھوں نے لکھے جو کشمیر اور بمبئی کے رسالوں میں شائع ہوئے''۔(18)

جموں خطے میں پونچھ کی سرزمین اردو ادب کے حوالے سے سرفہرست پر رہی ہے۔اس سرزمین ادب سے تعلق رکھنے والے بڑے قلمکار پیدا ہوئے تھے جن میں ایک سب سے بڑا نام کرشن چندر کا ہے۔یہیں سے ٹھاکر پونچھی کا بھی تعلق تھا۔انھوں نے اپنی تعلیم کے فوراً بعد محکمہ سپلائز میں ملازمت کر لی تھی۔ کچھ عرصہ بعد ان کو محسوس ہوا کہ یہ کام ان کی طعبیت کا نہیں لہٰذا جلد ہی اس کام سے کنارہ کشی اختیار کر لی اس کے بعد 1948ء میں ریڈیو کی ملازمت کے سلسلے میں وہ دہلی چلے گئے جہاں انھوں نے ڈوگری اور کشمیری یونٹ میں کئی عرصہ تک اس کام کو انجام دیا۔مگر کچھ عرصہ بعد اس کام سے بھی انھیں اکتاہٹ ہونے لگی اور آخر کار اس کام کو بھی چھوڑ کر اپنی سرزمین میں واپس چلے گئے۔جیسا کہ دیوندر ستیارتھی نے بھی ایک جگہ ان کے بارے میں لکھا ہے کہ دہلی کی زندگی سے ان کو دلبستگی پیدا نہ ہوسکی۔کیونکہ جنم بھومی کی یاد اسے بری طرح ستاتی ہے .... بات چیت میں ٹھاکر کشمیر کا ذکر لے بیٹھتا ہے اور کشمیر کا ذکر شروع ہوتے ہی اس کی آنکھوں میں چمک سی آجاتی ہے۔گاؤں، پہاڑ گھومنے کی باتیں سناتے ٹھاکر پر ایک نشہ سا طاری ہوجاتا ہے۔

ٹھاکر پونچھی نے اردو فکشن میں زیادہ اہم رول ادا کیا ہے۔انھوں نے تقریباً تیس سے زائد ناول اور پچاس سے زائد افسانے لکھے ہیں جو وقتاً فوقتاً مختلف رسائل وجرائد میں منظر عام پر آتے رہے۔

ٹھاکر پونچھی کی تخلیقات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تحریروں میں جگہ جگہ پریم چند کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ پریم چند کی طرح ہی ٹھاکر پونچھی گاؤں دیہات، غریب، مظلوم اور بے بس لوگوں کو اپنے افسانے اور ناولوں کا موضوع بناتے ہیں۔ یہ ہی سب چیزیں جیسے وطن کی محبت، گاؤں کی محبت، دیہات کی منظر کشی وغیرہ ان کی تحریروں میں جان پیدا کردیتی ہیں۔

ٹھاکر پونچھی کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔ان میں سب سے بہترین مجموعہ ''زندگی کی دوڑ'' ہے جس میں دس افسانے شامل ہیں۔اس مجموعے میں انھوں نے دیہات میں بسنے والے لوگوں کی زندگی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔اس مجموعے کے پیش لفظ میں دیوندر ستیارتھی رقم طراز ہیں کہ:

> ''ٹھاکر کے بیشتر افسانوں میں بڑی چابکدستی سے کام لیا گیا ہے۔افسانے کی ہئیت میں مصنف ایک کہنہ مشق ایکٹر کی طرح اپنی شعوری پختگی سے کام لیتا ہے، زبان کا بہاؤ پورے رکھ رکھاؤ سے آگے بڑھتا ہے''۔(19)

ان کے افسانوی مجموعے میں جو اردو ادب میں کافی اہم ہیں ''زندگی کے موڑ پر'' اور ''چناروں کے چاند'' قابل ذکر ہیں۔ٹھاکر پونچھی کے اس مجموعے ''زندگی کے موڑ پر'' دیوندستیارتھی نے بھی مطالعہ کر کے اس پر تبصرہ کیا ہے اور انھوں نے ٹھاکر پونچھی کی فنی خوبیوں پر زیادہ زور دیا ہے۔اسی لیے ان کا یہ تبصرہ ٹھاکر پونچھی کے اکثر افسانوں پر صادق آتا ہے۔اس بات کو کوئی نظر انداز نہیں کرسکتا ہے کہ افسانے کا ایک تو موضوع جدا ہوتا ہے اور دوسرا ان کی پیش کش کا انداز ہی الگ ہوتا ہے۔اس لیے جو رجحانات عام طور پر ٹھاکر پونچھی کے افسانوں میں نمایاں ہیں ان کا ایک بار مطالعہ کرنے سے قاری کے ذہن میں سما جاتے ہیں۔ان کے افسانوں کی ایک اور خاص بات یہ ہے کہ افسانہ پڑھتے وقت قاری اکتاہٹ محسوس نہیں کرتا ہے۔بلکہ کہانی میں گم ہو کر رہ جاتا ہے اور ہر وقت اس کو آگے کی کہانی کا تجسس رہتا ہے ،یہی خوبی ایک افسانہ نگار کی پہچان ہوتی ہے۔جس کو ٹھاکر پونچھی کے افسانوں میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ان کے افسانوی مجموعے ''زندگی کے موڑ پر'' قابل ذکر افسانوں ''موت کے سائے کے تلے''، ''ڈھولک بجتی رہی'' کے علاوہ ''اندھے کی بیوی''، ''معاوضہ''، ''زعفران''، ''وسندھا سنگھ دردی'' وغیرہ بھی موضوع کی ندرت، کرداروں کی اٹھان اور کھیل کے لحاظ سے عمدہ افسانے تصور کیے جاتے ہیں۔

ٹھاکر پونچھی کا پہلا افسانہ ''راجہ'' کے عنوان سے کالج کے رسالے ''توی'' میں شائع ہوا۔مگر ریاست کے دیگر ادیبوں نے ٹھاکر پونچھی کی کہانی ''کالگی'' کو پہلی کہانی قرار دیا ہے۔یہ کہانی جموں کے مشہور ہفت روزہ اخبار ''چاند'' میں منظر عام پر آئی تھی۔لیکن اس بات میں بہت اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔مگر ٹھاکر پونچھی کی تخلیقات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کی پہلی کہانی ''خانہ بدوش'' کے عنوان سے منظر عام پر آئی تھی۔جس کا ذکر انہوں نے خود کیا ہے۔ ملاحظہ ہو اقتباس:

> ''ریاست کشمیر کے جاگیردارانہ ماحول میں پیدا ہوا۔بچپن اور لڑکپن محلات کی منقش چار دیواری میں گزارا۔گھناونی اور معصوم زندگی کے قرب نے کہانی کار کی نگاہ بخشی۔پہلی کہانی ''خانہ بدوش'' اور آخری کہانی ''بہت دور جانا ہے۔''(20)

ٹھاکر پونچھی کے ادبی سفر کے ابتدائی افسانے ریاست کے سارے مشاہدات اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے جہاں دیہاتی زندگی کو پیش کیا ہے وہیں شہر میں بسنے والوں کی بھی عکاسی کی ہے۔''زندگی کی دوڑ'' کے عنوان سے ان کا افسانوی مجموعہ ہے۔اس میں کل دس افسانے ہیں۔ان کا یہ مجموعہ 1959ء کے آس پاس منظر عام پر آیا تھا۔ اس کتاب کا پیش لفظ جدیدیت کے مشہور ومعروف افسانہ نگار دیوندر ستھیارتھی نے لکھا ہے۔انہوں نے ایک جگہ ٹھاکر پونچھی کے افسانوں کے حوالے سے کہا ہے کہ:

> ''ٹھاکر نے بیشتر افسانوں میں بڑی چابکدستی سے کام لیا ہے۔افسانے کی ہیئت میں مصنف ایک کہنہ مشق ایکٹر کی طرح اپنی شعوری پختگی سے کام لیتا ہے۔زبان کا بہاو بھی پورے رکھ رکھاؤ سے آگے بڑھتا ہے۔''(21)

''چناروں کے چاند'' کی کامیاب اشاعت کے بعد ٹھاکر پونچھی کو اردو کے مقبول ترین اور ماہر افسانہ نگاروں میں شامل کیا جانے لگا۔ان کے افسانے نہ صرف ریاست جموں وکشمیر میں مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ بلکہ پورے برصغیر میں ٹھاکر پونچھی کو ایک بڑے فکشن نگار کی حیثیت سے مانا جاتا ہے۔ان کے کئی افسانے ہندوستان کے مختلف رسائل و جرائد میں منظر عام پر آئے تھے۔ان کی قابلیت کی وجہ سے جس طرح سے انہوں نے دیہات کی زندگی اور پہاڑی مناظر کی عکاسی کی اس وجہ سے انہیں پہاڑی رومانوں کا ترجمان افسانہ نگار کہا جاتا ہے۔ان کی ہر تحریر ان کی انفرادیت کی منہ بولتی تصویر تھی۔''زندگی کے موڑ پر'' ٹھاکر پونچھی کا ایک اور افسانوی مجموعہ ہے۔ان افسانوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے جموں کے دور دراز پہاڑی علاقوں میں بسنے والے لوگوں کی زندگی کی سچی تصویریں پیش کی ہیں۔ان کا ایک افسانہ''موت کی موت'' ریاستی کلچرل اکیڈمی کے رسالے''شیرازہ'' میں 1978ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ان کا یہ افسانہ بہت ہی عمدہ افسانہ ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''بلتی یار نے بلتی یار کی لاش کو کمبل میں لپیٹا۔پانچ روپے کا آخری نوٹ مٹھی میں دبایا اور کفن کا انتظام کرنے چل پڑا پورے دس برس کا ساتھ ختم ہوگیا تھا۔دس برس کی بچی کچھی سانجھی کمائی بھی ختم ہوگئی تھی۔اب صرف بلتی یار کی لاش تھی۔اب اپنے کچے گھروندے سے قبرستان تک کا طویل فاصلہ رات اترنے سے پہلے عبور کرنا تھا۔ساتھ سب کے سب پہاڑی پرندے تھے۔جو سردیوں میں پہاڑوں کی برفانی چوٹیوں سے مرغابیوں کے جھنڈوں کی طرح اترتے

آئے اور گرمیوں میں اپنے اپنے گھونسلوں میں لوٹ جاتے لیکن رمضانا اور بلتی یار اپنے اپنے
گھونسلے اجاڑ کر وہاں آئے تھے اور وہیں کے ہوکر رہ گئے (22)

اس کہانی میں مصنف نے دوستوں کی سچی محبت کو پیش کیا ہے اور کہانی کے کلائمیکس میں بلتی یار کی جب موت ہو جاتی ہے تو اس کے لیے کفن نہیں ملتا۔ اسی دوران ایک امیر آدمی اپنے مردہ کتے کو ریشمی کفن میں باندھ کر دفنانے کے لیے لے جا رہا تھا۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ایک غریب سے زیادہ ایک کتے کی اہمیت ہے۔ اس منظر کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تہذیبی زندگی کا المیہ پوری طرح سے ابھر کر سامنے آتا ہے۔ رومانیت اور حقیقت پر مبنی ٹھاکر پونچھی کے افسانے بہت ہی قابل قدر افسانے کہلاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے افسانے مصنف کے قابل تعریف ہیں جن میں خاص طور پر ''آنسو''، ''خلش کہاں سے ہوتی''، ''بے خواب کواڑ'' غرض کہ ٹھاکر پونچھی کے افسانوں میں ہر ایک کہانی اپنی ایک الگ پہچان بنائے ہوئی ہے۔ ان کا افسانہ ''بے خواب کواڑ'' میں انہوں نے خوشتر گرامی کے نام ایک خط پیش کیا ہے جس میں مصنف نے روزمرہ میں ہونی والی چھوٹی چھوٹی پریشانیوں کا ذکر کیا ہے۔

موہن یاور:

موہن یاور کا شمار صوبہ جموں کے فکشن نگاروں میں کافی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کی پیدائش 7/دسمبر 1926ء میں راج تلک روڈ جموں میں ہوئی تھی۔ ان کے والد کا نام بشن چند تھا جو کہ رومانی شاعری کے دلدادہ تھے۔

موہن یاور اپنی تعلیم کو مکمل کرنے کے بعد 1940ء سے شاعری میں طبع آزمائی کرنے لگے۔ مگر صنف شاعری میں انہیں زیادہ دلچسپی نہیں تھی، اس لیے جلد ہی اردو فکشن کی طرف راغب ہو گئے جہاں انھوں نے نہ صرف ریاست میں اپنی شخصیت کو بلند کیا بلکہ دیگر ریاستوں میں بھی انھیں اچھے فکشن نگار کی وجہ سے مقبولیت حاصل ہوئی۔ ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھنے والے ادیبوں میں موہن یاور جموں کے نمائندہ ادیب تھے جنھوں نے اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ وہ اپنے افسانوں کی قیمت اور کیفیت کے لحاظ سے جموں کے فکشن نگاروں میں ایک بلند مقام حاصل کر چکے ہیں۔ افسانوں کے علاوہ انھوں نے لگ بھگ 1965ء میں ایک ناولٹ "پتھروں کا شہر" بھی لکھا تھا جس کو کافی مقبولیت حاص ہوئی۔ یہ ناولٹ پہلی بار ماہنامہ ''شاعر'' بمبئی سے شائع ہوا تھا۔ ان کے چار افسانوی مجموعے ''وسکی کی بوتل''، ''تیسری آنکھ''، ''دو کنارے'' اور سیاہ تاج محل'' منظر عام پر آ چکے ہیں۔

موہن یاور اپنے افسانوں میں زندگی کے ہر بدلتے موڑ اور نئے نئے مواقف کو گرفت میں لانے کی کوشش

کرتے ہیں،اور اپنے کرداروں میں انسانی نفسیات کے نئے نئے گوشے تلاش کرتے ہیں۔ان کے اکثر و بیشتر افسانوں میں صوبہ جموں کے عوام کی زندگی کے بدلتے رجحانات اور ان کی روزمرہ زندگی کو دیکھا جا سکتا ہے۔اس کے علاوہ بھی بہت سے مسائل کو موہن یاور نے اپنے افسانوں میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے اپنے افسانوں کے پس منظر میں جموں اور اس کے مفادات کی سادہ زندگی کو پیش کیا ہے۔جس میں ماحول کے طبعی عناصر کا کڑا پن بھی موجود ہے ۔ان کے اکثر کرداروں میں ڈوگرہ دیس کے سیدھے سادھے مگر دیہاتی اور بہادر انسانوں کے نمونے ملتے ہیں۔ پروفیسر ظہورالدین نے ان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح سے کیا ہے ملاحظہ کیجیے ایک اقتباس:

> "Mohan Yawar is not only senior most but also a leading short-story writer of the state. His short stories mostly deal with the day to day problems of life, like all progressive, he is also dissatisfied with the prevailing conditions of life in society where money is everything. Those who possess it, are the Lords of the entire system. The poor are subjected to an emending chain of suppression. They are subjected to inhumane treatment like animals. They are deprived of all those benefits which are in reality, prerequisites of human life. Mohan Yawar, therefore dreams of a complete revolution, because he knows that only a complete revolution can redress the injustice caused by a rotten system. We therefore, here a summed of approaching revolution in a number of his short stories of his first collection "Teesri Ankh".(23)

موہن یاور کے افسانوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں افسانہ نگاری کے فن میں مہارت حاصل تھی ۔وہ افسانہ لکھتے وقت افسانے کی ہئیت اور فن کو اپنی گرفت میں رکھتے ہیں۔جس کی وجہ سے قاری کو ایک دلچسپی پیدا ہو جاتی

ہے۔انھوں نے اپنے افسانوں میں زیادہ تر جموں کی قدیم روایت کو پیش کیا ہے۔ان کا ایک افسانہ ''پتھر کے بت'' فنی لحاظ سے ایک کامیاب افسانہ ہے۔اس میں موہن یاور نے جموں کے افراد جو کہ قدیم تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں کو پیش کیا ہے۔اس افسانے میں سب سے اہم عناصر قلعہ باہولوچن، جامبولوچن اور توی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

موہن یاور کے افسانوں کی ایک خاص خوبی یہ بھی ہے کہ ان کے افسانوں کے مرکزی موضوع بھی سیدھے سادے واقعات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ وہ قاری کا بخوبی لحاظ رکھتے ہیں کہ کہیں انھیں افسانے پڑھتے وقت اکتاہٹ محسوس نہ ہو۔اوران چیزوں سے احتراز کرتے ہیں کہ پڑھنے والوں کو کہانی کے واقعات کی دلچسپی سے ہٹا کر مسائل میں الجھا دیں۔اس لیے ان کے افسانوں میں ایک سبق آموزی کی کیفیت پائی جاتی ہے۔اپنے سماجی ماحول اور خاص طور پر شہری زندگی کی ناہمواریوں اور گندگیوں کو منظر عام پر لانے میں وہ چابک دست ہیں۔انھوں نے اپنی کہانیوں میں نچلے طبقے کے لوگوں کا خاص خیال رکھا ہے۔ان لوگوں کی مشکلات، دکھ درد، پریشانی، غربت، افلاس وغیرہ کا بھی انہوں نے گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا اور اسی طرح افسانوں میں پیش کیا ہے۔اس لیے ٹھاکر پونچھی ان کے افسانوں کا مطالعہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''مصنف کا انسانی شعور اور انسانی نفسیات کا تجربہ بہت وسیع ہے اسی لیے جب وہ لکھتا ہے تو اس کی تحریز ہر خند بن جاتی ہے''۔(24)

اس میں کوئی شق وشبہ کی گنجائش نہیں کہ موہن یاور کا انسانی شعور اور انسانی نفسیات کا تجربہ وسیع درجہ نہ رکھتا ہو۔موہن یاور کا ایک اور افسانہ ''بلند شہر کے بلند شہزادے'' بہت بلند درجہ رکھتا ہے۔اس میں انھوں نے دو دوستوں کی کہانی کو پیش کیا ہے۔ جو ایک دوسرے کے اچھے دوست بھی تھے اور بعد میں دونوں ایک دوسرے کے جانی دشمن بن جاتے ہیں۔ایک چھوٹی سی بات کو لے کر دونوں کی اچھی دوستی گہری دشمنی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ایک دن اچانک دونوں کا آمنا سامنا ایک چھوٹے سے بازار میں ہوتا ہے۔دونوں کی آنکھوں میں ایک دوسرے کو دیکھ کر نفرت ہونے لگتی ہے آخر کار اپنے اپنے غصے کو قابو نہیں کر پاتے ہیں اور بازار میں ہی دونوں گتھم گتھا ہو جاتے ہیں۔سارے لوگ بازار میں اکٹھا ہو کر دونوں کا اس طرح سے تماشا دیکھنے کا مزا لیتے ہیں جیسے کہ اکھاڑے میں کشتی چل رہی ہو مگر کوئی ان کو چھڑا نہ پائے۔موہن یاور کے طنزیہ لہجے کے الفاظ اس افسانے میں اس طرح سے ہیں ملاحظہ ہو:

''جب دونوں ایک دوسرے کو ادھ موا کر کے تھک گئے تب بازار والوں نے نہایت شرافت

کے ساتھ دونوں کو زخمی حالت میں ہسپتال پہنچا دیا''۔(25)

''وسکی کی بوتل'' موہن یاور کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے جو 1958ء میں شائع ہوا۔اس میں بارہ افسانے شامل ہیں۔اس مجموعے کا مطالعہ کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وسکی کی بوتل افسانہ اس مجموعے میں سب سے اہم اور کامیاب افسانہ ہے۔اس افسانے میں موہن یاور نے سرمایہ دارانہ نظام اور صاحبِ اقتدار کے اخلاقی تزلزل کو افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ترقی پسندوں کا یہ محبوب موضوع تھا۔اس کے مختلف پہلوؤں کو بار بار دہرایا گیا ہے۔ان طبقوں کے اعتبار پول کئی دفعہ کھل چکا ہے۔لیکن موہن یاور نے اسے جس نئی توضیح میں پیش کیا ہے اس سے پورا مسئلہ نیا معلوم ہوتا ہے۔

موہن یاور کے دیگر افسانوی مجموعہ ''سیاہ تاج محل'' کے عنوان سے فروری 1961ء میں منظر عام پر آیا۔اس پر انھیں ریاستی کلچرل اکیڈمی کی جانب سے ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔یہ ان کا سب سے بہترین افسانوی مجموعہ ہے۔

ان افسانوں کے موضوعات،مواقف اور پیش کش کے انداز میں ایک تازگی ہے۔اکثر افسانے رومانی ہیں۔جس میں موہن یاور نے حسین لڑکیوں کی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ باقی تمام اچھی اچھی باتوں کو پیش کیا ہے۔خاص طور پر لڑکیوں کے بناؤ سنگھار، ناچ رنگ، ناز ونخرے،غرض کہ تمام چیزوں کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جو حسین لڑکیوں میں خصوصیت کے طور پر پائی جاتی ہیں۔مگر اس کے باوجود بھی اگر دیکھا جائے تو مصنف انہی سب باتوں میں کھو کر نہیں رہتا ہے بلکہ ان دلکش فضاؤں میں چکر کاٹتے ہوئے افسانہ نگار سماجی شعور کو بھی برقرار اور زندہ رکھتا ہے۔وہ مرقع کشی کرتا ہے لیکن وعظ خوانی اس کا شیوہ نہیں۔

موہن یاور کا افسانہ ''سیاہ تاج محل'' ان کا شاہکار افسانہ ہے اس کی کہانی ایک عادتی مجرم محمد متین کی زندگی کے چکر کے ساتھ گھومتی ہے اس افسانے میں کل تین کردار ہیں جن میں محمد متین، رقیہ اور اسلم خان ہیں۔اس میں پوری کہانی محمد متین کے اردگرد گھومتی ہے اس کا یہ کام ہے کہ جیل جانا، جیل سے باہر آنا اور پھر جیل جانا۔افسانہ نگار اس آواگمن پر غور کرتے ہوئے یہ عجیب نتیجہ نکالتا ہے کہ وارڈر اسلم خان اور قیدی محمد متین کا بہت ہی گہرا اور پرانا رشتہ ہے۔اسلم خان جب قیدی محمد متین کی داستان سنتا ہے تو اس کی باتوں سے اسلم خان وارڈر کو اس سے ہمدردی ہوجاتی ہے۔اس کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے۔

''وارڈر آج تم بہت جلدی گشت لگا آئے محمد متین خان نے پوچھا اسلم خان نے جواب دیا

گھبراہٹ ہو رہی تھی گشت لگائے بغیر ہی لوٹ آیا سوچا گشت تو ہوتا ہی رہتا ہے آج تم سے جی بھر کے باتیں کرلوں۔ قیدی نے کہا وارڈر باتیں رہ جائیں گی باقی سب کچھ مٹ جائے گا''۔(26)

افسانہ نگار اس افسانے میں قیدی اور وارڈر کا پرانا رشتہ بتاتا ہے جب قیدی نے جنم لیا تھا تب جیل تعمیر ہوئی اور جیل کے ساتھ ہی وارڈر بھی بندوق تھامے اپنی ڈیوٹی دینے آیا تھا۔ قیدی جو کہ چوری کرنے میں مہارت رکھتا تھا اس کے دل کے قلعے میں ایک دفعہ نقیب زنی ہوئی تھی اور یہ نقیب زنی ایک بہادر پٹھان کی نوجوان لڑکی نے کی چوری کرتے وقت پٹھان نے اپنے منہ کو نقاب سے ڈھانک کر اس کی کان پر پستول رکھ کر کہی الگ جگہ لے گئی تھی۔ بعد میں محمد متین کو معلوم ہوا کہ وہ ایک پٹھان رقیہ نام کی لڑکی تھی جو اپنے والد کا بدلہ لینے کے لیے چوری کا پیشہ اختیار کرتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ محبت کر بیٹھتے ہیں، مگر بدقسمتی سے یہ ان کی پہلی اور آخری رات بن جاتی ہے، کیونکہ اس کے بعد محمد متین کو جیل ہو جاتی ہے۔ اس رات وہ دونوں شادی کا بھی فیصلہ کر لیتے ہیں مگر یہ خواب ادھورا ہی رہ جاتا ہے۔ محمد متین کو ایک بار اس سے ملنے کی خواہش رہتی ہے مگر وہ کبھی نہ مل سکے اور جب ملے تو رقیہ دو سپاہیوں کے ساتھ لائی جارہی تھی۔ اور دوسری طرف محمد متین خان کو سپاہی دوسری جگہ لے جارہے تھے جب دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو اس کا منظر افسانہ نگار نے کچھ اس طرح کھینچا ہے کہ:

''وہ چلایا ''رقیہ''، ''میری رقیہ''، ''وارڈر یہی ہے وہ رقیہ' وارڈر حیران رہ گیا۔ رقیہ نے کہا ''خان تم باہر جارہے ہو ناب کے میری سزا بہت کم ہے صرف دو مہینے۔ میرا انتظار کرنا میں تم سے اسی جگہ آکر ملوگی'' خان نے سپاہیوں سے کہا'' وارڈر اب مجھے جلدی سے لے چلو میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو پوری ہوگئی ہے۔ مجھے مرنے کا کوئی افسوس نہیں''۔(27)

اس کہانی کے ڈرامائی موقف نے ساری کہانی میں جان ڈال دی ہے۔ سماج کے ایک ملعون طبقے میں بھی جذبات کی یہ رفعت نفسیات کا بڑا نازک شائبہ تھا جسے موہن یاور نے بڑی خوبی سے پیش کرنے کی کوشش کی۔

ریاست کے فکشن نگاروں میں شمار ہونے والے کشمیری لال ذاکر موہن یاور کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار موہن یاور کے ایک مجموعے کا تعارف لکھتے ہوئے ان کے ایک افسانے ڈگر دیس کے تیکھے پن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''مجاز میں لکھنوی بانکپن تھا، اور یاور میں ڈگر دیس کا تیکھا پن، یہ تیکھا پن یاور کی کہانیوں کی جان ہے''۔

اسی طرح سے موہن یاور کے فن کے بارے میں مزید لکھتے ہیں کہ:

''یاور کا فن کسی گیت کی گونجتی ہوئی لے ہے۔ جس میں سوز ہے، تڑپ ہے، نغمگی ہے لیکن نرماہٹ نہیں بلکہ آپریشن ٹیبل پر پڑے ہوئے کسی اوزار کی تیز دھار ہے جو ایک دم چیرتی ہوئی سی جسم میں گزر جاتی ہے''۔(28)

''توی اور جہلم" بھی ان کا ایک بہترین افسانوی مجموعہ ہے اس کے علاوہ ''وسکی کی بوتل'' بھی ان کا ایک اچھا افسانوی مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کا پیش لفظ ٹھا کر پونچھی نے لکھا ہے اور اس میں انھوں نے موہن یاور کو ''ایک عظیم سرکش باغی افسانہ نگار'' قرار دیا ہے۔ ٹھا کر پونچھی نے جموں کی سنگلاخ زمین اور کنڈی سے دلکش افسانے تخلیق کرنے میں موہن یاور کی ذہانت پر زور دیتے ہوئے رمزیہ انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کچھ یوں کیا ہے کہ:

''سعادت حسن منٹو کے علاوہ اگر کسی افسانہ نگار نے افسانہ نگاری بنجر پتھریلی دھرتی میں بیج بوئے، کھیتی کاٹی اور اس فصل کے بوٹے پر اپنی پیاسی سانسوں سے آبیاری کی ہے تو وہ موہن یاور ہے جو سراپا افسانہ نگار ہے''۔(29)

موہن یاور جموں کے فکشن نگاروں میں صفحہ اول کے ادیبوں میں شامل کیے جاتے ہیں یہی خوبیاں انھیں زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

''وسکی کی بوتل'' موہن یاور کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جو 1958ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ اس مجموعے میں کل بارہ افسانے شامل ہیں۔ موہن یاور کے افسانوں میں ایک نیا پن ہے۔ جس کی وجہ سے قارئین فوری طور پر موہن یاور کی تخلیقات کے دیوانے ہو جاتے ہیں۔ ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''سیاہ تاج محل'' کے عنوان سے 1961ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ اس پر انہیں کلچرل اکیڈمی سے انعام بھی ملا۔ اس مجموعے میں قابل ذکر افسانہ دائرہ، بانجھ، چند تصویر بتاں، موم اور پتھر، دل چارہ گر وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ ان تمام افسانوں میں اگر چہ کچھ خامیاں ضرور موجود ہیں لیکن باوجود ان کے یہ تمام افسانے موضوع اور مسائل اور جدید دور کے حوالے سے بہت ہی قابل ذکر ہیں۔ موہن یاور کا ذکر ریاست کے بڑے ترقی پسندوں میں بھی کیا جاتا ہے۔ موہن یاور کے افسانوں میں تازہ کاری کے ساتھ ساتھ انفرادیت

کا احساس بھی ملتا ہے۔جس کا ذکر ریاست جموں وکشمیر کے مشہور فکشن نگار کشمیری لال ذاکر نے بھی کیا ہے۔کشمیری لال ذاکر ''سیاہ تاج محل'' کے تعارفی سطور میں رقم طراز ہیں:

''مجاز میں لکھنوی بانکپن تھا اور یاور میں ڈگر دیس کا تیکھا پن۔ یہ تیکھا پن یاور کی کہانیوں کی جان ہے۔ یاور کا فن کسی گیت کی گونجتی ہوئی لے ہے جس میں سوز ہے تڑپ ہے نغمگی ہے۔ لیکن نرماہٹ نہیں۔ بلکہ آپریشن ٹیبل پر پڑے ہوئے کسی اوزار کی تیز دھار ہے جو ایک دم چیرتی ہوئی سی جسم میں گزر جاتی ہے۔''(30)

موہن یاور کا ایک اور افسانوی مجموعہ ''تیسری آنکھ'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ان افسانوں میں زندگی اپنی تمام تر پیچیدگیوں ،محرومیوں اور تمناؤں کے ساتھ سامنے آتی دکھائی دیتی ہے۔موہن یاور کے افسانوں میں جہاں دیہاتی زندگی کی عکاسی ملتی ہے تو وہیں انہوں نے اپنی تحریروں میں شہر میں بسنے والے غریب طبقے کے لوگوں کو بھی اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔شعور کی تہذیب اور نفسیاتی تفسیر موہن یاور کے فن میں ایک پختگی پیدا کرتی ہے جس سے ان کی تعظیم ایک منجھے ہوئے ادیب وفنکار کی سی بن جاتی ہے۔ بقول برج پریمی موہن یاور کہانی کے فن پر قادر ہیں، وہ منٹو ہیں۔وہ منٹو اور بیدی کی طرح الفاظ کے کم از کم استعمال سے تاثر کی وحدت قائم کرتے ہیں۔موہن یاور کے ہم عصر فکشن نگاروں میں پریم ناتھ پردیسی، پریم ناتھ در اور رامانند ساگر وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔موہن یاور ناول اور افسانہ کے علاوہ ڈرامہ اور صحافت میں بھی کافی مہارت رکھتے تھے۔ان کے اکثر ڈرامے ریڈیو کشمیر جموں سے نشر کئے جاتے تھے۔نور شاہ اپنی کتاب میں موہن یاور کے بارے میں لکھتے ہیں:

''پریم ناتھ پردیسی، پریم ناتھ در اور رامانند ساگر کی طرح موہن یاور نے بھی اپنے ادبی سفر کا آغاز تقسیم ملک سے پہلے کیا لیکن وہ تقسیم کے بعد ہی باقاعدگی کے ساتھ افسانے قلم بند کرنے لگے اور زندگی کی آخری سانس تک ان کے افسانے مختلف ادبی اور فلمی رسائل میں شائع ہوتے رہے۔افسانوں کے علاوہ انہوں نے بہت سے ڈرامے بھی لکھے تھے جن میں اکثر ریڈیو کشمیر جموں سے نشر ہوئے۔ وہ اکثر اپنے ہی افسانوں کو ریڈیائی روپ دیتے تھے۔ افسانوں کے علاوہ وہ صحافت میں بھی کافی دلچسپی رکھتے تھے بلکہ صحافت ہی ان کے روزگار کا ایک وسیلہ تھا۔''(31)

''پتھروں کا شہر'' موہن یاور کا ایک قابل ذکر ناول ہے۔اس میں انہوں نے اپنے وطن کی عکاسی کی ہے اور یہ ناول فنی اور تکنیکی اعتبار سے بہت اچھا ہے۔ زبان و بیان اور منظر نگاری کے حوالے سے مصنف نے اس ناول میں مہارت دکھائی ہے۔اس کے علاوہ موہن یاور نے ''جہلم اور توی'' کے عنوان سے ایک افسانوی مجموعہ ترتیب دیا تھا۔اس مجموعے کو کافی سراہا گیا ہے۔اس میں مصنف نے ریاست کے تمام کہانی کاروں کی کہانیوں کو پیش کیا تھا۔ریاست جموں وکشمیر میں شائع ہونے والی یہ کتاب اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ''جہلم اور توی'' موہن یاور کی ایک قابل قدر تخلیقی کوشش تھی۔اس کے علاوہ ''دو کنارے'' بھی موہن یاور کی ایک اچھا تخلیقی کارنامہ ہے۔جان محمد آزاد صاحب موہن یاور کی ادبی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ملاحظہ ہو اقتباس:

> ''جموں کے باغی افسانہ نگار نے اب نیا روپ دھارن کیا تھا لیکن یہاں بھی انگلیاں وقت کے نبض پر تھیں۔ یہاں جموں کی سنگلاخ سرزمین کے پس منظر میں بدلتی زندگی یکا بے لاگ تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ماہ نامہ سنگم جموں کے ساتھ آپ ''موہن یاور'' برسوں وابستہ رہے۔ یہ آپ کی مساعی جمیلہ کا اعجاز تھا کہ اس ماہ نامہ نے قلیل وقت میں بے پناہ مقبولیت حاصل کی اور یہ برصغیر کی مقتدر قلم کاروں کا ترجمان بنا رہا۔روز نامہ سندیس اور روز نامہ رفتار بھی موہن یاور کی ادبی صحافت کے غماز ہیں۔'' (32)

موہن یاور کی مشہور کہانیوں میں ایک کہانی ''سوسال پرانا'' کے عنوان سے ہے۔ یہ کہانی جموں کی قدیم مناظر پر مبنی ہے جب شہر جموں کو پتھروں کا شہر کہا جاتا تھا۔اور دیوتاوؤں کی سنگری سے پہچانا جاتا تھا۔اس کہانی کے مرکزی کردار چرن سنگھ مہاراج اور ٹھاکر قابل ذکر ہیں۔

موہن یاور کی اس کہانی کا پس منظر قدیم جموں کے تاریخی مناظر کو ابھار کر سامنے لاتا ہے۔اس کہانی میں موہن یاور نے بیان کیا ہے کہ ایک روز اسی شہر (جموں) میں جاگیردار کی بہو، کو کوئی اٹھا کر لے گیا۔ چرن سنگھ کو جب اس بات کی خبر ہوئی تو وہ بہو اور اغوا کار کی تلاش میں دن رات ایک کر دیتا ہے۔

چرن سنگھ اس کہانی میں اچھا کردار پیش کیا گیا ہے۔ وہ اغوا کار کو گولی مار کر جاگیردار کی بہو کو بے عزت ہونے سے بچا لیتا ہے اور اس کے بعد وہ اغوا کار کی لاش کو اور جاگیردار کی بہو کو ساتھ لے کر حویلی پہنچتا ہے جہاں اس کی بہت حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔اصل میں اغوا کار چرن سنگھ کا ہی بیٹا ہوتا ہے مگر اسے اس بات کی خبر نہیں تھی۔ جب اسے معلوم

ہوتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ اپرادھی تو اپرادھی ہی ہوتا ہے چاہے وہ بیٹیا ہی کیوں نہ ہو۔ ملاحظہ ہو اس افسانے کا ایک اقتباس:

> ''چرن سنگھ: ٹھاکر صاحب اپنی بہو کو سنبھال لئے۔۔۔اور آپ کا اپرادھی بھی حاضر ہے۔ بہو کو گلے لگانے کے بعد جاگیردار لاش کے چہرے پر پڑے نقاب اٹھالیتا ہے۔ٹھاکر (حیران ہوکر): ارے چرن سنگھ تم نے اپنی گولی سے اپنے ہی بیٹے کو مار ڈالا۔ چرن سنگھ، ٹھاکر صاحب اپرادھی تو اپرادھی ہے چاہے وہ اپنا ہی بیٹا کیوں نہ ہو۔''(33)

اس کہانی میں اہم موڑ تب آتا ہے جب چرن سنگھ اپنے پوتے مہاراج سنگھ کے ساتھ باتیں کرتا ہے اور مہاراج چرن سنگھ سے کہتا ہے کہ بابا یگ بدل گیا ہے اور دیش بھی بدل گیا ہے مگر آپ نہیں بدلے آپ کو کیا پریشانی ہے۔ مگر اس وقت چرن سنگھ اپنے بیٹے کی موت پر سوچ رہا ہوتا ہے اور اب چرن سنگھ کی عمر سو سال ہو چکی تھی۔

نرسنگھ داس نرگس:

نرسنگھ داس نرگس کی تحریروں میں اکثر و بیشتر جگہ پر دیہاتی اور پہاڑی علاقوں کے غریب عوام کے استحصال کو دیکھا جاسکتا ہے۔اس حوالے سے ان کے افسانوی مجموعے''دکھیا دیس''، ''سندیہ'' اور ''پردیسی پریتم'' وغیرہ کو مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ان تمام کہانیوں کا موضوع ''ڈوگرہ کلچر'' کی نشاندہی کرتا ہے۔ان سب کہانیوں کو نرسنگھ داس کے اپنے قلمی نام ممولا رام کوٹی کے نام سے ہفتہ وار اخبار ''چاند'' میں شائع کیا تھا۔اس کے بعد ان تمام کہانیوں کو کتابی شکل میں تبدیل کیا گیا۔نرگس نے افسانوں نے بہت مقبولیت حاصل کی تھی۔اس کے علاوہ ان کی شخصیت کو خطہ جموں میں ناول نگاری کے حوالے سے بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔انھوں نے جانکی، نرملا اور پاربتی جیسے ناول لکھ کر اپنے گرد کے ماحول کو عوام تک پہنچانے کی کوشش کی۔ان کی تقریباً تخلیقات چاہے وہ افسانے ہوں یا ناول ان تمام میں زیادہ تر ڈوگرہ، رسم و رواج، ان کے رہن سہن، کلچر اور دیہاتی و شہری زندگی کے نادر نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔انھوں نے ناول میں بھی اپنا دوسرا قلمی نام ''پریم منوہر'' اختیار کیا تھا۔اس نام سے انھوں نے اخبار ''چاند'' میں اپنے ناولوں کو شائع کیا تھا۔

اقبال نرگس:

اقبال نرگس جموں کے مشہور صحافی، ڈراما نگار، فکشن نگار دیوان نرسنگھ داس نرگس کے بیٹے تھے۔اقبال نرگس کی پیدائش 31؍دسمبر 1936ء کو گوندال ہوشیار پور میں ہوئی۔ابتدائی تعلیم انھوں نے گوندال سے ہی حاصل کی اور میٹرک کا امتحان ہوشیار پور سے پاس کیا۔ معاشی حالات اچھے تھے اور والد صاحب کی جائداد سے وہ عیش و آرام کی زندگی

گزارتے تھے مگر پھر بھی نرسنگھ داس نرگس انھیں علمی وادبی کاموں میں لگائے رکھتے تھے تاکہ ان کی خود کی ایک الگ پہچان بنے۔

1947ء کے بعد اقبال نرگس نے اپنے والد صاحب کے اسرار پر ایک پریس کا انعقاد کیا جس میں وہ اپنے علمی و ادبی کارنامے انجام دینے کی کوشش کرنے لگے۔ اس کام میں نرگس داس نے بھی ایک باپ کے فرائض کو انجام دیتے ہوئے اقبال نرگس کی مدد کی۔ یہیں سے اقبال نرگس کو کہانیاں لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اور چونکہ ان کے والد ایک اچھے مصنف تھے اس لیے کسی اور کی شاگردی کی ضرورت محسوس نہ ہوئی اور آگے چل کر اقبال نرگس ایک اچھے افسانہ نگار کہلانے لگے۔ انھوں نے اپنے بہت سے افسانے ریاست اور دیگر ریاستوں کے اخبارات ورسائل میں شائع کروائے تھے اور ان کے افسانے خاص طور پر لاہور سے ''نرنگِ خیال''، ''ادبی دنیا'' اور ''ادب لطیف'' سے شائع ہوئے تھے۔ ان کے والد کی بیک وقت وفات نے انہیں بہت کمزور کر دیا۔ 1973ء میں نرسنگھ داس کی وفات کے بعد وہ پریس کے صدر بن گئے اور اخبار ''چاند'' بھی انہیں کی زیرِ نگرانی میں شائع ہوتا رہا۔ والد کی وفات کے بعد انھوں نے اپنے کام کے ساتھ والد کے کام کو بھی آگے بڑھایا۔

اقبال نرگس نے چند افسانے تحریر کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا خاص کارنامہ انجام نہیں دیا۔ اور نہ ہی انھوں نے اپنے افسانوں کو کتابی شکل میں شائع کرانے کی کوشش کی تھی۔ محققین ومورخین نے بھی ان کی کسی تصنیف کا ذکر نہیں کیا ہے تاہم پروفیسر ظہور الدین نے اپنی کتاب میں ایک جگہ لکھا ہے:

> "He (Iqbal Nargis) has not published any literary work so far. The present writer has read a few of his short-stories which are quite impressive. He gives a befitting rendering to his subjects which are mostly progressive".(34)

کشوری منچندہ:

کشوری منچندہ جموں صوبہ کے پرتاپ گڑھ کے رہنے والے تھے۔ ان کی پیدائش 2/مارچ 1929ء کو جموں ہی میں ہوئی تھی۔ ان کا اصل نام کشوری لال تھا۔ افسانہ نگاری کا شوق کشوری منچندہ کو بچپن سے ہی ہو گیا تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔ اس سے پہلے وہ شاعری بھی کیا کرتے تھے۔ مگر اس

میدان میں انھیں خاص مقام حاصل نہ ہوسکا۔اس لیے شاعری کا سلسلہ زیادہ دیر نہ چل سکا۔ان کے ابتدائی دور کے افسانے مختلف اخبارات ورسائل جیسے''فلم آرٹ'' دہلی''سویرا''اور''تیج'' وغیرہ میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے تھے۔ اس دور کے نوجوان افسانہ نگاروں میں کشوری منچندہ کا شمار بھی اچھے قلمکاروں میں کیا جاتا تھا۔جموں کے افسانہ نگاروں کی تخلیقات کے منتخب مجموعے''حوا کی بیٹیاں''میں کشوری منچندہ کا افسانہ''ساحرہ''اوراسی طرح سے بزم فروغ اردو کے منتخب مجموعے''منتخب ادب''میں ان کا افسانہ''سپاہی'' شائع ہوئے۔اس کے علاوہ کلچرل اکیڈمی کے رسالوں میں بھی ان کے افسانے منظر عام پرآتے رہتے تھے۔

کشوری منچندہ کا شمار جموں خطے کے اردو فکشن نگاروں اور خاص طور پر اردو افسانہ نگاروں میں کیا جاتا ہے ان کے افسانوں کے پانچ مجموعے منظر عام پرآ چکے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔

1. اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا1967ء
2. ہرے پودے بنجر زمین1968ء
3. سڑک انصاف کرتی ہے1971ء
4. احساس کے گھاؤ1978ء
5. شکست آرزو1980وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

کشوری منچندہ کا پہلا افسانوی مجموعہ''اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا'' کے عنوان سے 1967ء میں منظر عام پرآیا۔جو چھ افسانوں پر مشتمل ہے۔اس مجموعے کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے اگر چہ ان کے افسانے فنی اعتبار سے کمزور ضرور ہیں مگر پھر بھی یہ تمام افسانے قابل ذکر ہیں۔کشوری منچندہ کو ہر وقت نئے نئے موضوعات کی تلاش رہتی ہے۔

''تکون کا کرب''ان کا ایک اور افسانوی مجموعہ ہے۔یہ مجموعہ چھ افسانوں پر مشتمل ہے جو ریاستی کلچرل اکیڈمی کی جانب سے 1982ء میں منظر عام پرآیا تھا۔اس مجموعے کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس مجموعے کو افسانوی فن کے کسی نئے دور کی تمہید نہیں کہا جا سکتا ہے۔اس مجموعے میں بہت سی خامیاں بھی موجود ہیں جس کے وجہ سے یہ مجموعہ دیگر ادیبوں کی تنقید کا نشانہ بنا تھا۔وہ اپنی الگ تکنیک سے افسانے تخلیق کرتے تھے بعض لوگوں کو ان کی اس تکنیک کی روایت پرستی پر اعتراضات بھی تھے مگر بعض ایسے بھی تھے جو ان کے افسانہ نگاری کو اہمیت کا حامل سمجھتے تھے۔ان کی ایک خوبی یہ بھی دیکھنے

کو ملتی ہے کہ انھوں نے ایک ہی انسان کی ذہنی کیفیتوں کی بھر پور عکاسی کی ہے۔جس میں وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ انھوں نے ایک ایسا ماحول تیار کیا تھا جس سے انسان کی ذہنی حالتوں کا نقشہ کھینچا جا سکے۔ان کے افسانوں کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ زندگی بہت مشکل کن اور دردانگیز ہے۔ان کے افسانوں کے کرداروں نے ان کی ادبی خدمات میں بہت اضافہ کیا جس سے انھیں بڑے افسانہ نگاروں میں شمار کیا جانے لگا۔

ان افسانوں کے کردار میں چاہے وہ بھوک کا اسکول ماسٹر ہو، اور بھی غم ہیں زمانے میں کی ''رجنی'' ہو ''تکون کا کرب'' کا ''کیول'' ہو جسے زندگی کے ہر موڑ پر لوٹ کھسوٹ کا شکار بنایا جاتا ہے۔ جو ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔''پتھر کا آدمی'' کا نرشیں ورما ہو، جس کو مصنف نے پتھر دل افسانوں کی بے التفاتیوں سے تنگ آ کر پتھروں کی آغوش میں پناہ لینے پر مجبور کیا ہے، یا پھر اس کے علاوہ مصنف کے افسانے ''پھر وہی بات'' کا راجن ہو غرض ان تمام افسانوں کے مرکزی کرداروں میں ہر ایک کردار کی نفسیاتی گرہیں اور مصنف نے انھیں نہایت مخصوص انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جس کی وجہ سے قارئین ان کے افسانے مزے لے لے کر پڑھتے ہیں۔کشوری منچندہ کے ہر ایک افسانے میں ایک کمزور انسان کی الجھنیں دیکھی جا سکتی ہیں، اور زندگی کا بخشا ہوا بے پناہ درد ہر وقت چھایا رہتا ہے۔ کشوری منچندہ کی کہانیاں معنوی تقاضوں کے میزان و معیار پر جدید ذہن سے بہت حد تک مطابقت نہیں رکھتیں، لیکن ان کی سلاست اور انفرادیت سے ان کی تحریروں میں جان آجاتی ہے۔کشوری منچندہ کی افسانہ نگاری کے بارے میں مالک رام آنند رقمطراز ہیں:

> ''ریاست میں اردو کہانی کو پروان چڑھانے میں کشوری منچندہ کا نام بڑے طمطراق سے لیا جا سکتا ہے۔منچندہ کی کہانیاں انسان کے باطنی دکھ درد کی کہانیاں ہوتی ہیں۔جن کے اندر شعور کی تیز رو، جذبات کی دلآویزی اور فنی چابک دستی کا کمال بخوبی دیکھا جا سکتا ہے''۔(35)

''بھوک'' افسانے میں انھوں نے ایک اسکول ماسٹر کی کہانی کو پیش کیا ہے۔اسکول ماسٹر جو کہ ایک اچھا افسانہ نگار بھی ہے۔ایک بس میں سفر کرتے ہوئے وہ بھوک کی شدت میں مجبور ہو کر ایک جگہ گلاب کی پتیاں چباتا جاتا ہے۔ اس کے بعد کے واقعات غیر متوقع ہیں۔''مجموعے'' کا نام جس افسانے پر رکھا گیا ہے۔اس کہانی کو کشوری منچندہ نے بڑے بہترین انداز میں بیان کیا ہے۔اس کہانی میں چند دوست لڑکے اور لڑکیوں کے ایک بار پک نک منانے کے لیے

جانے کا واقعہ ہے۔اس افسانے میں مرکزی کردار رجنی اور رمیش ہیں۔ سیر وتفریح کے دوران رجنی ایک جگہ ندی میں گر جاتی ہے، اور رمیش اسے نکالتا ہے یہیں سے ان دونوں میں دوستی ہو جاتی ہے اور یہی دوستی دونوں میں باہمی محبت کے آغاز کا سبب بن جاتی ہے۔لیکن رجنی کا باپ جو کہ سخت مزاج ہے۔اپنی بیٹی کا بیاہ کسی دوسری جگہ ایک مالدار نوجوان رندھیر سے طے کرتا ہے اور رجنی کو مفلوک الحال رمیش سے شادی کرنے کے اونچ نیچ سمجھتا ہے۔اس افسانے میں اس وقت ایک اہم موڑ آتا ہے جب رجنی کو بہلا پھسلا کر اس کے گھر والے اس کی دولت مند لڑکے سے شادی کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں اور رجنی بے بس ہو کر راضی ہو جاتی ہے۔

کشوری منچندہ کے افسانوں کا اگر گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو ان کے افسانوں میں مختلف موضوعات دیکھے جاسکتے ہیں اور خاص طور پر انھوں نے اپنے افسانوں کے موضوعات میں پیار محبت، غریبی، بھوک، افلاس، سماجی نابرابری، چھوت چھات، وغیرہ کو پیش کیا ہے۔ پروفیسر ظہور الدین اپنی کتاب میں ایک جگہ کشوری منچندہ کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ:

> "His composition deals with a variety of subjects like love beauty, poverty, social injustice and corruption but his style and direction are both unimpressive. Short-story is an art which requires the mind of a poet and the hands of a sculptor. Kishori Manchanda lacks both. Even the best of his short stories are week and puerile. From this observation, however, one should not draw the meaning that Kishori Manchanda is not gifted to be a good artist Art is not a gift it is a reward, which is earned by dint of hard labour and persevere. Kishori Manchanda has no doubt a proliferous imagination but he has to chisel it into a perfect expression through undaunted and in case sent efforts".(36)

کشوری منچندہ نہ صرف اردو فکشن میں اپنے کارنامے انجام دیتے رہے بلکہ اچھے شاعر بھی تھے۔ غزلوں، نظموں، رباعیات وغیرہ کافی ذخیرہ ان کے پاس موجود تھا جو انھوں نے وقتاً فوقتاً مختلف اخبارات و رسائل سے شائع کروایا تھا۔

او، پی شرما:

اردو ادب میں روشن راہی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ان کے والد کا نام منسارام شرما تھا۔ او پی شرما کی ولادت 4/اپریل 1932ء کو جموں میں ہوئی وہ جموں کے نوجوان فکشن نگار اور خاص افسانہ نگاروں میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ مصوری میں بھی ریاست کے فنکاروں میں اپنی ایک بلند حیثیت رکھتے تھے۔ او۔ پی۔ شرما نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز تقریباً 1960ء کے بعد اردو فکشن نگاری سے کیا۔ وہ اردو ادب کے ساتھ ساتھ ڈوگری اور ہندی زبان میں بھی مہارت رکھتے تھے ان کا پہلا افسانوی مجموعہ دیوناگری اسکرپٹ میں ''عمریں'' کے عنوان سے ریاست کلچرل اکیڈمی کی جانب سے 1965ء میں منظر عام پر آیا۔ یہ مجموعہ تقریباً تیرہ (13) افسانوں پر مشتمل ہے۔

کہانی ''عمریں'' جس کو او۔ پی۔ شرما نے مجموعے کے عنوان کے لیے منتخب کیا ہے۔ غالباً ان کی نمائندہ کہانی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ مجموعے بلند درجہ رکھتا ہے۔ یہ کہانی زندگی کے المیہ پر ایک ایمائی طنز ہے۔ راقم ان کے اس مجموعے میں سب سے زیادہ افسانہ ''رمتا جوگی'' سے متاثر ہوا۔ جو ایک فوجی کی کہانی ہے۔ اس مجموعے میں یہ کہانی تمام افسانوں سے منفرد مقام رکھتی ہے۔ اس میں ایک فوجی کو مصنف نے مرکزی کردار کے طور پر پیش کیا ہے۔ فوجی اپنی مرحوم بیوی کی تصویر بنوانے کے مقصد سے اپنے مصور دوست کے پاس جاتا ہے۔ لیکن دوست سے ملے ہوئے اسے کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے دوست کے پاس پہنچ کر اسے پہچاننے سے محروم رہتا ہے۔ اسی دوران وہ مصور کو اپنی بیتی ہوئی فوجی زندگی کا حال سناتا ہے۔ او۔ پی۔ شرما کے اس افسانے میں منظر کشی اور جذبات نگاری عمدہ طریقے سے پیش کی گئی ہے۔ فوجی جب مصور کو اپنی زندگی کا حال سناتا ہے تو ایک اجنبی کی طرح سناتا ہے ملاحظہ ہو ایک اقتباس:

> ''ہاں صاحب، اٹھارہ سال اوپر، لیکن یہ آرمی کی نوکری بھی بڑی عجیب ہے، مزے تو بہت ہیں، لیکن بندشیں بھی ہیں۔ دیکھئے نا (حوالدار نے بیڑی دانت میں دباتے ہوئے کہا) چالیس دن کی چھٹی پر گھر گیا تھا، بائیس دن میں ہی واپس بلالیا، یونٹ والوں نے تار بھیج کر۔ دستور میں رہنا پڑتا ہے، ہمیشہ آدھی رات میں بگل بج جائے تو لوہے کی دیوار کی طرح،

فال ان ہو جائیں گے سبھی''۔(37)

اوپی شرما کی ابتدائی کہانیاں ریاست کے مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوتی رہی۔انھیں چتر کاری کے میدان میں خاص مہارت تھی جس کی مثالیں ان کی تخلیقات میں دیکھی جاسکتی ہیں۔شروع میں ان کی کہانیوں میں فنی اعتبار سے کئی خامیاں دیکھنے کو ملتی تھیں۔مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے آپ کو تنگ دائرے سے نکل کر آزاد خیال اور مختلف موضوعات پر کہانیاں لکھنے میں ماہر ہوگئے۔جس کی وجہ سے ان کی کہانیوں میں نیا نکھار پیدا ہوا۔1980ء کے بعد ان کی جتنی بھی کہانیاں منظر عام پر آئیں وہ سب قابل ذکر ہیں۔1980ء کے بعد ان کی تخلیقی سرگرمیاں نئے رنگ دکھانے لگیں اور ان کی ہر کہانی تکنیکی اور فنی اعتبار سے اور خامیوں سے آزاد ہونے لگیں۔یعنی 1980ء کے بعد اوپی شرما ریاست کے بڑے تخلیق کاروں میں شمار کیے جانے لگے۔بقول جان محمد آزاد:

''آپ کی ابتدائی فنی کاوشوں کا محور عموماً آپ کے فطری رجحان کی غمازی کرتا تھا۔ایک چتر کار کی محسوسات آپ کا محبوب موضوع ہوتی تھیں۔............چنانچہ 1980ء کے بعد آپ کی تخلیقی سرگرمیاں نئے آفاق کو چھونے لگیں گو آپ کا فن مجموعی حیثیت سے ارتقائی مراحل میں ہی رہا تاہم آپ کی بعض کہانیاں اس بات کا عندیہ دیتی ہیں کہ ایک کہنہ مشق کہانی کار کا ہاتھ وقت کی نبض پر ہے''۔(38)

او۔پی۔شرما نے نہ صرف اردو فکشن میں شہرت حاصل کی بلکہ اس کے علاوہ بھی دیگر اصناف میں چھائے رہے۔انھوں نے بیس سے زائد ریڈیو ڈرامے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔کلچرل اکیڈمی کی جانب سے انھیں ڈوگری افسانوی مجموعے پر 1979ء میں ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔اس کے علاوہ ہندی زبان میں بھی انہیں ریاستی کلچرل اکیڈمی کی طرف سے انعامات سے نوازا گیا۔ان کے اکثر افسانوں کے موضوعات ان کے آس پاس کے ماحول اور ذاتی زندگی پر مبنی ہیں۔ان کے افسانوں میں زیادہ تر روزمرہ کی زندگی کی باگ ڈور کو دیکھا جاسکتا ہے۔

مالک رام آنند:

ان کی پیدائش 5رمئی 1939ء کو سحرا ضلع پونچھ آزاد جموں وکشمیر پاکستان میں ہوئی۔انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم پونچھ پاکستان میں ہی حاصل کی تھی مگر اس کے بعد وہ جموں میں منتقل ہوگئے تھے۔ملک تقسیم کے بعد انھیں جموں میں ملازمت مل گئی جہاں انھوں نے اپنی پوری زندگی اردو ادب کی خدمات میں صرف کی۔مالک رام آنند نے اپنی

ابتدائی زندگی کا سفر شاعری سے کیا تھا۔ مگر یہ سفر زیادہ دیر نہ چل سکا اور جلد ہی شاعری سے اردو فکشن کی طرف متوجہ ہوئے اور صوبہ جموں کے ایک اچھے فکشن نگار کہلانے لگے۔ بزم فروغ اردو کے حوالے سے بھی ان کا اہم نام ہے۔ وہ بزم فروغ اردو کے اہم رکن رہ چکے تھے۔ جموں کے ادیبوں میں ادبی خدمات کو بلند درجہ حاصل کرانے میں ان کا نمایاں رول رہا ہے۔

مالک رام آنند کو زمانہ طالب علمی سے ہی شعروادب سے کافی لگاؤ ہو گیا تھا اور ترقی پسند تحریک سے وہ بے حد متاثر تھے۔ ابتداء میں انھوں نے کافی گیت وغیرہ بھی لکھے تھے۔ اسی طرح سے نظموں میں طبع آزمائی کی تھی ان کی نظموں کا ایک مجموعہ ''خرام انقلاب'' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ مالک رام آنند 1955ء تک شاعری میں زور آزمائی کرتے رہے مگر جب جموں میں انھیں کئی دیگر فکشن نگاروں سے ملاقات ہوئی تو انھیں بھی اس میدان میں دلچسپی ہوئی اور خاص طور پر یہ دور پورے ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کا دور تھا، مالک رام آنند بھی بہت متاثر ہوئے۔ 1955ء کے بعد وہ افسانہ نگاری اور ناول نگاری کی طرف راغب ہوئے۔ اس سے پہلے بھی پچھلے دس بارہ برسوں میں کبھی کبھی ان کے اکا دکا افسانے اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتے رہے تھے مگر باضابطہ طور پر وہ 1955ء کے بعد ہی اردو فکشن کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کے افسانوں کے چار مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں جن میں ''پیار اور ترازو''، ''عشق ہو گیا ہے''، ''عشق میں پھول نہیں'' اور جانے وہ کیسے لوگ تھے'' قابل ذکر ہیں۔ اس آخری مجموعہ ''جانے وہ کیسے لوگ تھے'' میں پانچ افسانے شامل ہیں جن میں ''تیرگی کی صلیب دو'' دھرتی کے داغ''، ''سرخ برف زرد دینے''، ''آندھیاں'' اور جانے وہ کیسے لوگ تھے'' اہمیت کے حامل ہیں۔

مالک رام آنند کو جموں خطے میں ناول نگار کی حیثیت سے بھی جانا جاتا ہے۔ اگرچہ انھوں نے کئی اچھے ناول بھی لکھے تھے مگر بنیادی طور پر وہ ایک افسانہ نگار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ افسانہ نگاری میں راقم کی نظر میں سب سے اہم ان کے دو افسانوی مجموعے ہیں جن میں ''شہر کی خشبو'' اور ''تصویر کے پھول'' قابل ذکر ہیں۔ ان افسانوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ افسانے رومانیت اور حقیقت نگاری میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ مالک رام نے اپنے افسانوں میں زیادہ تر متوسط طبقے کے لوگوں کو اپنا موضوع بنایا ہے اور دیہاتی زندگی کی بھرپور عکاسی ان کی تخلیقات میں ملتی ہے۔ اس کے ساتھ ان کی تحریروں میں اکثر جگہ انسان دوستی کی مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ بقول ڈاکٹر مشتاق احمد وانی:

''مالک رام آنند بنیادی طور پر پونچھ کے رہنے والے تھے لیکن بعد میں جموں منتقل ہوئے اور

اپنی زندگی کا بیشتر زمانہ جموں ہی میں گزارا۔ اردو ادب میں ان کی حیثیت ناول نگار، افسانہ نگار اور شاعر کی رہی ہے۔............ان کے افسانوں میں رومانیت اور حقیقت نگاری کا عنصر موجود ہے، ....ان کے افسانوں میں انسان دوستی اور اخلاقی اقدار کا ذکر ملتا ہے ''۔(39)

ان کا آخری افسانہ ''بزم فروغ اردو جموں'' کے مجموعے ''منتخب ادب'' میں بھی شائع ہوا تھا۔ اس افسانے کو منظر عام پر آنے کے بعد بہت پسند کیا گیا تھا۔ ''تیرگی کو صلیب دو'' بھی ان کا قابل ذکر افسانہ ہے اس میں انھوں نے ایک جانباز شیدائے وطن سپائی افتخار جو ہر وقت اپنے وطن کے لیے قربان ہونے کے لیے تیار رہتا ہے۔ مصنف نے اسی کی کہانی کو اس افسانے میں پیش کیا ہے۔ ایک بار افتخار گولیوں کی بوچھار میں بچ کر اپنے ہیلی کپٹر میں میدان جنگ کے زخمیوں کو ہمت دلانے میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے، مگر خود گولیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس افسانے میں مصنف نے افتخار کو ایک جوش اور مادر وطن سے محبت کرنے والے سپاہی کی طرح پیش کیا ہے وہ میدان جنگ میں خود کو موت کے منہ میں ڈال کر زخمی سپاہیوں کو ایک جگہ پر لے آتا ہے۔ مگر خود گولیوں کے زخموں سے جان بر نہیں ہو سکا۔

مالک رام آنند کی تخلیقات میں اگر ہم فن اور ہیئت کی بات کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اسلوب بیان کافی جاذب توجہ ہے اور ان کی اردو ادب کی خدمات کا جذبہ قابل تحسین ہے۔ چنانچہ ان نامساعد حالات کے باوجود جن کی طرف انھوں نے اشارہ کیا ہے۔ ان کی مستقل مزاجی تقلید کے قابل ہے اور جموں کے اردو فکشن کی تاریخ میں بڑے قلمکاروں میں مالک رام آنند کا نام بھی قابل ذکر ہے۔

شہباز راجوروی:

کا پورا نام غلام نبی شہباز راجوروی تھا۔ شہباز کی ولادت فروری 1940ء کو راجوری میں ہوئی تھی۔ شہباز راجوروی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا تھا۔ انھوں نے جتنے بھی افسانے تحریر کیے ان میں آج کوئی افسانہ دستیاب نہیں ہے۔ افسانہ نگاری کے میدان میں انھیں زیادہ شہرت حاصل نہ ہوئی اور خود بھی ان کی دلچسپی افسانے سے زیادہ شاعری میں ہونے لگی۔ اسی لیے افسانہ نگاری سے جلد ہی شاعری کی طرف راغب ہو گئے ۔ 1965ء تک شہباز راجوروی افسانہ نگاری میں طبع آزمائی کرتے رہے اور اس کے بعد وہ شاعری میں مصروف ہو گئے۔ شاعری کے حوالے سے ان کی کئی نظمیں، غزلیں، رباعیات اور قطعات جموں کے محافظ خانہ سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ انھیں اردو زبان کے

ساتھ ساتھ ڈوگری، گوجری، کشمیری اور ہندی زبانوں میں مہارت تھی۔

بہار راجوروی:

ان کا پورا نام عبدالسلام بہار تھا۔ ان کی پیدائش جموں صوبہ کے تحصیل مینڈر گاؤں پشانہ میں 1940ء کو ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنی میٹرک کی تعلیم ہائی اسکول نوا کدل سرینگر سے حاصل کی تھی۔ اس سے مزید تعلیم حاصل نہ کر سکے تھے۔ اسی دوران وہ ملازمت کی تلاش میں نکل پڑے اور جلد ہی انھیں محکمہ تعلیم میں ٹیچر کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔ 1959ء کے بعد وہ اپنے ہی ضلع راجوری میں محکمہ تعلیم میں اپنے کام کو انجام دیتے رہے۔ بہار راجوروی نے نجی طور پر 1968ء میں ایم اے اردو میں کی اور 1972ء میں ایم اے پولیٹکل سائنس کا امتحان پاس کیا۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا تھا ۱۹۶۲ء ان کا پہلا افسانہ ''عالمِ خواب'' سے منظر عام پر آیا۔ صوبہ جموں میں بہار راجوروی کو افسانہ انگار کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے کئی افسانے تحریر کیے جو زیادہ تر سماج کی ان کی کہانیوں میں مظلوم اور بے بس لوگوں کے دکھ درد اور غریب طبقہ کی عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہار راجوروی نے پریم چند کا اثر قبول کیا ہے۔ جس سے وہ اپنے سماج کی عکاسی کر کے اور اپنے گرد و پیش کے ماحول کو عوام کی نظر کرنا چاہتے تھے تا کہ سماجی برائیوں اور غربت وغیرہ کو جڑ سے اکھاڑا جا سکے۔ یہی سب چیزیں بہار راجوروی کے افسانوں میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

اقبال نازش:

اقبال نازش کا شمار 1947ء سے قبل کے لکھنے والے قلمکاروں میں ہوتا ہے۔ وہ بیک وقت افسانہ نگار اور شاعر تھے۔ انھوں نے صوبہ جموں کے تھانہ منڈی کے علاقے میں اردو زبان وادب کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اس علاقے میں اردو ادب کو فروغ دینے اور نئی نسل کے شعراء و ادبا کی رہنمائی کے لیے ایک مجلس ''مجلسِ ادب'' تھنہ منڈی کے عنوان سے قائم کی گئی جس میں اقبال نازش نے بہت ہی اہم کام انجام دیا۔ ان کی شاعری اور افسانے وقتاً فوقتاً ریاست اور دیگر ریاستوں کے اخبارات اور رسائل سے منظر عام پر آتے رہے تھے۔ تھنہ منڈی میں اقبال نازش نے ''مجلسِ ادب'' کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ ایک میگزین ''دھنک'' کا بھی اجرا کیا تھا جس کے ایڈیٹر وہ خود تھے۔ یہ میگزین کافی عرصہ تک صوبہ جموں کے علاقہ تھنہ منڈی سے جاری ہوتی رہی۔ اس کے بعد کسی مجبوری کی وجہ سے اس میگزین کو بند کرنا پڑا۔ اقبال نازش کی تحریروں میں قدیم روایات کو بخوبی دیکھا جا سکتا تھا۔ انھوں نے اپنی تخلیقات خواہ وہ

نثر ہو یا شاعری دونوں میں علامتی انداز کو اپنایا ہے۔جس سے ان کی تحریروں میں اس وقت کی نئی نسل کے لکھنے والے قلمکاروں کا رنگ ملتا ہے۔بقول پروفیسر ظہور الدین:

"Iqbal's compositions both in prose and poetry are dominated by the modern trends. As far short stories they are mostly symbolic".(40)

اقبال نازش نئی سوچ اور نئے تجربے کے اہم اور مشہور افسانہ نگار تھے۔ان کے فکر وفن کو وسعت دینے اور ان کی ادبی تخلیقات کو واضح سمت بخشنے میں مجلس ادب تھنہ منڈی جو علاقہ جموں خطے کے علاقہ پونچھ میں واقع ہے کا نمایاں کردار رہا تھا۔انھوں نے اردو نثر کے ساتھ ساتھ شعری تخلیقات میں بھی مہارت حاصل کی تھی۔ان کی شاعری کے حوالے سے بات کریں تو وہ ایک جدید فکر رکھنے والے نمائندہ فنکاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔اقبال نازش کی بہت سی کہانیاں علامتی انداز میں ترتیب دی گئی ہیں۔ان کی مشہور کہانیوں میں خاص طور پر''پانیوں کا قہر اور بھیگتے الفاظ''،''ایک ٹھہرے ہوئے لمحے کی کہانی''اور''بے نام سسکیوں کے ماتم''وغیرہ قابل ذکر کہانیاں ہیں۔اس کے علاوہ''مونسپلٹی کی گاڑی''اور ''پتنگ''عنوانات کی کہانیاں بھی قابل تعریف ہیں۔ان کی تمام کہانیاں اپنے فنی اور تکنیکی اعتبار سے کافی حد تک عمدہ پیمانے پر نمایاں کردار ادا کرتی ہیں۔جموں خطے میں اقبال نازش کے ہمعصروں میں سب سے اہم نام پرویز مانوس کا ہے انھوں نے بھی ریاست میں فکشن نگاری میں کافی مقبولیت حاصل کی ہے۔اقبال نازش کی مشہور افسانوں کا مجموعہ ''چناروں کی آگ''کے نام سے منظر عام پر آیا ہے۔اس میں ان کے کئی قابل ذکر افسانے شامل ہیں۔جن کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ان تمام افسانوں میں مصنف نے زیادہ تر اپنے گردو پیش میں ہونے والے مسائل کو ابھارا ہے اور انہیں اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے۔اس مجموعہ کا دیباچہ ریاست کے افسانہ نگاروں میں تعلق رکھنے والے جدید دور کے افسانہ نگار خالد حسین نے لکھا ہے۔

عبدالحمید نظامی:

صوبہ جموں کے مشہور افسانہ نگاروں میں نظامی کو بھی شمار کیا جاتا ہے۔صوبہ جموں کے قلمکاروں میں نظامی صاحب نے کئی افسانے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔عبدالحمید نظامی اپنی ادبی خدمات دینے کے ساتھ ساتھ انھیں ریشمی کپڑا بنانے میں بھی مہارت حاصل تھی اسی وجہ سے انہیں صوبہ جموں میں سلک ڈیپارٹمنٹ (ریشمی کپڑا بنانے کا کام)

میں ملازمت حاصل ہوگئی تھی۔ ریاست میں انہیں نہ صرف اچھے افسانہ نگار کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے بلکہ ایک اچھے اور کامیاب مترجم کی حیثیت سے بھی انھیں جانا جاتا ہے۔عبدالحمید نظامی نے بہت سی تخلیقات کو انگریزی سے اردو میں منتقل کیا ہے۔اس میں انھوں نے خاص طور پر انگریزی کی شارٹ اسٹوریز (افسانے) کو اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ جس میں وہ کافی حدتک کامیاب بھی ہوئے تھے۔اس حوالے سے اگران کی ترجمہ کردہ تصانیف کا مطالعہ کیا جائے تو اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ترجمہ نگاری میں مولوی عنایت اللہ اور،ل۔احمد کا اثر قبول کیا۔انہیں انگریزی افسانوں کے مطالعے کا بہت شوق تھا۔اسی شوق کی بنا پر انھوں نے کئی انگریزی کے افسانوں اور افسانہ نگاروں کو اردو کے ادیبوں و دانشوروں کے لیے روشناس کروایا ہے۔اسی دور میں انہیں اردو افسانہ نگاری میں بھی دلچسپی پیدا ہوئی اور بہت سے افسانے تحریر کیے۔افسانہ نگاری کے حوالے سے خواہ وہ انگریزی افسانے ہوں یا اردو افسانے عبدالحمید نظامی صاحب کا بنیادی موضوع رومانیت تھا۔اس لیے ان کے اپنے افسانوں میں بھی رومانیت کی عکاسی ملتی ہے۔رومانی افسانوں میں انھوں نے مجنوں گورکھپوری کا گہرا اثر قبول کیا ہے۔عبدالحمید نظامی کے بارے میں پروفیسر ظہورالدین صاحب نے گلزار احمد فدا کا حوالے دیتے ہوئے اپنی کتاب میں لکھا ہے:

> "He is matchless in translating English short stories in to Urdu. He does it in such an attractive manner that it be comes difficult to distinguish between the original and the translation. His style of translation is similar to the style of Maulvi Inayatullah and Lam Ahmed. Like his imagination his language is also summative. He is also a creative writer and his short stories are usually difficult like that of Majnun Gorakhpuri".(41)

عبدالحمید نظامی تقسیم ملک کے بعد جموں سے ترک وطن کر کے سیالکوٹ پاکستان میں آباد ہوگئے۔سیالکوٹ میں آباد ہونے کے کچھ عرصہ بعد انھوں نے اپنا ایک اخبار شائع کیا تھا۔جو کافی عرصہ تک ان کی سرپرستی میں نکلتا رہا۔نظامی صاحب کی وفات بھی سیالکوٹ میں ہی ہوئی تھی۔

دینا ناتھ رفیق:

ریاست جموں وکشمیر کے علاقہ پونچھ سے تعلق رکھنے والے شعرا و ادبا میں دینا ناتھ رفیق کا نام بھی قابل ذکر ہے۔وہ بنیادی طور پر شاعر ہیں مگر شاعری کے علاوہ انھوں نے اردو ادب کی دیگر اصناف پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔

دینا ناتھ رفیق نہ صرف جموں میں مشہور تھے بلکہ شاعری کے حوالے سے برصغیر میں بھی انہیں یاد کیا جاتا ہے۔انھوں نے شاعری میں کمال دکھایا مگر اردو نثر کے حوالے سے بھی انھوں نے کئی کارنامے انجام دیئے تھے۔نثر میں ان کو زیادہ تر افسانے لکھنے کا بے حد شوق تھا۔انھوں نے کئی افسانے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔جن میں ان کا ایک بہترین افسانہ''خدا کی لاٹھی''کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔اس افسانے کو نند گوپال باوا نے دینا ناتھ کے افسانوی مجموعے''آدم کے بیٹے''میں شامل کیا تھا۔مصنف نے اس افسانے میں دیہات کی بہترین انداز میں عکاسی کی ہے،جس میں انھوں نے اس کہانی کے ذریعے سے دو مسافروں کو پیش کیا ہے جو پہاڑی ملک کی دشوار گزار وادیوں میں راستے سے بھٹک جاتے ہیں۔راستے میں انھیں بھاری بارش کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔جس کی وجہ سے بارش میں بھیگنے کے ڈر سے ایک مکان میں داخل ہوتے ہیں اور مالک مکان سے پناہ کی التجا کرتے ہیں۔مگر مکان مالک انہیں بے رحمی سے دتکار دیتا ہے اور پناہ دینے سے انکار کر دیتا ہے۔مصنف نے اس افسانے میں مکان مالک کی بے رحمی کی اچھی مثال پیش کی ہے۔اصل میں یہ افسانہ ایک التجائی افسانہ ہے۔اور افسانہ نگار نے اس میں یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ انسان چاہے کتنی بھی بلندی کیوں نہ حاصل کرلے آخر کار جب خدا کا قہر برپا ہوتا ہے تو ایک ہی جھٹکے میں وہ سب کچھ تہس نہس کر دیتا ہے۔اور یہی اس مکان مالک کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔جب مسافروں کی التجا پر اس کو رحم نہیں آتا ہے تو مسافروں کو مجبوراً وہاں سے جانا پڑتا ہے اسی دوران اچانک سے بھیانک طوفان اور آسمانی بجلی کا منظر دکھائی دیتا ہے جس سے گھر تہس نہس ہو جاتا ہے۔

نند گوپال باوا:

نند گوپال باوا کا تعلق صوبہ جموں کی ادبی محفلوں اور ادبی چہل پہل کے ساتھ کافی گہرا تھا۔وہ بنیادی طور پر شاعر مانے جاتے ہیں مگر شاعری کے علاوہ انھوں نے ڈراما اور افسانہ نگاری میں بھی نام کمایا تھا۔انھوں نے جموں کے افسانہ نگاروں اور ڈراما نویسوں کی کچھ تخلیقات کو اکٹھا کر کے اسے ایک مجموعے کی شکل دی۔اس مجموعے کو نند گوپال باوا نے ''آدم کے بیٹے''کے عنوان سے شائع کیا۔اس میں تین افسانے ان کی اپنی تخلیقات ہیں۔جس میں خاص طور پر''وہ بدل

گئی‘‘، ’’ضرورت‘‘ اور ’’ہمارے ساتھی‘‘ قابل ذکر ہیں۔ اس مجموعے کا پیش لفظ موتی لال کپور نے لکھا ہے۔ جو ریاست جموں وکشمیر کے بڑے افسانہ نگاروں اور انشائیہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔

نند گوپال باوا کے افسانوں کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے پریم چند کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا اور یہی اثر ان کے افسانوں میں بھی کہیں نہ کہیں مل جاتا ہے۔ نند گوپال صاحب کے افسانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اس میدان میں کافی مہارت حاصل تھی۔ ان کے افسانے پوری طرح سے فنی لوازمات پر کھرے اترتے ہیں۔

اگرچہ ان کی ابتدائی زندگی اور پیدائش کا کچھ پتہ نہیں چلتا ہے مگر جموں کے مورخین اور محققین کی تصانیف سے اس بات کا پتہ چل جاتا ہے کہ نند گوپال باوا 1947ء کے قبل لکھنے والے قلمکاروں سے تعلق رکھتے ہیں۔

ان کا پہلا افسانہ ’’وہ بدل گئے‘‘ میں ایک عورت کی فطرت کے کمزور پہلوؤں کی عکاسی ملتی ہے۔ اس افسانے میں مصنف نے کہانی کا ہیرو جو ایک عورت کے اس کمزور پہلو کا شکار ہو جاتا ہے لیکن وہ اپنے تجربے کو دہرانے سے خائف ہے۔ افسانہ نگار نے اس میں ہیرو کی کمزوری کو بھی پیش کیا ہے۔ وہ عورت کے حسن وجمال میں اس قدر پھنسا ہوا ہے کہ کوششوں کے باوجود وہ عورت کے حسن اور حسن عمل کے جال سے نکل نہیں سکتا ہے۔ اس کے علاوہ نند گوپال کے کئی دوسرے افسانے ہیں جو اپنے گردوپیش کے ماحول کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ ان کا شاہکار افسانہ ’’ہمارے ساتھی‘‘ ہے۔

نند گوپال باوا اچھے شاعر، افسانہ نگار اور انشاء پرداز بھی تھے۔ انھوں نے مذکورہ بالا مجموعے میں اپنا حلیہ اور اپنے کچھ حالات بھی ایک استعارے کے انداز میں ’’حروف اول‘‘ کے عنوان سے قلم بند کیے ہیں۔ اس کو اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ بھی ایک افسانہ سا معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے انتخابات کے بارے میں لکھا ہے کہ ان میں سماج کی جھلک ملے گی جسے دیکھ کر فخر اور شرمساری کا احساس بیک وقت پیدا ہوگا۔

دھرم چند پرشانت:

ان کا شمار جموں کے مشہور صحافیوں میں کیا جاتا ہے مگر صحافت کے علاوہ انھوں نے مضمون نگاری، انشائیہ نگاری اور افسانہ نگاری سے بھی دلچسپی لی تھی۔ دھرم چند پرشانت کی ولادت اور ابتدائی تعلیم میں بہت کم لکھا گیا ہے اس لیے ان کی پیدائش کی معلومات حاصل نہیں ہوتی تاہم ریاستی کلچرل اکیڈمی کی جانب سے رسالہ ’’شیرازہ‘‘ میں ان کے کچھ افسانوں اور انشائیوں وغیرہ کا پتہ چلتا ہے۔ دھرم چند پرشانت کے ہمعصروں میں بہت سے نام قابل ذکر ہیں

۔جنھوں نے ریاست میں اردو زبان وادب کوفروغ دینے میں نمایاں رول ادا کیا جن میں دینا ناتھ رفیق،نند گوپال باوا، صوفی غلام محمد، کنول نین پرواز،سومناتھ زتشی وغیرہ۔

دھرم چند پرشانت کا ایک افسانہ نومبر 1964ء میں رسالہ ''شیرازہ'' میں ''انسان اور بزم قدرت'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا تھا۔انھوں نے اس افسانے کوڈوگری زبان سے اردو میں منتقل کیا مگر یہ ان کا طبع زاد معلوم ہوتا ہے۔ مصنف نے اس افسانے میں ڈوگرہ حکمرانوں کی بہترین انداز میں عکاسی کی ہے۔جس میں جموں کے علاقہ بسوہلی کے راجا امرت پال کے دربار کا مصور لوچن، راجہ کی فرمائش پر تصویر بنانے سے انکار کر دیتا ہے۔افسانہ نگار نے اس افسانے میں لوچن کو ہیرو کے طور پر پیش کیا ہے جو راجہ کے ساتھ آنکھ سے آنکھ ملا کر اس کی فرمائش سے انکار کر دیتا ہے۔لوچن اپنے مصوری میں ماہر ہیں مگر وہ صرف قدرتی مناظر کی تصاویر بنانے میں مصروف رہتا ہے۔اسی وجہ سے بات اتنی آگے بڑھ جاتی ہے اور لوچن کو راجا دربار سے نکال دیتا ہے۔وہ دربدر کی ٹھوکریں کھاتا ہوا جنگلوں میں پناہ کے لیے بھٹکتا رہتا ہے۔ سفر کے دوران وہ جنگل میں ایک جگہ پر اندھی حسینہ سے مسحور ہوکر،اس کی تصویر بناتا ہے۔تصویر بنانے میں وہ کامیاب ہوجاتا ہے مگر اس تصویر میں لڑکی آنکھیں درست کرنے کے لیے ممیرہ یعنی ایک جڑ جو ہلدی سے مشابہ ہوتی ہے اور بینائی کے لئے بہت کارآمد ہوتی ہے کی ضرورت پڑتی ہے۔لوچن کو راجہ کے دربار کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتی تھی۔ وہ ممیرہ کو حاصل کرنے کے لیے راجہ کے دربار میں جانے کے لیے مجبور ہوجاتا ہے۔ وہ کئی بار راجہ کے دربار میں جانے کے لیے سوچتا ہے اور آخر کار وہ ممیرہ کے لیے پھر سے واپس راجہ کے دربار میں داخل ہوتا ہے۔اس دوران لڑکی سے اسے ایک سبق ملتا ہے کہ بزم قدرت سے زیادہ حسین ہے۔اسی لیے انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ ملا ہے۔

جگدیش کمل:

جگدیش کمل کا تعلق بھی جموں سے ہی تھا۔فلم کے میدان میں انھوں نے خوب نام کمایا تھا۔تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے زیادہ تر فلموں کے لیے کہانیاں لکھیں تھیں۔انھوں نے ادبی زندگی کا آغاز تقریباً1940 میں کہانیوں سے کیا تھا اس حوالے سے ان کی مشہور کہانیوں میں ''گیٹ وے آف انڈیا''، ''کھنیا''، ''لاٹ صاحب'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔جموں کی فلم اینڈسٹریز میں ان کہانیوں کو بہت پسند کیا جاتا تھا۔ان کی کہانیوں میں سب سے زیادہ مقبولیت ''گیٹ وے آف انڈیا'' کو حاصل ہوئی ہے۔اس کہانی میں مصنف نے قومی شاہرہ جموں سے سرینگر کے راستے میں علاقہ بانہال جو ضلع رام بن میں واقع ہے۔سری نگر اور جموں کو جوڑنے والا یہ بانہال کا علاقہ گیٹ وے آف انڈیا کے نام سے

جانا جاتا ہے۔

جگدیش کمل صاحب کو فلموں کے لیے کہانی لکھنے کا بہت شوق تھا۔قلمکار کی حیثیت سے انھیں فلمی دنیا میں کافی مقبولیت ملی۔ان کا شمار بھی 1949ء سے قبل کے قلمکاروں میں ہوتا ہے۔

پشکر ناتھ:

ان کی پیدائش 1932ء میں ہوئی تھی۔انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کہانی لکھنے سے کیا۔ان کی پہلی کہانی ''اور کہانی ادھوری رہ گئی'' کے عنوان سے ماہنامہ ''بیسویں صدی'' فروری 1953 میں منظر عام پر آئی۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''اندھیرے اجالے'' کے عنوان سے کلچرل اکادمی سے 1962ء میں شائع ہوا۔اس مجموعے پر انہیں ریاستی کلچرل کیڈمی کی جانب سے انعام سے بھی نوازا گیا۔اس کے علاوہ ان کے دیگر افسانوی مجموعے''ڈال کے باسی'' 1967ء ''عشق کا چاند اندھیرا'' 1981ء اور ''کانچ کی دنیا'' 1984ء میں منظر عام پر آئے۔''ڈال کے باسی'' افسانوی مجموعہ بھی ریاستی کلچرل اکیڈمی کی جانب سے شائع کیا گیا تھا۔اس کے علاوہ پشکر ناتھ نے کئی ٹی وی اور ریڈیو ڈرامے بھی تحریر کیے تھے۔پشکر ناتھ کے پہلے افسانوی مجموعے ''اندھرے اجالے'' کے علاوہ بھی کئی افسانے رسالوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔خاص طور پر کلچرل اکادمی کے رسالے اور ''ہمارا ادب'' کے وہ باضابطگی کے ساتھ لکھنے والوں میں سے تھے۔ ان کے قابل ذکر افسانے جو مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوئے ان میں ''موت کا سوداگر''، ''راز دل''، ''پردہ نشین''، ''گالی''، ''نروان''، ''انتقام''، ''جاہل کمینے''، ''اندھیرے اجالے'' وغیرہ ہیں۔ان کے افسانوں میں کشمیر کی بھرپور عکاسی ملتی ہے انھوں نے کشمیر کی زندگی اور اس کے حسین فضاؤں کی منظر کشی کی ہے۔لیکن فطرت کے ان حسین مناظر کے درمیان عوام کی غربت اور ان کا افلاس ایک ہے۔جس کے نقوش وہ بڑی فنکاری کے ساتھ ابھارتے ہیں۔ان کا افسانہ ''جاہل کمینے'' کے پورے واقعات کشمیر کی خوبصورت جگہ گلمرگ کی عکاسی کرتے ہیں۔ اس پورے افسانے میں گلمرگ کے واقعات کو پیش کیا ہے جو اپنے حسین اودلکشی کی وجہ سے دنیا کے سیاحوں کی آماجگاہ ہے۔مگر اس افسانے کے کردار حمدو، خدیجی، نوری اور اس کا مریض بچہ فطرت اور سماج کے تضاد کا ایک نمونہ ہے۔اسی طرح سے ان کا ایک اور قابل ذکر افسانہ ''موت کا سوداگر'' ہے یہ افسانہ پشکر ناتھ کے نمائندہ افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔اس افسانے کا مرکزی کردار ایک بدمعاش کا ہن سنگھ ہے، کی کہانی کو مصنف نے پیش کیا ہے۔جو بعد میں غائب ہوجاتا ہے۔پشکر ناتھ نے اس کے عمل اور کردار کو بڑی خوبی سے اٹھایا ہے لڑکے سے محبت کرنا اس کا بنیادی موضوع

ہے۔جس نے بدمعاش کوایک ہوٹل کے ہیڈ ویٹر کا خون کرنے سے باز رکھااوراس کے معاوضہ سے جودو ہزار روپیوں کی صورت میں سیٹھ گجا نند اسے پیش کرر ہا تھا۔اس کے علاوہ بھی کہانی میں کئی دوسرے دلکش لمحے بھی آتے ہیں۔جیسے کہ کاہن سنگھ غصے میں آ کر اپنا چھرا نکالتا ہے اور رام لال کا قتل کرنے کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔مگر اتنے میں گھر کے اندر سے اس کے لڑکے کی ''بابا۔بابا'' کی آواز اس کے کانوں میں پہنچتی ہے اس آواز نے اس کے دل میں ایک انسانی ہمدردی پیدا کردی اور قتل ہونے سے بچالیا۔اس افسانے میں ایک اور اہم واقع تب آتا ہے جب کاہن سنگھ سیٹھ گجا نند کا روپیہ لوٹانے کے لیے جار ہا ہوتا ہے۔''پہلے وہ اندھیرے میں کچھ لانے جاتا تھا مگر آج وہ کچھ دینے جار ہا تھا''۔اس افسانے کی ہئیت پر نظر ڈالی جائے تو فنی اعتبار سے اس میں پورے لوازمات دیکھے جاسکتے ہیں۔

پشکر ناتھ کا ایک اور اچھا افسانہ''پردہ نشین'' کے عنوان سے رسالہ''ہمارا ادب'' میں 1959ء کو منظر عام پر آیا تھا۔اور یہ بعض اعتبار سے ان کے بہترین افسانوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔اس میں شعوری رو کا شائبہ، زینب کے بھٹکتے ہوئے انداز مطالعہ میں نمایاں ہے۔زینب جو کہ اس افسانہ کا مرکزی کردار ہے۔مصنف نے بڑے اچھے طریقے سے زینب کے نفسیات کی عکاسی کرنے کی کوشش کی ہے۔اس افسانے میں زینب جو کہ کتاب پڑھ رہی ہے۔امتحان میں اب صرف بیس دن باقی رہ گئے ہیں اور اس دوران وہ خوب کتابوں میں مبتلا رہتی ہے۔باہر موسلا دھار بارش ہورہی ہے۔زینب کو تاریخ میں بہت دلچسپی ہے وہ امتحان کے لیے تاریخ ہند کو زبانی یاد کرنا چاہتی ہے۔ملاحظہ ہو اس افسانے کا ایک اقتباس:

> ''نو جہاں کا اصلی نام مہرالنسا تھا'' مگر یہ بارش تو تھمنے کا نام نہیں لیتی۔سوال دہرایا نہیں جاتا اور ابھی اس مسخرے کا باپ آتا ہوگا۔کیسا بے ڈھنگا آدمی ہے وہ بھی بارش کے قطرے نہ ہوئے،موسیقی کی لہر ہوگئی''۔''نور جہاں کی شادی شیر افگن سے ہوگئی۔شیر افگن یعنی شیر کو مارنے والا۔بڑا ہی لڑاکو ہوگا پھر تو۔اللہ جانے نور جہاں کو اس سے محبت تھی یا نہیں''۔(42)

یہ زینب کا مطالعہ تھا جو ہند کی تاریخ رٹتے رٹتے دوسری باتوں میں اپنا دھیان بھٹکا دیتی ہے۔پھر تاریخ میں پہنچ جاتی ہے۔اور بھٹکتے خیالات کی یہ رو تیز تیز چلتی ہے۔پشکر ناتھ کی سلیس انداز میں جو گھلاوٹ ہے اس کا شائبہ اس جملے سے ملتا ہے جس میں لکھا ہے کہ:

> ''بس سوچنے لگتی ہوں تو سوچتی ہی چلی جاتی ہوں،ادھر ادھر کی باتیں'۔

پشکر ناتھ کی کہانیوں کا اگر مطالعہ کیا جائے تو اس میں راقم الحروف کی رائے کے مطابق ان کہانیوں میں زیادہ تر کشمیری عوام کی عکاسی ملتی ہے۔پشکر ناتھ نے کہانی لکھنے کی شروعات برج پریمی کے اسرار پر کی تھی۔ برج پریم نے پشکر ناتھ کو کہا تھا کہ کیا تم کہانی نہیں لکھ سکتے؟ اسی چیلنج پر انھوں نے اپنی پہلی کہانی ''اور کہانی ادھوری رہ گئی'' تحریر کی تھی۔اس حوالے سے سلیم سالک اپنی تصنیف میں لکھتے ہیں:

''پشکر ناتھ کی ادبی زندگی برج پریمی کے چیلنج سے شروع ہوئی۔ جب برج پریمی نے پشکر ناتھ سے کہا کہ تم کہانی نہیں لکھ سکتے تو انھوں نے اپنی پہلی کہانی ''اور کہانی ادھوری رہ گئی'' تحریر کی جو بعد میں ماہنامہ ''بیسویں صدی'' فروری 1953ء میں شائع ہوئی۔'' (43)

پشکر ناتھ کے دو افسانوی مجموعے بہت ہی اہمیت کے حامل ہیں۔ان کے افسانوں میں زیادہ تر کشمیر کے غریب طبقے کی عکاسی ملتی ہے۔اس حوالے سے پشکر ناتھ کے افسانوی مجموعے خاص طور پر ''عشق کا چاند اندھیرا'' اور ''کانچ کی دنیا'' قابل ذکر ہیں۔اولالزکر مجموعے میں کل 13 افسانے شامل ہیں جن میں ۔ یہ مجموعہ 1981ء میں نئی دہلی سے شائع ہوا تھا اس مجموعے میں پشکر ناتھ نے اپنے خاص ہمعصروں کا بھی ذکر کیا ہے اور خود اس مجموعے کو اشاعت کے بارے میں بھی لکھتے ہیں:

''بارہ سال کے عرصہ کے بعد یہ تیسرا افسانوی مجموعہ پیش کر رہا ہوں بیچ والی مدت کی ایک لمبی کڑی گم ہوگئی کیوں؟ اور کیسے؟ اس کے بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔کہوں گا تو دکھ ہوگا۔ یہ کتاب اپنے مکرم جناب نریندر ناتھ سوز صاحب کی وساطت سے شائع ہو رہی ہے سوز صاحب کا شکر گزار ہوں ہی۔اپنے عزیز ویریندر پٹواری کا شریہ بھی ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں............''۔(44)

یہ افسانہ پشکر ناتھ کا بہترین افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔اس میں صرف ایک ہی کردار کے اردگرد کہانی گھومتی ہے۔اس افسانے کا مرکزی کردار گومتی ہے۔وہ ایک غریب لڑکی ہے جو بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ کبھی نہیں بدلتی ہے۔جیسا کہ مصنف نے خود اس افسانے میں ذکر کیا ہے:

''پھر چند سالوں میں سب کچھ بدل گیا۔اب مردوں نے چر چراتے ہوئے دیہی چمڑے کے جوتے پہننا بند کر دیتے ہیں۔عورتیں ایلوا رطرز کے بال سنوار کر شاپنگ کرنے جاتی ہیں

> اور لڑکے سڑچ لان کی بیل بوٹم پتلونیں پہن کر کافی ہاؤس جاتے ہیں۔صرف گومتی نہیں بدلی ہے۔گومتی اس قافلے کی دوسری لڑکی ہے اس کے علاوہ پہلی لڑکی ہے اور تیسری لیکن ان کے ساتھ میرا کوئی سروکار نہیں ہے ایسی لڑکیاں تو ہر گلی کوچے میں تھرکتی نظر آتی ہیں۔ ہر دیچے اور ہر چھت کی منڈیر سے مسکراتی ہوئی جھانکتی ہیں۔ ہر بازار اور ہر میلے میں اچھلتی کودتی نظر آتی ہیں۔لیکن گومتی ....گومتی ایک چھلاوہ ہے۔ یا کسی خواب کا سرسراتا ہوا پریشان کرتا ہوا ،دل و دماغ کو جھنجھوڑتا ہوا پیکر ہے۔ گومتی کیوں نہیں بدلی ، یہ شاید وہ خود بھی نہیں جانتی ....‘‘(45)

اسی طرح سے پشکر ناتھ کا ایک اور قابل ذکر افسانہ ’’ایک بوند زہر‘‘ ہے۔اس افسانے میں دو مرکزی کردار ہیں۔مصنف نے ڈاکٹر بابو اور اسے ہونے والی منگیتر کی محبت کی بہترین انداز میں عکاسی کی ہے۔ڈاکٹر بابو کی حکایت کے کردار اچانک اسے خوبصورت نظر آنے لگتے ہیں۔ جہاں وہ ایک الاؤ کے سامنے بیٹھا ہوا ہے اور ہر وقت اپنی منگیتر رنجیتا کے بارے میں سوچتا رہتا ہے۔اس دوران اس کے ذہن میں کئی ضمنی کردار آتے ہیں جن میں کبھی اسے نوراں، کبھی ریشماں ، زیباں وغیرہ دکھائی دیتی ہیں اور وہ ہر وقت اپنی پریشان کن داستان انھیں سناتا رہتا ہے۔ ملاحظہ ہو اس افسانے کا ایک اقتباس:

> ’’میری حکایت کے کردار اچانک خوبصورت نظر آنے لگتے ہیں۔ میں ان کرداروں کی طرف دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہوں اور مجھے رنجیتا یاد آتی ہے۔خوبصورت خوشبودار، دھلی دھلائی ، صاف شفاف میں نے سوچ سمجھ کر تمہیں چاہا ہے، ہائے آواز میں کتنی مٹھاس ہے۔سوچ سمجھ کر تم سے محبت کی ہے۔تمہارا ڈیڈی وکیل ہے تم ویٹرنری ڈاکٹر ہو۔کھاتا پیتا گھرانا ہے اور کیا چاہیے۔ہاں اور کیا چاہیے؟ مگر معلوم ہے کہ جب تم دلہن بن کر میری دہلیز پار کروگی تم اور بھی کچھ چاہنے لگوگی ....تم نے سوچ سمجھ کر ترازو ہاتھ میں لے کر مجھ سے محبت کی ہے اور میں طرح طرح کے زہر کا مارا ہوا تمہاری اس چاہت کی زہر کو بھی پی جاؤں گا‘‘۔(46)

اس افسانے کے آخر میں جب ڈاکٹر بابو کو اپنی منگیتر کی جدائی برداشت نہیں ہوتی تو وہ اللہ داد خاں سے زہر کی ایک بوند مانگتا ہے۔

''تم کیا جانو کسی کی یاد آجائے تو اندر ہی اندر لہو کیسے بہتا ہے؟ .... میر ہاتھ پاؤں ساکت ہو گئے ہیں کھٹے مکھن کی بو میرے دماغ کی بولیں ہلا رہی ہے میں مر رہا ہوں میں چیخنا چاہتا ہوں مگر آواز میرے حلق میں اٹک جاتی ہے زہر کی ایک بوند میرے خدا صرف ایک بوند مگر زہر کہاں سے لاؤں............''۔(47)

اس طرح سے پشکر ناتھ کے کئی دیگر قابل ذکر افسانے ہیں جو اپنی فنی اور ہیتی خوبیوں کی وجہ سے مہارت رکھتے ہیں۔ان کے دیگر افسانوی مجموعوں میں'' کانچ کی دنیا'' بھی کافی اہمیت کے حامل ہے یہ مجموعہ 1984ء میں منظر عام پر آیا۔اس مجموعے میں کل 17 افسانے شامل ہیں۔

پشکر ناتھ کا افسانہ ''رازِ دل'' کی پوری کہانی کشمیر میں ڈوگرہ حکومت کے دوران کی عکاسی کرتی ہے۔اس افسانے میں بیوہ عورتوں کی نا انصافی کی عکاسی کی ہے۔مگر اس افسانے کے حوالے سے پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب نے کچھ اور ہی کہانی بیان کی ہے۔معلوم نہیں سروری صاحب نے خود یہ افسانہ پڑھا تھا یا نہیں؟ چونکہ راقم الحروف نے جب اس افسانے کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ جو تجزیہ عبدالقادر سروری صاحب نے کیا ہے وہ شاید کوئی اور کہانی ہوگی۔انھوں نے اس افسانے کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''رازِ دل'' ایک نفسیاتی الجھن کا افسانہ ہے۔گوبند ولبھ اپنے دوست کے ساتھ سنیما جاتا ہے۔سنیما میں اس کے پیر میں کوئی چیز کاٹتی ہے۔اسے شبہ ہوتا ہے کہ اسے سانپ نے ڈسا ہے۔اس خیال کے ساتھ ہی اس پر ایسی مردنی چھا جاتی ہے کہ اپنے ساتھی کو وہ ہسپتال لے چلنے کو کہتا ہے اور راستے میں اپنی زندگی سے مایوس ہوکر، کچھ ضروری راز جو اس نے دل میں چھپا رکھے تھے، اپنے دوست سے کہہ دیتا ہے۔لیکن ہسپتال پہنچنے پر جب ڈاکٹر سے یہ بتاتا ہے کہ اس کے پیر کو سانپ نے نہیں، چوہے نے کاٹا ہے تو ایک سخت نفسیاتی الجھن کا شکار ہو جاتا ہے کہ دوست کو راز کیوں بتائے اور اب اس کے دل میں دوست سے بدگمانی اور اس سے دشمنی پیدا ہو جاتی ہے............''۔(48)

اس مذکورہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدالقادر سروری صاحب نے نہ جانے کون سا افسانہ پڑھا ہوگا۔جب کہ پشکر ناتھ کے افسانے ''رازِ دل'' کی کہانی کچھ اور ہی بیان کرتی ہے اس افسانے میں تین اہم کردار ہیں۔رکمنی جو

کہ حویلی کی نوکرانی ہے، چندر مکھی حویلی کی مالکن اور کرائے دار جو حویلی میں کرائے پر رہتا تھا۔ کرائے دار رکمنی سے ساری کہانی سنتا ہے جو واقعہ چندر مکھی کے ساتھ ہوا تھا کہ وہ شادی کے دوسرے دن بیوہ ہوگئی تھی کیونکہ شادی کے دن اس کے شوہر رانا رتن سنگھ جو کہ حویلی کا آخری وارث تھا، مگر شادی کے دن اس کو کسی نے گولی ماردی تھی اس دوران اس کی موت ہوجاتی ہے۔ اس دن کے بعد چندر مکھی ہی پوری حویلی کی اکلوتی وارث ہے۔ جس دن سے چندر مکھی بیوہ ہوگئی تھی تب سے اس نے کسی مرد کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ کرائے دار جب پوری کہانی رکمنی سے سنتا ہے تو وہ چندر مکھی کو دیکھنے کے لیے رکمنی سے التجا کرتا ہے۔ رکمنی اور کرائے دار کی آپس میں بہت ہمدردی ہوگئی تھی۔ کرائے دار رکمنی کو موسی کہہ کر پکارا کرتا تھا وہیں دوسری طرف رکمنی کو بھی بیٹے کی طرح کرائے دار سے محبت ہوگئی تھی۔ ملاحظہ ہو ایک اقتباس:

> ''موسی! مجھے ایک بار رانی جی کے درشن کراؤ۔ میری بات سن کر جیسے رکمنی کو سانپ چھوگیا۔ اس کی آنکھیں وحشت سے پھیل گئیں۔ ''کیسی بات کرتے ہو بیٹی؟ اس بڑھاپے میں مجھے ذلیل کرواؤ گی؟'' ''کیوں؟ اتنی بے رحم ہے یہ تیری رانی؟'' نہیں بیٹا! ایسا نہ کہو یہ سوچو، جس عورت نے چودہ برس تک کسی بھی مرد کو اپنی چھایا تک نہ دکھائی ہو۔ اسے میں کیسے کہوں کہ............'' ''چودہ برس؟ چودہ برس تو بہت ہوتے ہیں! رام بن باس بھی تو چودہ ہی برس کا تھا!'' ہاں بیٹا! چودہ برس بہت لمبا عرصہ ہوتا ہے اور رانی نے ان چودہ برسوں میں کبھی اپنے پتا تک کو پاس نہیں آنے دیا۔ وہ تو بہت پہلے ہی سورگباس ہوگئے تھے۔ ایک میں بڑھیا رہ گئی ہوں نہ کبھی بیاہ رچایا، نہ گھر گرہستی، نہ اولاد دیکھی۔ عمر ہوگئی نوکرانی کا کام کرتے۔ اسی حویلی میں پیدا ہوئی یہیں کسی دن مرجاؤں گی لیکن زندگی کیا، ہزار زندگیاں رانی جی پر نچھاور کرسکتی ہوں............''۔(49)

مذکورہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مصنف نے کہیں نہ کہیں جہز کے نظام کی جھلک دکھانے کی بھی کوشش کی ہے کیوں کہ پہلے زمانے میں بیوہ عورتوں کو دوسری شادی کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔

پشکر ناتھ کا ایک اور افسانہ ''کانچ کی دنیا'' جو کشمیر کی عکاسی کرتا ہے یہ رومانی افسانہ ہے اس میں مرکزی کردار مادھوری ہے جو اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی ہے وہ ایک اسکول ٹیچر کی لڑکی ہے جو نرسنگھ کا کام کرتی ہے، وقت گزاری کے لیے طاش کھیلا کرتی ہے اس کے علاوہ نشے کرنے کی بھی عادی ہوچکی ہے۔ دوسرا اہم کردار اس افسانے میں ایک سن رائز

کلب کا ممبر ہے وہ بیک وقت ممبری کا کام بھی کرتا ہے اور کیو یو، کی دکان بھی چلاتا ہے۔

مادھوری اگرچہ نشے کرنے کی عادی ہو چکی ہے مگر اس نے اپنی ماں سے ایک وعدہ بھی کیا ہے کہ وہ کچھ بھی ایسا ویسا کام نہیں کرے گی جس سے اس کے اور اس کے والدین کی عزت میں کوئی دھبا لگے۔ مصنف نے مادھوری کے کردار کو نئی نسل اور آزاد خیال کی طرح پیش کیا ہے جس میں مادھوری اپنے طور طریقوں پر زندگی جینا چاہتی ہے۔ سن رائز کلب کا ممبر مادھوری سے شادی کرنا چاہتا ہے مگر اندر ہی اندر سوچتا ہے کہ وہ بیک وقت دو زندگیاں گزارتی ہے نرس کا کام بھی کرتی ہے اور پھر پارٹیوں میں جا کے شراب اور طاش اس کا پیشہ بن چکا ہے۔ مگر پھر سوچتا ہے کہ بہت سے ایسے انسان ہیں جو بیک وقت دو دو کام کرتے ہیں ملاحظہ ہو اقتباس:

''میرے لیے یہ اطلاعات کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی، کیونکہ آج کل ہر شخص دو دو بلکہ تین تین زندگیاں بیک وقت گزارنے پر مجبور ہے۔ اسی لیے ایک پٹواری بیک وقت پٹواری بھی ہوتا ہے، اسمگلر بھی ہوتا ہے اور اپنے محلے کا پریزیڈنٹ بھی ہوتا ہے۔ ہاں ایک افیسر بیک وقت افسر بھی ہوتا ہے اور کسی فرم کمپنی کا مالک بھی یا ایک سادھو بیک وقت مذہبی پیشوا بھی ہوتا ہے، پردہ فروش بھی ہوتا ہے اور جوئے خانے کا مالک بھی ہوتا ہے............اس لیے مجھے مادھوری کی دو زندگیوں کے بارے میں کوئی تعجب نہ ہوا بلکہ میرا ارادہ اس کے ساتھ شادی کرنے کا اور پختہ ہو گیا''۔(50)

اس متذکرہ بالا اقتباس سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اس وقت کے لوگوں میں خاص طور پر پٹواری، سادھو اور دیگر افسران دو دو کام کیا کرتے تھے اور غریب عوام کا ہر دن خون چوستے تھے۔

اس افسانے میں مصنف نے ایک ضمنی کردار کا ذکر کیا ہے جو ایک کمپاؤنڈر رہتا ہے اور مادھوری کا پہلا عاشق جو مادھوری سے بے انتہا محبت کرتا تھا مگر مادھوری نے اسے شادی سے انکار کر دیا تھا۔ مگر آخر میں اپنا فیصلہ بدل کر کمپاؤنڈر سے ہی شادی کرنے چلی جاتی ہے ملاحظہ ہو اقتباس:

''وہ کمپاؤنڈر تو نرسنگھ ہوم میں کبھی کبھی میرا انتظار کرتے کرتے وہیں بینچ پر سو جاتا تھا''، ''ہٹاؤ اب اس کمپاؤنڈر کے بچے کی باتیں''۔ ''ہنسی آتی ہے، پگا! زبان سے ایک لفظ ہی بولتا۔ صرف چپ چاپ کانچ کے ٹکڑے چنتا رہا'' مادھوری نے ایک اور قہقہ لگایا اور ساتھ ہی

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں حیران وششدر اس عجیب سی لڑکی کو دیکھتا رہا۔ ''پگلا کہیں کا۔نرس ٹائیپ آدمی۔ بوتل ہاتھ سے گر گئی اور پھر چپ چاپ کانچ'' روتے روتے ہی وہ کہتی جارہی تھی۔ مجھے غصہ آ گیا۔ ''مادھوری!'' میں نے تقریباً چیخ کر کہا۔ وہ رک گئی اور میری طرف رحم طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔ ''مدو ڈیر! ہم تو اپنی شادی کا پلان بنا رہے ہیں''۔ ''شادی؟'' اس نے دھیمے سے کہا اور دوسرے لمحے وہ لپک کر کھڑی ہوگئی اس نے جھپٹ کر میز سے اپنا پرس اٹھایا اور باہر بھاگ گئی۔ ''مادھوری کہاں جارہی ہو؟'' میں نے حیرت سے پکارا۔ ''شادی کرنے اس کمپاؤنڈر کے ساتھ''۔اس نے پلٹ کر جوب دیا اور دوسرے لمحے وہ بازار کی بھیڑ میں کھوگئی''۔(51)

پشکر ناتھ کے دیگر افسانے زیادہ تر کشمیر کی عکاسی کرتے ہیں۔انھوں نے کشمیر کی ثقافت اور سماجی زندگی کی جو تصویریں اپنے افسانوں کے ذریعے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے ان میں کشمیر کی حقیقی زندگی کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ان کے دیگر قابل ذکر اور شاہکار افسانوں میں ''درد کا مارا'' بھی اہمیت کے حامل ہے۔

برج پریمی:

برج پریمی نے جموں وکشمیر کے نثر نگاروں میں اہم رول ادا کیا ہے۔ان کا اصل نام برج کشن ایمہ تھا مگر وہ اپنے قلمی نام ''برج پریمی'' کے نام سے مشہور تھے۔ان کی ولادت 24رستمبر 1935ء کو محلّہ داربی یا رحبہ کدل سرینگر میں ہوئی ان کے والد کا نام شیام لال ایمہ تھا۔ برج پریمی کے فرزند پریمی رومانی موجودہ دور میں اردو زبان وادب سے کافی لگاؤ رکھتے ہیں انھوں نے نہ صرف اپنے والد صاحب کی شخصیت کو منظر عام پر لایا بلکہ خود بھی اپنے والد صاحب کی طرف اردو ادب کی خدمات کو انجام دے رہے ہیں ان کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا بہر حال پریمی رومانی اپنے والد صاحب کی ولادت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''والد 24رستمبر 1935ء میں سرینگر کے ایک نہایت ہی گنجان محلے درابی یا ،حبہ کدل (سرینگر) کے ایک اہل علم کشمیری پنڈت گھرانے میں پیدا ہوئے۔کہا جاتا ہے کہ اس روز جنم اسٹمی تھی اور لوگ کرشن مہاراج کی جھانکی سجانے اور سنوارنے میں مشغول تھے اسی مناسبت سے والد کا نام کشن ایمہ رکھا گیا''۔(52)

برج پریمی شروع سے ہی پڑھنے لکھنے کی طرف مائل تھے۔ان کے والد اپنے زمانے کے معروف اساتذہ میں شامل ہوتے تھے اس لیے برج پریمی کی ابتدائی تعلیم میں ان کے والد کا بڑا ہاتھ تھا۔ ابتدائی تعلیم نانہال یعنی نانی کے گھر رنگہ ٹینگ عالی کدل (سرینگر) کے مدرسوں سے حاصل کی۔1948ء میں بی اے وی اسکول مہاراج گنج سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اس کے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے سری پرتاپ کالج سرینگر میں داخلہ لیا اور وہاں سے سائنس کے مضامین کے ساتھ ایف ایس سی کا امتحان پاس کیا۔اسی سال ان کے والد کا سائیہ سر سے اٹھ گیا اور گھر کی ذمے داریوں کا سارا بوجھ ان کے سر آ گیا۔ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی حاصل کرتے گئے مگر یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہ چل سکا آخر کار انھیں تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا اس کے بعد انھوں نے پرائیویٹ طور پر ادیب کامل، ادیب فاضل اور گریجویشن کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔

1960ء میں برج پریمی نے بی۔ایڈ کیا اور 1961ء میں ایم اے اردو کا امتحان پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے اول درجہ میں پاس کیا۔1976ء میں کشمیر یونیورسٹی کی جانب سے انھیں اردو کے عظیم افسانہ نگار اور مشہور ادیب ''سعادت حسن منٹو: حیات اور ادبی کارنامے'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دی گئی۔

برج پریمی نے جس ماحول میں جنم لیا وہ خالص ادبی ماحول کا احاطہ کرتا ہے۔ان کے والد پنڈت شیام لال کول ایمہ، ریاست جموں و کشمیر میں اپنے دور کے بڑے قلمکاروں میں شمار کیے جاتے تھے یہ وہ دور تھا جب کشمیر میں تعلیم کے احیاء نو کا آغاز ہو چکا تھا مگر اس سلسلے کو آگے بڑھانے کے لیے اردو زبان وادب کی درسی کتابوں کی سخت ضرورت تھی اسی دوران محکمہ تعلیم نے اردو میں نئی کتابیں مرتب کرنے کا کام ریاست کے چند ادیبوں کے ہاتھ دیا جن میں خاص طور پر پروفیسر نندلال کول، طالب کاشمیری، غلام حیدر چشتی اور برج پریمی کے نام قابل ذکر تھے۔ان لوگوں نے اس دور میں کئی درسی کتابیں تخلیق کر کے منظر عام پر لائیں جنھیں بعد میں ریاست کے طلبا و طالبات کے نصاب میں شامل کیا گیا۔ان متذکر بالا ادیبوں کے یہاں اس وقت اردو ادب کو فروغ دینے میں کئی نئی ہستیاں اپنے اساتذہ سے فیض اٹھانے اور شعر وادب کی محفلوں سے لطف اندوز ہونے میں پیش پیش تھیں۔جن میں قابل ذکر ادبا و شعراء دینا ناتھ، شاہد کاشمیری، پریم ناتھ پردیسی، دینا ناتھ دلگیر اور پریم ناتھ بزاز وغیرہ شامل تھے۔ان ادبی محفلوں کا ذکر کرتے ہوئے برج پریمی اپنی تصنیف میں لکھتے ہیں کہ:

''اس زمانے میں وہ (طالب) والد کے ساتھ درسی کتابیں لکھتے تھے۔اس کام میں ان کے

ساتھی پنڈت دینا ناتھ واریکو، شاہد کاشمیری اور پنڈت پریم ناتھ پردیسی تھے کبھی کبھی اس محفل میں دینا ناتھ، مٹو دلگیر اور پنڈت پریم ناتھ بزاز بھی شامل ہوتے تھے اور شعر وادب کی محفلیں جم جاتیں''۔(53)

ریاست میں شعر وادب کی محفلوں کی وجہ سے برج پریمی کی ادبی زندگی میں دلچسپی ہوئی۔گھر میں بھی مختلف رسائل وجرائد آیا کرتے تھے۔ان کے ادبی ذوق نکھارنے اور سنوارنے میں ان اخبارات ورسائل کا اہم رول رہا۔ابتداء میں انھوں نے اپنی کہانیوں پر اپنے والد صاحب سے اصلاح لی لیکن والد کی اچانک وفات کے بعد کشمیر کے معروف افسانہ نگار پریم ناتھ پردیسی نے ان کی ذوق ادب کو کامیاب بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

برج پریمی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز تو اپنی تعلیم کے دوران ہی شروع کر دیا تھا مگر باضابطہ طور پر ان کی ادبی زندگی کا آغاز 1949ء میں افسانہ نگاری یا کہانی سے شروع ہوا۔اگر چہ برج پریمی نے نثر کی مختلف اصناف سخن مثلاً تحقیق و تنقید، سفرنامہ، تراجم وغیرہ میں طبع آزمائی کی لیکن بنیادی طور پر وہ افسانہ نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔انھوں نے بے شمار کہانیاں تخلیق کیں تھیں۔اس حوالے سے خود انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے:

''میری ادبی زندگی کا سفر بیسویں صدی کے نصف میں کہانی کار کی حیثیت سے ہوا اور کافی عرصہ تک میں اپنی روح کا درد اپنی کہانیوں میں انڈیلتا رہا اور اب بھی جب کسی داخلی کرب کی ٹیس اندر ہی اندر دور تک کاٹتی ہوئی چلی جاتی ہیں تو کہانی جنم لیتی ہے۔مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ کہانی میرا پہلا عشق ہے''۔(54)

1949ء میں برج پریمی کا پہلا افسانہ''آقا''کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔یہ افسانہ روزنامہ''جیوتی''سرینگر میں شائع ہوا تھا ان کے کئی افسانے یکے بعد دیگرے مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہے۔ان کے افسانے نہ صرف ریاست بلکہ ریاست کے باہر بھی کئی جگہوں سے وقتاً فوقتاً منظر عام پر آتے گئے جن میں خاص طور پر''راہی'' (جالندھر)''معصوم''(پٹنہ)''استاذ''(سرینگر)''پگڈنڈی''(امرتسر)''جیوتی''(سرینگر)''فلمی ستارے'' (دہلی)''سب رنگ''(بمبئی)''ہمارا استاذ''(سرینگر)''دیش''(سرینگر)''گاش آگر''(سرینگر) وغیر قابل ذکر ہیں۔

متذکرہ بالا رسائل وجرائد میں ہی برج پریمی کے افسانے زیادہ تر شائع ہوتے رہے۔افسانہ''آقا''کے علاوہ

جن افسانوں کی وجہ سے برج پریمی کو مقبولیت حاصل ہوئی ان میں ''لمحوں کی راکھ''، ''ٹیس درد کی''، ''خوابوں کے دریچے''، ''ناکام محبت''، ''ہنسی کی موت''، ''اجڑی بہاروں کے جڑے پھول''، ''میری پہلی فلم''، ''شرنارتھی''، ''ولر کے کنارے''، ''سپنوں کی شام''، ''پھٹی پھٹی آنکھیں'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر ظہورالدین برج پریمی کی افسانہ نگاری میں اپنے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں:

> ''برج پریمی کی ادبی زندگی کا آغاز اردو افسانہ نگاری کے طور پر 1949ء میں ہوا۔ آپ کا پہلا افسانہ ''آقا'' سرینگر سے شائع ہونے والے اخبار ''جیوتی'' میں 1949ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد آپ کے متعدد افسانے ''بیسویں صدی'' دہلی، ''راہی'' جالندھر ''فلمی ستارے'' دہلی ''پگڈنڈی'' امرتسر ''سب رنگ'' بمبئی اور ''ہمارا ادب'' سرینگر وغیرہ ملک کے نامور جرائد میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے''۔(55)

مذکورہ بالا اقتباس سے برج پریمی کے تخلیقی سفر کے بارے میں پوری طرح سے واقفیت ہو جاتی ہے۔ برج پریمی کی مختلف تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔ یہ تصانیف مختلف موضوعات پر مبنی ہیں ان میں اردو زبان سے متعلق بہت سے موضوعات شامل کیے گئے ہیں۔ ان تمام تصانیف کا ذکر اس طرح ہے:

''سپنوں کی شام'' بھی برج پریمی کی ایک اہم کتاب ہے۔ یہ برج پریمی کے سولہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ یہ بات یاد رکھنا بہت ضروری ہے کہ برج پریمی بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے افسانوں سے ہی اپنی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ ان کے افسانے ہندو پاک کے مختلف رسائل و جرائد میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ اس افسانوی مجموعے میں شامل افسانے مندرجہ ذیل ہیں۔ جن میں خاص طور پر خوابوں کے دریچے، ٹیس درد کی، لمحوں کی راکھ، امر جیوتی، میرے بچے کی سالگرہ، سپنوں کی شام، ہنسی کی موت، اجڑی بہاروں کے اجڑے پھول، بہتے ناسور، ننھی کہانیاں، چلمن کے سایوں میں، گرتے آنسو، آنسوؤں کے دیپ، مانسبل جب سوکھ گیا، یاد، شرنارتھی قابل ذکر ہیں۔

متذکرہ بالا تمام افسانوں کا مطالعہ کرنے سے برج پریمی کی کہانیوں میں دو باتیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں ایک تو یہ کہ برج پریمی کو اپنی وادئ کشمیر سے جتنی محبت اور اپنے ہم وطنوں کے لیے جتنا درد ان کے دل میں ہے، اس کی عکاسی ان افسانوں کے میں دیکھی جاسکتی ہے۔ جس زمانے میں یہ کہانیاں تحریر کی جارہی تھیں اس دور کے کشمیر اور اس کے بعد کے کشمیر میں بہت سی تبدیلیاں آچکی ہیں۔ برج پریمی اگر آج زندہ ہوتے تو ان کی قلم کو اس دور سے زیادہ آج کے دور

میں مقبولیت حاصل ہوتی چونکہ جس طرح سے انھوں نے کشمیر کی ہر شئے کی عکاسی کی ہے شاید ہی کوئی دوسرا کر پاتا۔ دوسری اور اہم بات جو ان افسانوں کے مطالعے سے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں مارکس اور لینن کا ذکر بھی اپنی کہانیوں میں کیا ہے اور ترقی پسندی کی ان علامتوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو انہیں عزیز تھیں۔ برج پریمی بنیادی طور پر ترقی پسند ادیب تھے اور افسانوی ادب کو ان کی بہت بڑی دین یہی ہے کہ انھوں نے وادئ کشمیر کو ایک ذہن، دردمند اور انسان دوست ادیب کی نظر سے دیکھا۔ اوران کی نگاہیں ہمیشہ ان مسائل پر جمی رہتی تھیں جو ایک عام آدمی کے مسائل تھے۔ اس بات کا اندازہ ان کے افسانوں کو پڑھ کر لگایا جاسکتا ہے۔ جن مسائل کو برج پریمی نے ابھارنے کی کوشش کی تھی وہ نہ صرف اس دور میں بلکہ موجودہ دور میں بھی وادئ کشمیر کے عام آدمی میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس افسانوی مجموعے کے بارے میں کشمیری لال ذاکر نے اپنے الفاظ کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''لگتا ہے کہ برج پریمی نے ایک خاص عرصہ تک ہی کہانیاں لکھیں۔ اس کے بعد اس نے اپنے آپ کو تحقیقی کام میں لگا دیا۔ جو کہانیاں میرے سامنے ہیں ان میں آخری کہانی ''لمحوں کی راکھ'' اکتوبر 1978ء میں ماہنامہ ''فلمی ستارے'' دہلی میں چھپی تھی۔ باقی سب کہانیاں 1949ء سے 1978ء کے دوران لکھی گئی ہیں جن میں سے سوائے دو ایک کے سب ہی شائع شدہ ہیں۔ ایک بات جو ان سبھی کہانیوں میں مشترک ہے وہ یہ ہے کہ برج پریمی کا کہانی لکھنے کا انداز خود کلامی کا انداز ہے یعنی سلی لوکی (Soliloguy) کا انداز اس کا ہر کردار خود کلامی کرر ہا ہے اور جب وہ کسی دوسرے شخص کے بارے میں بولتا ہے یا اپنے سماج اور ماحول کا ذکر کرتا ہے تو لگتا ہے کہ وہ اپنے آپ ہی سے گفتگو کر رہا ہے۔ خود کلامی کا یہ عمل بڑا ہی عذاب ہوتا ہے۔ کیونکہ بات کرنے والا جب بات کرتا ہے تو اپنی روح میں لگے ہوئے پرانے اور نئے زخموں کو چھیڑتا ہے اور جس کسک کا احساس اسے خود ہوتا ہے وہی کسک دھیر دھیرے پڑھنے والوں تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ میں اسے لکھنے والے کی ایک بڑی اچیومینٹ (Achievement) سمجھتا ہوں لیکن اس سے کہانی کمزور ہوجانے کا بھی امکان رہتا ہے''۔(56)

''مباحث'' اس کتاب میں برج پریمی کے مختلف موضوعات پر لکھے ہوئے مضامین شامل ہیں۔ جن میں مولانا ابوالکلام آزاد بحیثیت انشا پرداز، سردار جعفری اور قومی یکجہتی، مختصر افسانے کا آرٹ، لفظوں کا جادوگر کرشن چندر، کشمیری

غزل، کشمیری افسانہ، کشمیری ڈراما، منٹو اور فلم، لمحے جو زندہ ہیں، پریم چند اور ہندوستانی فلم وغیرہ کے نام خاص طور پر اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کتاب میں ایک حصہ بچوں کے ادب کے لیے بھی وقف کیا گیا ہے۔ یہ مجموعہ بھی ادب کے طالب علم کے لیے بہت ہی مفید اور کارآمد ہے۔ برج پریمی کی یہ تصنیف رچنا پبلی کیشنز، جموں سے 1997ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کو برج پریمی کے فرزند پریمی رومانی نے ترتیب دے کر شائع کیا۔ اس کتاب کے بارے میں پریمی رومانی لکھتے ہیں کہ:

> ''والد محترم ڈاکٹر برج پریمی (مرحوم) کی نگارشات کو مباحث کے نام سے آپ کے سامنے پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ کتاب میں شامل مضامین ان کی مختلف النوع فکری اور تجزیاتی کاوش کا ماحصل ہیں اور ان کے اندازِ نظر اور انداز فکر کی نشاندہی کرتے ہیں''۔(57)

اس متذکرہ بالا تصانیف کے علاوہ برج پریمی نے ''مرغبانی اور شجرکاری'' کے عنوان سے بھی دو کتابیں تحریر کیں تھیں۔ ''مرغبانی'' ان کی ایک مختصر سی تصنیف ہے اس کتاب کو ریاست جموں وکشمیر اسٹیٹ بورڈ آف اسکول ایجوکیشن نے ستمبر 1981ء میں شائع کیا تھا۔

برج پریمی کو بحیثیت افسانہ نگار ریاست جموں وکشمیر میں کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے کئی افسانے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ اگرچہ ان کے افسانوں میں بہت سی خوبیاں ہیں مگر کچھ خامیاں بھی ہیں بقول پروفیسر عبدالقادر سروری کہ:

> ''برج کشن افسانوں میں کشمیر کی زندگی کو پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کشمیری پس منظر ان میں زیادہ نمایاں نہیں''۔(58)

اگرچہ برج پریمی کے افسانوں میں خامیاں موجود ہیں مگر بہت سی خوبیاں بھی ان کے افسانوں میں پائی جاتی ہیں۔ یہ بات قابل قبول ہے کہ ان کی تمام کہانیاں کشمیری عوام کی زندگی کے اردگرد گھومتی ہیں۔ ان کی ایک کہانی ''ہنسی کی موت'' جو ماہ نامہ ''شعلہ وشبنم'' جون 1956ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کہانی میں مصنف نے ایک پڑھی لکھی ترقی پسند لڑکی اور اس کے دق زدہ شوہر کی کہانی کو پیش کیا ہے۔ یہ دونوں میاں بیوی شہر کے مشینی نظام سے دور مانسبل جھیل جو علاقہ ادھم پور صوبہ جموں میں واقع ہے اس جھیل کے قریب دونوں میاں بیوی گاؤں میں زندگی گزارنے آتے ہیں۔ شوہر ایک چھوٹی دکان دیکھ کر اس میں منشی کی ملازمت کر لیتا ہے اور بیوی دن دیاڑے مستقبل کے خواب دیکھنے میں لگ جاتی ہے وہ

خوابوں میں اتنا کھو جاتی ہے کہ خود ایک بھولا بسرا خواب بن جاتی ہے اور قلب کی حرکت بند ہونے سے اس کی موت ہو جاتی ہے۔ برج پریمی چونکہ اس عہد کی ترقی پسندی سے بے حد متاثر تھے اس لیے ان کی کئی کہانیوں میں بھی ترقی پسندی کا اثر دیکھا جا سکتا ہے۔ برج پریمی کے افسانوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے افسانوں میں موضوعات مثلاً مہاجن، ٹھیکہ دار، لمبی توندوں کے ڈراونے سپاہی، غریبوں کی بے بسی، بھوک افلاس وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس حوالے سے ان کا ایک افسانہ ''میرے بچے کی سالگرہ'' جو ماہنامہ ''دیش'' سرینگر مارچ 1958ء میں شائع ہوا۔ افسانہ میں مصنف نے ایک نوجوان شوہر جو باپ بننے کی خبر سن کر اپنی زندگی ماہ و سال گزر جانے کا جو احساس ہوتا ہے اس کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''میرے بچے نے آج تیسری بہار میں قدم رکھا ہے بہار............ جو بڑی حسین ہوا کرتی ہے جس میں پھول اور خوشبو اور حسن رنگ اور نور نہ جانے کہاں کہاں سے ابھر کر دھرتی کے جگر چاک کر کے باہر پھوٹ آتا ہے جیسے یک بخت کوئی چشمہ نیند کی مدھ ماتی گود سے جاگ پڑا ہو............''۔(59)

اس کے علاوہ برج پریمی کے دیگر قابل ذکر افسانوں میں ''پھٹی پھٹی آنکھیں''، ''مانسبل''، ''فرض''، ''اس کی موت''، ''لمحوں کی راکھ''، ''منی کہانیاں''، ''زاوے''، ''راجو''، ''قبا کے ایک طرف''، ''یہ گیت یا سزا''، ''قاشیں'' وغیرہ مختلف اخبارات ورسائل میں چھپ کر آ چکے ہیں۔

''سپنوں کی شام'' برج پریمی کا فضا اور موقف کے اعتبار سے ایک اچھا افسانہ ہے۔ اس افسانے میں مصنف نے وادیٔ کشمیر کی بہترین انداز میں عکاسی کی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس میں کشمیر کی نکھری ہوئی فضا ملتی ہے۔ اس میں مصنف نے اومپورہ کے ایک اسکول ماسٹر کی کہانی کو بیان کیا ہے۔ جو اپنے صاحب خانہ کی لڑکی ساجی اور اس کی سہیلی نوری کو رات میں الاؤ کے قریب بیٹھا کر کہانیاں سنایا کرتا تھا۔ اس افسانے میں تین مرکزی کردار ہیں ساجی، نوری اور اسکول ماسٹر۔ ساجی جو کہ بہت کم باتیں کرتی ہے برعکس اس کے نوری ایک آزاد خیال کی لڑکی ہے جو بغیر سوچے سمجھے بہت زیادہ باتیں کرتی رہتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''کبھی کبھی تصویریں دیکھنے کے بہانے ساجی اور نوری بھی آتی۔ ساجی خاموش رہتی لیکن نوری سوالوں کی بوچھاڑ کرتی۔ ''آپ کی شادی ہوئی ہے؟''۔ ''کب ہوگئی''، ''کس سے

شادی کریں گے آپ''،''آپ کا شہر کیسا ہے؟''،''آپ حقہ کیوں نہیں پیتے؟''،''کیا آپ نے کھیل کود کا مزہ چکھا ہے؟''،''کیا آپ سفیدے پر چڑھ سکتے ہیں؟''،''مکئی کے بھٹے آپ کو کیوں پسند ہیں؟...........''۔(60)

ایک ساجی جب کسی کام کے لیے پہاڑ کی طرف گئی ہوئی تھی تو واپس پہاڑ کی ڈھلوان پر سے اتر رہی تھی تو بارش میں بھیگ کر مٹی کا ایک بڑا تودہ چٹان سمیت گرنے کو تھا۔اس دوران ماسٹر خدائی فوجدار کی طرح وہاں پہنچ گیا اور ساجی کو موت کے منہ سے بچالیتا ہے۔اس کے بعد ساجی اور ماسٹر میں محبت ہو جاتی ہے کچھ دن کے بعد نوری کی شادی بھی ہو جاتی ہے اور ماسٹر سے ساجی کا ملنا کچھ دنوں تک بند ہو جاتا ہے کیونکہ نوری کے ساتھ ساجی ماسٹر سے ملنے جایا کرتی تھی ایک دن ماسٹر رمضان جو کے بچوں کو پڑھا رہا تھا کہ رمضان جو نے ماسٹر کو ساجی کے گھر جانے کے لیے کہا ماسٹر نے وجہ طلب کی تو معلوم ہوا کہ ساجی کی شادی ہونے والی ہے۔اس افسانے میں مصنف نے ساجی اور ماسٹر کی محبت کو پیش کیا ہے مگر ساتھ ہی ساتھ اس میں ہمیں وادئ کشمیر کی تہذیب وکلچر،رسم ورواج وغیرہ کی عکاسی بھی ملتی ہے ملاحظہ ہو اقتباس:

''ساجی کی شادی...........ساجی کی شادی...........جیسے فضاؤں میں صرف یہی آواز ڈول رہی ہو۔جیسے چنار کے سرخ پتے عجیب سی سرسراہٹ پیدا کر کے نیچے گر پڑے ہوں یا جیسے بہار نے کھڑکیوں کے پیٹ کھولنے کے بعد اندر آنے سے پہلے قدر واپس پھیر لیے ہوں۔ ساجی نے اس ملگجی شام جب رات کا سناٹا رس آیا تھا جب اس کے گھر میں عورتیں اس کے لیے گیت گا رہی تھیں اور جب دوسرے گاؤں سے اس کا شہزادہ جیسا دولہا گھوڑے پر چڑھ کر اسے اپنے ساتھ لے جانے والا تھا۔مجھ سے کچھ بھی نہ کہا۔وہ مجھ سے ملک بھی نہ سکی۔کیوں کہ وہ ساجی تھی۔کشمیر کی ایک دیہاتی لڑکی اور ساجہاں شادی کے وقت اپنے عشق کو بھلا ڈالتی ہیں۔اور وہ اپنے محبوب سے مل بھی نہ سکتیں۔صرف اپنے آہستہ آہستہ کھیت کی منڈھیر پر کسی درخت کی چھاؤں میں چپکے چپکے آنسو بہاتی ہیں جن کو دیکھا نہ جاسکے پہچانا نہ جاسکے...........''۔(61)

''ایک بھول ایک کل''کے عنوان سے بھی ان کا ایک افسانہ ہے۔اس افسانے میں مصنف نے ایک غریب چپراسی کی مصیبتوں کی داستان کو بیان کیا ہے۔غریب چپراسی کی بیوی گوری، بچہ کی ولادت کے وقت ڈاکٹر کے نہ ملنے کی

وجہ سے جان بحق ہو جاتی ہے۔افسانے میں ایک طرح کا ڈرامائی انداز ہے۔اس افسانے میں ریاست جموں وکشمیر کے غریب اور خستہ حال لوگوں کی داستان سامنے آتی ہے۔

اس طرح کے کئی اور افسانے برج پریمی کی یادگار ہیں جنھیں کافی سراہا گیا تھا۔ڈاکٹر مغنی تبسم نے ماہنامہ ''سب رس'' حیدرآباد جون 1990ء میں برج پریمی کی شخصیت کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''ڈاکٹر برج پریمی کشمیر یونیورسٹی سرینگر میں اردو کے ریڈر تھے۔ وہ ایک اچھے افسانہ نگار اور بلند پایہ محقق تھے۔ بڑے شغف اور لگاؤ کے ساتھ تصنیف وتالیف کے کام میں منہمک رہتے تھے''۔(62)

برج پریمی کو 19/اپریل 1990ء میں دل کا دورہ پڑنے سے اچانک حالت خراب ہوگئی۔انھوں نے ڈاکٹر رتن لال چودھری سے مشورہ کیا اور 20/اپریل 1990ء کو انھیں جموں کے ایس ایم جی ہسپتال میں داخل کیا گیا۔اسی دن یعنی 20/اپریل 1990ء کو ان کا انتقال ہوگیا۔ان کی بے وقت موت پر ان کے معاصرین ملک کے بے شمار انجمنوں اور اکادمیوں، مختلف رسائل وجرائد نے انہیں خراج تحسین پیش کی۔ کشمیری لال ذاکر نے برج پریمی کی وفات پر لکھتے ہیں کہ :

> ''اس خبر سے مجھے دلی صدمہ ہوا کہ محترم ڈاکٹر برج پریمی انتقال کر گئے ....وہ میرے عزیز دوست تھے اور اس خبر نے مجھے شدید دکھ پہنچایا۔ کچھ عرصہ قبل ان کا ایک بڑا ہی دل نواز اور خوبصورت خط مجھے ملا تھا کبھی اس کا یقین نہیں تھا کہ وہ ہم سے اتنی جلد جدا ہو جائیں گے''۔(63)

لیش سروج:

لیش سروج کا اصلی نام یش رام پال تھا۔ان کی پیدائش 1933ء کے آس پاس جموں میں ہوئی۔یہیں ابتدائی تعلیم بھی حاصل کی اور مزید تعلیم بی۔اے تک ہی حاصل کر پائے۔اسی دور میں کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم کارکن بھی رہے۔اس دور میں ترقی پسند تحریک اختتام پذیر ہورہی تھی اس وقت لیش سروج روسی سفارت خانے کے اشاعت گھر میں مترجم کی خدمات انجام دے رہے تھے۔لیش سروج اردو زبان وادب میں مہارت رکھنے کے ساتھ پنجابی زبان میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے۔وہ اردو اور پنجابی کے ساتھ ساتھ ہندی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔کہانیاں تخلیق کرنے کے ساتھ

ساتھ وہ مزدور تحریک میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔مظلوم اور بے بس لوگوں کا درد انہیں چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف محنت کش طبقہ کو منظّم کرتے رہے۔ان سرگرمیوں کے دوران لیش سروج کو بہت سے بڑے بڑے لوگوں سے ملنے جلنے کا موقع فراہم ہوا جس سے انہیں مزدور تحریک کے ساتھ مزید جذبہ پیدا ہوا۔

لیش سروج کی تخلیقات کی تعداد کافی طویل ہے۔انھوں نے کئی افسانے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ان کا کہانی لکھنے کا ایک الگ ہی انداز ہے۔کہانی لکھتے لکھتے شعر بھی کہہ دیتے ہیں۔ان کے افسانوں کا مجموعہ ''زمین پیاسی ہے'' کے عنوان سے 1964ء میں شائع ہوا۔اس مجموعے میں کل بارہ افسانے ہیں۔انھوں نے جو کچھ حقیقی زندگی میں غریبوں ،مظلوموں کی حمایت اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف کیا وہی چیزیں ان کے افسانوں میں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔وہ عوام کے دکھ درد اور پریشانیوں کو اپنے دکھ درد اور پریشانیوں میں شامل کرتے ہیں۔افسانوی مجموعے ''زمین پیاسی ہے'' کا پیش لفظ انگریزی کے مشہور استاد ڈاکٹر اپورب سومناتھ نے لکھا ہے جس میں انھوں نے اپنے عزیز شاگرد کی تخلیقات کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے،اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''یہ افسانے رومانیت اور حقیقت نگاری کی عکاسی کرتے ہیں۔جواں سال افسانہ نویس نے زندگی کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس کی تخلیقات میں خلوص ومشاہدہ کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔دماغی اور دلی طور پر ایسے پسماندہ عوام سے گہری ہمدردی ہے۔مگر وہ ہمدردی کسی تماشائی کی ہمدردی نہیں بلکہ یہ اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ افسانہ نگار نے عوام کی خواہشات کو اپنے دل کی دھڑکنوں میں سمولیا ہے اور وہ عوام کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد خیال کرتا ہے''۔(64)

ان کے علاوہ دیگر افسانے بھی قابل ذکر ہیں جو مختلف رسائل واخبارات میں شائع ہوئے تھے۔جن میں خاص طور پر ''امرت جیسا زہر'' اور ''سکتے کی لاٹ'' قابل ذکر ہیں۔لیش سروج کی تخلیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت ہی جذباتی انداز میں افسانے لکھتے ہیں۔اپنے ہم عصر اور عزیز دوستوں کی طرح انہیں بھی عوام اور اطراف واکناف کے ماحول سے دلچسپی ہے۔جس میں وہ اپنے افسانوں کے ذریعے زندگی کے مسائل کو ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔''زمین پیاسی ہے'' لیش سروج کا مشہور اور نمائندہ افسانہ ہے اس افسانے میں تقسیم ہند کی کہانی کی بہترین انداز میں عکاسی کی گئی ہے۔مصنف نے اس کہانی کو اشاروں اشاروں میں اس طرح کہانی پیش کی ہے کہ قاری کے ذہن میں خود

بخود انجام ابھر جاتا ہے۔ان کی کہانیوں میں کبھی جھول نہیں ہوتا۔جس کی وجہ سے قاری ان کے افسانوں کو مزے سے پڑھتا ہے۔انہیں انسانیت سے ہمدردی ہے۔اسی لئے انھوں نے انسان کے دکھ درد اور غم کو پیش کیا ہے، رومانیت کے ساتھ حقیقت نگاری کا بھی خوشگوار امتزاج ان کے افسانوں میں نمایاں ہے۔ زندگی کے بارے میں ان کے اپنے تصورات ہیں۔اور کچھ تجربات جنہیں وہ اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں اور پیش کش کے نئے نئے انداز رقم کرنے کی کوشش کی ہے۔

ریاست جموں وکشمیر کے معروف ادیب جان محمد آزاد لکھتے ہیں:

> ''لیش سروج کی کہانیوں کو انفرادیت یہ ہے کہ ان میں اس کے اپنے گرد و پیش اس کی اپنی مٹی کی مہک ہے۔اپنی عصری زندگی کی زخمی تمنائیں ہیں۔اپنے مخصوص اس سیاسی نظریے کی تبلیغ وتشہیر ہے لیکن کہیں کہیں وہ سنبھل نہیں پاتے ہیں............''۔(65)

لیش سروج کی کہانیوں میں طرح طرح کے موضوعات پائے جاتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے لہجے میں خطابت سی آجاتی ہے اور وہ بہت زیادہ جذباتی ہو جاتے ہیں۔نفسیاتی کشمکش کی تفسیر پیش کرنے میں لیش سروج کو کمال حاصل ہے، اور اسی وجہ سے ان کی کہانیاں شعور وفکر کی ایسی شعاعوں سے قاری کو محظوظ کرتی ہیں۔اس حوالے سے ان کے دو افسانے بہت ہی اہمیت کے حامل ہیں۔''زمین پیاسی ہے'' اور'' کلائیمکس''۔افسانہ'' کلائیمکس'' کا مرکزی کردار رام لعل ہے وہ اپنی بیوی ساوتری سے بہت محبت کرتا ہے اور ساوتری کی پیشانی سہلاتے سہلاتے اپنی اور اس کی ساری سرگذشت کہتا ہے۔مصنف نے افسانے کا اختتام ایسے انداز میں کیا جس سے افسانے میں رام لعل اور ساوتری کے جذبات کی بہترین عکاسی ملتی ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''اور پھر رام لعل نے غیر شعوری طور پر کسی کے گلے کو اپنی گرفت میں لے لیا اور پھر پکڑ شدید ہوگئی، حتیٰ کہ کسی کے گلے پر رام لعل کے ہاتھوں کی آہنی گرفت کا ہالہ بن گیا اور کسی کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور پھر ساوتری کی گردن رام لعل کے ہاتھوں سے پھسل کر ایک طرف لڑھک گئے''۔(66)

اگر چہ لیش سروج نے اردو شعر وادب کے میدان میں کم لکھا مگر جتنا بھی لکھا قابل ذکر ہے۔ان کے افسانے ہئیت اور تکنیک پر کھرے اترتے ہیں۔لیش سروج کی افسانہ نگاری کا تجزیہ کرتے ہوئے ریاست جموں وکشمیر کے مشہور

فکشن نگار موہن یاور نے لکھا ہے:

''لیش سروج افسانہ کے اس فن تنوع اور تکنیک سے بخوبی واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ افسانہ زندہ جاوید کیسے بنتا ہے اور اس کے زندہ جاوید بنانے میں افسانہ نگار کو کتنا خون تھوکنا پڑتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ لیش سروج نے اپنے افسانوں کو سیاہی کے بجائے خون سے تحریر کیا ہے ''۔(67)

لیش سروج کی دیگر تخلیقات میں ''پتھر کا درد'' (افسانوی مجموعہ) ''قمقموں کے سیاہ اجالے'' (ناول) وغیرہ بھی منظر عام پر آ چکے ہیں۔ لیش سروج کے بارے میں ایک بات بہت ہی قابل ذکر ہے کہ وہ اپنے عہد کی ادبی تحریکوں سے آگاہی رکھتے تھے اور ان سے متاثر بھی ہوتے تھے۔

مدن سنگھ ٹھاکر:

مدن سنگھ ٹھاکر پونچھ (جموں) کی سرزمین سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی ولادت 1940ء کے آس پاس پونچھ (جموں) میں ہی ہوئی تھی۔ مدن سنگھ ٹھاکر کی تخلیقات کے متعلق بہت کم مواد دستیاب ہوا ہے۔ انھوں نے سب سے زیادہ طبع آزمائی افسانہ نگاری میں کی تھی مگر اس حوالے سے بھی ان کے کچھ افسانے رسالوں میں شائع ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنے معاصر افسانہ نگاروں کے منتخب افسانوں کا مجموعہ ''نثار میں تری گلیوں کے'' کے عنوان سے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ اس مجموعے میں خود ان کا اپنا ایک مشہور افسانہ ''سورگ کی سیڑھی'' قابل ذکر ہے۔ اس افسانے کے مرکزی کردار دادی اور اس کا پوتا ہے۔ مصنف نے اس افسانے میں داری کے دل میں اپنے پوتے کی بیوی سے نفرت کو پیش کیا ہے۔ افسانے کا مرکزی موضوع ایک عوامی عقیدہ ہے کہ پڑپوتا ایک ایسی سیڑھی تھام سکتا ہے جو سیدھی سورگ کو جاتی ہے او ر پردادی جو اپنے پوتے کی بیوی کو ہمیشہ کھرا کھوٹا سناتی ہے اور ہمیشہ اس سے جھگڑتی رہتی ہے لیکن جب دادی کے پوتے کو بیٹا پیدا ہوتا ہے تو اس کی وجہ سے دادی کو اپنے پڑپوتے سے بہت زیادہ لگاؤ ہو جاتا ہے پڑپوتے کی ولادت سے دادی کا رویہ ایسا بدل جاتا ہے کہ گویا بہو کی پرستش کرنے لگتی ہے۔ اس تبدیلی کا احساس بہو کو بھی ہوا اور پردادی نے بھی اسے محسوس کیا اور آخر میں پڑپوتے کے کارن دادی گھر میں سب سے محبت کرنے لگی۔ مصنف نے اس نئے رویے کو پیش کرنے میں پردادی کی زبان سے بڑی حسین توجیہہ پیش کی ہے۔ وہ بہو سے کہتی ہے:

''تمہارا نام لے کر میں اپنے آپ کو کوستی تھی۔ تم گھر کی لکشمی ہو............اور اس سارے واقعہ

میں اس کا ذاتی مفاد اور نجات کا یقین پوشیدہ تھا چنانچہ پردادی بہو کو بتاتی ہے کہ تم نہ ہوتیں، تو میرا پڑپوتا کہاں سے مجھے ملتا''۔(68)

مدن موہن شرما:

ان کی ولادت 1942ء میں میر پور (پاکستان) میں ہوئی تھی مگر کچھ ہی عرصہ بعد میر پور سے جموں چلے گئے تھے ۔جہاں باقی کی زندگی گزارنے کا موقع ملا۔ مدن موہن شرما جموں کے ذہین افسانہ نگاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اگرچہ مدن موہن شرما کا اصل وطن میر پور تھا لیکن ان کی تربیت اور تعلیم اور ذہنی نشو ونما، جموں کی ادبی فضاؤں کی مرہون منت ہے۔ مدن موہن شرما کے کئی افسانے وقتاً فوقتاً منظر عام پر آتے رہے۔راقم کے مطابق ''پتھر اور پانی'' ان کے افسانوں میں سب سے زیادہ انوکھے انداز کا افسانہ ہے۔اس افسانے کو بہت زیادہ سراہا گیا تھا اور اس کا اظہار خود مدن موہن شرما نے کیا تھا جس کا حوالہ عبدالقادر سروری نے بھی دیا ہے:

''میری اس کہانی کا پلاٹ، ایک نئی تکنیک کی طرف اشارہ کرتا ہے''۔(69)

''پتھر اور پانی''افسانے کا مرکزی کردار پرکاش ہے اور یہ واحد کردار ہے۔جس کے تاثرات کی اٹوٹ رو، ماضی کے زمانے اور بچپن کے عہد تک پہنچتی ہے۔بچپن کی دلچسپیاں، شرارتیں، کھیل کود، آشا سے جھگڑنا، اس کے بعد حال کی وارداتیں، جوانی اور اس کے جذبات کی عکاسی، آشا سے محبت، آشا سے دولت مند ہونا، آشا سے چھوٹی چھوٹی شرارتیں وغیرہ یہ سارے قصے ایک تسلسل کے ساتھ مصنف نے اس افسانے میں بیان کیے ہیں۔ جو ہمارے سامنے ایک فلم کی طرح چلتے رہتے ہیں۔

مدن موہن شرما کے اور بھی کئی افسانے منظر عام پر آچکے ہیں جو اپنے دور کے بہترین افسانوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ان کے دو مجموعے کافی اہمیت کے حامل ہیں۔جن میں ''جہاں گناہ پلتے ہیں' 'اور'' چاند کے آنسو' قابل ذکر ہیں۔

گیان چند شرما:

1947ء قبل کے لکھنے والوں میں گیان چند شرما بھی ایک اہم نام ہے۔ان کے خاندان کا تعلق جموں سے ہی تھا اور گیان چند شرما کی تعلیم وتربیت بھی جموں میں ہی ہوئی۔انہیں افسانہ نگاری سے بے حد لگاؤ تھا اسی وجہ سے انھوں نے کئی افسانے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ گیان چند شرما کا ایک افسانوی مجموعہ جو بہت ہی مشہور ہوا''بنجر دھرتی پتھر لوگ''

کےعنوان سے منظر عام پرآیا تھا۔

ان کے افسانوں میں متوسط اور نچلے طبقے کے لوگوں کی زندگی کے مسائل اور ان کے مصائب اور ان کی کمزوریوں کو پیش کرنے کی انھوں نے بھر پور کوشش کی ہے۔بعض کہانیوں میں انسانوں کی کمزوریوں کو بہت غیر رسمی او رکہیں کہیں غیرفنی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

سوم ناتھ ڈوگرہ:

سوم ناتھ ڈوگرہ،1947ء کے قبل کے افسانہ نگاروں میں قابل ذکر ہیں۔انہیں افسانہ نگاری سے بے حد شغف ہےاوران کے کئی افسانے منظر عام پرآ چکے ہیں۔ان کے چھ افسانوں پر مشتمل مجموعہ ''دوخط ایک کہانی'' بہت ہی اہمیت رکھتاہے۔''دوآنسو'1965 کے پاکستانی حملے کے واقعات پرمبنی ہے۔

سوم ناتھ ڈوگرہ کے افسانوں کا اگر گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اکثر افسانے رومانیت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔لیکن ان کے محرکات اور مرقعے الگ الگ ہیں۔سوم ناتھ ڈوگرہ کی کہانیاں شہر سے دور پہاڑی زندگی کی عکاسی کرتی ہیں۔ان کہانیوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گاؤں میں بسنے والے لوگوں کے مسائل آج بھی کہیں نہ کہیں ان کہانیوں میں دکھائی دیتے ہیں۔

خیراتی لال:

ان کا شمار بھی خطہ جموں کے 1947ء سے پہلے کے لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔جموں کے افسانہ نگاروں سے تعلق رکھتے ہوئے خیراتی لال کافی مشہور ہوئے۔ان کا اصل وطن میر پور(مدھیہ پردیش) تھا۔لیکن ولادت کے بعد وہ جموں میں آگئے تھے جہاں انھوں نے اپنی تعلیم حاصل کی۔جموں کی ادبی فضا میں ہی خیراتی لال کے ذوق کی تربیت ہوئی۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں ہمیشہ نچلے طبقے کے لوگوں کی زندگی کی عکاسی کی ہے۔مدن موہن شرما نے اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں کا ذکر کرتے ہوئے خیراتی لال کے افسانوں میں نئے رجحانات کی نشاندہی بھی کی ہے۔

''پونم کا چاند'' خیراتی لال کا ایک بہترین افسانوی مجموعہ ہے۔اس مجموعے میں ''پونم کا چاند'' افسانہ ان کا سب سے اچھا افسانہ ہے۔اس میں مصنف نے ہریش اوررونیا کی داستان محبت کو بخوبی بیان کیا ہے۔

اس افسانے میں مصنف نے اونچے اور نچلے طبقے کے نوجوانوں کے درمیان محبت جس میں لڑکی ہمیشہ اونچے

طبقے سے تعلق رکھتی ہے اور دنیا بھی اس ضابطے کی ایک شکل ہے۔ مصنف کے اس انداز کے افسانوں میں نوجوان عموماً شاعر یا ادیب ہوتا ہے اور کبھی کبھی اسے ایک اسکول ماسٹر کے روپ میں بھی دیکھا جاتا ہے۔ اس افسانے میں بھی خیراتی لال نے کچھ اسی طرح کی کہانی کو بیان کیا ہے۔ جس میں پونم کی رات کو ہریش کو وینا سے محبت نبھانے کے قول وقرار ہوئے۔ دونوں نے ایک دوسرے سے الگ نہ ہونے کے وعدے کیے مگر یہ قول وقرار محبت کرنے والے دلوں کے درمیان سیم وزر کی دیواروں کو چھیپ نہیں سکتے۔ افسانے میں بیان کے کئی اچھے مواقع بھی آتے ہیں ہریش کو وینا سے انتہا محبت ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے ہریش کا ذہن وینا کی تصویر گہرائی سے کھینچتا ہے۔ جس میں تشبیہوں کی قدرت جاذب نظر ہے۔ ملاحظہ ہو اقتباس:

> ''نیلی جھیل میں ڈولتے ہوئے کنول جیسا چہرہ، چنچل ہرنی کی سی بڑی بڑی آنکھیں، رخساروں کو چھوتی ہوئی رات کی سی زلفیں، جیسے کہ کسی مصور کی تصویر میں جان آ گئی ہو''۔
>
> (70)

برج کتیال:

ویدراہی اور موہن یاور کے ہم عصر قلمکاروں میں برج کتیال کا بھی ایک بڑا نام ہے۔ ان تینوں نے نہ صرف اردو شعروادب کی محفلیں سجائیں بلکہ ادب کی دنیا سے باہر بھی کافی گہری دوستی کا ثبوت پیش کیا تھا۔ بعض اوقات ان کے آپس کی دوستانہ مسابقت ان کی تخلیقات کے لیے کام بھی دیتی ہے۔ برج کتیال اور ویدراہی افسانوں کے علاوہ کئی دوسری اصناف سخن میں بھی طبع آزمائی کرتے رہے۔ برج کتیال کا تعلق ایک خوشحال گھرانے سے تھا۔ ان کی ولادت کے بارے میں زیادہ کچھ معلومات حاصل نہیں ہوئی البتہ اتنا ضرور ہے کہ جموں ہی ان کا وطن تھا اور یہی تعلیم اور ادبی تربیت بھی حاصل ہوئی تھی۔ ادبی ذوق زمانہ طالب علمی ہی میں نمایاں ہونے لگا تھا چنانچہ کالج کے رسالے میں وہ باضابطہ لکھا کرتے تھے۔ وہ جموں سے ممبئی چلے گئے تھے، اور فلمی دنیا سے وابستہ ہو گئے جہاں انہیں کافی شہرت ملی۔ انہوں نے ممبئی میں رہنے کے دوران کئی فلموں کے لیے کہانیاں لکھیں۔

ان کے افسانوں کا جہاں تک تعلق ہے تو ایسا لگتا ہے کہ حقیقی زندگی متحرک نظر آتی ہے اور زندگی کے ہر پہلو برج کتیال نے ابھارنے کی کوشش کی ہے اس وجہ سے ان میں حسن وخوبی کے گوشے ان کی پیش کش کے انداز سے نمایاں ہو جاتے ہیں۔ برج کتیال نے کئی افسانے اپنی یادگار چھوڑے ہیں جن میں خاص طور پر ''ایک لڑکی''، ''آنند''، ''نقاب

اور چہرے‘‘،’’مایا پنجابن‘‘،’’چھوکرا‘‘،’’آئینہ‘‘وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ان افسانوں کے موضوعات انوکھے پن اور بعض وقت تکنیک کی قدرت اور عموماً تاثر کے اعتبار سے اردو کے اچھے افسانوں میں شمار ہوتے ہیں۔ برج کتیال کے افسانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ممبئ میں رہتے ہوئے اور فلمی دنیا سے تعلق رکھتے ہوئے انھوں نے فلمی ضابطوں کے انداز کے افسانے نہیں لکھے، بلکہ اپنی ہیروئن کی تلاش بسا اوقات وہ جھونپڑیوں اور خستہ حال آبادیوں میں کرتے ہیں جن سے ان کے افسانوں میں جان پیدا ہو جاتی ہے۔

برج کتیال کا ایک مشہور افسانہ’’ایک لڑکی‘‘ایک غیر معتمد موضوع پر مبنی ہے۔اس افسانے میں مصنف نے ایک پاگل لڑکی کے کردار کو پیش کیا ہے اس پاگل لڑکی کا کردار ایسے حقیقت اور انفرادی انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ وہ ایک نمونے کے کردار کے طور پر پڑھنے والے کے ذہن میں زندہ رہ جاتی ہے۔ برج کتیال کا ایک بہترین افسانوی مجموعہ ’’موت کے راہی‘‘ کے عنوان سے منظر عام پر آیا ہے۔اس کا پیش لفظ لکھتے ہوئے رامانند ساگر نے کہا ہے کہ برج کتیال نے اپنے کردار خود ڈھونڈ نکالے ہیں۔ ان دھندلے ہوئے کرداروں کو برج کتیال اپنی جانی پہچانی فضا میں بساتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اپنے پلاٹ یا خاکے کے تانے بانے میں ان کی فطرت کے نقوش ابھارتے ہیں۔

برج کتیال کے افسانوں میں اکثر موضوعات دیہات کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں مگر اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں رومانی رجحانات کا بھی اثر دیکھنے کو ملتا ہے ۔ اس حوالے سے ان کے افسانوں کی بہترین مثال ان کا افسانہ’’نرگس کے پھول‘‘ ہے اس افسانے کو پڑھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا موضوع بہت ہی عام ہے لیکن اگر اس افسانے کی پیش کشی پر بات کی جائے تو اس میں کہیں کوئی خامی نظر نہیں آتی ہے اسی طرح سے برج کتیال کا ایک اور افسانہ’’ آئینہ‘‘ کافی مقبولیت رکھتا ہے۔اس افسانے میں نفسیاتی پہلو پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔اس کے علاوہ برج کتیال کے کئی اور افسانے قابل ذکر ہیں۔انھوں نے فلموں کے لیے جو کہانیاں لکھی تھیں ان میں خاص طور پر’’جب جب پھول کھلے‘‘ اپنے انداز کی اچھی کہانیوں میں شمار ہوتی ہے اور فلموں کے لیے لکھے گئے مکالمے بھی برج کتیال کی حیثیت کو بلند درجہ عطا کراتے ہیں۔

وجے سوری:

وجے سوری کا اصل وطن میر پور تھا مگر تقسیم وطن کے بعد وہ جموں میں آباد ہو گئے تھے۔جموں وکشمیر کے ادیبوں میں وجے سوری کو بھی ایک اہم شخصیت کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔انھوں نے افسانہ اور ناول دونوں میں طبع آزمائی کی

تھی۔

وجے سوری کی ولادت میر پور میں 1942ء میں ہوئی تھی۔اس کے بعد وہ اپنے خاندان کے ساتھ جموں میں آئے اور یہی ان کی تعلیم اورادبی زندگی کا آغاز ہوا۔ابتدائی تعلیم جموں میں حاصل کرنے کے بعد وہ سانگ اینڈ ڈراما کے شعبے میں ملازم ہوگئے تھے۔مگراس کام میں زیادہ انجام نہ دے سکے اور فوراً بعد روزنامہ ''اجالا'' کی ادارت کے فرائض انجام دینے لگے۔

وجے سوری کے بہت سے افسانے منظر عام پر آتے رہے۔اور نوعمری سے ہی وہ افسانے لکھنے میں مشغول تھے۔ان کے افسانے خاص طور پر ''تخلیق''، ''چرا''، ''پرواز''، ''پرتاپ'' وغیرہ جیسے رسائل و جرائد میں شائع ہوتے تھے۔1963ء میں ان کا مشہور افسانوی مجموعہ ''آخری سودا'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔

کشمیر میں اردو افسانہ کی ابتداء اس وقت ہوئی جب انجمن ترقی پسند مصنفین کا وجود عمل میں آچکا تھا اور اس صنفِ سخن میں بہت اچھی اچھی چیزیں لکھی جارہی تھیں یہی وہ وقت تھا جب ملک بھر میں افسانہ نگاروں کا ایک نیا گروہ سرگرم عمل تھا اور بلند پایہ افسانے لکھے اور پڑھے جارہے تھے۔ایسے وقت میں کسی شخص کا اس صنف سخن میں طبع آزمائی کرنا اور وہ بھی ایک ایسے علاقے سے جو ایک الگ تھلگ حیثیت رکھتا ہے۔

اس دور میں کشمیر میں بہت سی مشکلیں پیش آرہی تھیں اور ریاست سے باہر کے ادیبوں کے ساتھ بھی رابطہ کرنا بہت مشکل تھا۔مگر ایسے میں اردو افسانے کی ابتدا پریم ناتھ پردیسی مرحوم نے بڑی ہنرمندی کے ساتھ یہ کارنامے سرانجام دیا۔تب سے لے کر آج تک اس میدان میں بہت سے ادیبوں نے اپنی تخلیقات سے شہرت حاصل کی۔وجے سوری کا نام بھی اس سلسلے میں اہمیت کا حامل ہے۔ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''آخری سودا'' نہ صرف ریاست جموں و کشمیر بلکہ بیرون ریاست میں بھی قابل قدر سمجھا گیا۔

وجے سوری کے افسانوی مجموعے ''آخری سودا'' کا مطالعہ کرنے سے ہمیں پتہ چلتا ہے، کہ وہ اپنے افسانوں کو پیش کرتے ہوئے اس بات کو نظر انداز نہیں ہونے دیتے ہیں کہ وہ افسانہ کی دنیا میں پہلی بار قدم رکھ رہے ہیں۔مگر انھیں اس بات سے سخت نفرت تھی کہ وہ کسی ادیب سے پیش لفظ لکھوا کر احسان مند ہوں، وہ اس رسم کہن کی شکایت کرتے ہیں ایک اور بات ان کی شخصیت کے بارے میں معلوم ہوتی ہے کہ انھیں اہل وطن سے بھی بہت سی شکایتیں رہتی تھیں کہ آپ پرکھنے کے بجائے دیباچہ نگاری کی شہرت کی آنکھ سے پرکھنا چاہتے ہیں۔ان ہی باتوں سے وہ وجے سوری کو احساس اور

ناانصافی کے ساتھ ذہنی بغاوت پر کمر بستہ ہونے پر مجبور ہو جاتے تھے۔اور پھر بعد میں یہ اعلان کر دیتے تھے کہ ’’اگر دیباچہ نگار کا کام تعریف ہے تو پھر میں اپنا قلم کس غیر کو دوں‘‘۔

وجے سوری کے افسانوں میں جنسی موضوعات کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔اس کے علاوہ بھی انھوں نے کئی موضوعات پر کہانیاں لکھی ہیں ان کہانیوں میں سب کے معیار الگ الگ ہیں۔مجموعہ ’’آخری سودا‘‘ کی ’’ایک کہانی‘‘ بہترین معلوم ہوتی ہے۔

رند بھدرواہی:

رند بھدرواہی صاحب کو افسانہ اور کہانیاں لکھنے کا بہت شوق تھا اس حوالے سے ان کے دو افسانے سامنے آئے ہیں جن میں پہلا افسانہ ’’ہم ولی ہو گئے‘‘ اور دوسرا افسانہ ’’کنوئیں سے جھیل تک‘‘ ہند سماچار (اخبار) میں منظر عام پر آیا تھا۔اس کے علاوہ رند بھدرواہی صاحب نے اپنی کہانیوں اور انشائیوں کا ایک مجموعہ ’’سرایوں کا سفر‘‘ کے عنوان سے تخلیق کیا تھا جو 1996ء میں شائع ہوا تھا۔اس کتاب میں مشہور کہانیاں ’’آؤ واپس چلیں‘‘، ’’پائی دے کا فقیر‘‘، ’’فریب منزل‘‘، ’’سرابوں کا سفر‘‘، ’’اپنی کلہاڑی اپنے پتر‘‘ اور ’’اپنے بھی خفا‘‘ جیسی تقریباً پندرہ تخلیقات کو پیش کیا گیا ہے۔رند بھدرواہی کی کہانی میں ایک خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے افسانوں اور کہانیوں میں مزاحیہ انداز اپنایا ہے۔اگر چہ رند بھدرواہی صاحب بنیادی طور پر امیک شاعر کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ وہ نثر نگاری میں بھی کسی سے کم نہیں۔

اردو فکشن 1947 کے بعد:

ریاست جموں و کشمیر میں اردو زبان و ادب کی داغ بیل ہندوستان کی دیگر ریاستوں کے برعکس بہت بعد میں پڑی اور اس کی خاص وجہ یہ بھی ہے کہ اردو زبان و ادب میں ریاست کے کم ادبا و شعرا لکھنے کی طرف متوجہ ہوئے۔چوں کہ ڈوگرہ حکومت کے دوران ریاست میں اردو زبان کا آغاز ہوا مگر ڈوگرہ دور کے آخری مرحلے تک ریاست کے قلم کاروں کو اپنی تخلیقات کو شائع کرنے کی پابندی لگا دی گئی تھی۔

شاد فرید آبادی:

ان کا اصلی نام سعد اللہ بلوان تھا مگر ادبی دنیا میں وہ شاد فرید آبادی کے نام سے مشہور ہوئے۔وہ جموں کے ضلع ڈوڈہ سے تعلق رکھتے تھے اور ڈوڈہ کے بڑے ادیبوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔شاد فرید آبادی کی ولادت 15 فروری

1940ء میں ڈوڈہ ضلع کے علاقہ عسر میں ہوئی تھی۔

شادفرید آبادی بہت کم تصانیف کے مالک تھے مگر ان کی تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ موجودہ دور کے انسان کی نفسیات سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ موجودہ دور کے انسان کے کرب واضطراب کا ذکر کرتے ہیں اور موجودہ دور کے انسان کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مشتاق فریدی صاحب نے اپنی تصانیف میں شادفرید آبادی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''شاد صاحب بہت کم لکھتے ہیں مگر جب لکھتے ہیں تو فکر وخیال، فصاحت و بلاغت کے شہ پارے بکھیر دیتے ہیں۔ ان کے قلم کی روانی عبارت کو آبشار بنا دیتی ہے۔ انہیں نہ شاعر ہونے کا دعویٰ ہے اور نہ شاعروں کی صف میں بیٹھنے کے روادار ہیں۔لیکن جب شعر لکھتے ہیں تو کہنہ مشق شاعر معلوم ہوتے ہیں ۔ شاد صاحب ''نوید صبح'' کے مرتب و معاون تھے جو ''سراج''، سکول میگزین کے بعد صدر مقام ضلع ڈوڈہ کا دوسرا جریدہ تھا۔ ''آغاز سفر'' عنوان کے تحت جناب سعد اللہ شاد صاحب نے بصیرت افروز اور فکر انگیز اداریہ لکھا ہے۔ انہوں نے موجودہ دور کے انسان کے کرب واضطراب کا ذکر کر کے ان سوالوں کی طرف اشارہ کیا ہے جن کا جواب آج کا یہ مشینی دور دینے سے قاصر ہے۔''(71)

شادفرید آبادی شاعر بھی تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اردو نثر میں مقالات، مضامین، انشائیے اور افسانے وغیرہ میں بھی طبع آزمائی کی تھی۔ ان کے اکثر افسانے اور انشائیے ریاست اور بیرون ریاست کے مختلف رسائل وجرائد میں منظر عام پر آتے رہے۔

شادفرید آبادی نے بہت سارے افسانے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ اگر چہ ان کے ابتدائی افسانوں میں کہیں کہیں فنی خامیاں موجود تھیں مگر بہت کم عرصہ میں انہوں نے افسانہ نگاری میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ انہوں نے بہت سارے افسانہ نگاروں کے افسانوں کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ شادفرید آبادی کے افسانوں میں زیادہ تر سماجی برائیوں کا ذکر ملتا ہے۔ اس حوالے سے ان کا ایک مشہور افسانہ ''شاخ بریدہ'' کے عنوان سے ''رہنمائے تعلیم دہلی'' میں جون 1974ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس افسانے میں مصنف نے تین مرکزی کرداروں کے ذریعے سے غریبی کو پیش کیا ہے۔ اس میں تین کردار کرم داس، موہنی اور باس اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کرداروں کے روپ میں مصنف نے

امیروں کی بے راہ روی اور مظلوموں کے مسائل کو پیش کیا ہے۔اس افسانے میں کردار نگاری مکالمہ نگاری سے اصل زندگی اور سماجی حقیقت کو دیکھا جاسکتا ہے۔اس افسانے میں کرم داس ایک غریب اور محنتی آدمی تھا۔ایک بار میں وہ پیسوں کے لالچ میں آ گیا اور اس کی بیوی موہنی دفتر کے باس کے نرغے میں پھنس گئی۔جب باس اور موہنی کی محبت کے چرچے ہونے لگے تو کرم داس کو اس بات کی خبر ہوئی کہ اس کی بیوی موہنی اور کسی غیر سے رنگ رلیاں منا رہی ہے۔جب سماج کے لوگوں نے کرم داس پر الزام لگانا شروع کئے تو ایک دن وہ غصے میں اپنے ہاتھ میں خنجر لیے انتقام کے لیے نکل پڑا۔وہ دبے پاؤں کوٹھی کے اندر داخل ہوا جہاں اسے اپنی بیوی موہنی اور باس کی کچھ آوازیں سنائی دی۔اس نے دیکھا کہ دونوں اندر بند کمرے میں رنگ رلیاں منا رہے تھے۔کرم داس غصے سے لال ہو گیا۔اس نے ٹھوکر سے دروازہ کھولا اور اپنے ہاتھ میں خنجر لہرایا۔اتنے میں باس نے اپنے جیب سے پستول نکالا اور کرم داس کا ہاتھ ہوا میں معلق ہو کر رہ گیا۔اس دوران جو جزبات بھرے الفاظ کرم داس نے اپنی بیوی سے کہے ہیں واقع قابل تعریف ہیں۔ملاحظہ ہو اقتباس:

> ''کاش تم جانتی میں تم سے کتنا پیار کرتا ہوں۔یہ درندہ تیری بہار لوٹ کر شراب کی خالی بوتل کی طرح گندی نالی میں پھینک دے گا۔میں نے دیوی کی طرح دل کے مندر میں تجھے سجا کر تیری پوجا کی۔مگر نادان تو نے اپنی جوانی اور حسن کو اپنے ہاتھوں سے رسوا کیا ہے۔''(72)

شاد فرید آبادی کے افسانوں میں روزمرہ کے غم اور غم میں زندگی ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے۔جہاں ایک طرف انہوں نے اپنے افسانوں میں زندگی کے ناکام مراحل، حسرتیں، دکھ درد، جدوجہد زندگی کو پیش کیا ہے تو وہیں دوسری طرف کرداروں کے ظاہر و باطن کا بھی تجزیہ کیا ہے۔

قیصر کشتواڑی:

جموں خطے سے تعلق رکھنے والے قیصر کشتواڑی کا نام بھی اردو شعر و ادب میں کافی اہمیت کا حامل ہے۔ان کا اصل نام من موہن گپتا تھا اور قیصر کشتواڑی تخلص کرتے تھے۔ان کی پیدائش 14 اگست 1941ء کو ہوئی تھی۔ابتدائی تعلیم انہوں نے اپنی ہی سرزمین کشتواڑ میں حاصل کی تھی قیصر کشتواڑی انجمن ترقی ادب کشتواڑ چلنت کلچرل فورم کشتواڑ اور گلستان ادب کشتواڑ کے ساتھ کافی عرصہ تک وابستہ رہے تھے۔اس دوران انہوں نے ان انجمنوں میں کئی اہم کارنامے انجام دئے۔

قیصر کشواڑی نے زیادہ تر افسانے، خطوط اور مضمون وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے۔ان کے مشہور افسانوں میں

خاص طور پر ''شکست کس کی''، ''وشواس جو ہار گیا'' اور ''بہو چلی'' وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔انہوں نے اپنے افسانوں میں اپنے گرد کے ماحول اور سماجی مسائل کو پیش کیا ہے۔

پروفیسر ظہورالدین:

جموں خطے کے اردو نثر نگاروں میں 1947ء کے بعد کے لکھنے والوں میں چند بڑے نثر نگاروں کے نام سامنے آتے ہیں۔جن میں ایک نام پروفیسر ظہورالدین کا بھی ہے۔ان کی پیدائش 1942ء میں جموں کے ضلع ادھمپور میں ہوئی تھی۔ابتدائی تعلیم انہوں نے ضلع ادھمپور سے حاصل کی تھی۔اس کے بعد انہوں نے اپنی ایم۔اے کی ڈگری یونی ورسٹی آف جموں سے حاصل کی۔اس کے علاوہ انہوں نے انگریزی میں بھی ایم۔اے کیا تھا۔ظہورالدین صاحب نے اردو ادب کے مشہور و معروف محقق پروفیسر گیان چند جین کی نگرانی میں اپنی پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔انہوں نے ''بیسویں صدی کے اردو ادب میں انگریزی ادبی رجحانات'' کے عنوان سے پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ پیش کیا تھا۔ان کا یہ تحقیقی مقالہ بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔جو ریاستی کلچرل اکیڈمی کی جانب سے 1978ء میں شائع کیا گیا تھا۔اس مقالے میں انہوں نے ادب کی غرض و غایت کلاسیکیت اور رومانی نظریات کے حوالے سے بحث کی ہے۔ظہورالدین نے اپنے اس مقالے میں اردو ادب کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب کے حوالے سے بھی اہم باتوں کی نشان دہی کی ہے۔انہوں نے اس مقالے کو اکٹھا کرنے کے لیے انگریزی کے بہت سارے ماخذوں سے استفادہ کیا تھا۔اس مقالے کے بارے میں برج پریمی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''ظہورالدین نے اپنے مقالے میں اردو کے ساتھ انگریزی ادب کے اہم رجحانات کو بڑی محنت سے تلاش کیا ہے۔ایسا کرتے ہوئے انہوں بڑی دیدہ وری کا ثبوت دیا ہے۔انہوں نے انگریزی ماخذوں سے اپنا مواد اکٹھا کیا ہے اور پھر بیسویں صدی کے اردو ادب میں ان رجحانات کو دریافت کرنے کی سنجیدہ کوشش کی ہے۔''(73)

اس کے علاوہ مقالے کے آخر میں سوانحی خاکے بھی دیے گئے ہیں جو کافی اہمیت کے حامل ہیں۔اس کے بعد پروفیسر ظہورالدین نے اردو ادب کی دنیا میں بہت اہم کارنامے انجام دیے ہیں۔انہوں نے کئی کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔جن میں ''تلافی'' (افسانوی مجموعہ)، ''اوڈی سوز'' (طویل افسانہ)، ''کینی بلز'' (افسانوی مجموعہ) ہے۔

پروفیسر ظہور الدین ان کے علاوہ کئی تصانیف کے مالک تھے۔ وہ جموں کے ایک اچھے فکشن نگار بھی تھے۔ ان کے کئی افسانے مختلف رسائل وجرائد میں وقتاً فوقتاً منظر عام پر آتے رہتے ہیں۔ ان کے افسانے زیادہ تر 1970ء کے بعد ہی سامنے آئے تھے اور اس کے بعد پروفیسر ظہور الدین کو جموں خطے کے اولین افسانہ نگاروں میں شامل کیا جانے لگا۔ بقول جان محمد آزاد:

''ادھر 1970ء کے بعد ریاست جموں وکشمیر میں نئے افسانہ نگاروں کا ایک قافلہ رواں دواں نظر آنے لگا۔ اردو افسانہ اس دوران روایات سے انحراف کر کے نئے تغیرات سے آشنا ہونے لگا۔ ظہور الدین اس نئے دبستان کے اولین مبلغین میں شامل تھے۔'' (74)

ریاست جموں وکشمیر کے نئے اور علامتی افسانے کی روشنی میں ایک اہم نام پروفیسر ظہور الدین کا ہے۔ ان کے افسانوں میں ایک خاص بات یہ ہے کہ انہوں نے جدیدیت کے اندھے طوفان کو فوراً قبول نہیں کیا تھا بلکہ فنی اور تکنیکی سطح پر انھوں نے افسانوں کا گہرائی سے تجزیا کیا تھا۔ اس کے بعد بہت سارے افسانوں کے اثرات ان کی تخلیقات میں دکھائی دینے لگے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں بدلتے ہوئے دور کی عکاسی بڑے بہترین انداز میں کی ہے۔ اسی کی ساتھ ساتھ انہوں نے اپنے گردوپیش کے سماج میں گزرنے والے اہم مسائل کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ پروفیسر ظہور الدین بہت ہی غور وفکر سے لکھتے ہیں۔ افسانہ نگاری کے فن سے انہیں گہری واقفیت تھی۔ وہ ہر ایک جملے کو سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں عصری زندگی کے اضطراب، بے مقصدیت اور انسانی نفسیات کے مختلف پہلو دکھائی دیتے ہیں۔ اس حوالے سے ان کے قابل ذکر افسانوں میں نجات، بدروح، درشہسوار، بیگ والا اور کینی بلنز وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانے ''نجات'' میں موجودہ دور کے انسانی المیے کو بڑے بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔ جس طرح سے سائنسی اور صنعتی ترقی نے انسان کو مالی خوشحالی بخشی ہے۔ اس نے ہر انسان کے ذاتی اوصاف کو مسخ کر دیا ہے۔ اور موجودہ دور کا انسان ہر وقت ذہنی اور روحانی انتشار کا شکار ہوتا جا رہا ہے۔ یہی سب چیزیں پروفیسر ظہور الدین کے افسانوں میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

''کینی بلنز'' مصنف کا سب سے اہم اور مشہور افسانوی مجموعہ ہے۔ ان کا یہ افسانوی مجموعہ 1981ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ اس مجموعے کو انہوں نے دو حصوں پر مشتمل کیا ہے۔ پہلے حصے میں انہوں نے علامتی طرز کے آٹھ سے زیادہ افسانوں کو شامل کیا ہے۔ اس مجموعے کی یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس کے دوسرے حصے کے افسانوں میں مصنف کی

انفرادیت پسندی کے غماز ہیں۔اگر چہ ان کی طرز تحریر کو سپاٹ اور بے رنگ بتایا گیا ہے۔مگر ان افسانوں میں انسان کی ہزمیت خوردگی کی سچی تصویریں دیکھی جا سکتی ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ ان افسانوں میں ایک اور بات خصوصیت کی حامل ہے کہ ان تحریروں میں پروفیسر ظہورالدین نے شعور کی رو، وجودیت اور بعض دیگر جدید رجحانات سے کافی حد تک استفادہ کیا تھا۔اوراس کے علاوہ انہوں نے اکثر جگہ پر اس افسانوی مجموعے میں افسانے کی ہیئت اور فن کو لے کر بھی مطالعے اور تجربے کئے ہیں۔ان کے اس افسانوی مجموعے کو بڑے بڑے ادیبوں نے سراہا تھا اور 1982ء میں یوپی اردو اکیڈمی کی جانب سے پروفیسر ظہورالدین کو انعام سے بھی نوازا گیا تھا اور ساتھ میں پانچ ہزار روپے کی رقم بھی پیش کی گئی تھی۔

افسانہ ''بیگ والا'' پروفیسر ظہورالدین کے اہم افسانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ان کا یہ افسانہ سلیم سالک کی کتاب ''جموں وکشمیر کے منتخب اردو افسانے'' میں بھی 2011ء میں منظر عام پر آیا تھا۔یہ ایک علامتی افسانہ ہے۔اس میں مصنف نے غریبوں، بے بس اور مظلوموں کی بہترین عکاسی کی ہے۔جنہیں عمر بھر اپنے دکھ درد کو اپنے ساتھ چلنا ہوتا ہے۔اوران غریب اور بے بس لوگوں کو کبھی بھی خوشی نصیب نہیں ہوتی ہے۔بلکہ وہ جب مرتے ہیں تو ان کے دکھوں کا بوجھ ان کے آنے والی نسلوں کے کاندھوں پر آجاتا ہے۔جو نسل در نسل آگے چلتا رہتا ہے۔یہی سب باتیں مصنف نے اس افسانے میں بیان کی ہیں۔اس افسانے کے دومرکزی کردار ہیں۔ایک بیگ والا اور دوسرا برہنہ شخص۔بیگ والا اس افسانے میں پورے انسانی وجود کی عکاسی کرتا ہے۔اس کے بیگ میں وہ پورے دکھ درد ہوتے ہیں جو اس کے والد کے بعد اس کے کندھوں پر آجاتے ہیں اور وہ اس بوجھ کو اٹھائے اپنی منزل کی طرف چل پڑتا ہے۔مگر وہ منزل بھی ایسی منزل ہے کہ جس کو وہ پا نہیں سکتا ہے اور اس کی موت منزل سے پہلے ہی ہو جاتی ہے۔راستے میں اسے کی برہنہ شخص سے ملاقات ہوتی ہے جو اس کے ساتھ ایک سائے کی طرح چلتا ہے۔وہ بیگ والے کو بہت سمجھانے کی کوشش کرتا ہے مگر بیگ والا اسے ہر بار نظر انداز کر دیتا ہے۔اسی دوران ان کی راستے میں بہت ساری باتیں ہوتی ہیں۔جو سالوں سال چلتی رہتی ہیں۔بیگ والا کے راستے میں ایک بیمار کتا اور ایک بیمار بندر آتا ہے اور بیگ والا اپنے کندھوں کے بوجھ کو اور بڑھا دیتا ہے اور اس بندر اور کتے کو کندھوں پر اٹھا کر اپنی دیسی دوا سے ٹھیک کرتا ہے۔ایک دن بیگ والے کا بوجھ تو ختم نہیں ہوتا ہے مگر اس بوجھ کو اٹھاتے اٹھاتے اس کی موت ہو جاتی ہے اور کتا اور بندر اس کی لاش پر اس کے اٹھنے کا انتظار کرتے ہیں۔غرض کہ اس افسانے میں مصنف نے علامتی انداز میں اس کے زندگی بھر کے بوجھ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ بوجھ بھی اس قدر بھاری ہے جو منزل سے پہلے ہی انسان کی جان لے لیتا ہے۔مثال کے طور پر اس افسانے کا

اقتباس:

''جب وہ گھر سے روانہ ہونے لگا تو اس کے بوڑھے باپ نے ایک بڑا سا بیگ اسے تھماتے ہوئے کہا۔''اس میں تمہاری ضرورتوں کی سبھی اشتہار موجود ہیں۔تم اگر ان کا درست استعمال کرتے رہے تو بہ آسانی منزل مقصود تک پہنچ جاؤ گے۔۔۔وہ چلتا رہا۔ چلتا رہا۔ پتھریلی اور پرخار راہوں کو ناپتا رہا۔۔۔ پہاڑوں، جنگلوں اور ویرانوں کے سینوں کو چیرتا رہا۔ تاریک اور روشن وادیوں میں پگڈنڈیوں اور شاہروؤں پر اس کے قدم گونجتے رہے۔''(75)

دوسری مثال:

''تمہارا باپ بھی یہی سوچ کے اسے عمر بھر اٹھائے پھرتا رہا اور جب اس کے شانوں میں اسے اٹھانے کی سکت نہ رہی تو اس نے یہ تمہارے کندھوں پر ڈال دیا۔اب تم اسے اٹھائے پھر رہے ہو اور جب تمہارے شانے بھی شل ہو جائیں گے تو تم اسے دوسروں کے کندھوں پر ڈال دو گے اور اس طرح یہ بوجھ نسل در نسل، شانہ بہ شانہ منتقل ہوتا رہے گا۔''(76)

''کینی بلیز'' کے علاوہ پروفیسر ظہورالدین کا ایک اور افسانوی مجموعہ ''تلافی'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔نور شاہ پروفیسر ظہورالدین کی ادبی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان کے تحریر کردہ تنقیدی اور تحقیقی مضامین نئی نسل کے قلم کاروں کے لیے مشعل راہ ہیں۔ان کی تحریر کردہ افسانوں میں علامت کا جو صحیح اور پر معنی ادراک ملتا ہے اس کا اندازہ لگانے کے لیے ان کا افسانہ بیگ والا۔۔۔''(77)

ڈاکٹر عبدالمجید بھدرواہی:

جموں خطے کے ضلع ڈوڈہ سے تعلق رکھنے والے افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام ڈاکٹر عبدالمجید بھدرواہی کا بھی ہے۔اگر چہ انہوں نے اردو شعر و ادب میں بہت کم لکھا تھا مگر ان کی تحریریں بہت ہی قابل تعریف تھیں، ان کی پیدائش 3 مئی 1943ء کو ہوئی تھی۔ ان کے والد کا نام خواجہ عبدالکریم تھا۔ جو محلّہ مسجد بھدرواہ میں رہائش پذیر تھے۔ ڈاکٹر عبدالمجید بھدرواہی کی ابتدائی تعلیم بھدرواہ کے مڈل اسکول میں ہوئی۔اس کے بعد انہوں نے اپنی پرائمری اور میٹرک کی تعلیم سری امر ہائی اسکول بھدرواہ سے حاصل کی۔اس کے بعد انہوں نے مزید تعلیم کے لیے گورنمنٹ ڈگری کالج

بھدرواہ میں داخلہ لیا جہاں سے انہوں نے اپنی ایف۔ایس۔سی کی تعلیم حاصل کی اور پھر پٹیالہ (پنجاب) سے ایم۔بی۔بی۔ایس کی ڈگری بھی حاصل کی۔اس کے فوراً بعد ڈاکٹر عبدالمجید بھدرواہی میڈیکل آفیسر بھدرواہ اور کشتواڑ میں تعینات ہوئے۔انہوں نے اپنی ملازمت کے دوران کئی جگہوں پر اپنی خدمات انجام دی ہیں۔جن میں خاص طور پر کشتواڑ، سامبہ، اکھنور، بانہال اور رام بن قابل ذکر ہیں۔اس کے بعد وہ ترقی پا کر اسٹنٹ ڈائرکٹر کنڑول بنائے گئے تھے۔جہاں انہوں نے کافی عرصہ تک کام کیا کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے بہ حیثیت چیف میڈیکل آفیسر راجوری میں اپنی خدمات انجام دی ہیں۔اس کے بعد حکومت نے پھر سے انہیں راجوری سے ڈوڈہ میں بہ حیثیت چیف میڈیکل آفیسر تعینات کیا۔20 اگست 1996ء کو انہوں نے چیف میڈیکل آفیسر جموں کے عہدے کا چارج بھی سنبھالا تھا اور اپنی زندگی کے آخری دور میں جموں میں سی۔ایم۔او بھی رہ چکے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالمجید بھدرواہی صاحب کو افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ شعر وشاعری سے بھی کافی لگاؤ تھا۔وہ تخلیق کاروں کی بہت عزت کرتے تھے۔اور انہیں افسانہ نگاری کا شوق بھی اپنی ابتدائی تعلیم سے تھا اور طالب علمی کے دوران ہی انہوں نے اردو ادب کے کئی بڑے افسانہ نگاروں کا مطالعہ کیا تھا اور ان میں سب سے زیادہ وہ سعادت حسن منٹو کے افسانوں کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔انہوں نے ریاست جموں وکشمیر کے معروف شاعر وادیب مرحوم عشرت کاشمیری کی شاگردی اختیار کی تھی اور ان کی شخصیت میں ڈاکٹر عبدالمجید نے کافی فیض اٹھایا تھا۔عشرت کاشمیری بھی اس وقت ریاست کے نئے لکھنے والوں کی خوب حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ان میں ایک نام ڈاکٹر عبدالمجید کا بھی تھا۔ان کے افسانے ریاست اور بیرون ریاست کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ڈاکٹر عبدالمجید بھدرواہی کے مشہور افسانوں میں جلتا گلاب، منی آرڈر، آدمی آدمی، تلاش، لکیر، آپ بیتی، دھواں، لو آپ اپنے دم میں، آنچ وغیرہ قابل ذکر افسانے ہیں۔ان کے کچھ افسانے منی افسانے کی مانند ہیں۔یعنی وہ اپنے افسانوں میں بہت کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کردیتے ہیں۔ان کے جچے تلے الفاظ ہی ان کی کہانی میں اہم درجہ رکھتے ہیں۔وہ اپنی کہانیوں میں صاف، سادہ، سلیس زبان کا ستعمال کرتے ہیں اور کبھی کبھی تو قارئین ان کی کہانی کو چند منٹ میں ہی پڑھ لیتے ہیں۔مثلاً ان کا ایک مختصر افسانہ جو ''آپ بیتی'' کے عنوان سے ہے اور صرف اٹھائیس الفاظ پر مشتمل ہے۔مگر ان اٹھائیس لفظوں میں ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے دریا کوزے میں بند کردیا ہے۔ملاحظہ کیجئے اس افسانے کے خوبصورت الفاظ:

> ''میں بچپن کی کھڑکی کے جھروکے سے جوانی کے انتظار میں جھانک رہا تھا کہ بڑھاپے نے دروازے پر دستک دے کر کہا۔''میرے بعد موت آرہی ہے۔'' (78)

اس کے علاوہ بھی ڈاکٹر عبدالمجید نے بہت سارے افسانے لکھے تھے جو انہوں نے اپنے سماجی مسائل کی عکاسی کرتے ہوئے تخلیق کیے تھے۔ ان کا ایک مشہور افسانہ ''تنہائی کا آسیب'' بھی ایک سماجی مسائل پر مبنی ہے۔ اس افسانے میں پروین اور شاہد دو ہی مرکزی کردار ہیں۔ جن کے ارد گرد پوری کہانی چلتی ہے۔ شاہد ایک چھوٹا سا ننھا سا تین سال کا بچہ ہے۔ اور دودھ کے لیے ہر وقت اپنی ماں پروین کو بہت زیادہ تنگ کیا کرتا ہے۔ پروین جو کہ دن بھر محنت مزدوری کر کے گزارہ کرتی تھی اور اس کے دن بھر کی مزدوری سے اس کی چھاتی کا پورا دودھ سوکھ جاتا تھا۔ اس لیے وہ اپنے بچے کو دودھ نہیں پلا سکتی تھی۔ مگر بدقسمتی سے شاہد بھوک کی وجہ سے مر گیا اور پروین تنہائیوں کا شکار ہو گئی۔ اب اس کے پاس نہ مزدوری کے لیے ہمت بچی تھی اور نہ ہی کوئی سہارا تھا۔ اقتباس:

> ''شاہد کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی تھی اور پروین مایوسی کی حالت میں دودھ بھری چھاتیاں ہاتھوں میں لے کر رہ گئی۔ بالکل اکیلی تن تنہا۔ اسے ایسا معلوم ہونے لگا کہ چاروں طرف تنہائی کے خوفناک آسیب خوفناک چہرے لیے اپنے نوکیلے پنجے گاڑنے کے لیے اس کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ وہ اکیلی ہے بالکل اکیلی۔ اس کے آس پاس پھر اسی اکیلی اور تنہائی کی شاہراہ پر ڈال دیا گیا ہے جس کو ختم کرنے کے لیے اس نے تین سال سے اپنی عصمت کو کسی اجنبی کے ہاتھوں نیلام کر کے شاہد کو حاصل کر لیا تھا۔'' (80)

اسی طرح کا ایک اور مشہور افسانہ ''آدمی آدمی'' کے عنوان سے ہے۔ اس افسانے میں مصنف نے ڈاکٹروں کی بڑھتی ہوئی رشوت ستانی، لالچ وغیرہ کی حصولیابی کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح سے ڈاکٹر اپنے لالچ کے لیے درندگی کی حد تک آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اس پورے افسانے میں مصنف نے ڈاکٹروں کے لالچ کو فاش کر دیا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار ''نیلم'' کا ہے۔ جو ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتا ہے اور اس شہر کے بڑے بڑے ڈاکٹروں سے ملاقات ہوتی ہے مگر ڈاکٹروں کی فیس اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ ڈاکٹر فیس کی ادائیگی کے بغیر بیمار کو نظر تک ڈالنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس دوران نیلم بہت ہی بے بس ہو جاتی ہے، اس کو اتنے بڑے شہر میں کوئی مددگار نہیں ملتا ہے اور وہ کسی طریقے سے فیملی پلاننگ کمپ میں جا کر بھیک مانگ کر صرف ڈیڑھ سو روپے کا ہی انتظام کر پاتی ہے۔ جب تک واپس آتی ہے تب تک اس کی ماں کی موت ہو چکی ہوتی تھی۔ اس وقت بھی ڈاکٹروں کے دل میں ایک بے بس کے لیے رحم نہ آیا بلکہ وہ نیلم کی ماتم داری کو اور بھی نظرانداز کرتے ہوئے اپنی فیس کا تقاضا کرنے لگے۔ پریشانی کی حالت میں نیلم بہت مجبور ہو چکی تھی۔ اب اس کے پاس صرف پچاس روپے بچے تھے۔ ان پیسوں سے اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو اپنے

ساتھ اپنی ماں کی لاش کے لے جانا چاہا۔ٹیکسی ڈرائیور کو اس کی حالت دیکھ کر بہت ترس آیا اور اس نے نیلم سے پیسے لینے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ ''بیٹی! یہ پیسہ رکھ لو میں ڈاکٹر نہیں ہوں ڈرائیور ہوں۔''

ڈاکٹر عبدالمجید کے افسانے اسی طرح کی درد بھری کہانی بیان کرتے ہیں۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہیں فن افسانہ نگاری پر پوری دسترس حاصل تھی۔''آنچ'' بھی ان کا ایک اچھا افسانہ ہے جو ایک رومانی افسانہ ہے۔انہوں نے اس افسانے میں جنسی ہیجان اور رومانی صورت حال کا ایک نقشہ پیش کیا ہے۔ان کا یہ افسانہ نسوانی فطرت اور جوان دھڑکنوں کا غماز ہے۔ڈاکٹر عندالمجید بھدرواہی کے افسانوں میں نفسیاتی میلان بھی بہت اور رومانیت کا اظہار بھی پایا جاتا ہے۔ان کی افسانہ نگاری کا ذکر کرتے ہوئے عاصم فریدی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

> ''ڈاکٹر عبدالمجید بھدرواہی نے اپنے افسانوں میں انسانی افعال کی کھل کر ترجمانی کی ہے۔عریانیت ان کی پہچان ہے۔ان کے افسانے کچھ ایسے ہیں جنہیں پڑھتے ہوئے عظیم قلم کار جناب سعادت حسن منٹو کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔اگرچہ اس مقام کو پانا ان کے لیے بعید از امکان ہے،ان کے کردار نفسیاتی پیچ وخم سے گزرتے ہیں اور لطیف ترین جذبات کی پردہ کشائی کرتے ہیں۔ان کے افسانوں میں سے ایک افسانہ ''آنچ'' نسوانی فطرت اور جوان دھڑکنوں کا غماز ہے ان کے افسانوں میں نفسیاتی میلان کے ساتھ ساتھ رومانیت بھی پائی جاتی ہے۔پرکشش کرداروں اوران کے فطری اختلافات کو بھی نہایت خوش اسلوبی سے پیش کرتے ہیں اور جس کسی موضوع کو چھیڑتے ہیں۔خوبی،زبان کے طفیل تصویر میں سماں ٹھرٹھر کر جاتا ہے۔پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے ک یہ افسانہ کوئی خیالی اختراع نہیں بلکہ کوئی وارداتی سانحہ یا امر واقعہ ہے۔''(80)

ڈاکٹر عبدالمجید بھدرواہی کے رومانی افسانوں میں ''دھواں'' بھی ایک اچھا افسانہ ہے۔اس افسانے میں انہوں نے مرد کی خودغرضی اور جنسی خواہشات کو پورا کرنے کے ضمن میں ہونے والی خودغرض حرکتوں کو علامت کے طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح سے ایک انسان اپنی جنسی خواہشات میں آکر اپنی بیوی کو ستاتا ہے۔اس افسانے میں دو مرکزی کردار غلام اور رسیدہ ہیں۔جن پر یہ کہانی تیار کی گئی ہے۔غلام اپنی بیوی رسیدہ کے جذبات کو نظرانداز کردیتا ہے اور ایک جگہ وہ اس افسانے میں اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ:''ادب رات والی بات ہی نی رہی۔اس وقت مجھے بھوک

بھی نہیں ہے اس لیے آگ جلانے میں کیوں آپ کا ہاتھ بٹاؤں گا؟‘‘اس طرح کے کئی اور افسانے مصنف کے قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر عبدالمجید بھدرواہی کے افسانوں کا مطالعہ کرنے سے یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ ان کی تخلیقات میں طنز وظرافت کی چاشنی بھی خوب دیکھنے کو ملتی ہے۔ انہوں نے اردو کے مشہور ومعروف افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کا بہت گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کی تحریروں میں بھی منٹو کا اثر جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ عبدالمجید صاحب کے زیادہ طویل افسانے نہیں ہیں۔ اس لیے ان کے سارے افسانوں کو پڑھنے کے لیے چند گھنٹے لگتے ہیں۔ بقول ولی محمد اسیر کشتواڑی کہ:

’’ان کے سارے افسانوں کو پڑھنے کے لیے دوتین گھنٹے کافی ہیں۔‘‘(81)

دنیا میں سب سے زیادہ محبت کرنے والی شخصیت ’’ماں‘‘ ہوتی ہے۔ وہ اپنی اولاد کو کس مشکل میں بڑا کرتی ہیں اس کا احساس کسی کو نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی کبھی ماں اپنی اولاد کو اپنی تکلیفات کا احساس ہونے دیتی ہے۔ ماں کی محبت اور اس کی ممتا پر ڈاکٹر عبدالمجید بھدرواہی کے تین قابل ذکر افسانے ہیں جن میں ’’ماں کا آنچل‘‘، ’’ماں‘‘ اور ’’کاش! کچھ دیر تو رک جاتی‘‘ قابل ذکر ہیں۔ ان افسانوں کے مطالعے سے کوئی بھی شخص اپنی ماں کی یاد میں کھو جاتا ہے۔ مصنف نے ان افسانوں میں زبان وبیان کا بہت خیال رکھا ہے اور صاف اور سلیس زبان استعمال کرکے قارئین کی دلچسپی کا خوب خیال رکھا ہے۔ ہر لفظ غور کرنے کے قابل ہے۔ چوں کہ مصنف کی یہ خوبی ہے کہ وہ بہت کم الفاظ استعمال کرتے ہیں اور زیادہ معلومات فراہم کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان افسانوں کے کچھ اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ افسانہ ’’ماں‘‘ میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

’’ماضی کی کھڑکی کھلی، ایک ایک بات یاد آتی گئی۔ اپنی یادداشت کے اوراق سے ایک ایک بات تک کرتا گیا۔ اللہ نے صحت دی، رتبی دیا، بیوی بچے دیے۔ وہ سب کچھ دیا جس کی ماں نے دعا دی تھی۔ لیکن ایک چیز کی کمی کھٹک رہی تھی۔ وہ ماں تھی۔ اس کی دعاؤں کا یہ ثمر تھا۔ حسن سلوک میں ماں کا حق باپ سے بہت زیادہ ہے۔‘‘

اسی طرح ان کے دوسرے افسانے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

’’اب فجر کی نماز کا وقت ہونے والا تھا۔ محلّہ مسجد سے موذن کے اذان دینا شروع کی میں ان

کی آواز کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ بھی انہماک سے اذان کے الفاظ دہرائی اور یہ کہتی ہوئی کمرے سے باہر جانے لگی! بیٹا خدا حافظ! میں اب چلتی ہوں۔ میں نے اتنی ہی اجازت لی تھی۔ میں صرف تیرا حال معلوم کرنے آئی تھی۔ اپنا خیال رکھنا بیٹا۔ یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر گئی اور بہت دور۔۔۔۔بہت۔۔۔۔اور میں دیکھتا ہی رہ گیا۔ یہ میری ماں تھی جسے نہ جانے خیالی مہینہ عالم خواب میں ایک سراک کی طرح دیکھ رہا تھا۔ میرے لبوں پر یہ الفاظ آکر جیسے منجمد ہوکر رہ گئے: ماں! کچھ دیر تو رک جاتے۔'' (82)

عبدالمجید مزاحیہ انداز میں بھی افسانے لکھتے تھے۔ جس میں وہ مزاق مزاق میں چھوٹی چھوٹی باتوں میں بہت کچھ کہہ دیتے ہیں۔ اس حوالہ سے ان کا ایک افسانہ ''پڑے گر بیمار تو'' قابل ذکر ہیں۔ اس میں انہوں بیماری کا جھوٹا ناٹک رچانے والوں اور دفتر کے جھوٹے وفاداروں پر زبردست چوٹ کی ہے۔ اس کے علاوہ ''مہنگائی بتہ'' اور ''خواب اور آنسو'' ان کے قابل تحسین افسانے ہیں۔ اس کے علاوہ ''احساس ندامت''، ''یاد رفتہ'' اور ''ہاتھ لکیر کی چوری'' وغیرہ بھی ڈاکٹر عبدالمجید کے اہم مضامین ہیں۔

ڈاکٹر عبدالمجید کے افسانوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے افسانے ان کے ذاتی تجربات اور ذاتی زندگی سے متعلق ہیں۔ اگرچہ انہوں نے افسانہ نگاری کے میدان میں بہت کم توجہ دی تھی۔ کیوں کہ وہ پیشے سے ایک ڈاکٹر تھے مگر پھر بھی ان کی تخلیقات سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اگر وہ اس اردو زبان وادب میں اور خاص طور پر اردو افسانہ نگاری میں اور بھی دلچسپی سے کام لیتے تو شاید وہ ریاست جموں وکشمیر کے بڑے افسانہ نگاروں میں شامل ہو سکتے تھے۔ ان کی کہانیاں زیادہ تر تلخ سچائیوں کی نشاندہی کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی تخلیقات کے کردار بھی ہمارے معاشرے کے جیتے جاگتے دکھائی دیتے ہیں۔ اور ان کی کہانیوں میں زیادہ تر سماجی مسائل ہی کی عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کی تخلیقات میں زبان بھی سادہ سلیس اور عام فہم استعمال ہوتی ہے۔ بہر حال اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ خطہ جموں میں افسانہ نگاری کے حوالے سے انہیں کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

راز بھدرواہی:

راز بھدرواہی کا اصل نام عبدالمجید راز بھدرواہی تھا۔ ان کی ولادت 2 اکتوبر 1946ء کو قلعہ محلّہ ڈوڈہ خطہ جموں میں ہوئی تھی۔ وہ ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے بزرگوں میں بڑے بڑے ایسے صوفی بزرگ لوگ

گزرے ہیں جو نہ صرف صوم وصلوۃ کے پابند تھے بلکہ وہ صوفیانہ رنگ اور اچھے اخلاقی اقدار کے لیے بھی اپنے علاقے میں کافی مشہور تھے۔ راز بھدرواہی کے قبیلے کے لوگ زیادہ تر اپنی روزی روٹی کمانے کے لیے پشمینہ چادریں بنانے کا کام کیا کرتے تھے۔ راز بھدرواہی کے والد محترم ریاست کے مشہور شاعر رسا جاودانی کے رفیقوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ وہ نعت خوانی میں کافی دلچسپی رکھتے تھے۔ اس لیے ان کی رسا جاودانی سے کافی گہری دوستی تھی۔ راز بھدرواہی نے بھی شعر و شاعری کا علم اپنے والد ہی سے حاصل کیا تھا۔ راز بھدرواہی کو تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ مگر ان کے والد صاحب ان کی تعلیم جاری نہیں رکھنا چاہ رہے تھے۔ اس لیے راز بھدرواہی دسویں جماعت تک ہی اپنی تعلیم حاصل کر پائے تھے اور اس کے بعد وہ محکمہ اطلاعات میں ملازم ہو گئے تھے۔ اس کے بعد وہ ترقی کر کے ڈسٹرکٹ مشن آفیسر ڈوڈہ کے عہدے پر تعینات کئے گئے تھے۔ جہاں انہوں نے کافی عرصہ تک اپنی خدمات انجام دی۔ دوران ملازمت وہ اپنی تعلیم کو بھی برقرار رکھے ہوئے تھے اور ایک پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے انہوں نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے اپنی تعلیم اردو آنرز اور اس کے بعد جموں و کشمیر یونی ورسٹی کی جانب سے راز بھدرواہی نے انگریزی زبان میں اپنی بی۔ اے کی تعلیم مکمل کی۔

راز بھدرواہی کو اپنی ابتدائی تعلیم کے دوران شعر و شاعری سے کافی لگاؤ تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ افسانوی ادب میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ چناں چہ انہوں نے نثر کے حوالے سے 1964ء اور 1965ء میں ''ادھورے خواب'' کے عنوان کا ناول ترتیب دیا تھا۔ انہوں نے افسانہ نگاری میں کافی مہارت حاصل کی تھی۔ ان کے مختلف موضوعات کے افسانے قومی اور مقامی اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتے رہے تھے۔ ان کے مشہور افسانوں میں خاص طور پر ''ایفائے قول''، ''سپنوں کے شیش محل''، ''تیرے کیے کا بدلہ''، ''شراب''، ''آدم خور''، ''حسرتوں کی راکھ''، ''بوڑھا چنار''، ''خزاں کا گلاب''، ''سستی موت مہنگا کفن''، ''روح کا داغ'' وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ ان مذکورہ بالا افسانوں کا مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے زیادہ تر مظلوم لوگوں کو ہی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے اور ان افسانوں میں اس دور کے سماجی مسائل کی بہترین عکاسی دیکھی جا سکتی ہے۔

ضلع ڈوڈہ کی مشہور و معروف کتاب جو تمام بڑے بڑے اردو ادبا و شعرا سے متعلق ہے۔ وہ رند بھدرواہی کی کتاب ''کہکشاں'' کے عنوان سے ہے۔ رند بھدرواہی صاحب اپنی اس کتاب کو تخلیق کرتے وقت راز بھدرواہی کا ذکر کرنا بھول گئے تھے اور اس کے بعد انہوں نے اس کتاب میں راز بھدرواہی کا ذکر ''اور وہ جن کا ذکر ہوتے ہوتے رہ گیا'' کے عنوان سے کیا ہے۔ جموں خطے میں راز بھدرواہی نے زیادہ تر اردو غزل اور افسانے کے حوالے سے نام کمایا

تھا۔مگران کی شاعری سے زیادہ انہیں جموں خطے میں ایک اچھے افسانہ نگار کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔راز بھدرواہی کے افسانوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے افسانوں میں اپنے ہی دور کے اردگرد کے ماحول کو پیش کیا ہے۔اس کے علاوہ ایک انفرادی خصوصیت جوان کے افسانوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔وہ یہ ہے کہ ان کی تخلیقات میں کہیں کہیں پر بڑے بڑے شہروں ،گلیوں ، بازاروں اوراس کے ساتھ کچھ بڑے بڑے ریستوران وغیرہ کی منظرکشی بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔مگر زیادہ تر انہوں نے اپنی کہانیوں میں اپنے گرد کے سماجی ماحول اور گرد و پیش ہونے والے سماجی مسائل کو ہی موضوع بنایا ہے۔راز بھدرواہی کے افسانوں میں کبھی کبھی قاری پڑھتے پڑھتے اتنا کھو جاتا ہے کہ ایسا لگتا ہے جیسے اس کے آنکھوں کے سامنے وہ پورا منظر چل رہا ہو۔یہی خوبی ان کی تحریروں کو بلند درجہ عطا کرتی ہے کہ راز بھدرواہی نے اپنے افسانوں میں قارئین کی دلچسپی کا خاص خیال رکھا ہے۔ان کی کہانیوں میں تصوراتی دنیا میں ملک بوس پربتوں کے مسکن اور ہوشربا طلسمی ماحول کی مہک سے مدحوش اور دو جواں دلوں میں گزرنے والی محبت و جذبات وغیرہ جیسی مثالوں کوانہوں نے اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔اس حوالے سے ان کا سب سے مشہور افسانہ ’’ایفائے قول‘‘ کو پیش کیا جاسکتا ہے۔مصنف نے اپنے افسانوں میں کہیں کہیں سماج کی فرسودہ روایات کے خلاف بھی محاذ آرائی کی کوشش کی ہے۔اس کی مثال ہمیں ان کے افسانہ ’’سپنوں کے شیش محل‘‘ میں ملتی ہے۔راز بھدرواہی نے اپنے افسانوں میں ویسے کردار پیش کیے ہیں جوحرص وہوس پر پڑ کر احسان فراموش بن کر اپنی تمام تر حدوں کو پار کردیتے ہیں اور غیرت کی دھجیاں اڑانے میں ذرا بھی نہیں ڈرتے ہیں۔انہوں نے جو کردار پیش کرنے کی کوشش کی ہے وہ تمام ہمارے سماج میں روزمرہ کی زندگی میں چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔راز بھدرواہی کوفن افسانہ نگاری میں کافی مہارت حاصل تھی اس لیے انہوں نے جس طرح سے سماجی مسائل کوابھارنے کی کوشش کی ہے وہ بہت ہی اہمیت کی حامل ہے۔ان کے افسانوں میں ایسے ناگفتہ بہ صورت حال کی مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ موجودہ دور کے غریب لوگ اور مظلوم ہر دن ان حالات سے دوچار ہوتے رہتے ہیں۔مثال کے طور پر راز بھدرواہی کے افسانوں سے کچھ اقتباسات مدرجہ ذیل ہیں۔افسانہ حسرتوں کی راکھ میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

’’تپتے ہوئے صحرا میں کسی تھکے ہوئے مسافر کو اچانک ایک ہرے بھرے نخلستان میں موجود پانی کے چشمے پر نظر پڑھنے سے شاید وہ مسرت حاصل نہیں ہوسکتی جو حامد کو ایک سال قبل سلمہ پر نظر پڑھتے ہوئے محسوس ہوئی تھی۔اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے ایک طوفان زدہ بیکراں سمندر میں ہچکولے کھاتی ہوئی اس کی شکستہ کشتی کو کسی غیبی طاقت نے ساحل مراد سے ہمکنار کیا

ہو۔ جیسے افسانہ نگار کو اپنے دل پسند افسانے کے لیے کوئی دل نشین عنوان یاد آ گیا ہو۔ یا پھر کسی بھی مادر زاد تا بنیا کو قدرت کی مہر بانی سے دونوں آنکھوں کی روشنی واپس مل گئی ہو۔''(83)

اسی طرح ان کے ایک اور مشہور افسانے سے ایک اقتباس مثال کے طور پر پیش کیا جا تا ہے۔ افسانہ بہ عنوان ''بوڑھا چنار'' ہے۔ یہ ایک علامتی افسانہ ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''ایک صبح بوڑھے چنار کو جیسے سانپ سونگھ گیا اور اس کی تمام تر خوشنمائی جیسے ماتم میں بدل گئی یوں محسوس ہوتا تھا کہ چنار کی عمر رسیدہ ٹہنیاں ایک دوسرے سے لپٹ کر خون کے آنسو بہا رہی ہوں۔ بلبل خاموش تھے۔ کوئیلیں نغمہ سرائی کے ہر فن سے مانو نا آشنا معلوم ہوتی تھیں۔ سانپ نیلیوں نے اپنے بلوں سے باہر آنے کی جیسے قسم کھائی تھی۔ حتیٰ کہ مردار خور گدھ بھی آج مردار کی تلاش میں نہیں نکلے۔ ایک کہنہ سال گدھ چنار کی اونچی ٹہنی پر بیٹھا مایوسانہ انداز میں اس پہاڑی ندی کے اور یک ٹک گھورے جا رہا تھا۔ جہاں گزشتہ شب چھمانے اپنی زندگی کی شمع کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بجھا دیا تھا۔''(84)

راز بھدرواہی صاحب فکشن نگار کے ساتھ ساتھ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ انہوں نے شاعری میں زیادہ شہرت حاصل نہیں کی مگر اس حوالے سے ان کا اردو کلام قابل تعریف ہے۔ وہ ایک ذہین، بے باک اور سنجیدہ قسم کے انسان تھے۔ شرافت نفسی اور معاملہ فہمی ان کی ذاتی خصوصیات میں سے ہیں۔ مختصر یہ کہا جا سکتا ہے کہ راز بھدرواہی صاحب ضلع ڈوڈہ کے ایک اہم شاعر وادیب ہیں۔

رند بھدرواہی:

ان کا اصل نام شیخ طالب حسین تھا مگر اردو ادب کی دنیا میں انہیں رند بھدرواہی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان کی پیدائش 16 اپریل 1947ء کو ضلع ڈوڈہ کے علاقہ درنگہ میں ہوئی تھی۔ ابتدائی تعلیم انہوں نے درنگہ سے ہی حاصل کی تھی اور اس کے بعد 1961ء میں کشمیر یونی ورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں داخلہ لیا۔ جہاں سے انہوں نے 1968ء میں ادیب ماہر اور 1969ء میں ادیب کامل کے امتحانات پاس کئے۔ کچھ ہی عرصہ بعد وہ ایجوکیشن ڈپاٹمنٹ میں جونیئر اسٹنٹ کی حیثیت سے ملازم

ہو گئے۔ اس کے بعد رند بھدرواہی ترقی پا کے ضلع ڈوڈہ کے چیف ایجوکیشن آفس ڈوڈہ میں اسٹنٹ کے طور پر اپنی خدمات کوانجام دیتے رہے۔

رند بھدرواہی کو کہانیاں لکھنے کا بہت شوق تھا۔ انہوں نے کئی کہانیاں اور انشائیے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ ان کی کہانیوں کا مجموعہ ''سرابوں کا سفر'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ یہ مجموعہ 1996ء میں طبع ہوا ہے۔ اس مجموعے میں ان کی پندرہ تخلیقات شامل کی گئی ہیں۔ جن میں خاص طور پر صاحب ولادت، آؤ واپس چلیں، ہائی وے کا فقیر، فریب منزل، سرابوں کا سفر، اپنی کلہاڑی اپنے پیر، اپنے بھی خفا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

رند بھدرواہی کے کہانیوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنی تخلیقات میں جگہ جگہ پر مزاحیہ انداز سے کام لیا ہے۔ انہوں نے اردو زبان کے علاوہ کشمیری زبان میں بھی بہت سارے مختصر افسانے لکھے تھے۔

رند بھدرواہی کے بارے میں ولی محمد اسیر کشتواڑی صاحب یوں رقم طراز ہیں:

> ''وہ کشمیری میں بھی مختصر افسانے لکھنے لگے ہیں جو ایک اچھی بات ہے۔ کیوں کہ صوبہ جموں میں اس صنف میں ایک دو اصحاب ہی دلچسپی لے رہے ہیں۔ جن میں شہباز راجوروی کو اولیت حاصل ہے۔ رند کی نثر نگاری کی عمر ابھی بہت تھوڑی ہے۔ انہوں نے جس سرعت کے ساتھ اپنا یہ سفر شروع کیا ہے۔ اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک ادیب اور انشا پرداز کی حیثیت سے بھی اچھا نام کما سکیں گے۔''(85)

رند بھدرواہی کو اردو نثر میں تو اچھا مقام حاصل ہی تھا مگر ان کی شاعری بھی کچھ کم نہ تھی۔ انہوں نے اپنی شاعری کا سفر تقریباً 1968ء کے بعد ہی شروع کیا تھا اور 1970ء کے بعد انہوں نے بیس پچیس سالوں میں جموں صوبہ میں ایک اہم نام کمایا تھا۔ انہوں نے اپنی شاعری کا آغاز 1968ء میں ضلع ڈوڈہ کے علاقہ بھدرواہی سے ''اقبال بزم ادب بھدرواہ'' کے قیام سے کیا تھا۔ وہ بھی اس علاقے کے دوسرے ادبا و شعرا کے حلقے میں شامل ہوئے اور سالہا سال اس بزم ادب میں اپنی شمولیت کرتے رہے۔ کئی بار انہیں اس بزم ادب کا سکریٹری اور صدر بھی منتخب کیا گیا تھا۔ انہوں نے اقبال بزم ادب بھدرواہ میں بہ حیثیت سکریٹری کئی عرصہ تک اپنی خدمات کوانجام دیا تھا اور اسی دور کی ان کی شاعری بھی کمال درجہ کی نظر آتی ہے۔ کیوں کہ اس دوران انہیں ریاست کے بڑے بڑے شعرا سے ہم کلام ہونے کا موقع فراہم ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ رند بھدرواہی آج صوبہ جموں کے بڑے شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

تسکین بڈانوی:

جموں خطے سے تعلق رکھنے والے ادیبوں میں ایک نام تسکین بڈانوی کا بھی ہے۔ان کا اصل نام ماسٹر جلال الدین بٹ تھا مگر وہ ادب کے میدان میں تسکین بڈانوی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ان کے والد محترم محمد عبداللہ بٹ تھے۔تسکین بڈانوی اردو اور کشمیری دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ان کی تاریخ پیدائش 31 اگست 1947ء میں ہوئی ہے۔ان کا تعلق ضلع ڈوڈہ کے علاقہ ٹھاٹھری سے تھا۔ان کی ابتدائی تعلیم ڈوڈہ میں ہی تھی۔وہ اپنی ابتدائی تعلیم کے دوران سے ہی شاعری کا شوق رکھتے تھے۔وہ بنیادی طور پر ایک شاعر ہیں مگر انہوں نے اردو ادب کی دیگر اصناف ادب میں طبع آزمائی کی تھی۔

تسکین بڈانوی نے جہاں اپنی تعلیم حاصل کرنے کے بعد محکمہ تعلیم میں بحیثیت مدرس ملازمت کر لی تھی جہاں انہوں نے کافی عرصہ تک اپنی خدمات کو انجام دیا۔

اگرچہ تسکین بڈانوی کے ابدی ماحول میں اپنی ابتدائی زندگی نہیں گزاری تھی لیکن پھر بھی انہیں اردو ادب میں بڑا مقام حاصل ہے۔انہوں نے بعد میں جموں صوبہ کی بڑی بڑی شخصیتوں کی شاگردی اختیار کی تھی۔جن میں ابتدائی نام سید عزیز الدین شاہ کا ہے۔اس کے بعد مرحوم رسا جاودانی، ڈاکٹر قطب الدین، احمد سوز الہ آبادی اور میکش کاشمیری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ان تمام ادیبوں سے تسکین بڈانوی نے بہت فیض اور شرف حاصل کیا تھا۔

تسکین بڈانوی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز تیرہ سال کی عمر میں ایک قوالی سنا کر کیا تھا۔انہوں نے یہ قوالی مرحوم بخشی غلام محمد صاحب ضلع ڈوڈہ کے ایک صوفی بزرگوں میں تھے، کے سامنے قوالی سنائی تھی۔اس وقت تسکین اپنی مڈل کی تعلیم حاصل کر رہے تھے اور بہت سارے لوگوں نے ان کی حوصلہ افزائی بھی کی تھی۔مرحوم بخشی غلام محمد نے بھی تسکین بڈانوی کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے انہیں سرکاری خرچہ پر اٹھارہ روزہ ریاستی سیاحت پر بھجوا دیا تھا۔تسکین بڈانوی شاعری کے علاوہ افسانہ نگاری میں بھی مہارت رکھتے تھے، مگر اس حوالے سے ان کی چند تحریریں ہی سامنے آئی ہیں۔ان کا ایک مشہور افسانہ ''رگھو بنجارا'' چناب ویکلی میں منظر عام پر آیا تھا۔ان کی بہت ساری نثری اور شعری تخلیقات پرچم ہند، چناب، سندیس، سچ، ملاپ اور بدرو وغیرہ جیسے ریاستی رسائل وجرائد میں شائع کی جاتی تھیں۔

تسکین بڈانوی نے 1975ء میں پہلی بار ریڈیو کشمیر جموں میں پروگرام دیا تھا۔اس کے بعد وہ کافی عرصہ تک ریڈیو کشمیر جموں میں اپنی خدمات انجام دیتے رہے۔اس دوران انہوں نے اردو، کشمیری اور بھدرواہی وغیرہ

پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ریاست جموں و کشمیر کی ادبی محفلوں میں انہیں کافی بار مہمان خصوصی کے طور پر بھی بلایا گیا اور ریاستی کلچرل اکادمی اور دیگر ریاستی ادبی تنظیموں کی جانب سے منعقدہ مشاعروں و محفلوں میں بھی انہیں مدعو کیا جاتا تھا۔

عاصم فریدی:

عاصم فریدی کا اصل نام اللہ رکھا ہے۔ ان کا تعلق بھی ضلع ڈوڈہ سے ہے۔ ان کی تاریخ پیدائش 16 مئی 1947ء کو ہوئی۔ عاصم فریدی کے کئی افسانے ابھی تک مختلف رسائل و جرائد میں منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان کا پہلا افسانہ ''ان مٹ یادیں'' کے عنوان سے تھا۔ اس کے علاوہ ان کے مشہور و معروف افسانوں میں خاص طور پر روبینہ، سیاہ پوش چاندنی، احساس کی دہلیز پر، احتجاج، کلید، رقابت کی آگ، سرخ دھبے اور الجھن وغیرہ جیسے قابل ذکر افسانوں کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے افسانوں اور کہانیوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عاصم فریدی رومانی اور سماجی رنگ کی کہانیاں لکھنے میں بہت زیادہ مہارت رکھتے ہیں اور ان کے افسانوں کے کردار، مکالمے اور زبان و بیان روزمرہ زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے ایسے کرداروں کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ جو آئے دن ہمارے سماج میں سامنے آتے رہتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں کہیں کہیں جدت کا رنگ بھی جھلکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

عاصم فریدی جموں خطے میں اول درجے کے افسانہ نگاروں میں تو شامل نہیں کیے جا سکتے ہیں مگر ان کے کارناموں کی وجہ سے وہ ضلع ڈوڈہ کے اہم اور قابل تعریف شاعروں میں ضرور شمار کیے جا سکتے ہیں۔ وہ بیک وقت انشاء پرداز، مقالہ نگار، افسانہ نگار اور شاعر تھے، ان کی شاعری میں روایت اور جدت کا امتزاج بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ جب وہ کلام پڑھتے ہیں تو قارئین کو اپنی آواز سے متاثر کر دیتے ہیں۔ انہیں کلام پڑھنے کا سلیقہ بخوبی آتا ہے۔ ان کی آواز میں بہت مٹھاس ہے۔ اکثر ریاست کے بڑے بڑے مشاعروں میں انہیں حتیٰ الوسیع حوصلہ افزائی ہوتی رہی ہے۔

شاذ شرفی:

1947ء کے بعد جموں خطے کے افسانہ نگاروں میں ایک نام شاؔذ شرفی کا بھی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کا اصل نام قاضی شبیر احمد شاذ شرفی تھا۔ ان کی ولادت 8 جون 1949ء میں ہوئی تھی۔ شاذ شرفی مصوری بھی کرتے تھے جس کا خود انہیں اندازہ نہیں ہوتا تھا اور اس تصویر میں گھنٹوں تک کھوئے رہتے تھے۔ انہوں نے پہلے پہل ''غریب اور مکھیاں''، ''میں اور میری تنہائی'' جیسی کہانیاں لکھی مگر جلد ہی اس میدان سے کنارہ کشی اختیار کی اور فکشن سے نکل کر وہ شاعری

کی طرف راغب ہو گئے ۔ وہ کئی عرصہ تک اقبال بزم ادب بھدرواہ کے ساتھ جڑے رہے جہاں انہوں نے مقامی شاعروں میں اپنی جگہ بنائی اور کچھ ہی عرصہ میں ایک اچھے شاعر کہلانے لگے۔

اگر چہ شآذ شرفی ابتدا میں ہی شاعری کی طرف مائل ہو گئے تھے۔مگر اس کا مطلب ہرگز نہیں تھا کہ انہوں نے اردو نثر لکھنا بند کر دیا ہو بلکہ انہیں جب بھی موقع ملتا وہ اردو نثر میں بھی کچھ نہ کچھ تحریر کرتے رہتے۔اردو نثر کے حوالے سے انہوں نے جگنو، مگر مچھ، کرسی، چوہا اور بادل وغیرہ جیسی اچھی کہانیاں لکھیں تھیں۔ان کہانیوں میں انہوں نے سماج میں ہونے والے حقیقی قصوں کو ایک کہانی کی شکل میں پیش کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ انہوں نے اپنی کہانی میں لکھا ہے کہ:''میرے بھی ہاتھ پاؤں ناک کان تمہاری طرح ہیں۔لیکن جس قدر تم وجود میں بڑے ہو اسی قدر میں چھوٹا ہوں۔ میں رہائش میں تمہارا حصہ دار کھانے میں شریک ہوں کچا پکا سب کھا جاتا ہوں۔سردی ہو یا گرمی میں کپڑے نہیں پہنتا اسی لیے تمہارے لیے کبھی انہیں بے کار اور ناکارہ کر دیتا ہوں جس کے بدلے میں تم مجھے قید، پھانسی یا زہر دیتے ہو! مجھے موت کا کوئی غم نہیں کیوں کہ میرا اچھا اور ادھورا کام میرے بچے کرتے ہیں جو اردو زبان کا پہلا حرف ہے وہی مجھے میرے نام کا آخری حرف۔۔۔۔بتاؤ۔۔۔میں کون ہوں؟۔۔۔۔''چوہا''۔

اس کے علاوہ شآذ شرفی صاحب نے افسانہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی تھی۔ان کے کچھ مشہور افسانوں میں ''کتے''''سنہری بال''،''غریب اور مکھیاں''،''میں اور میری تنہائیاں'' وغیرہ کافی اہمیت کے حامل ہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے خاکوں میں بھی طبع آزمائی کی تھی۔ان کا ایک مشہور خاکہ جو انہوں نے ''ہماری بیگم'' کے عنوان سے تین حصوں میں قلم بند کیا ہے۔ یہ ایک طویل خاکہ ہے جس پر طنز و مزاح نگاری کی گہری چھاپ ہے۔شآذ شرفی کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ علاقہ بھدرواہ کے اچھے شاعر، مصور، نثر نگار اور ادیب گزرے ہیں۔

محمد اسد اللہ وانی:

محمد اسد اللہ وانی بنیادی طور پر محقق کی حیثیت رکھتے ہیں۔مگر اس کے علاوہ انھوں نے شاعری اور افسانہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کر کے اپنی تخلیقات کو بہترین بنانے کی کوشش کی ہے۔ان کے مختصراً اردو افسانوں میں ''ادھورا تاج محل''،''انتظار کا قیدی''،''میری کہانی''،''انتظار''،''تعقب''،''تو ی نے کہا اور روشنی'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اسی طرح سے مصنف نے کئی دیگر افسانے اور ادبی تحریریں مختلف رسائل و جرائد میں وقتاً فوقتاً منظر عام پر آتے رہے۔

آنند لہر:

آنند لہر کا اصل نام شام سندر تھا۔لفظ آنند کا استعمال وہ اپنے نام کے ساتھ اس لیے کرتے ہیں کیوں کہ ''آنند'' اُن کی ذات ہے اور ''لہر'' اُن کا تخلص ہے۔آنند لہر کا پیدائش ریاست جموں وکشمیر کے ضلع پونچھ میں ہوئی۔اُن کا بچپن ضلع پونچھ کے ایک گاؤں میں گزرا۔علاقہ پونچھ 1947ء سے پہلے ایک ہی ہوا کرتا تھا مگر بٹوارہ کے بعد اس کے دو حصے کر دیے گئے،اب پونچھ کا آدھا حصہ پاکستان میں آتا ہے اور آدھا حصہ ہندوستان کی سرزمین کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔

1947ء سے پہلے آنند لہر کا خاندان پونچھ کے اُس حصے میں رہائش پذیر تھے، جو آج پاکستان کے ساتھ جڑا ہوا ہے مگر بٹوارے کے وقت آنند لہر کا خاندان اُس پار سے اس پار یعنی آج جو پونچھ ہندوستان کے ساتھ جڑا ہوا ہے میں منتقل ہو گئے تھے اور وہیں آنند لہر کی پیدائش 2/ جولائی 1951ء میں پونچھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں کے ایک محلے سرائے میں ہوئی۔اُن کی وفات 6/ دسمبر بہ روز جمعرات 2018ء کو ہوئی۔

پونچھ سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے کشمیر یونیورسٹی چلے گئے۔جہاں سے انھوں نے بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی کی ڈگری حاصل کی اور اُس کے بعد انھوں نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔کچھ ہی عرصہ کے بعد گورنمنٹ نے انھیں پرموشن دے کر جموں ہائی کورٹ میں سینئر وکیل کے عہدے پر فائز کر دیا جہاں انھوں نے کافی عرصہ تک کام کیا۔اگر چہ آنند لہر کا پیشہ ایک وکیل کا تھا،مگر اردو زبان وادب کے ساتھ اُن کا رشتہ کچھ اس طرح سے جڑا ہوا تھا کہ اپنے وکالت کے کام میں مصروف ہونے کے باوجود وہ کچھ نہ کچھ تحریر کرتے رہتے تھے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان وادب کے ساتھ اُن کی کتنی محبت تھی۔

اُن کا شمار ریاست جموں وکشمیر کے اُن تخلیق کاروں میں ہوتا ہے جو صرف اور صرف اپنے دلی سکون کے لیے لکھتے تھے۔انھوں نے کبھی اپنی شہرت کو بڑھاوا دینے کے لیے اس زبان کا سہارا نہیں لیا بلکہ انھیں اس زبان وادب سے روحانی سکون ملتا تھا۔اب تک اُن کی کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جس میں انھوں نے اردو ادب کے کئی موضوعات اور کئی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔انھوں نے اپنی تخلیق کا آغاز افسانہ نگاری سے 1972ء میں کیا تھا۔اُن کا پہلا افسانہ ''پتھر کے آنسو'' اُس وقت لکھا تھا جب وہ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔''پتھر کے آنسو'' ڈگری کالج پونچھ کی میگزین میں چھپا تھا۔اس کے بعد اُن کا پہلا افسانوی مجموعہ 1975ء میں ''انحراف'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔اور دوسری بار دہلی سے 2002ء میں شائع ہوا۔اس میں کل 33 افسانے ہیں۔

آنندلہر کے افسانوں میں زندگی کی کشمکش دیکھی جاسکتی ہے۔ اُن کے افسانوں میں انسانی رشتوں اور سماجی رابطوں کے ساتھ ساتھ اخلاقی قدروں کو بھی صاف طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ ان کے افسانے زندگی کے مختلف مسائل سے جڑے ہوئے ہیں۔ اُن کے افسانے تجریدی کہلاتے ہیں کیوں کہ انھوں نے اپنے افسانوں میں ادبی تحریک جدیدیت کی پذیرائی کی ہے۔ ان کی یہی خوبی اُن کے اسلوب کو نکھارنے میں کامیاب نظر آتی ہے۔ انھیں حالات کا ماتم کرنا نہیں آتا بلکہ وہ حالات کو قابو پانے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ زندگی کو آنندلہر نے اچھی طرح سے جانا ہے اور وہی خیالات اور وہی زندگی کا تجربہ وہ اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عام انسانی زندگی پر لکھے گئے قصے ہیں گویا ایسا لگتا ہے کہ جیسے زندگی میں ہونے والے روزمرہ کے حالات ہیں جو انھوں نے خود محسوس کیا ہے اسی کو اپنے افسانوں میں پیش کردیا ہے۔ آنندلہر کے افسانوں میں ابھرتی، سسکتی، چھومتی، جوجھتی، پھرتی زندگی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قصے ہر شخص کی زندگی سے ہر دن گزرتے ہیں۔ آنندلہر کے افسانے بہت ہی مختصر ہوتے ہیں مگر ان مختصر افسانوں میں وہ بہت کم لفظوں میں زیادہ بات کہہ دیتے ہیں۔ مثلاً

''تو بہتر یہی ہوگا کہ جہاں راستہ مڑے تم بھی موڑ کاٹتے جاؤ کیوں کہ پاؤں راستے کے موڑوں کے ساتھ ہی مڑے ہیں''۔(86)

افسانہ''راستے کا پہاڑ''میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

''لیکن ان سے پیچھا کیسے چھڑایا جاسکتا ہے۔''اس نے پھر سوال کیا؟ ہر لفظوں کو حرفوں میں بانٹ دیں۔ کروڑوں لفظ کٹ کر چند حرفوں میں بٹ جائیں گے اور ہم انھیں آسانی سے ختم کرکے اپنے آپ کو آزاد کرسکیں گے''اتنا کہہ کر وہ زخمی شخص گہری نیند سوگیا''۔''انحراف''،ص 13

اسی طرح سے آنندلہرا پنے ایک اور افسانہ''سورج کا قتل''میں لکھتے ہیں:

''اگر تمام حملے جنگ کو روکنے کے لیے ہی کیے جاتے ہیں تو پھر جنگ کا آغاز کون کرتا ہے ....اپنی غلطی کو چھپانے کے لیے انھوں نے غصہ کا سہارا لیا اور سورج پر الزام لگایا کہ وہ ان سے دھوکا کرتا ہے لہٰذا سب سے پہلے سورج کو قتل کیا جائے بس اس کے بعد اندھیری رات میں سورج کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا جانے لگا اور یہ اعلان کیا گیا کہ بچوں کو اب یہ سبق

نہیں پڑھایا جائے گا کہ سورج ہمیں روشنی اور گرمی دیتا............سورج کو اگر قتل کرنا ہے تو پہلے آسمان سے دوستی کرنی ہوگی۔نہیں ہمیں تو آسمان کو فتح کرنا ہوگا۔دوسرے نے جواب دیا مگر ہر بھلا وہاں تک پہنچیں گے کیسے؟ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہر پاؤں کٹوا دیں تا کہ ہر ہوائیں اُڑسکیں‘‘۔(87)

اس سے پہلے آنند لہر کا ایک افسانوی مجموعہ ’’سرحد کے اُس پار‘‘ 2001ء میں منظر عام پر آیا۔اس کے بعد اُن کا تیسرا افسانوی مجموعہ ’’بٹوارہ‘‘ کے عنوان سے 2009ء میں شائع ہوا تھا۔اُن کی یہ کتاب کل 182 صفحات پر مشتمل ہے جس میں کل 34 افسانے شامل ہیں۔

اس مجموعے کے شائع ہونے کے بعد نہ صرف ریاست جموں و کشمیر میں آنند لہر کا نام مشہور ہوا بلکہ ریاست سے باہر بھی انھیں کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔اس مجموعے کو آنند لہر نے خود نو آموز وکیلوں کے نام کیا ہے اور لکھتے ہیں کہ

’’جموں بار ایسوسی ایشن کے ان نو آموز وکیلوں کے نام، جو صرف میری عزت ہی نہیں کرتے بلکہ مجھ سے از حد محبت بھی کرتے ہیں‘‘۔(88)

اس مجموعے میں آنند لہر نے روایتی افسانے بھی لکھے تھے اور ان کے کئی افسانے قاری کو متاثر کرنے میں کافی اہم ثابت ہوئے ہیں۔راقم کو ان کا افسانہ خاص طور پر ’’بٹوارہ‘‘ سب سے بہترین لگتا ہے۔اس افسانے کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بٹوارہ کے وقت کی تمام تصویریں آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں گویا ایسا لگتا ہے جیسے کوئی فلم چل رہی ہو۔زبان و بیان کے اعتبار سے اور کردار اور منظر نگاری کے حوالے سے بھی یہ افسانہ کافی اہمیت کا حامل ہے۔اس افسانے کے کردار، جن میں سرپنچ، نظیر چند نیاری والا، راج دین نمبردار، نہیا، گلاب، سائیں داس، اور بیگماں وغیرہ ان تمام کے اردگرد پوری کہانی کا تانا بانا بنا گیا ہے۔بٹوارے کی اصل بنیاد کیا تھی کہ ایک گیند مٹّی میں چلی جاتی ہے او ر دونوں گاؤں کے پنچ اور سرپنچ فیصلہ کرتے ہیں کہ گیند کو توڑا جائے یا مٹّی کو اس وجہ سے سرپنچ کا فیصلہ ہوتا ہے کہ بٹوارہ کیا جائے اس میں کچھ لوگ خوش تھے اور کچھ ناخوش اور خود سرپنچ تیسرے گاؤں میں رہائش پذیر ہو جاتا ہے۔

اب ہوتا یوں ہے کہ دونوں گاؤں میں نہ صرف لوگوں کا بٹوارہ ہوتا ہے بلکہ تمام تر چیزوں کے ساتھ ساتھ پرندوں، جانوروں اور درختوں کا بھی بٹوارہ ہو جاتا ہے۔دونوں گاؤں کے لوگ ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں شریک ہونا چاہتے ہیں مگر سرحد کی وجہ سے ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہونے کے باوجود ملنے کی اجازت لینی پڑتی۔دونوں

گاؤں میں دوستی رشتہ داری قائم ہے مگر بغیر اجازت کے ایک دوسرے کے یہاں نہ جاسکتے۔ ایک دن راج دین کا بیٹا گلاب بیمار ہوتا ہے تو نصیر چند کے پاس سے دوائی منگوائی جاتی ہے مگر وہ چوں کہ دوسرے گاؤں میں تھا اس لیے سرحد میں کھڑے فوجی آفیسروں سے اجازت لینی ضروری ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''صاحب میرا بچہ بیمار ہے'' ''تو کیا کریں...........؟''

''صاحب سرحد سے دوائی منگوانی ہے۔ اگر انسانیت کے ناطے ہوسکے''۔(89)

ایسی پابندیوں کی وجہ سے دو گاؤں کے لوگ اپنی زندگی گزارنے لگے۔ ہر تیہوار اور شادی بیاہ میں اسے شامل ہوتے جیسے ایک طرف ڈھول بج رہا ہے تو دوسری طرف تمور دونوں طرف باجے کا تال اشاروں میں ہی ملایا جاتا۔ ملاحظہ ہو اقتباس:

''یہی حال اب اُس گاؤں والوں کا ہے۔ ایک دن شادی تھی۔ اشاروں اشاروں میں لوگوں نے فیصلہ کرلیا۔ ڈھول ایک طرف بجا تو تمور دوسری طرف کیوں کہ تقسیم میں صرف لوگ ہی نہیں بلکہ کھیل، آنگن، رسمیں، بینڈ، اسکول، کتابیں سب بٹے''۔(90)

اس متذکرہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنند لہر کو افسانہ نگاری کے نہ صرف منظر نگاری پر دسترس حاصل تھی بلکہ وہ افسانہ نگاری کے فن پر خوب مہارت رکھتے تھے۔ کردار نگاری کے معاملے میں بھی انھیں کمال حاصل تھا۔ جس کی چند مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں۔

''نیہا اور بڑی ہوئی۔ ایک دن اُس نے پوچھا۔

''کیا میری ماں بھی میری طرح غریب تھی؟

''نہیں بیٹی ایسی بات نہیں ہے کیونکہ اس وقت چوڑیوں کے بہت گاہک تھے۔ رنگ برنگی اور خوبصورت چوڑیوں کے'' ''وہ گاہک کہاں گئے............'' نیہا نے پوچھا''۔

اسی طرح سے ایک اور مثال ہے۔ جس کو آنند لہر نے بہت ہی خوبصورت انداز اور الفاظ میں پیش کیا ہے اور دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اگرچہ دونوں گاؤں کا بٹوارہ ہو چکا ہے مگر لوگوں کے دلوں میں ابھی بھی اتنی ہی محبت ہے جتنی پہلے تھی۔ سرحدوں کے باوجود اب بھی وہ دونوں طرف سے ایک دوسرے کی مدد کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ

ہوں:

''سائیں داس نے زور سے کہا'' خود دین شادی نہ توڑ نا روپے بھیج رہا ہوں............سائیں ٹھیکڑ پھر زور سے چیخا'' روپے مت بھیجنا کیوں کہ اُس گاؤں کے روپے اس گاؤں میں نہیں لگتے .... سائیں داس کے ساتھ کچھ اور لوگ ملے ۔سب نے ایک سرنگ بنائی او رسائیں داس نے دودھ بھیجا۔ایک دن وہ دودھ پکڑا گیا۔فوجی اکٹھے ہوئے۔سائیں داس بچ گیا۔''صاحب یہ کیسے ثابت ہوسکتا ہے کہ یہ کس گاؤں کا دودھ ہے کیوں کہ دودھ کا رنگ تو ہر طرف ایک جیسا ہوتا ہے۔یہ انسان کے بنائے ہوئے روپے تو ہیں نہیں کہ ایک ملک کے روپے دوسری طرف نہیں لگ سکیں''۔(91)

اس افسانے میں مصنف نے نہ صرف خوبصورت لفظوں کا استعمال کیا ہے بلکہ صنعتوں،تشبیہوں اور استعاروں وغیرہ کا بھی اچھے سے استعمال کیا ہے۔اس افسانے میں مصنف کے کہنے کا صرف یہی مقصد تھا کہ یہ بٹوارہ صرف او رصرف زمین کا ہوسکتا ہے اور اس سے صرف انسانوں کے لیے سرحدیں بنائی جاسکتی ہیں۔مگر ان کے دلوں میں محبت کی سرحدیں نہیں بنائی جاسکتی اور دوسری طرف پرندے، جانور اور درخت یہ کہتے ہیں کہ لڑائی صرف انسانوں کے درمیان ہے مگر اس کا اثر سب چیزوں پر کیوں ہوا۔

''افسانہ'' دادی اماں'' بھی کافی اہمیت کا حامل ہے۔بلکہ یوں کہنا غلط نہ ہوگا کہ آنند لہر کے ایکا دکا افسانے جس میں اسلوب اور پلاٹ میں چند خامیاں ضرور ہیں مگر دیگر افسانے قابل تحسین ہیں۔''دادی اماں'' میں مصنف نے بوڑھی دادی کی محبت کو بڑے اچھے اور خوبصورت لفظوں میں استعمال کیا ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح سے وہ اپنے دونوں پوتوں راجہ اور گوپی کی پرورش کرتی ہے۔اس کے دل میں اپنے ان دو پوتوں کے علاوہ کچھ باقی نہیں ہے۔ہر وقت ان کے ہی بارے میں سوچتی رہتی ہے۔خود بھوکی رہتی ہے مگر اپنے پوتوں پر کبھی آنچ نہ آنے دیتی۔اس افسانے میں تین مرکزی اور اہم کردار ہیں۔راجہ، گوپی اور دادی، راجہ اور گوپی دونوں بھائی تھے اور بچپن میں ہی سائیہ پدری سے محروم ہوگئے اس کے بعد ان کی دادی ہی ان کا سب کچھ تھا۔دادی نے بھی ان کی پرورش میں کوئی کثر باقی نہ رکھی تھی۔اچھی خاصی جائیداد کے بھی مالک تھے مگر ان کا دادا مرنے سے پہلے کاغذات پر یہ لکھ کے گئے تھے کہ ان کی اہلیہ کے مرنے کے بعد گوپی اور راجہ جائیداد کے مالک بنیں گے۔ایک بار راجہ کو بدریش میں سیٹ پکی ہوگئی اور پیسوں کی ضرورت ہوئی دادی

نے اپنے جوانی کے بچے سارے روپے جو ایک صندوق میں رکھے تھے جس میں ایک ایک اٹھانی، چوانی، روپیہ وغیرہ تھا سب راجہ کو دے دیے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''اس ایک ایک روپے کے اندر کئی کہانیاں بسی تھیں۔ کئی بار دیوالی کی مٹھائی کم لائی گئی تھی۔ کئی بار رات کو دیا بجھا دیا گیا تھا تا کہ ایک روپیہ بچ جائے۔ ایک بار اس نے کپڑے سلوائے تو دادی نے بٹن کم لگائے۔ وہ کم بٹنوں والے کپڑے کم مزدوری دے کر لائی اور ایک روپیہ بچائے ہوئے کہنے لگی اسی میں گزارا کر لیں گے۔ ایک بار اُس نے نائی سے جھگڑا کیا کہ اٹھنی کم دی تھی۔ کچھ روپے تو چائے میں دودھ کم ڈال کر بچائے گئے تھے''۔(92)

اس مذکورہ اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے قریب لوگوں کی کتنی خستہ حالت تھی اور کس طرح سے وہ اپنی آمدنی میں سے ایک ایک روپیہ اکٹھا کرتے تھے۔ بہر حال راجہ اور گوپی جب جوان ہو گئے تو پیسوں کے لالچ میں آ کر انھوں نے ایک بار اپنی زمین بیچنے کا ارادہ کیا مگر وہ تب تک ایسا نہیں کر سکتے تھے جب تک ان کی دادی اماں کی وفات نہ ہو جائے۔ اب ان دونوں نے اپنی دادی کو مارنے یعنی اس کا قتل کرنے کی ترکیب سوچنے لگے یہاں افسانہ نگار نے کمال درجہ کے الفاظ پیش کیے ہیں۔ مثلاً

''بوڑھی اگر مر جائے تو اس کا کیا بگڑے گا؟ راجہ نے کہا۔'' اب جی کر بھی کیا کرے گی؟ ....کیوں نہ اسے آرام سے مارا جائے'' راجہ نے کہا۔'' وہ کیسے............؟ گوپی نے سوال پوچھتے ہوئے کہا۔ چاقوں سے ماریں اُسے؟''(93)

ایک طرف گوپی اور راجہ کو اپنی دادی کی محبت اور پرورش یاد آنے لگی تو دوسری طرف پیسوں کے لالچ سے اُن کے دماغ میں کشمکش ہونے لگی۔ یہ سوچتے سوچتے دونوں سو گئے اور صبح دادی اماں مری ہوئی نظر آئی اور خط میں راجہ اور گوپی کے نام کچھ اس طرح لکھ گئی جس سے پڑھ کر ہر قاری کے ذہن میں داری اماں کے لیے ایک محبت کا جزبہ بڑھ جاتا ہے۔ اقتباس:

''پیارے بچوں کپڑے کچھ دنوں کے لیے دھو چکی ہوں۔ سوئیٹر دوسرے بڑے ٹرنک میں ہیں۔ راجہ تمہیں کہہ دوں کہ بدیش جا کر اپنی صحت کا خیال رکھنا اور کھانا بنانا پڑا ہے۔ جب مجھے جلا کر آنا تو فوراً کھا لینا بھوکے نہ رہنا''۔(94)

اس افسانے کو مصنف نے بڑے اچھے انداز میں پیش کرنے کی کوشش بھی کی ہے مگر کچھ جگہوں پر ان کے افسانوں میں خامیاں بھی نظر آتی ہیں۔ چاہے وہ اسلوب یا لفظوں کی پیش کش میں ہوں چاہے وہ کردار نگاری یا پھر منظر نگاری وغیرہ میں ہوں مثلاً اسی افسانے ''دادی اماں'' میں انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''انھوں نے سوچا تھا کہ راجہ بدیش جائے گا کروڑوں روپے کما کر لائے گا۔ پھر دونوں ایک بڑا امکان بنائیں گے، موٹر سائیکل پر بیٹھ کر لڑکیاں چھیڑیں گے، مرضی کے کپڑے پہنیں گے''۔(95)

اس متذکرہ بالا اقتباس کو پڑھنے سے شاید آپ کو بھی لگے گا کہ اس اقتباس میں جھول سا پیدا ہو جاتا ہے جو راقم کو بھی لگا کہ ایسا جملہ استعمال کرنا کہ ''سائیکل پر بیٹھ کر لڑکیاں چھیڑنا............'' اس کی جگہ مصنف نے اگر کوئی دوسرا جملہ استعمال کیا ہوتا تو شاید میرے خیال سے اچھا رہتا کیوں کہ یہ اس دور کا افسانہ ہے جب غربت اور بھکمری ہوا کرتی تھی اور ظاہر سی بات ہے کہ اگر کوئی پڑھا لکھا نوجوان بدیس سے پڑھ کر واپس آئے گا تو اس کا ذہن ایک الگ قسم کا ہوگا۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ انھوں نے یہ جملہ کیوں استعمال کیا ہے۔ بہر حال اس کے باوجود ان کا یہ افسانہ قابل تحسین ہے۔

افسانہ ''دوسرا بٹوارہ'' بھی آنند لہر کا ایک اہم افسانہ ہے۔ اس میں انھوں نے ایک گھر کی کہانی کو اس طرح سے پیش کیا ہے کہ بٹوارہ کے بعد کے تمام حالات اس میں بیان کر دیے گئے ہیں۔ یہ ایک علامتی افسانہ ہے جس میں ایک نئی دلہن کو افسانہ نگار نے علامتی طور پر پیش کیا ہے۔ اور ایسے گھر کے حالات کو پیش کیا ہے جہاں ہر طرف ایک دوسرے کے دلوں میں محبت اور ایکتا بھری پڑی تھی۔ مگر اچانک ایک نئی نویلی دلہن کے گھر آنے سے مانوں پورے گھر کو گرہن لگ گیا ہو۔ ایسا لگ رہا ہو جیسے کہ لوگ خوشیوں کی جگہ ماتم کر رہے ہوں۔ محبت کے بجائے اب چاروں طرف نفرت ہی نفرت دکھائی دیتی ہے۔ اور ایک ہی گھر میں جیسے نفرت کی ایک بڑی دیوار کھڑی کر دی گئی ہو۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''نربدا یہ جان کر حیران ہوگئی کہ یہ لوگ اکٹھے رہتے ہیں۔ درشن سے اس نے کہا جو مزا الگ رہنے میں ہے وہ اکٹھے رہنے میں نہ ہے۔ نربدا نے ایک دن کھانا کھایا اور الٹی کر دی اور کہا کہ وہ اپنا بنایا ہوا کھانا ہی کھا سکتی ہے اس پر الگ ہونے کا سلسلہ شروع ہوا، خاندان بٹا، گھر بٹا، پھر کاروبار بٹا''۔(96)

اس افسانے میں چار کرداروں پر زیادہ زور دیا ہے۔ سوہن لعل، ٹیٹو، موہن لعل اور نربدا۔ اس کے علاوہ وہ کچھ

ضمنی کردار بھی پیش کیے ہیں۔ سوہن لعل اور موہن لعل دونوں سگے بھائی تھے۔ ان دونوں کے بیٹے ترقی کر کے ایک بیڈمینٹن کا کھلاڑی بن گیا تھا اور دوسرا یعنی موہن لعل کا لڑکا کرکٹ کا کھلاڑی بن گیا تھا اور سارا پریوار ایک ساتھ رہتا تھا او رکچھ چچازاد بھائی بھی ساتھ میں ہی رہتے تھے مگر جب موہن لعل کا لڑکا شادی کرتا ہے تو سارا ماحول خراب ہوجاتا ہے۔

نربدا اصل میں جس گھر سے آئی تھی وہاں بھی اس کے والد اور چچا کی آپس میں نہیں بنتی تھی۔ اسی وجہ سے اس کو وہ خوشگوار ماحول اچھا نہ لگا اور اس نے پورے گھر اور جائیداد کا بٹوارہ کروادیا یہاں تک کہ اس سے پہلے لوگ اس گھر کی ایکتا اور محبت سے اکٹھے رہنے کی مثالیں دیتے تھے مگر اب نربدا کے آنے کے بعد سے گھر میں ہی ایک دوسرے کی شکل دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن آخر میں نربدا اپنے مائیکے جاتی ہے تو وہاں پورا ماحول بدلہ ہوا تھا اور سارے ایک ساتھ رہنے لگے تھے کیوں کہ نربدا کے والد ایک بار نربدا کے سسرال میں ایکتا اور محبت دیکھ کر حیران تھے اور انھوں نے بھی گھر جا کر اپنے بھائیوں سے نفرت کی دیوار توڑ کر پھر سے بھائی کی طرح رشتہ جوڑ دیا تھا اور دوسری طرف موہن لعل اور سوہن لعل کے گھر میں بھی سب ایک ہوجاتے ہیں۔ نربدا کے والد نے جب نربدا کے سسرال کا ماحول دیکھا تو تو اس نے گھر جا کر کچھ یوں کہا تھا اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''لوگ زندگی میں ایک بار تیرتھ کرتے ہیں مگر میری بیٹی تو تمام زندگی تیرتھ ستھان میں رہے گی۔ ان سب کو جب میں نے تمہارے گھر کا ماحول بنایا تو ہماری دیواریں ٹوٹ گئیں اور آنگن ایک ہوگئے۔ کیونکہ ملک بٹنے سے ایک بٹوارہ ہوا تھا اب گھر بٹنے سے ہم دوسرا بٹوارہ نہ کر سکتے تھے''۔(97)

اسی طرح سے افسانہ ''بیراگن'' میں آنند لہر نے ایک ایک عورت کے جذبات اور اُس کی بے پناہ محبت کو پیش کیا ہے۔ اس افسانے میں تین کردار بہت اہم ہیں۔ گوتم پرشاد، سریتا اور ویشیا، گوتم پرشاد کی شادی تو کرادی تھی مگر وہ بیراگ بن کر رہتا تھا یعنی اس نے دنیا تیاگ دی تھی (بیراگ ایک سنسکرت لفظ ہے جس کے معنی دتیا تیاگ دنیا کے ہیں) سریتا جو کہ گوتم پرشاد کی بیوی تھی۔ اس نے لاکھ کوشش کی کہ وہ اپنی محبت کے اثر سے گوتم پرشاد کو قابو میں کرلے مگر ناکام رہی اگر میں ویشیا نام کی عورت جو کہ کوٹھے پر ناچنے کا کام کرتی ہے اُس کی خوبصورتی کو دیکھ کر گوتم پرشاد عاشق ہوجاتا ہے مگر ویشیا اسے اپنی سچائی بتاتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''اُس پر ویشیا نے کہا اُس کا وقت بٹا ہوا ہے اُس کا حسن گلی میں لگے بلب کی طرح ہے

جوراستہ تو روشن کرسکتا ہے مگر کسی کے گھر کا اندھیرا نہ مٹا سکتا ہے‘‘۔

اُس کے بعد گوتم پرشاد کو اپنی بیوی سریتا کی محبت یاد آتی ہے اور بھاگا ہوا گھر آتا ہے مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی کیونکہ اب سریتا نے دنیا تیاگ دینے کا فیصلہ کرلیا تھا اور وہ اب بیراگن بن چکی تھی۔افسانہ نگار نے اس افسانے میں ایک عورت کی بے پناہ محبت و جفاکشی اور جانفشانی کو پیش کرنے کی بہترین کوشش کی ہے۔جو کافی حد تک کامیاب کوشش بھی نظر آتی ہے۔

افسانہ’’دوسری بے انصافی‘‘میں آنندلہر نے سماج کی سچائی کو پیش کیا ہے۔آنندلہر میں یہ قابلیت بہت زبردست تھی کہ وہ اپنے سماج میں جو بھی ہوتا تھا اُس کی ہو بہو تصویر اپنے افسانوں میں پیش کر دیتے تھے۔ایسا ہی کچھ اس افسانے ’’دوسری بے انصافی‘‘میں بھی پیش کیا گیا ہے۔انھوں نے سچ کی لڑائی لڑی ہے اس افسانے میں بھی انھوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے، کہ عدالت کا صرف یہی کام ہے کہ اُس کے پاس جو بھی آئے اُس کے بارے میں تمام بیانات کو مدِنظر رکھتے ہوئے اپنا فیصلہ سنائے اُس کے آگے عدالت کا کوئی کام نہیں ہوتا ہے یعنی کہ عدالت تو اپنا فیصلہ سنا دیتی ہے مگر اُس کے بعد مرنے والے لوگوں کا کیا ہوا اُن کے گھر والوں، بیوی، بچوں پر کیسے گزری اس بات کا کسی پر اثر نہیں ہوتا ہے یہی سب اس افسانے میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

’’جج صاحب‘‘ بھی مصنف کا ایک بہترین افسانہ ہے۔اور چوں کہ وہ خود پیشے سے وکیل تھے تو اس وجہ سے ان کے اپنے جذبات بھی اس میں دیکھے جاسکتے ہیں انھوں نے اپنی وکالت کی زندگی میں گزرے لمبے اور ایمانداری اور انصاف وغیرہ کو بھی اس افسانے میں دیکھا جاسکتا ہے، یہ ایسی کہانی ہے کہ جو اکثر ہمارے سماج میں دیکھنے کو ملتی ہے۔اس افسانے میں افسانہ نگار نے افسانے کی ابتداء میں بھی جج صاحب کو ایک سچے اور ایماندار شخص کے طور پر پیش کیا ہے۔اس افسانے میں چار کرداروں کے اردگرد پوری کہانی کا تانا بانا بنا گیا ہے۔جس میں گرداس مل، نرج کمار شرما، جج کیلاش ناتھ جوشی اور کنول۔

افسانہ نگار نے اس میں ایک جج کو ایمانداری سے اپنا کام کرنے اور سچائی بیان کرنے والے کردار کو پیش کیا ہے اور چوں کہ اس افسانہ میں مصنف نے دیگر محکمہ جات میں کئی بے ایمان آفیسروں کو بے نقاب کیا ہے۔مگر ایک جج صاحب کو ایماندار کے طور پر پیش کیا ہے لیکن آخر میں وہ بھی بے ایمان ہوجاتا ہے، لیکن باوجود اس کے مصنف نے اس افسانے میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جج صاحب پوری طرح سے ایماندار بھی نہیں ہیں مگر سیاست دان، باقی بے

ایمان آفیسروں کی طرح بے ایمان بھی نہیں ہیں۔ جج صاحب کی تھوڑی سی بے ایمانی اُس وقت نظر آتی ہے جب جج صاحب نیرج کمار سے کچھ گفتگو کرتے ہیں۔ نیرج کمار شرما، چونکہ ایک سنگیت کار تھے اور سنگیت کار کے کام میں وہ جج بنا ہوا تھا اور لوگ اپنے بچوں کے ہنر دکھانے اُس کے پاس جاتے تھے اور وہ نمبر دیتا تھا۔ ملاحظہ ہو اقتباس:

''بے انصافی کی گنجائش نہ رہے۔ کیونکہ جج صاحب بیٹھے ہوئے ہیں۔ جج صاحب ٹہلتے ٹہلتے اندر کی طرف چلے گئے۔ نیرج کمار گھبرا گیا اُس کو پسینہ آ گیا۔ اُس نے سمجھا کہ شاید اُس سے کچھ غلط ہو گیا ہے۔ جج صاحب اور اندر چلے گئے۔ نیرج جھک کر کھڑا ہو گیا مگر جج صاحب اُسے صرف اتنا کہا ''میری بیٹی کا خیال رکھنا..........''۔(98)

''افسانہ یہ سرحدیں'' میں آنند لہر نے ایک عورت کے موضوع کو پیش کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ تمام مذاہب میں یہی تعلیم دی جاتی ہے کہ عورت عظیم ہے اور اس کی حفاظت کرنے میں چاہے اپنا وقت برباد بھی ہو جائے مگر پھر بھی عورت کی حفاظت ضروری ہے یہی سب کچھ اس افسانے میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں مصنف کی اسلوب نگاری اور جذبات نگاری قابل تعریف ہے۔ اور تمام مذاہب کو ایک جگہ رکھ کر ایک انسانیت کا فرض ادا کرتے ہوئے ایک شخص کو پیش کیا ہے کیوں کہ انسانیت سے بڑا کوئی دھرم نہیں ہوتا ہے۔ اس افسانہ میں ایک راجہ نام کا شخص ہے جو ہر دھرم کو مانتا ہے وہ فوج میں بھرتی ہو جاتا ہے اُس کا خیال تھا کہ سرحد کی حفاظت کرنا تو اُس کا اصول ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ عورت کی حفاظت اور انسانیت کو زندہ رکھنا بھی اُس کا دھرم ہے۔ ایک بار سرحد میں ایک عورت کی عزت لوٹی جا رہی تھی، کہ راجہ نے اُس عورت کو بچا لیا مگر سرحد پار کرنے کے جرم میں اسے دوسرے ملک کی عدالت نے پانچ سال کی سزا سنائی اور دوسری طرف اپنے ملک میں بھی اُسے غدار کہنے لگے۔ جب وہ دوسرے ملک کی عدالت میں اپنا جرم پوچھتا ہے تو اُس وقت کا ایک واقعہ پیش خدمت ہے۔

''ایک اچھا کام کیا ہے۔ میں نے ایک عورت کی عزت بچائی ہے'' ''مگر تم نے سرحد پار کی ہے؟'' ''حضور عورت کی عزت بچانا بھگوان کا حکم ہے اور سرحد کی حفاظت کرنا انسان کا ....''۔

''خاموش..........وہ عورت تمہارے ملک کی نہیں تھیں''

''مگر حضور! عورت کے درد کا کوئی ملک نہیں ہوتا۔ وہ جہاں بھی ہو اُس کا بدن ایک جیسا ہے''

(99)

ان متذکرہ بالا افسانوں کے علاوہ اس مجموعے میں اور بھی بہت سارے افسانوں کو مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اس کے بعد آنند لہر کا ایک اور افسانوی مجموعہ ''سر شیٹا نے بھی یہی لکھا ہے'' کے عنوان سے 2015ء میں روشان پرنٹرس دہلی سے منظر عام پر آیا۔ یہ مجموعہ کل 153 صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں ان کے کل 38 افسانے شامل ہیں۔

اس افسانوی مجموعے میں راقم کی نظر میں آنند لہر کا سب سے بہترین افسانہ ''سریشٹا نے بھی یہی لکھا ہے'' ہے چوں کہ اس افسانہ میں مصنف نے جذبات نگاری سے بہت کام لیا ہے۔ جس کی وجہ سے قاری اس کو مزے لے لے کر پڑھنے میں مشغول رہتا ہے۔ اس افسانے میں چار کردار بہت ہی اہم ہیں۔ روشن، حمید، بانو اور سریشٹا۔ اس کے علاوہ کچھ ضمنی کردار بھی ہیں جن میں گل اور نریش وغیرہ شامل ہیں۔ افسانہ نگار نے اس میں دونوں ملکوں کی سرحدوں کو پیش کرنے میں صرف ایک ہی منظر پیش کیا ہے۔ روشن اور حمید دونوں ملکوں کے سپاہی ہیں اُن کے آفیسر انھیں اپنے اپنے ملکوں کا راز بتانے کے لیے جاسوس بنا دیتے ہیں مگر اس سے وہ راز تو نہیں بتانے پر دونوں ایک جگہ بیٹھ کر سریشٹا اور بانو کی باتیں کرتے سریشٹا جو کہ روشن سے محبت کرتی ہے اور بانو جو کہ حمید سے پیار کرتی ہے۔ مگر اسی بیچ گُل اور نریش نامی کرداروں کو مصنف نے پیش کیا ہے گُل، بانو کو چاہتا ہے اور حمید اُس کا سب سے بڑا دشمن ہے اور دوسری طرف نریش سریشٹا کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے وہ روشن سے اسے دشمنی ہے اور آخر میں دونوں گُل اور نریش اپنے اپنے آفیسروں کو جھوٹ بول کر اور حمید اور روشن کو غداری کے الزام میں گولی مار دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ایک اقتباس:

> ''وہ دیکھو صاحب حمید روشن کو اپنے ملک کے نقشے دکھا رہا ہے۔ یعنی کہ ملک کے ساتھ غداری کر رہا ہے''۔ ''کمانڈر نے زور سے گولی چلائی جو کہ سیدھے حمید کو لگی اور حمید مر گیا اور مرتے ہوئے کہنے لگا'' بانو نے لکھا ہے ادھر نریش بھی اپنے کمانڈر کو لایا۔ اس نے بھی کمانڈر کو یہی بات بولی۔ پھر روشن پر گولی چلی اور مرتے ہوئے روشن نے کہا'' سریشٹا نے بھی یہی لکھا ہے ''۔(100)

اس کے علاوہ اُن کا ایک اور افسانہ ''بدلتے رنگ'' بھی قابل ذکر ہے۔ اس افسانے میں مصنف نے ایک مرد کی زندگی میں ہونے والی تمام تکلیفیں اور پریشانیاں جو اُسے اپنے ہی گھر پریوار میں جھیلنی پڑتی ہیں اور کس طرح سے وہ اپنی تمام پریشانیوں کو دور کر دیتا ہے مگر کبھی بھی اپنے بیوی اور بچوں سے الگ ہو کر زندگی گزارنے کا فیصلہ نہیں کرتا اور نہ ہی ان

پریشانیوں سے منہ موڑتا ہے۔

اسی طرح سے آنند لہر کے دیگر افسانوں میں ایک افسانہ ''اپنا گھر'' اس افسانے میں مصنف نے ایک عورت کو سچی محبت کو پیش کیا ہے، اسی طرح افسانہ ''بدلتے لوگ'' کی کہانی بھی ہے۔ ''بدلتے لوگ'' افسانہ میں آنند لہر نے ایک مرد کے جذبات اور سچی لگن کو پیش کیا ہے اور ''اپنا گھر'' میں ایک عورت کی محبت کو پیش کیا ہے۔ اس افسانے میں دو مرکزی کردار ہیں راجا اور سریشٹا۔ راجا ایک بہت بڑی فیکٹری کا مالک تھا اُس کے والد دینا ناتھ کروڑوں کے مالک تھے مگر وہی پیسہ راجا عورتوں سے عیاشی میں اڑا دیتا تھا۔ دینا ناتھ کی خواہش کے مطابق اس نے ایک گاؤں کی لڑکی سریشٹا جو ایم۔ اے پاس تھی اور بہت خوبصورت تھی سے شادی کر لی۔ مگر راجا کے لیے بیوی ایک کھلونا تھی وہ اپنی بیوی کے ہوتے ہوئے بھی دوسری عورتوں کے ساتھ عیاشی کرتا تھا۔ راجا کے لیے بیوی صرف ایک نام کے مانند تھی اور کچھ نہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''اُسے لگا کہ جیسے اُس کے باپ نے اُسے سونا اور کپڑے دیئے ہیں۔ ایسے ہی ایک عورت بھی دی ہے۔ جس کا نام بیوی ہے جیسے، ریتا، سلمٰی، گلاب، ہزاروں لڑکیوں کے نام تھے اُس نے سوچا کہ بیوی بھی ایک نام ہے''۔(101)

مگر آخر میں جب راجا کو ایسی بیماری لگ جاتی ہے جس کو نہ بتایا جاتا ہے اور نہ ہی اُس کا کوئی علاج تھا۔ ڈاکٹروں نے اُسے پاگل خانے بھیجنے کا فیصلہ کیا مگر سریتا نے نہیں مانا اور وہ راجا کو اپنے گھر لے گئی اور بہت پیار کرنے لگی۔ تب راجا کو محسوس ہوا کہ جتنی محبت، جتنی خوبصورتی سریتا کے پاس ہے اتنی کسی دوسری عورت کے پاس نہیں تھی۔

آنند لہر کی افسانہ نگاری کے بارے میں شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں کہ:

> ''لہر کی افسانہ نگاری پر اب کسی شک کی گنجائش نہیں انھوں نے تین دہائیوں کی مدت افسانہ نگاری کے میدان میں صرف کی ہے۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ وہ فیشن کو ہمارا میں بے راہ رو نہیں ہوتے۔ شروع ہی سے انھوں نے اشعاراتی اور علامتی لیکن سہل اور آسانی سے دل میں بیٹھ جانے والا اسلوب اختیار کیا تھا، اس پر وہ ہمیشہ قائم رہے۔ معاصر دنیا کا عکس اس کے افسانوں میں نہ اس طرح جھلکتا ہے کہ اخباری رپورٹ معلوم ہو اور نہ وہ اس قدر دھندلا یا گنجلک ہے کہ اس کے خدوخال کو پہچاننے کے لیے دیر تک الجھنا پڑے''۔(102)

آنند لہر کے بہت ہی چھوٹے چھوٹے افسانے ہوتے ہیں مگر ان کم الفاظ میں وہ بہت کچھ کہہ دیتے ہیں۔ان کی خاص بات یہ ہے کہ وہ انھوں نے اپنی تخلیقات میں بہت ہی عام اور آسان زبان کا استعمال کیا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی بات قارئین تک پہنچانے میں قارئین کا خاص خیال رکھا ہے۔اسی وجہ سے قاری اُن کی تخلیقات کو پڑھنے میں کھٹن محسوس نہیں کرتا ہے۔

ان متذکرہ بالا افسانوی مجموعوں کے علاوہ آنند لہر کے دو اور افسانوی مجموعے قابل ذکر ہیں۔''سرحد کے اُس پار''جو 2001ء میں منظر عام پر آیا تھا اور اس کے علاوہ ''کوٹ مارشل'' بھی ان کا ایک قابل قدر افسانوی مجموعہ ہے۔

آنند لہر کی افسانہ نگاری اور ان کی کردار نگاری کے بارے میں انور کمال حسینی اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں کہ:

> ''ان کے افسانے زندگی کے قاشیں ہوتے ہیں جو زندگی کی طرح کھٹے، میٹھے، کڑوے، کسیلے اور تیز ہوتے ہیں اور ان افسانوں کے کردار کسی دور دیس کے اجنبی نہیں ہوتے بلکہ ہمارے معاشرے کے جانے پہچانے افراد ہوتے ہیں''۔(103)

اسی طرح سے جموں کی مشہور افسانہ نگار ڈاکٹر نصرت چودھری نے آنند لہر کی افسانہ نگاری کے بارے میں لکھا ہے:

> ''لہر کے یہاں زیادہ تر اینٹی اور تجریدی کہانیاں ملتی ہے۔انھوں نے اپنے افسانوں میں بغیر پلاٹ اور کردار کے ایک خواب اور کیفیت کو ابھارا ہے۔نئے افسانوں میں جہاں موضوعاتی سطح پر زندگی کی بے معنویت، معاشی، ناہمواری طبقاتی تضادات، بے چینی اور میکانکی عمل کا احساس ملتا ہے وہیں افسانے کے فن میں تجربے بھی ہوئے ہیں۔افسانے میں کہانی پن، پلاٹ اور کرداروں سے قطع منظر اینٹی پلاٹ اور اینٹی کہانی کی جھلک ملتی ہے۔نئے تجریدی افسانوں کی تکنیک اور ہیئت روایتی افسانوں سے قدرے مختلف ہیں۔آنند لہر کے یہاں زیادہ تر یہی نیا انداز کارفرما ہے۔ان کے افسانوں میں واقعات کی ترتیب، پلاٹ کی تعمیر اور کرداروں کے روایتی ارتقاء کے بجائے منتشر خیالات وواقعات کو یکجا کرکے پیش کیا گیا ہے۔جس طرح خواب میں ہم زماں ومکاں کی حدود سے ماورا ہو جاتے ہیں اسی

طرح ''انحراف'' جیسے افسانے کو پڑھتے ہوئے خواب کے عمل کے تحت زمانی ومکانی حدود
کے بجائے واقعات کا ایک منتشر عمل سامنے آتا ہے''۔(104)

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ آنندلہر جموں خطے کے ایک نمائندہ افسانہ نگار تھے۔ان کے افسانے اردو افسانہ نگاری کے میدان میں افسانے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان کے افسانے خاص طور پر روایتی انداز کے ساتھ تجریدی انداز میں دیکھے جاسکتے ہیں۔انھوں نے اپنے روایتی افسانوں کی تکنیک میں تجریدی تجربے کی بھی کوشش کی ہے۔جموں خطے کے فکشن نگاروں میں آنندلہر کا ذکر صفحہ اول میں کیا جاتا ہے۔

محمد اسلم میر شہزاد:

ان کا شمار 1947ء کے لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔محمد اسلم میر شہزاد خطہ جموں کے سرزمین کشتواڑ کے ایک پس ماندہ طبقے سے تعلق رکھتے تھے ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں کچھ خاص معلومات نہیں ملتیں مگر ان کی کچھ ادبی زندگی کے بارے میں مختصراً ذکر ملتا ہے۔وہ ایک شاعر اور افسانہ نگار تھے۔

افسانہ نگاری کے علاوہ بہت سارے مقامی مشاعروں اور ادبی محفلوں میں شرکت کرتے رہتے تھے۔ان کے بہت سارے افسانے ریاست کے اخبارات ورسائل میں شائع ہوتے رہے اس حوالے سے ان کا ایک مشہور افسانہ ''دل کی عدالت'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا تھا۔اس کے علاوہ ان کے جتنے بھی افسانے تھے ان تک راقم الحروف کی رسائی نہیں ہو پائی ہے کیوں کہ انھوں نے بہت کم لکھا تھا اور اس وجہ سے جموں کے محققین ومورخین میں سے صرف اکادکا ادیبوں نے ان کا مختصراً ذکر کیا ہے۔

اردو ادب سے انھیں کافی لگاؤ تھا وہ ایک ذہین اور محنتی قسم کے انسان تھے جس قدر انھوں نے اپنی تحریروں کو منظر عام پر لایا ہے اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ادبی میدان میں کافی دلچسپی رکھتے تھے مگر انھیں اپنے محکمہ انجینئر نگ سے بہت کم وقت ملتا تھا اس مصروفیت کی وجہ سے انھیں اردو ادب کی دنیا میں آنے کا موقع نہیں مل سکا۔یہی وجہ ہے کہ ان کی بہت ساری تحریریں منظر عام پر نہ آسکیں۔ان کی نثری کاوشوں کے بجائے ان کے شعری سرمائے منظر عام پر آچکے ہیں مثال کے طور پر ان کے کچھ اشعار پیش خدمت ہیں۔

طبیعت کی بے باکیوں سے ہم اکثر
زمانے کو تھوڑے دیوانے لگے ہیں

تمہاری محبت کے موسم سہانے
مجھے آج پھر یاد آنے لگے ہیں

محمد اسلم میر شیراز کی ادبی کاوشوں کے بارے میں ولی محمد اسیر کشتواڑی صاحب لکھتے ہیں کہ:

''وہ اردو کے کافی شوقین ہیں ایک ذہین اور محنتی نوجوان ہیں لیکن فن جس قدر متواتر کا تقاضا کرتا ہے اس کے لیے شیراز کے پاس وقت ہی باقی نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ ان کا شعری یا نثری سرمایہ ابھی بہت کم ہے اگر وہ کسی صاحب فن سے رجوع کرتے اور مطالعہ کتب کے لیے کچھ اوقات نکال لیتے تو وہ ان صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکتے ہیں جو ان کو قدرت کی جانب سے عطا ہوگئی ہیں''۔(105)

تمنا منشی:

ان کا پورا نام زاہدہ پروین تھا مگر وہ اپنے قلمی نام تمنا منشی کے نام سے مشہور ہیں۔ان کی ولادت 3/مئی 1956ء کو ضلع ڈوڈہ فرید آباد میں ہوئی تھی۔زاہدہ پروین (تمنا منشی) نے تقریباً تیس برس تک اردو ادب کی خدمت کی اور انھیں ضلع ڈوڈہ کی اول ادیبہ ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے۔ان کے افسانوں کی بات کریں تو ان کی کئی تحریریں ریاست اور بیرون ریاست کے مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوتی رہی ہیں۔

مصنفہ کے افسانوں کا اگر گہرائی سے مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ان کے افسانے زیادہ تر فنی بصیرت کے ہوتے ہیں اور اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں انسانی کردار کے روشن آئینے بھی دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔انھیں کرداروں کو ہو بہو اس کے اصل کردار میں ڈالنا آتا ہے وہ اس طرح سے کرداروں سے باتیں کرواتی ہیں جیسے لگتا ہے۔کہ یہ کردار ہمارے معاشرے کے جیتے جاگتے کردار ہیں۔ان کا اسلوب بھی کمال درجہ کا ہے۔وہ نہایت صاف اور سادہ زبان استعمال کرتی ہیں۔ان کی کہانی میں ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ ان کی کہانیوں میں ربط برقرار رہتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ انکی کہانی کے صفحے پڑھتے پڑھتے قاری کو کبھی الجھن محسوس نہیں ہوتی ہے۔اور ظاہر سی بات ہے کہ وہ خود ایک عورت تھیں اور عورتوں کی نفسیات کو اچھی طرح سمجھتی تھیں اس لیے ان کی کئی کہانیوں میں عورت کی ذہنی الجھن کے بڑے درد بھرے انداز میں پیش کیا ہے۔انھوں نے اپنی کہانیوں میں جو بھی موضوعات پیش کیے ہیں ان تمام کو انھوں نے صاف صاف واضح کرنے کی زحمت کی ہے اور ان کے اکثر موضوعات ہمارے سماج میں ہونے والے روزمرہ کی زندگی میں

دکھائی دینے والے موضوعات ہیں جس سے سماج کا ہر فرد اپنی کہانی سمجھ لیتا ہے۔تمنا منشی کے افسانوں میں احساسات و جذبات زیادہ تر دیہاتی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔

ضلع ڈوڈہ کے بزرگ ادیب جناب عاصم فریدی صاحب نے تمنا منشی کی ادبی خدمات کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''ضلع ڈوڈہ کے افسانہ نگاروں کی اولین صنف میں تمنا منشی کے تخلص سے موسوم خاتون افسانہ نگار کا اصلی نام زاہدہ پروین ہے۔ان کے افسانے فنی بصیرت کے ساتھ ساتھ انسانی کردر کے روشن آئینے ہیں جس مزاج کا کردار وہ اپنے افسانے میں لاتی ہیں ان کی زندگی اور نفسیاتی کیفیت کا پورا عکس سامنے آجاتا ہے۔زبان نہایت رواں دواں ہے اور سادگی اس کا جوہر ہے ان کے افسانوں کی انفرادی خصوصیت یہ ہے کہ صفحے کے صفحے پڑھتے چلے جائیں لیکن تاثیر میں کمی نہیں آتی بلکہ دلچسپی بڑھتی جاتی ہے۔صاف ظاہر ہے کہ تمنا منشی نے عورت کی نفسیات اس کی ذہنی الجھنوں اور درد و کرب کو بڑی جابکدستی سے قلمبند کیا ہے۔مجموعی طور پر موصوفہ کے افسانوں میں پیش کیے جانے والے حالات ، واقعات اور احساسات ہماری روز مرہ کی زندگی کے ترجمان ہیں۔انھوں اپنے افسانوں میں انسانی کردار کے مختلف پہلوؤں کو کھل کر واضح کیا گیا ہے۔ان کا مشاہدہ عمیق اور نظر گہری ہے''۔(106)

تمنا منشی اگر چہ بنیادی طور پر ایک افسانہ نگار تھیں مگر انھوں نے شعر و شاعری میں بھی کافی طبع آزمائی کی ہے۔انھیں اس میدان میں بھی بہت دلچسپی تھی اس لیے ان کی نثری تحریروں سے زیادہ شعری تحریریں کثیر تعداد میں دستیاب ہیں۔انھوں نے شروع میں افسانہ نگاری کے حوالے سے ہی ادبی میدان میں قدم رکھا تھا مگر اس حوالے سے ان کے کچھ ہی افسانے منظر عام پر آئے ہیں۔

اگر چہ افسانہ نگاری سے زیادہ وہ شاعرہ ثابت ہوئی لیکن ادبی محفلوں میں انھیں زیادہ تر افسانہ نویس کے حوالے سے ہی جانا جاتا ہے۔ان کے بہت سارے افسانے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ان میں سے کچھ افسانے ''شیرازہ''، ''ماہِ رُخ''، ''نیا ولولہ'' اور ''روشنی کا سفر'' میں خاص طور پر منظر عام پر آئے ہیں۔ان کے افسانے میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ انھوں نے بہت ہی شگفتہ بیانی سے کام لیا ہے۔اور بہت ہی کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ بات کو اپنے

افسانوں میں بیان کر دیتی تھیں۔اوران کے کچھ افسانے سماجی اور رومانی نوعیت کے بھی ہیں۔انھیں افسانہ نگاری کے فن سے گہری واقفیت تھی۔ان کے افسانوں کے کردار میں زیادہ تر مطابقت کا ماحول دیکھا جا سکتا ہے۔مکالمہ نگاری کے حوالے سے بھی وہ ایک کامیاب افسانہ نگار ہیں۔

ان کا ایک افسانہ بہت ہی مشہور ہے اور راقم الحروف کو بھی ذاتی طور پر یہ افسانہ بے حد پسند ہے جو مصنفہ نے ''حصار'' کے عنوان سے پیش کیا تھا۔ان کی یہ کہانی ماہنامہ''ماہِ رُخ'' جو رام پور کا مشہور رسالہ ہے کے جون 1986ء کے شمارے میں منظر عام پر آئی تھی۔اس افسانہ میں انھوں نے دو کرداروں درجینا اور زروب کو مرکزی حیثیت سے پیش کیا ہے۔مصنفہ نے درجینا کا کردار اس طرح سے پیش کیا ہے کہ وہ ایک آزاد خیالات کا کردار ہے۔درجینا کسی بھی دباؤ میں آ کر اپنی شادی کا فیصلہ نہیں کرنا چاہتی اس لیے وہ اپنی سہیلی اور ماں کے لاکھ سمجھانے پر بھی اپنی شادی کے لیے راضی نہیں ہوتی۔وہ جانتی ہے کہ شادی کا فیصلہ ایک بہت بڑا فیصلہ ہے اور اس فیصلے کو وہ جلد بازی میں نہیں کرنا چاہتی۔وہ ہمیشہ یہ سوچتی ہے کہ وہ کسی غیر شادی شدہ سے اپنی زندگی بسر کرنا چاہتی ہے۔درجینا کی اس ضد کی وجہ سے اس کی سہیلیاں اور گھر والے سارے پریشان ہو جاتے ہیں۔یہاں مصنفہ نے تانیثیت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ایک عورت جو اپنے حق کے لیے اپنی پوری زندگی کے لیے فیصلہ کرنا چاہتی ہے مگر اسے سماج کے بندھن میں باندھ کر رکھ دیا جاتا ہے۔مگر آخر کار وہ شادی کے لیے راضی ہو جاتی ہے۔چونکہ اب اس کے پاس اتنا وقت بھی نہیں ہے اور اس کی عمر بھی ڈھلتی جاتی ہے اس لیے وہ گھر والوں اور سہیلیوں کی خوشی کے لیے شادی کے لیے ہاں کر دیتی ہے اور ایک روز وہ اپنی سہیلی کو خط لکھتی ہے جس میں لکھا تھا کہ وہ شادی کے لیے راضی ہوگئی ہے۔اس کہانی میں طاہر کا کردار بھی ایک اہم کردار ہے مصنفہ نے اس کو ایک سیدھا سادھا اور اچھے کردار کے طور پر پیش کیا ہے جو درجینا کی محبت کے لیے دس سال تک انتظار کرتا رہتا ہے۔جب درجینا اپنی سہیلی کو خط لکھتی ہے اور شادی کے لیے رضامند ہو جاتی ہے تو اس وقت کے احساسات و جذبات کس طرح سے مصنفہ نے بیان کروائے ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''طاہر بڑا اچھا آدمی ہے۔اس نے تقریباً دس سال میرا انتظام کیا ہے۔میں نے طاہر سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔دراصل مشاہدات نے مجھے سمجھا دیا ہے کہ عورت چاہے کسی بھی منزل پر پہنچے اپنے گرد کے حصار جس کے اندر وہ آزاد بھی رہے اور قیدی بھی جس کی باڑھ چھوٹی چھوٹی مسرتیں ہوں اور جس کے اندر ننھے منھے پھولوں کی گل کاریوں کا سحر پھیلا ہو۔عورت حقیقی مسرتوں کو ہی پاتی ہے''۔(107)

اس افسانے کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہر عورت کو اس کے ہم سفر کی ضرورت ہوتی ہے۔اور دوسری خاص بات یہ کہ عورت چاہے جتنی بھی آزاد ہو جائے پھر بھی اس کو اپنے گھر والوں اور سماج کے رسم و رواج پر ہی چلنا ہوتا ہے۔

تمنا منشی کے اندر تخلیقی صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔مگر کچھ مصروفیات کی وجہ سے وہ ادبی میدان میں زیادہ وقت نہ دے پائیں۔باوجود اس کے ان کی جتنی بھی تحریریں منظر عام پر آئی چاہے وہ شعری ہوں یا نثری تمام قابل ذکر ہیں۔

خالد حسین:

خالد حسین کا شمار بھی 1947ء کے بعد کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔اگرچہ بنیادی طور پر ان کا تعلق پنجاب سے تھا مگر جموں خطے کے افسانہ نگاروں میں ان کا بھی ایک اہم نام ہے۔انھوں نے اپنی ادبی زندگی کی آغاز پنجابی زبان سے کیا تھا مگر اس کے بعد ان کی کئی بہترین کہانیاں اردو میں شائع ہو چکی ہیں۔پنجابی اور اردو زبان میں خالد حسین نے اپنے منفرد طرز تحریر، زبان و بیان، تشبیہات و استعارات اور محاورات و روزمرہ کے برمحل استعمال سے اپنی ایک الگ شناخت بنائی ہے۔انھوں نے بہت ساری کہانیاں براہ راست اردو میں تحریر کیں اور درجنوں کہانیوں کو اردو زبان میں ترجمہ کیا۔

خالد حسین کی ادبی زندگی کا آغاز 1976ء میں پنجابی زبان سے ہوا تھا اسی سال ان کا پہلا پنجابی کہانیوں کا مجموعہ ''تے جہلم ولدا رہیا'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا تھا۔اس مجموعے کے شائع ہونے سے ادبی حلقوں میں خالد حسین کی کافی پذیرائی ہونے لگی۔کئی بڑے بڑے ادیبوں اور دانشوروں نے مصنف کی حوصلہ افزائی اور مزید تحریروں کو منظر عام پر لانے کے لیے ان کی ہمت بڑھائی۔خالد حسین کی کہانیوں کا یہ مجموعہ کل چھبیس (26) کہانیوں پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد مصنف کی دیگر پنجابی کہانیوں کے مجموعے یکے بعد دیگرے منظر عام پر آتے گئے۔جس میں ان کے دو مجموعے گورمکھی رسم الخط میں خاص طور پر ''گوری فصل کے سوداگر'' اور ''ڈونگھے پانیاں دا دکھ'' قابل ذکر ہیں۔اسی دوران انھیں اردو زبان سے لگاؤ پیدا ہوا اور اپنی بہت ساری کہانیوں کو اردو میں ترجمہ کرنے لگے۔اسی طرح سے انھوں نے اردو زبان میں افسانہ نگاری میں طبع آزمائی کی اور اپنی پنجابی کہانیوں کے ترجمہ اور اردو زبان میں لکھے افسانوں کو ملا کر انھوں نے 1981ء میں ''ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں'' کے عنوان سے اپنے اردو افسانوں کا پہلا مجموعہ شائع کیا۔اس طرح سے ہم

کہہ سکتے ہیں کہ اس افسانوی مجموعے سے خالد حسین نے اردو زبان میں افسانہ نگاری کا آغاز کیا۔ یہ مجموعہ کل 136 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے میں ان کی کل تینتیس کہانیاں شامل ہیں۔ ان تینتیس کہانیوں میں مصنف نے 14 کہانیوں کا پنجابی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے اور باقی تمام کہانیاں انھوں نے اردو زبان میں تحریر کی تھی۔

خالد حسین کی مشہور کہانیوں میں شمار ہونے والی کہانیاں جو متذکرہ بالا رسائل و جرائد میں بھی شائع ہوئی تھیں اور قارئین نے انھیں کافی سراہا تھا۔ ان کہانیوں میں خاص طور پر ''کھوکھلا سورج''، ''گھاس پر چلنا منع ہے'' اور ''گوری فضل کے سوداگر'' وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

''کھوکھلا سورج'' میں مصنف نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کہانی میں جان کیسے ڈالی جاسکتی ہے اور کہانی کیسے موتی کی لڑی میں پروئی جاتی ہے جس سے کہانی کا ردِعمل برقرار رہتا ہے۔ اور آخر تک قارئین اس سے لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ مصنف نے اس کہانی میں بیان کیا ہے۔ اس حوالے سے اس افسانے کے ابتدائی حصے میں ہی مصنف نے لکھا ہے:

> ''میں کہانی ٹکڑوں میں لکھنا پسند کرتا ہوں۔ کیونکہ میں پیوندکاری میں ماہر ہوں یہ کہانی بھی میں ٹکڑوں میں ہی بیان کرنے جارہا ہوں۔ آپ میرا یقین کرلیں کہ یہ ٹکڑے خوبصورتی سے جڑ جائیں گے اور کہانی بن جائے گی۔ ایک کہانی .... کئی ٹکڑے چھوٹے بڑے، غیر ضروری، ضروری............ ٹکڑے--- اور یہ پہلا ٹکڑا''۔(108)

اس طرح مصنف نے اسی کہانی کو آگے بڑھاتے ہوئے اور ٹکڑے جڑ دیے جس سے پوری کہانی ایک جیتی جاگتی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ اس میں مصنف نے یہ بیان کیا ہے کہ ایک لڑکی جس کا نام مریم بی بی ہے وہ اپنے کھیت میں جاتی ہے اور ایک آفتاب عالم نام کا نوجوان اس کی عصمت پر کھیلتا ہے جب غریب لڑکی کے گھر میں پتہ چلتا ہے تو معاملہ پولیس کے پاس جاتا ہے پھر اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ وہ کیس کورٹ میں درج کیا جاتا ہے۔ اور جج فاروق نامی اس فیصلے کو سناتا ہے مگر اس سے پہلے خان بہادر جو آفتاب عالم کا باپ ہے وہ اپنے بیٹے کو چھڑانے کے لیے طرح طرح کی کوشش کرتا ہے یہاں تک کہ جج کو بھی رشوت دیتا ہے اور آخرکار آفتاب عالم کے خلاف کوئی بھی گواہ نہیں ملتا ہے جس سے اس کو سزا سنائی جائے۔

اصل میں مصنف نے یہ ایک تاریخی منظر کو پیش کیا ہے جس سے انھوں نے دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ہر دور

میں عورت کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا ہے۔اور یہاں تک کہ کسی بھی دور میں چاہے وہ دورست یوگ کا ہی کیوں نہ ہو۔ اور آخر میں اس کہانی میں جب مریم بی بی کو انصاف نہیں ملتا ہے تو وہ سیتا کے روپ میں آتی ہے اور کہتی ہے کہ اس کوست یوگ میں بھی انصاف نہیں ملا اور اب کل یوگ میں بھی عورت انصاف کی گو ہار لگاتی ہے مگر سارے ثبوت اس کے خلاف مٹا دیئے جاتے ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''ٹھہریئے جج صاحب آپ کا نام فاروق ہے اور میرا .... جج صاحب مجھے پہچانئے میرا نام صرف مریم نہیں ہے۔سیتا ہے، دروپدی ہے، ہر یگ میں میری عزت پر حملہ ہوا ہے۔ مجھے رسوا کیا گیا ہے۔مگر تب انصاف کا ترازو کم اور زیادہ نہیں تولتا تھا۔تب عدل ....بکر ماجت تھا............نوشیر دان تھا۔عمر فاروق تھا۔لیکن آج انصاف کے ترازو میں زنگ لگ چکا ہے آج وہ سبھی چہرے مسخ ہو چکے ہیں۔اتہاس نے کئی کروٹیں بدلی ہیں ....اور نیا یگ شروع ہوا ہے''۔(109)

اس افسانے میں مصنف نے سارے تاریخی کرداروں کو پیش کیا ہے۔افسانہ میں مصنف نے کردار نگاری کے ساتھ ساتھ زبان و بیان پر بھی کافی زور دیا ہے۔اور منظر نگاری کی بھی کئی اچھی مثالیں جو مصنف نے عدالت کے حوالے سے پیش کی ہیں قابل تعریف ہیں۔اسی طرح سے خالد حسین کا افسانہ ''گھاس پر چلنا منع ہے'' کے عنوان سے کافی مشہور افسانہ ہے۔اس افسانے میں مصنف نے رانو کے کردار سے عورت کے جذبات کی عکاسی کی ہے رانو ایک ایسی عورت ہے جو بھری جوانی میں بہت خوبصورت ہوتی ہے۔رانو نے اپنے جذبات کو اشاروں کنایوں میں بیان کیا ہے۔رانو کا باغ یعنی اس کی خوبصورتی کا باغ جس میں سبز گھاس ہے اور اس باغ کو سنوارنے میں رانو نے کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ اس کے باغ کے باہر ایک گل مہر کا درخت ہے اور وہ چاہتی ہے کہ کاش وہ اس کے باغ کا سہارا بن جائے تو اس کی زندگی سنور جائے۔مگر گل مہر صرف کچھ وقت کے لیے رانو کی باغ میں اپنی خوشی کو نکالتا ہے اور پھر رانو اکیلی ہو جاتی ہے وہ گل مہر کے بارے میں ہر وقت سوچتی رہتی ہے۔اس وجہ سے وہ ہوس کا شکار ہو جاتی ہے اور پھر کوئی بھی راستہ چلنے والا شخص رانو کے مخملی گھاس کو کچل کر اپنی خواہش پوری کر کے نکل جاتا ہے اور رانو کسی کو بھی اس گھاس پر چلنے سے نہیں روکتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''میرا نام رانو ہے میں اس اجاڑ باغ کی مالن تھی میں نے اس باغ کو سنوارنے اور شنگھارنے

> میں کبھی کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ یہی وجہ تھی کہ کسی وقت یہ باغ اپنی خوبصورتی کے لیے دور دور تک مشہور تھا۔ میں نے اس باغ کی ہری گھاس پر چلنے والوں کو کبھی نہیں روکا ....میرے باغ کے باہر ایک گل مہر کا درخت لگا تھا مجھے وہ بہت پسند تھا میں نے بہت کوشش کی کہ وہ ہمیشہ کے لیے میرے باغ کے اندر آجائے اور اس کی خوبصورتی کو بڑھائے ۔مگر گل مہر کی جڑیں رسموں اور رواجوں کی کالی مٹی سے بھری دھرتی میں بہت اندر تک دھنسی ہوئی تھی ۔میرے لاکھ جتن کرنے پر بھی وہ اس کالی مٹی میں سے اکھڑ نہیں سکا اور میرے باغ کی رونق نہیں بن سکا''۔(110)

اگر چہ اس افسانہ میں مصنف نے کردار نگاری اور منظر نگاری سے کم کام لیا ہے مگر جس طرح سے انھوں نے اس میں جذبات نگاری کو بیان کیا ہے قابل تعریف ہے جس کا اندازہ آپ حضرات خود اس متذکرہ بالا اقتباس سے لگا سکتے ہیں۔

رانو بہت کوشش کرتی ہے گل مہر کو پانے کے لیے مگر اس ناکامی کی وجہ سے وہ اپنی ہوش وحواس کھو بیٹھتی ہے جس کی وجہ سے وہ سڑک پر لگا ہوا ایسا نا کہ بن جاتی ہے جس میں ہر کوئی چلتا انسان اپنا دل کی پیاس بجھانے کے لیے رانو کو استعمال کر لیتا۔مگر آخر میں ایک بار پھر اسے گل مہر کا دیدار ہوتا ہے جسے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتی ہے مگر اب افسوس ہی کرتی ہے کہ اس کا باغ اجڑ گیا اور وہ ہریالی اس کی زندگی میں ختم ہوگئی ہے گل مہر اس کے جذبات کو سمجھتے ہوئے رانو کے باغ میں لکشمن ریکھا کھینچ کر چار دیواری کر دیتا ہے اور ایک بورڈ لگا دیتا ہے جس پر لکھا ہوتا ہے کہ گھاس پر چلنا منع ہے مگر رانو یہ سوچتی ہے کہ اب اس بورڈ کو لگانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''دوبارہ ہریالی لانے کی ناکام کوشش میں وہ سارے باغ کی گڈائی کرنے لگا۔سوکھے پھولوں کی کیاریوں کو پانی دینے لگا۔اس نے باغ کے چاروں طرف لکشمن ریکھا کھینچی ....اور لکشمن ریکھا کے باہر ایک بڑا بورڈ لٹکا دیا............ بورڈ پر موٹے لفظوں سے لکھا تھا گھاس پر چلنا منع ہے''۔(111)

اس طرح کے کئی افسانے خالد حسین نے اپنی یادگار چھوڑے ہیں جن میں انھوں نے اپنے کئی افسانوں میں نسائی حیثیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی اور عورت کے درد وکرب ،ظلم وستم اور اس کے استحصال کی بہترین عکاسی کی۔اس

کے علاوہ بھی انھوں نے اپنے افسانوں میں کئی موضوعات کو جگہ دی ہے۔

جموں خطے کے مشہور و معروف فکشن نگار، ادیب، محقق، نقاد ڈاکٹر مشتاق احمد وانی صاحب خالد حسین کی افسانہ نگاری کے حوالے سے اپنے خیالات کا یوں اظہار کرتے ہیں:

> ''خالد حسین اگرچہ پنجابی کے افسانہ نگار ہیں مگر اردو زبان وتہذیب کے دلدادہ ہونے کی وجہ سے اردو میں بھی ان کی کہانیوں نے خاصی مقبولیت حاصل کی ہے۔ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں، اشتہاروں والی حویلی اور نئی سر کا سورج ان کے افسانوں کے مجموعے ہیں۔ خالد حسین کے بیشتر افسانوں میں ہندوستان اور پاکستان کی سرحدوں پر تعینات فوجوں کے ہاتھوں معصوم لوگوں کا قتل، انسان کی عیاری و مکاری، خودغرضی اور مردوزن کے بے میل رشتوں کے باعث جنسی بے راہ روی یا جنسی الجھنوں کا فنکارانہ بیان موجود ہے''۔(112)

''ٹھنڈی کانگڑی'' بھی ان کا ایک اچھا افسانہ ہے اس میں انھوں نے کشمیر کے عام لوگوں کی درد بھری زندگی اور باہر سے آئے ہوئے لوگوں کی خوشحال زندگی کو پیش کیا ہے۔

اسی طرح کے کئی اور موضوعات پر خالد حسین نے اپنا قلم اٹھایا ہے۔ خالد حسین کے دیگر افسانوی مجموعوں میں ''اشتہاروں والی حویلی'' اور ''نئی سر کا سورج'' قابل ذکر ہے۔''اشتہاروں والی حویلی'' مصنف کا ایک بہترین افسانہ ہے ۔اس میں مصنف نے اکرام کھوکھر کی منزل اوراس میں رہنے والے افراد کی عکاسی کی ہے۔ مصنف نے اس افسانے میں کرادر تو پیش کیے ہیں۔مگر کردار نگاری سے بالکل بھی کام نہیں لیا ہے۔اس افسانہ میں سب سے زیادہ زبان و بیان اور منظر نگاری اور جذبات نگاری پر زور دیا ہے۔ اس میں جن کرداروں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں خاص طور پر اکرام کھوکھر، اسلام کھوکھر، انعام کھوکھر، حلیمہ کھوکھر، زہرہ کھوکھر، حسنہ کھوکھر اور بے بے حاجراں ہے۔

بے بے حاجراں کا کرداراس میں ایک گونگا کردار پیش کیا ہے کیوں کہ وہ اکرام کھوکھر کی بیوی ہے اور سارا تباہی کا حال دیکھتے ہوئے بھی بیچاری کچھ نہ کر پاتی ہے۔اصل میں ہوتا یوں ہے کہ اکرام کھوکھر کا خاندان ایک خوشحال خاندان تھا کسی چیز کی کمی نہ تھی مگر اچانک سے اکرام کھوکھر کی وفات کے بعد اس کے دونوں بیٹے اسلام کھوکھر اور انعام کھوکھر غلط کاموں میں لگ گئے اور شراب وغیرہ بھی پینے لگ گئے اس طرح سے اکرام منزل میں ایک ایک اشتہار لگتا گیا۔

اسلام کھوکھر اور انعام کھوکھر کی دونوں بیویاں اپنے بچوں کو پالنے کے لیے کبھی کبھی دوسروں کے گھر سے مانگنے

لگیں۔ یہاں پر مصنف نے جس طرح کا منظر پیش کیا ہے وہ قابل تعریف ہے ملاحظہ ہو اقتباس:

> ''شراب کی اس بوتل میں دھیرے دھیرے حلیمہ بھی گھلتی گئی گھر کا خرچ، بچوں کا پالن---اور حلیمہ کا جیون، سہاگن ہوتے ہوئے بھی بیوہ لگنے لگا۔ اسلام کھوکھر اس کے لیے جیتے جی مرگیا''۔(113)

اسلام کھوکھر کی بیوی حلیمہ آخر میں قاسم کے یہاں ہمیشہ کے لیے چلی جاتی ہے۔ خالد حسین نے اس میں دکھایا ہے کہ اکرام منزل میں پہلی اشتہار تب لگتی ہے۔ جب اسلام اور انعام دونوں غلط کاموں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اور دوسرا اشتہار اکرام منزل میں تب لگتا ہے۔ جب انعام کھوکھر جلد ہی اپنے شہر کا بڑا چاند بن جاتا ہے اور شراب کے نشے میں لوگوں کو ماں بہن کی گالیاں بکتا رہتا ہے۔ مصنف اس کہانی کو بیان کرتے وقت خوب مایوس ہو جاتا ہے کیونکہ یہ وہ پرانی حویلی تھی جہاں ہر کوئی آنے کے لیے ترستا تھا۔ جہاں ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں نظر آتی تھیں اور حویلی کے تمام افراد خوشحال زندگی کو دیکھ کر ہر کسی کے چہرے پر رونق آجاتی تھی مگر اب حویلی کی تنہائی کو دیکھ ہر کوئی دنگ اور حیران رہ جاتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''میں نے اکرام منزل کی بہاریں دیکھی ہیں اس میں دولت، عزت، شرافت، لیاقت اور غیرت کا راج دیکھا ہے اور میں پچھلے بیس سال سے اکرام منزل میں شراب، بے حیائی اور گالی گلوچ کا راج دیکھ رہا ہوں''۔(114)

اگرچہ مصنف نے اس میں کردار نگاری سے کم کام لیا ہے، کرداروں کے منہ سے الفاظ ادا نہیں کروائے ہیں مگر اس افسانے کا پلاٹ، اسلوب، منظر نگاری اور جذبات نگاری کے حوالے سے اچھا افسانہ ہے۔

خالد حسین نے اپنے افسانوں میں کئی موضوعات کو پیش کیا تھا۔ ''سیاست'' کے عنوان سے ان کا ایک مشہور افسانہ ہے اور خاص طور پر طالب علموں کی عکاسی کرتا ہے۔ مصنف نے اس میں طالب علموں کو سیاست سے بچنے کے لیے براہ راست مشورہ نہیں دیا ہے بلکہ اس افسانے کو پڑھ کر لکشمن کے کردار سے معلوم ہو جاتا ہے۔ وہ سیاست کی چکی کی دو پاٹوں میں پسنے والے غریب لوگوں کے درد کو بڑی ہمدردی سے محسوس کرتے ہیں اور پھر اس برائی سے بچنے کے لیے لکشمن جیسے کردار کے طور پر کہانی کو بیان کرتے ہیں۔

اصل میں مصنف نے اس میں دو مرکزی کرداروں کو پیش کیا ہے۔ ایک رام کا ہے اور دوسرا لکشمن کا ہے۔ مگر یہ

دونوں نام تاریخ میں اور ہندو دھرم میں بہت بڑے نام ہیں۔ جن میں دونوں کے خیالات ملتے تھے اور دونوں سچائی کی ایک بڑی مثال ہیں مگر اس افسانے میں رام اور لکشمن دونوں ایک دوسرے کے خیالات سے کوسوں دور ہیں۔ دونوں اسکول کی زندگی گزارتے ہیں اور ان ہی دنوں رام سیاست میں حصہ لیتے اور بڑی بڑی تقریریں کرنے میں مشغول ہو گیا اور اسی کو اس نے اپنا پیشہ بنالیا۔ وہ چاہتا ہے کہ وہ سماج کو بدلے، کئی بار لکشمن نے اسے روکنے کی کوشش کی اور کہا کہ وہ اس راستے کو چھوڑ دے اور اپنی تعلیم کو جاری رکھے مگر اس نے ایک نہ مانی۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

> ''لکشمن رام کو سمجھاتا ہے کہ وہ یہ کھیل چھوڑ دے، جذباتی تقریروں سے کچھ نہیں مل سکتا وہ اپنی پڑھائی کی طرف دھیان دے، کیونکہ روشن دل و دماغ سے ہی صحت مند سوچ مل سکتی ہے۔ تعلیم ہی سماج میں پھیلی ہوئی ہر بیماری کا علاج ہے۔ لیکن رام اس کی فضول سی نصیحتوں کو ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ کہتا ہے دیکھنا لکشمن! ہم یہ نظام بدل کر دم لیں گے''۔(115)

خالد حسین کا اس مجموعے میں ایک بہت ہی خاص افسانہ ''ابابیل کا خواب'' کے عنوان سے ہے جو ذاتی طور پر راقم الحروف کو بہت پسند آیا ہے۔ اس میں انھوں نے زمین میں بسنے والے لوگوں اور مریخ پر بسنے والے لوگوں کی بہترین مثال پیش کی ہے۔ یہ ایک مختصر اور خیالی افسانہ ہے مگر جس طرح سے مصنف نے اس کو پیش کیا ہے قابل تعریف ہے۔

اس افسانے میں بنجارہ کا کردار بہت ہی اہم ہے اور ساری کہانی اسی کے گرد گھومتی ہے۔ بنجارہ اصل میں ایک علامت ہے جو انسان کو انسان کا دشمن بناتا ہے۔ اس میں مصنف نے بتایا ہے:

جب سے دیوتاؤں نے مریخ پر خوراک، پانی، ہوا کا بندوبست کرلیا تو زمین کا ایک بنجارہ اپنی خوبصورت ٹوکری میں رنگ برنگے کھلونے لے کر وہاں بیچنے چلا گیا۔ پہلے تو اہل مریخ والوں نے بنجارہ کا بڑے خوبصورت انداز میں استقبال کیا کیونکہ مریخ والوں نے بابا آدم کی اولاد کا نام تو سنا تھا، مگر دیکھا نہیں تھا۔ وہ بنجارہ کی ٹوکری میں خوبصورت کھلونے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ مریخ میں سارے لوگ اکٹھا ہو گئے اور بنجارے کے کھلونے دیکھنے لگے۔ بنجارہ دھرتی سے کھلونے لے کے گیا تھا اور مصنف میں مریخ والوں کو دینا چاہتا تھا اور ان کھلونوں میں خاص طور پر فولادی گھوڑا جو اپنے سامنے والی ہر چیز کو تباہ کر کے ہی دم لیتا ہے۔ اگنی بان، اس کی ہزاروں قسمیں ہیں وہ اپنے نسانے کو تباہ کرنے میں ماہر ہے۔ امیر چھیدک، سدرشن چکر، ہوائیاں، ہوائی شیر، فولادی انسان اور ایٹمی طاقت وغیرہ غرض کہ وہ سب کھلونے ایک ایک کر کے دکھاتا گیا اور ان تمام کھلونوں کے کمال بھی دکھاتا گیا، جب مریخ کے لوگوں نے ان کھلونوں کی

وجہ پوچھی تو بنجارہ نے بتایا کہ اگر کسی بھی کھیل میں تم بلندی حاصل کرنا چاہو تو ان کھلونوں سے ہرا سکتے ہو اور اگر کوئی تمہاری بات سے انکار کرے تو تم ان کھلونوں سے اس کو تباہ کر سکتے ہو اور سارے مریخ پر قبضہ کر سکتے ہو۔ جس طرح سے انسان زمین پر کر رہے ہیں۔ اپنے دشمنوں کو تباہ کر رہے ہیں۔ مگر مریخ والے یہ سب سن کر حیران ہو گئے ان کے لیے یہ سب چیزیں نئی تھیں۔ اور انھوں نے بنجارہ کو جواب دیا کہ ہمیں یہاں کسی سے دشمنی نہیں ہے، دشمنی ہماری رایادت کے خلاف ہے۔ ہم یہاں خوشحال زندگی گزارتے ہیں اور تمام مریخ والوں کو غصہ آ گیا اور انھوں نے بنجارہ کو اپنے کھلونے واپس زمین پر لے جانے کو کہا اور کڑے انداز میں بنجارے کو واپس مریخ سے واپس زمین پر دھکیل دیا۔

اگر چہ مصنف کا یہ مختصر افسانہ ہے مگر بہت ہی کم الفاظ میں انھوں نے دور حاضر کی ساری عکاسی کر دی ہے۔ اور زمین پر رہنے والے انسانوں کی ساری کالی کرتوتوں کو سامنے رکھ دیا ہے۔ بنجارہ جب اپنے سارے کھلونے مریخ والوں کو دکھاتا ہے اور کھلونوں کے اوصاف بیان کرتا ہے تو اس وقت مریخ والوں کا جواب کیا ہوتا ہے ایک اقتباس میں ملاحظہ کیجیے:

> ''مگر ہمارا تو کوئی دشمن نہیں ہے۔ دشمنی ہماری روایات کے خلاف ہے۔ ہماری نسل کے خمیر میں ہی موٹاپا، غصہ اور بغض و کینہ کے جراثیم نہیں ہوتے۔ ہماری دھرتی کبھی بانٹی نہیں جا سکتی۔ یہاں ہوا، پانی اور اناج کی تقسیم نہیں ہوتی۔ پیار محبت برابر اور بھائی چارہ مریخ والوں کے لیے خداداد عطیہ ہے۔ یہاں کی ہر شئے ہم سب کی سانجھی ہے، یہاں سب مل کر محنت کرتے ہیں محبت اور دوستی کے گیت گاتے ہیں۔ اکٹھے بیٹھ کر کھاتے پیتے ہیں اور امن و شانتی کے سائے تلے آرام سے سو جاتے ہیں.......... ہمیں تمہارے کھلونوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم یہ سب کھلونے لے کر یہاں سے فوراً نکل جاؤں ہم اپنی دھرتی پر نفرت اور جنگ کی فصل اکانا نہیں چاہتے۔ بھاگو یہاں سے اور پھر کبھی اپنے گندے قدم اس دھرتی پر مت ڈالنا''۔(116)

اس متذکرہ بالا اقتباس سے آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مصنف نے پورے دور حاضر کی حقیقی تصویر کو پیش کر دیا ہے چونکہ دور حاضر میں زمین پر انسان یہی کام کر رہا ہے جس سے وہ خود اپنے ہی نسل کا دشمن بنتا جا رہا ہے۔ اس طرح کے کئی موضوعات پر مصنف نے افسانے لکھے ہیں۔

خالد حسین کا تعلق ان افسانہ نگاروں سے ہے جنھوں نے روایت سے ہٹ کر اپنی تحریروں کو اجاگر کیا انھوں نے روایت اور ماضی کے حالات و مشاہدات اور تصورات سے کنارہ کشی کر کے حال کی زندگی کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔اس دوران مصنف کو معلوم ہوا کہ ان کے گردو پیش تقسیم کے خونی واقعات و سانحات اور غریب مزدوروں اور بے بسوں کی مشکلات کے علاوہ کوئی موضوع راس نہ آیا۔انھیں اپنے ارد گرد منتشر اور مضطرب زندگی دکھائی دی۔دیگر افسانہ نگاروں نے کبھی اسی طرح کی کوشش کی مگر خالد حسین کو پیچھے نہ چھوڑ سکے اور نہ ہی ان کا مقابلہ کر سکے۔تاہم خالد حسین کے دور میں ایک گروہ افسانہ نگاروں کا ایسا بھی موجود تھا جس نے افسانہ نگاری کی روایات پر اپنے قدم جمائے رکھے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ جس دور میں خالد حسین اپنے افسانے تحریر کر رہے تھے اس دور میں نئے موضوعات پر قلم اٹھانا بہت مشکل تھا چونکہ تقسیم ہند کے بعد سے تقریباً دو دہائی تک افسانہ نگاروں کے ہاں اکثر جدوجہد آزادی اور وطن پرستی اور شوراشٹر وغیرہ جیسے موضوعات تھے۔حالاں کہ اس دور سے ہی نئے افسانہ نگاروں میں نئے نئے موضوعات آرہے تھے اور حالات بھی آہستہ آہستہ مستحکم ہوتے جا رہے تھے اور بہت سارے فنکار اپنے گردو پیش کا جائزہ لینے لگے تھے اور ان حالات کو اپنی قلم میں سمو رہے تھے اب افسانہ نگاروں کو ہر شئے میں ایک تبدیلی سی محسوس ہونے لگی تھی ۔چنانچہ انھوں نے اپنے گرد کے مناظر کو ہی تصویر کشی اور اپنے گرد کے حالات و واقعات کو اپنی تخلیقات کا حصہ بناتے گئے ۔ایسے فنکاروں میں ایک نام خالد حسین کا بھی قابل ذکر ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں تقسیم ہند کے واقعات کے علاوہ کئی موضوعات دکھائی دیتے ہیں۔

خالد حسین نے تقریباً 1970ء کے آس پاس لکھنا شروع کیا تھا۔اس ریاست کے بڑے بڑے افسانہ نگار اپنی تخلیقات کو منظر عام پر لا چکے تھے جن میں خاص طور پر پریم ناتھ پردیسی ،قدرت اللہ شہاب، کرشن چندر، پریم ناتھ در، رامانند ساگر، کشمیری لال ذاکر، ٹھاکر پونچھی اور مہندر ناتھ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ان افسانہ نگاروں نے ترقی پسند تحریک میں بھی حصہ لیا تھا اور ان کے یہاں کئی موضوعات پائے جاتے ہیں مگر جدوجہد آزادی کا موضوع سب کے یہاں یکسر دیکھا جا سکتا ہے۔

خالد حسین کے ہم عصر افسانہ نگاروں کے یہاں جدیدیت کے ساتھ ساتھ ترقی پسند تحریک کا بھی ذکر ملتا ہے کیونکہ ظاہری بات ہے کہ یہ تمام قلم ابھی پوری طرح سے ترقی پسند تحریک سے باہر نہیں نکلے تھے تقسیم کے بعد جن لوگوں نے اپنی تخلیقات میں مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ان میں خاص طور پر ریاست جموں و کشمیر سے تعلق رکھنے والے قلم

کاروں میں سوم ناتھ زتشی، علی محمد لون، تیج بہادر بھان، شنکر ناتھ، موہن یاور، غلام رسول شوش، اختر محی الدین، نور شاہ، رام کمار ابرول، ویدراہی، بھگوت پرسات میاٹھے، رام ناتھ شاستری، ڈی سی پرشانت، نریندر کھجوایہ، این ڈی جموال، مدن موہن شرما، پریم سنگھ، بندھو شرما، سرن سنگھ، کنول کشمیری وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں۔ ان تمام لوگوں نے سب سے پہلے اردو زبان میں ہی لکھنا شروع کیا اس کے بعد وہ دوسری زبانوں جیسے پنجابی، ہندی، ڈوگری وغیرہ میں بھی طبع آزمائی کرنے لگے۔ اس لیے خالد حسین نے جب لکھنا شروع کیا تو ان کے پاس کافی مواد جمع ہو چکا تھا۔ اور انھوں نے پہلے پنجابی میں لکھا پھر اردو زبان کی طرف متوجہ ہوئے۔

خالد حسین کے افسانوں کا اگر گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جہاں وہ حقیقت اور رومان کا امتزاج کرتے نظر آتے ہیں وہیں ان کی تحریروں میں نفسیات اور جنسی پیچیدگیوں کے ساتھ ساتھ مذہبی و سیاسی عوامل کی کارفرمائی اور معاشی و معاشرتی مسائل کی بھی عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے۔ پریم چند اور علی عباس حسینی کی طرح خالد حسین کے یہاں بھی مخصوص معاشرے کی عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے۔ رومانیت میں ان کے افسانے کرشن چندر کی تحریروں کا اثر قبول کرتے ہیں۔ بقول محمد اسد اللہ وانی:

> ''ان کے افسانوں میں پریم چند اور علی عباس حسینی کی طرح مخصوص معاشرے کے دل پذیر مرقعے، کرشن چندر کی رومانیت، شعریت اور رنگینی، منٹو کی طرح تہہ در تہہ جنسی بے راہ روی اور گھٹن اور قرۃ العین حیدر کی طرح تقسیم وطن کا المیہ پایا جاتا ہے۔ ان کے افسانوں میں اس طرح کی کاروائی ان کے وسعت مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ مگر اس کے باوجود ان کا لب ولہجہ انداز اور اسلوب منفرد اور مخصوص ہے''۔(117)

خالد حسین کی افسانہ نگاری میں نہ صرف رومانیت اور حقیقت نگاری ہے بلکہ سماج میں ہو رہے غریب لوگوں کی مشکلات ان کے درد وغیرہ کی بھی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں طنز وظرافت، شگفتہ فقرے بازی اور موثر تکلم، محاوروں کا برمحل استعمال اور ساتھ ہی ساتھ کہیں کہیں انھوں نے ابہام گوئی کو بھی اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ ان کے افسانوں میں علامتی انداز بھی اکثر وبیشتر افسانوں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

خالد حسین کے اکثر افسانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس مواد کو اپنے اردگرد کے ماحول سے ہی اکٹھا کیا ہے۔ انھیں سماج میں جو بھی کمی محسوس ہوئی اس کو انھوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے سے عوام کے سامنے لانے کی

کوشش کی۔انھوں نے اپنے سماج کی زندگی کی گھٹن اوران کے اندر باہر ہونے والے تضاد اوران کی محرومیوں، مایوسیوں کو اکٹھا کر کے اپنی تخلیقات میں سمویا ہے۔

خالد حسین کی ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ معمولی واقعات کو کہانی کا موضوع بنا کر انسانیت کے بچھڑے ہوئے رشتوں کی پہچان دلاتے ہیں۔ان کے بہت سارے ایسے افسانے ہیں، جن میں انھوں نے انسانی رشتوں کے ساتھ ساتھ ایک عام انسان کے جذبات واحساسات کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔اس حوالے سے ان کے افسانوں میں خاص طور پر ''بنڈے کی لنکا''، ''دل کی گلیاں''، ''دشمن کون''، ''انتظار کا قیدی''، ''دھرتی روتی ہے''، ''کوئلہ بھئی نہ راکھ'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ان سب افسانوں میں ایک بات مشترکہ ہے کہ تمام انسان برابر کے حق دار ہیں اس دنیا میں چاہے وہ کسی بھی ملک سے تعلق کیوں نہ رکھتے ہوں۔ان تمام انسانوں کے مسائل ایک جیسے ہی ہیں۔راقم الحروف کی نظر میں خالد حسین کے بہت سے افسانے مشترکہ انسانی رشتے کی عکاسی کرتے ہیں۔اور خالد حسین خود ایک مشترکہ ذہن رکھتے تھے اور انسانی بھائی چارہ، امن اور انسان دوستی پر یقین کرتے تھے یہی سب کچھ ان کے افسانوں میں بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

ان کے کچھ نفسیاتی مسائل اور جنسی مسائل کی اچھی مثالیں ہیں جن میں خاص طور پر ''مہری''، ''اشتہاروں والی حویلی''، ''گرداب''، ''دیواروں میں چھپی واسنا''، ''ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں''، ''آہ وزاریاں''، ''اجالے کی تاریکی'' وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ان افسانوں میں مصنف نے انسانی کمزوریوں کا بڑی عمدگی سے تجزیہ کیا ہے ان افسانوں کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خالد حسین نے منٹو کے افسانوں سے کافی دلچسپی لی تھی۔بعض اوقات ان کے افسانوں کو پڑھنے سے نفرت سی پیدا ہوتی ہے۔مگر جب قاری ان کی کہانی کی گہرائی میں ڈوبتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو ہمارے سماج میں ہونے والے روزمرہ واقعات کو بیان کرتے ہیں۔

خالد حسین کی افسانہ نگاری کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے صاف اور شستہ انداز بیان کو اپنایا ہے اور اسی وجہ سے ان کی افسانہ نگاری میں قاری کو ان کی بات سمجھنے میں مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔انھوں نے زندگی کے مسائل کا بہت ہی قریب سے اور پوری گہرائی سے مشاہدہ کیا ہے۔اور وہی چیزیں انھوں نے اپنے افسانوں میں بھی قلم بند کر دیں۔

خالد حسین کا مشاہدہ ایک ہمہ گیر شخصیت کے حامل ہے وہ جس بھی ماحول پر اپنی نظر دوڑاتے ہیں اس کے چھوٹے چھوٹے پہلو کو اپنے افسانوں میں سمونے کی زحمت کرتے ہیں۔وہ بھی منٹو کی ہی طرح اپنے افسانوں کی تمہید

باندھتے ہیں انھوں نے منٹو کے افسانوں کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔اس سے منٹو کی افسانہ نگاری کا اثر خالد حسین کے افسانوں میں بھی مل جاتا ہے۔ان کی افسانوں میں کہانی شروع سے ہی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔اور پھر قاری آخر تک اس کہانی سے لطف اٹھاتا رہتا ہے کہانی کے ہر موڑ میں قاری کو کہانی کے اگلے پڑاؤ کا تجسس ہوتا ہے یہی خالد حسین کی افسانہ نگاری کا ایک بڑا جز ہے۔اور افسانہ نگاری کی سب سے بڑی خوبی اور کامیابی بھی یہی ہے کہ وہ قاری کو آخر تک کہانی میں مشغول رکھے۔

خالد حسین نے جن افسانوں میں علامتی اور استعارائی انداز کو اپنایا ہے ان میں خاص طور پر ''امرود کا پیڑ''،''گھاس پر چلنا منع ہے''،''گوری فضل کے سوداگر''،''نئے آدم کا خواب''،''صلیب ذات''، ''بھوشیہ وانی''،''اندھیر نگری''،''دھرتی روتی ہے''وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ان تمام کہانیوں میں مصنف نے موجودہ دور میں ہونے والے سائنسی اور تکنیکی حالات سے گزرنے والے انسان کے کرب، دردوغم، احساسات وجذبات، بے چینی وغیرہ کو استعاروں،اشاروں وکنایوں اور علامتوں کے ذریعہ سے منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔

خالد حسین اگرچہ اردو اور پنجابی میں اپنی کہانیاں لکھتے تھے۔مگر ان کی کئی کہانیاں ہندی دانی کا ثبوت دیتی ہیں۔ اس حوالے سے ان کی کہانیوں میں ''شردھاتو''،''سیاست''،''عیبی خلقت کے بے عیب کارنامے''،''بھوشیہ وانی''اور ''راج سنگھاسن ڈانواڈول'' قابل ذکر ہیں۔جیسا کہ ان کہانیوں کے عنوان سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ یہ تمام کہانیاں ہندی دانی کا ثبوت دیتی ہے۔

''مہری'' کہانی میں انھوں نے ڈوگری زبان کا استعمال بڑے ہی خوبصورت انداز میں کیا ہے۔تقسیم ملک پر لکھے گئے ان کے دو افسانے بہت ہی قابل ذکر ہیں۔''دل کی گلیاں'' اور ''دشمن کون'' اس میں بھی مصنف نے ان افسانوں کے کرداروں کو بری طرح سے سیاست میں شامل ہوتے ہوئے دکھاتے ہیں''دل کی گلیاں'' کا کردگی بابا اپنے وطن سے اتنی محبت کرتا ہے، کہ وہ اپنے وطن کو بھول ہی نہیں پاتا ہے۔حالانکہ بابا کا سارا خاندان پاکستان میں منتقل ہو گیا ہے مگر اسے پھر بھی اپنے وطن کی یاد ستاتی رہتی ہے۔

ان کے افسانے موضوع کی وسعت اور ہمہ گیری، اعلیٰ مطالعہ ومشاہدہ کی گہرائی اور فکر وفن کی گہرائی کا مظہر ہیں۔اعتدال اور توازن سے کام لینا ان کی ایک خاص خوبی تھی۔انھوں نے بہت سارے افسانوں میں ایسے بھی واقعات پیش کیے جس سے قاری ان کی کہانی تادیر ذہن میں رکھتا ہے۔خالد حسین اپنے افسانے کی فنی تکنیک کو پیش

کرنے میں ایک کامیاب افسانہ نگار ہیں۔

خالد حسین کے بارے میں جان محمد آزاد نے لکھا ہے کہ:

''آپ کے یہاں اگر چہ بات براہ راست اور دوٹوک کی جاتی ہے تاہم کہیں کہیں علامتی فریم ورک میں بھی افسانوں کے تانے بانے بنے دکھائی دیتے ہیں''۔(118)

خالد حسین کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر چہ وہ پنجابی زبان کے ادیب تھے مگر انھوں نے پنجابی زبان کے ساتھ اردو زبان وادب میں بھی کافی حد تک انصاف کیا ہے انھوں نے کچھ اپنے ہی افسانہ پنجابی زبان سے اردو میں منتقل کیے اور کچھ خود انھوں نے اردو زبان میں ہی لکھے جموں خطے میں خالد حسین کا شمار ایک بڑے افسانہ نگار کے حوالے سے کیا جاتا ہے۔

اوم پرکاش شاکر:

اردو دنیا میں انھیں ادبی شاکر کے نام سے جانا جاتا ہے اور کافی عرصہ تک وہ اردو ادب کے ساتھ وابستہ رہے۔ ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں زیادہ مواد دستیاب نہیں ہے مگر پھر بھی ان کا شمار فکشن، ڈراما نگاری اور شعروشاعری کے حوالے سے جموں خطے کے محققین ومورخین نے مختصراً طور پر کیا ہے۔

اوم پرکاش شاکر کا شمار 1960ء کے بعد کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔انھوں نے اپنے معاشرے میں جنم لیا تھا جہاں اردو زبان کا چلن بہت کم تھا مگر پھر بھی انھیں اس زبان سے اتنا لگاؤ ہوا کہ پھر عرصہ دراز تک اسی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار مختلف اصناف ادب کے ذریعے سے کرنے لگے۔ اردو افسانہ کے حوالے سے ان کے دو افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔جن میں ''موسم سرما کی پہلی بارش'' اور ''جیتا ہوں میں'' قابل ذکر ہیں۔''جیتا ہوں میں'' مجموعہ 2005ء میں شائع ہوا تھا۔اوم پرکاش شاکر نثری ادب کے ساتھ ساتھ شعری ادب میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں ۔ڈاکٹر مشتاق احمد وانی ان کی ادبی خدمات کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''او۔پی شاکر ریاست جموں وکشمیر کے ایک ایسے شاعر ہیں جنھوں نے نثر کے ساتھ ساتھ شاعری کے میدان میں بھی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوایا ہے مگر یہ بات بھی صحیح ہے کہ ادبی حلقوں میں ان کی پذیرائی جس طرح سے ہونی چاہیے تھی اس طرح سے نہیں ہوتی ہے۔مگر کیا کہیے اردو والوں کی گروہ بندیوں اور مصلحت پسندوں کے درمیان او۔پی شاکر جیسے مخلص

شریف......اور دیانت دار ادیب کیا کر سکتے ہیں سوائے اس کے کہ وہ اپنے گوشہ تنہائی میں
کاغذ اور قلم کے ساتھ ساتھ اپنا رشتہ استوار رکھیں''۔(119)

نثر اوصاف میں انھوں نے فکشن کے ساتھ ساتھ ڈراما نویسی میں بھی طبع آزمائی کی تھی اس حوالے سے محققین کا کہنا ہے کہ ان کے دو ناولٹ منظر عام آ چکے ہیں مگر راقم الحروف کو ان کے ڈراموں تک رسائی حاصل نہ ہو پائی ہے۔تاہم ان کے افسانوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اس فن پر کافی عبور حاصل تھا۔ان کے اکثر افسانے راست بیانیہ انداز میں لکھے گئے ہیں ۔ان کے افسانوی مجموعے''جیتا ہوں میں'' میں انھوں نے انسان کے اقدار کی شکست کو دکھایا ہے۔اسی طرح سے ان کے افسانوں میں سماج کے گرد روزمرہ کی زندگی سماجی پسماندگی ، بے ہودہ رسم و رواج ، سیاسی حالات وغیرہ ان کے افسانوں کے موضوعات ہیں۔ان کے افسانوں میں انسانی ذہن کی سب سے زیادہ عکاسی ملتی ہے کہ کس طرح سے موجودہ دور میں رہنے والے انسان کی ذہنی اور روحانی کشمکش اور طوفان کی طرح تیز چلنے والا سائنسی و تکنیکی دور جو انسان کو فرقہ وارانہ ماحول میں دھکیل رہا ہے۔چوں کہ مصنف کی ذاتی زندگی ایک خوشحال اور امن پسند دور میں گزری تھی اس لیے وہ اخلاقی اور پرامن ماحول کو زیادہ ترجیح دیتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ انسانی رشتوں اور ان کے اقدار کی ترقی پر زور دیتے تھے۔

ان کے افسانوں کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے پریم چند کا خاص اثر قبول کیا تھا اسی لیے اوم پرکاش شاکر کے افسانوں میں بھی دیہات کی زندگی کے حالات وواقعات اور دیہاتی لوگوں کی عام زندگی کی حقیقی تصویریں ان کی کہانیوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔فنی اعتبار سے ان کے افسانے بہترین افسانے ہیں۔بنیادی طور پر انھیں جموں خطے میں ایک شاعر کی حیثیت سے جانا جاتا ہے مگر نثر کے حوالے سے بھی انھیں کافی مقبولیت حاصل ہے۔

جسونت منہاس:

جسونت منہاس کا شمار 1947ء کے بعد کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ان کا تعلق خطہ جموں کے تحصیل بھدرواہ ضلع ڈوڈہ سے تھا۔ابھی تک ان کے چار افسانوی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔جن میں ''توجہ''، ''مسکراتے ناسور''، ''یادیں'' اور ''کم ظرف'' شامل ہیں۔ان کے افسانوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے گرد کے ماحول کو پیش کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں برتی ۔انھوں نے اپنے دور کی حقیقی تصویر کشی کی ہے ۔ان کے اکثر افسانے طوالت سے بھرے ہوتے ہیں۔جس کی وجہ سے کبھی کبھی قاری ان کی کہانیوں کو پڑھنے سے کتراتا ہے۔چونکہ طوالت

افسانہ نگاری کی ایک خامی مانی جاتی ہے۔ برحال مصنف کے افسانوں سے ایک بات قابل ذکر ہے کہ انھیں افسانہ نگاری کے فن پر عبور حاصل تھا۔ ان کے افسانوں میں پلاٹ ،کردار نگاری ، اسلوب ،منظر نگاری وغیرہ کافی اہمیت کے حامل ہیں۔

جسونت منہاس نے اپنے افسانوں میں کئی موضوعات پر قلم اٹھایا تھا۔ انھوں نے دور حاضر کی ایک ایک چیز کی باریک بینی سے عکاسی کی ہے۔ ان کے افسانوں کے موضوعات میں زیادہ تر اخلاقی قدروں کی پامالی، رشوت ستانی، فرقہ وارانہ ماحول، سماج میں ہونے والی نابرابری، عورتوں کے مسائل، معاشرے میں جہیز کی لعنت، دہشت گردی، غریبوں پر ڈھائے گئے مظالم، عام لوگوں کی پریشانیوں، غریبی، بےبسی، لاچاری، غربت، انسانی رشتوں کی بےقدری، جنسی استحصال، انسان کی محرومی وغیرہ جیسے موضوعات کو جسونت منہاس نے اپنے افسانوں میں بڑی عمدگی کے ساتھ برتا ہے۔

ان کے افسانوں میں اگر چہ طوالت ہے مگر جب قاری ان کے افسانوں کو پڑھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ طوالت ان کے افسانوں کا عیب نہیں بلکہ خوبی بن جاتی ہے۔ اور جس طرح سے انھوں نے دور حاضر کی ہو بہو تصویر کھینچی ہے ایسا لگتا ہے کہ مصنف نے عرصہ تک اپنے سماج کی بڑھی ہوئی مشکلات کو اپنے ذہن کے کوزے میں بند کر کے رکھا تھا او رانہیں سماج کے خامیوں کو بعد میں انھوں نے اپنے قلم سے منظر عام پر لانے کی کوشش کی۔

وجے سمن سوسن:

ہندی زبان کے حوالے سے ان کا ایک افسانوی مجموعہ ''عرمیا'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔ اسی طرح سے اردو زبان وادب کے حوالے سے ان کا افسانوی مجموعہ ''چھالے'' کے عنوان سے 1947ء کے آس پاس شائع ہوا تھا۔

ویدراہی:

ویدراہی کا تعلق جموں سے تھا ان کا شمار بھی 1947ء کے پہلے لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ ویدراہی لالہ ملک راج صراف کے صاحبزادے تھے۔ انہیں صحافت کے علاوہ افسانہ نگاری، ڈراما اور شاعری میں کافی دلچسپی تھی۔ ویدراہی کو بنیادی طور پر افسانہ نگار کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ ان کے مختلف افسانے اخبارات اور رسائل میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے تھے۔ انہیں لکھنے پڑھنے میں کوئی بھی دشواری پیش نہیں آتی تھی کیوں کہ ان کے والد خود جموں وکشمیر کے بڑے ادیبوں میں شمار ہوتے تھے اور ان کے مشہور رسالے ''رتن'' میں ویدراہی عمر نو سے ہی لکھنے لگے تھے۔ چنانچہ اس کے بعد انھوں نے کئی افسانے اور ڈرامے شائع کیے۔ فلمی دنیا سے بھی کافی لگاؤ تھا اس لیے فلم میں اپنی قسمت کو آزمانے کے لیے

ممبئی کا رخ کیا کچھ عرصہ وہاں کام کرنے کے بعد جب یہاں ان کو زیادہ کامیابی حاصل نہ ہوسکی تو پھر اپنی سرزمین جموں واپس چلے آئے اور اس کے بعد بڑی محنت اور لگن سے افسانے لکھنے لگے۔ ان کے مشہور افسانوں میں خاص طور پر ''منجر کا میلہ''، ''شگوفہ''، ''کالے ہاتھ''، ''اسلم میرا دوست'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ متذکرہ بالا افسانوں میں ویدراہی کا مشہور افسانہ ''منجر کا میلہ'' ہے مگر ''کالے ہاتھ'' ان کے افسانوں میں فنی اعتبار سے بہت ہی زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ اس افسانے میں مصنف نے ایک لیڈی ڈاکٹر کی کہانی کو پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر نشا کے کالے ہاتھوں نے ایک دفعہ سہیلی کے گڈے کے ساتھ اس کی گڑیا کی شادی طے کردی تھی مگر اس کے بجائے اس کی بہن کی گڑیا شادی کے منڈپ میں لا کر بٹھادی گئی تھی۔ اس کے بعد پھر سے ایک بار یہی واقعہ خود اس کے ساتھ اس کی شادی میں پیش آتا ہے اور خود اس کی شادی میں اس کی بہن لیڈی ڈاکٹر کی جگہ پر دلہن بنا کر بٹھادی گئی۔ اس کے بعد اسی دولہے کا آپریشن کرنے کے لیے وہ اپنے کمرے میں آتی ہے اور سسکنے لگتی ہے۔ اور تب اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے کہ جو اس نے کسی دوسرے کے ساتھ ناانصافی کی تھی وہی خود اس کے ساتھ اس کی اپنی شادی میں ہوتا ہے۔ ویدراہی کے افسانوں میں نفسیات کا اچھا تجزیہ دیکھا جاسکتا ہے۔ ان کے افسانہ مکالموں سے نہیں بلکہ ان کے اپنے منفرد اسٹائل اسلوب اور انداز بیان کی وجہ سے اہمیت کے حامل ہیں۔ ویدراہی ایک مخصوص تصویر کے گرد افسانوں کا تانا بانا بنتے ہیں۔ پھر اسی خصوصیت کو وہ اپنے افسانوں کے طلسماتی زور بیان سے زندگی کے سارے رنگ بھر دینے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ویدراہی کے افسانوں کا مطالعہ کرنے سے ایک خاص بات سامنے آتی ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں اپنے گردو پیش کی زندگی کو پیش کرتے ہیں اور خاص طور پر ان کے افسانوں میں گردو پیش کے سنگلاخ پہاڑی علاقوں میں رہنے والے غریب لوگوں کی زندگی کی سچی تصویر سامنے آتی ہے۔ اس حوالے سے راقم کی نظر میں وہ پہلے افسانہ نگار ہیں جن کی کہانیوں میں جموں کے پہاڑی علاقوں میں بسنے والوں کی زندگی کی عکاسی ہوتی ہے۔ ویدراہی کے افسانوں میں کردار نگاری بہت اہمیت کی حامل ہے۔

ویدراہی کے افسانوں میں پریم چند کا گہرا اثر دکھائی دیتا ہے۔ جس طرح سے پریم چند نے اپنے افسانوں میں دیہات کی عکاسی کی ہے اسی طرح ویدراہی نے بھی جموں کی دیہاتی زندگی کو اپنے افسانوں میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس حوالے سے پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب لکھتے ہیں:

> ''ویدراہی پر پریم چند کا کافی اثر ہے اور انھوں نے پریم چند کے انداز کے کچھ اصلاحی افسانے بھی لکھے ہیں جن میں ''یہ پربت میرے ہیں'' اچھا افسانہ ہے''۔(120)

ویدراہی کا افسانہ ''یہ پربت میرے ہیں'' ایک اچھا افسانہ ہے۔جس میں پریم چند کے اثرات دکھائی دیتے ہیں ۔اس میں مصنف نے اپنی کہانی کو پیش کیا جس سے کم عمر لڑکیوں کو معمولی آدمی کے ساتھ بیاہنے کی بُری رسم کو دکھایا گیا ہے ۔اس افسانے کو اگر ویدراہی کا نمائندہ افسانہ کہا جائے تو بے جانہ ہوگا۔ویدراہی نے اس افسانے میں ایک چھوٹے سے گاؤں کی چھوٹی سی کہانی کو بیان کیا ہے۔مگر یہی چھوٹی سی کہانی نہایت معصوم اداؤں کے ساتھ منظر عام پر آتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر چہ یہ ایک چھوٹے سے گاؤں کی چھوٹی سی کہانی ضرور ہے مگر اس کہانی میں مصنف نے بہت کچھ دکھانے کی کوشش کی ہے۔اس کہانی میں ویدراہی نے دیہی زندگی کا صاف شفاف عکس دکھانے کی کوشش کی ہے۔اسی دیہی زندگی کے دھندلے دھندلے سے نقوش ،بجھی بجھی سی آنکھوں سے بار بار جھانکتے نظر آتے ہیں ۔ان نقوش کو ہمارے لیے سمجھنا بہت مشکل ہو جا تا ہے اور یہی نقش کہن ہمارے لیے ایک بڑا سوالیہ نشان پیدا کر دیتے ہیں جن میں سے ایک کا تعلق کم عمر لڑکیوں کو بڑی عمر والے لڑکوں سے بیاہا جا تا ہے جو ایک صدیوں کی رسم کے طور پر سمجھا جا تا ہے۔مصنف نے اس میں جو کردار پیش کیے ہیں وہ قارئین کی نظروں سے کئی بار گزر چکے ہیں۔اگر چہ یہ کردار شکست خوردہ سہی ہیں مگر ان میں ایک جینے کی بے پناہ خواہش بھی ہے۔ویدراہی کے اس افسانہ کا مطالعہ کرنے کے بعد اس بات کا اندازہ لگایا جا تا ہے کہ انھوں نے کس قدر عرق ریزی سے دیہات کی زندگی کا مطالعہ کیا تھا۔ جب قارئین ان کی کہانیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کے سامنے دیہات کا پورا منظر آجا تا ہے۔یہی دیہی زندگی کی عکاسی ویدراہی کو اپنے فن کے سانچے میں کامیابی اور جراتمندی میں مدد دیتی ہے۔

ویدراہی کا ایک اور قابل ذکر افسانہ ''اسلم میرا دوست'' کے عنوان سے ہے اس میں مصنف نے تقسیم کے بعد ہونے والے دردناک حادثات وفسادات کی کہانی کو پیش کیا ہے۔ویدراہی کو جموں کے مخصوص لسانی تقاضوں سے تحریک پانے والا اردو کا محنتی اور پرخلوص قلمکار کہا جا تا ہے۔انھوں نے اردو زبان کے ساتھ ساتھ ڈوگری زبان میں بھی اپنے مافی الضمیر کا اظہار کیا ہے۔ وہ ڈوگرہ دیش کے لوگوں کی دیہاتی زندگی اور ان کے قہقہوں اور آنسوؤں کی امیدوں اور ناامیدیوں جیسی کہانیوں کو اپنے تخلیقات کا حصہ بناتے ہیں ۔جس سے وہ کسی حد تک کامیابی حاصل کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ۔ان کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی کہانی پڑھنے یا پڑھانے سے زیادہ سلولائڈ کے قرطاس رنگین اجاگر کرنے کے قائل ہیں۔

رام کمار ابرول:

رام کمار ابرول کے ڈوگری افسانوں کا ایک بہترین مجموعہ ''پیریں دے نشا'' (پاؤں کے نشان) کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس مجموعے کے ساتھ شری رام ناتھ شاستری اور دینو بھائی پنت کے ساتھ مل کر مشترکہ کتاب ''نواں گراں'' (نیا گاؤں) نام سے شائع ہوئی تھی۔ رام کمار ابروال کی ڈوگری تخلیقات کے بارے میں ٹھاکر پونچھی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا جس کا حوالہ جان محمد آزاد نے اپنی تصنیف میں کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''ابرول نے اگر چہ اردو کی معرفت ہی ڈوگری میں لکھنا شروع کیا تھا لیکن اردو سے قبل آپ کی بعض ڈوگری چیزیں شائع ہوئیں۔ ٹھاکر پونچھی نے ایک بار کہا تھا کہ رام کمار ابرول سوچتے اردو میں ہیں مگر لکھتے ڈوگری میں ہیں۔ چنانچہ ان کی ''دو ا بھرو'' (دو آنسو) اور ''غیر تو دامل'' (غیرت کی قیمت) کہانیوں میں احمد ندیم قاسمی اور بلونت سنگھ کا اثر نمایاں ہے۔ درحقیقت دو آنسو، احمد ندیم کے گنڈاسہ، افسانے سے متحرک ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ افسانہ احمد ندیم قاسمی کی کہانی کا ڈوگری حربہ ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اس بات کی تصدیق نیلامبر شرما نے بھی اپنی انگریزی کتاب میں کی ہے''۔(121)

رام کمار ابروال کے افسانوں میں زندگی کی یہی عکاسی دیکھی جا سکتی ہے ان کے موضوع اور کردار سب موجودہ دور کے سماجی اور دیہاتی زندگی سے لیے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے بارے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان کی ڈراما نگاری سے دلچسپی کے آثار ان کے افسانوں سے بھی نمایاں ہیں۔

بلراج بخشی:

ان کا شمار جموں خطے کے 1947ء کے بعد افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ بلراج بخشی نے اردو افسانہ میں ہی زیادہ تر طبع آزمائی کی تھی۔ انہیں جموں خطے کے افسانہ نگاروں میں کافی اہمیت کے حامل سمجھا جاتا ہے۔ ان کے اکثر افسانے طوالت سے بھرے ہوتے ہیں مگر جب ان کی کہانیوں کو پڑھا جاتا ہے تب یہ طوالت عیب نہیں بلکہ ایک خوبی بن جاتی ہے۔

بلراج بخشی کا تعلق ریاست جموں وکشمیر کے علاقہ پونچھ سے تھا۔ 1947ء تک ان کا خاندان اسی علاقے میں رہائش پذیر تھا مگر تقسیم وطن کے دوران چونکہ پونچھ کا علاقہ دونوں ملکوں پاکستان اور ہندوستان کی سرحد کے درمیان کا

علاقہ ہے اور غدر کے دوران بلراج بخشی کے والدین کو یہ جگہ راس نہ آئی اور وہ اپنے خاندان کے ساتھ جموں خطے کے علاقہ ادھم پور میں منتقل ہوتے گئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ بقول ڈاکٹر مشتاق احمد وانی:

> ''بلراج بخشی کا تعلق بھی آنند لہر کی طرح پونچھ ہی سے رہا ہے۔ 1947ء کے بعد ان کے والدین ادھم پور چلے آئے اور یہیں آ کے بس گئے۔ بلراج بخشی شاعر بھی ہیں نقاد بھی اور افسانہ نگار بھی''۔(122)

بلراج بخشی معاصر اردو افسانے کا ایک اہم نام ہے اگرچہ انھوں نے بہت کم لکھا ہے۔ مگر پھر بھی انھوں نے اپنے افسانوں میں جن موضوعات کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ وہ جب بھی کچھ تحریر کرتے ہیں بڑے ہی جذبے کے ساتھ اپنے قلم کو چلاتے ہیں۔ ان کی کہانیوں سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ان کہانیوں کو گہرائی سے تخلیق کیا ہے۔ وہ اپنی تخلیقات میں بالکل صاف اور سادہ زبان کا استعمال کرتے ہیں تا کہ قارئین کو با آسانی سمجھ آ سکے۔ ان کی ایک خصوصیت ہے کہ وہ زندگی اور معاشرے میں مثبت اقدار کی کھوج کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اس کو منظر عام پر لانے میں ادب کا بنیادی اور ضروری مقصد سمجھتے ہیں۔

ان کے افسانے اس چیز کی گواہی دیتے ہیں کہ وہ اپنے سماج کی ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز کا باریک بینی سے مطالعہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں انسانی قدروں کا زوال، فکری تضاد، سماج میں رونما ہونے والی تبدیلیاں وغیرہ جیسے موضوعات کی عکاسی ملتی ہے۔ انھوں نے اپنی تخلیقات میں سیاسی اور سماجی سرگرمیوں کا بہترین انداز میں تجزیہ کیا ہے۔ ان کا یہ ہنر ہے کہ وہ کسی بھی چھوٹے واقعے کو کہانی کے طور پر پیش کر دیتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کے مطالعہ سے یہ بات قابل غور ہے کہ انھوں نے اپنے گرد کے سیاسی اور سماجی روزمرہ کے ماحول کو اپنے افسانوں میں قلم بند کیا ہے۔

افسانہ نگاری کا یہ بنیادی اصول ہے کہ افسانہ نگار قاری کو اپنے گرفت میں رکھے تا کہ وہ پوری کہانی سے لطف اندوز ہو سکے۔ بلراج بخشی کے افسانے طویل ہونے کے باوجود قاری کی پکڑ افسانے میں آخر تک بنی رہتی ہے۔ اور ہر موڑ پر قاری کہانی سے لطف اٹھاتا رہتا ہے۔ اور اپنے سماج میں قارئین کو حقیقی تصویر نظر آتی ہے۔ اس طرح سے قاری کے ذہن میں یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ یہ محض کہانی نہیں بلکہ کہیں نہ کہیں یہ ہمارے سماج کی اپنی زندگی کی حقیقی تصویر ہے۔ جو مصنف نے برائے راست پیش نہیں کی ہے بلکہ کہانی کا سہارا لے کر اس حقیقت نگاری کو ہمارے سامنے لایا ہے۔ اس

سے معلوم ہوتا ہے کہ بلراج بخشی نے صرف وقت گزاری کے لیے افسانے نہیں بلکہ انھوں نے زندگی کے مسائل و مصائب کو اچھی طرح نظر ثانی کی تھی اور یہی مسائل ومصائب اپنے افسانوں میں پیش کر دیے۔ ان کے افسانے فنی خوبیوں پر کھرے اترتے ہیں۔

بلراج بخشی کے بہت سارے افسانے وقتاً فوقتاً مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہے۔ ان کا افسانہ ''ایک بوند زندگی'' پہلی بار 1978ء میں ماہنامہ ''تحریک'' دہلی سے منظر عام پر آیا تھا۔ بقول مولا بخش:

> ''افسانہ ''ایک بوند زندگی'' جون 1978ء میں گوپال متل کی ادارت میں ماہنامہ تحریک دہلی میں شائع ہوا تھا۔ میں نہیں مانتا کہ ان پینتیس برسوں کے دوران بلراج بخشی کسی جری گوشہ گمنامی یا اگیات واس میں رہے لیکن مجھے تو یہی طویل غائب باشی اس مجموعے کے انساب کی ماخذ نظر آتی ہے''۔(123)

ان کا افسانوی مجموعہ ''ایک بوند زندگی'' کے عنوان سے جو 2014ء میں منظر عام پر آیا تھا، یہ مجموعہ کل 157 صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں مصنف کے کل 12 افسانے شامل ہیں۔ یہ مجموعہ نہ صرف ریاست جموں وکشمیر میں افسانہ نگاری میں اضافہ کرتا ہے بلکہ اردو افسانہ نگاری کی روایت میں یہ ایک اہم اضافہ ہے۔ اس مجموعہ میں مصنف کے کل بارہ افسانے شامل ہیں۔

بلراج بخشی کی کہانیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہانی کہنے کے فن کو بخوبی جانتے تھے۔ وہ کہانی کو دکھانے میں بھی ماہر ہیں اور قاری کی دلچسپی سے بھی واقف ہیں۔ انھوں نے صرف چند کہانیوں کے ذریعے سے ہی زندگی کے پہلوؤں کو پیش کر کے حقیقی تصویر کو دکھا دیا۔ ان کے افسانوں میں دو باتیں اہمیت کے حامل ہیں۔ ایک تو یہ کہ انھوں نے اپنے افسانوں میں فرد کی بے چارگی، سماجی جبر، انسانی قدروں کا زوال وغیرہ کو اپنا موضوع بنایا ہے اور دوسرا یہ کہ سماج میں ہونے والی جکڑ بندی اور سیاسی نظام کی صورتحال کی بڑی عمدگی سے عکاسی ملتی ہے۔ وہ موضوع کی تکنیک سے اچھی طرح واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ کہانی کے موضوع کو جتنے بہترین تکنیک سے استعمال کیا جائے گا اتنا ہی کہانی میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی تخلیقات میں کہیں علامت نگاری سے کام لیا ہے اور کہیں استعارات و تشبیہات اور کہیں کہیں وہ واضح بیانیہ سے بھی کام لیتے نظر آتے ہیں۔

بلراج بخشی کا افسانہ ''ڈیتھ سرٹیفیکٹ'' ان کے شاہکار افسانوں میں شامل کیا جاتا ہے۔ اس کہانی میں مصنف

نے ایک شہری کی حقیقت بیانی پر کہانی کا پلاٹ تیار کیا ہے۔اس کہانی کا مرکزی کردار ایک عام شہری ہے۔ یہ کہانی سماجی حقیقت نگاری کا بہتر ثبوت فراہم کرتی ہے جس کے ذریعے سے سماجی برائی کا پردہ فاش کرنے کی سخت ضرورت تھی۔ دراصل یہ کہانی ایک انسان کی شناخت پر مبنی ہے ایک ایسا انسان جو اپنے ہی ملک میں اپنی شناخت چاہتا ہے اور وہ شہری اتنا پریشان ہو چکا ہے کہ اس کا اپنے ملک میں وجود ہے جو سب کو نظر آرہا ہے مگر پھر بھی وہ دفتروں کے چکر کاٹ رہا ہے۔ صرف اپنی پہچان کو ثابت کرنے کے لیے۔ یہ کہانی اس لیے حقیقت نگاری کی مثال دیتی ہے کیوں کہ یہ ہمارے معاشرے کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ چوں کہ دور حاضر میں انسان کا ایسا حال ہو چکا ہے کہ وہ اپنا وجود تو رکھتا ہے مگر اس کے باوجود بھی اسے اپنی شناخت دکھانی پڑتی ہے جس سے اکثر افراد محروم ہیں۔کہانی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے کہانی کا پلاٹ عام زندگی سے تیار کیا ہے لیکن اس کی گہرائی میں جا کر پتہ چلتا ہے کہ اس کہانی کے موضوع کی معنویت بہت گہری ہے۔

اس افسانے میں مصنف نے ایک ٹریولینگ سیلز مین کو دکھایا ہے جو اپنا آئیڈنٹیٹی کارڈ بنانے کے لیے ایک کمشنر سے التجا کرتا ہے مگر دفتری کاموں میں مصروف کمشنر اس کی کوئی مدد نہیں کر پاتا۔سیلز مین انفرادی طور پر جا کر بھی اپنے وجود کا ثبوت دے رہا ہے مگر اس کے باوجود بھی اس کی شناخت نہیں ہے۔جس کے وجہ سے وہ اپنا شناختی کارڈ بنانے میں محروم ہے۔اور شناختی کارڈ کے بغیر وہ کچھ بھی کام نہیں کر سکتا ہے اسے ہر دفتر ہر موڑ پر شناختی کارڈ کی ضرورت ہے۔شناختی کارڈ کی اتنی اہمیت ہے جتنی کہ ہر انسان کو جینے کے لیے روٹی ضروری ہے۔اور وہی روٹی، کپڑا اور مکان کے لیے شناختی کارڈ بے حد ضروری ہے۔اس افسانہ کے مطالعہ کے دوران قاری خود اس شہری کی حمایت میں کھڑا ہو جاتا ہے، کیوں کہ وہ اپنے ہی ملک کا باشندہ ہے مگر اس کے پاس کوئی دستاویزی ثبوت نہیں ہے۔ایک ملک میں اس سے بڑا المیہ کیا ہو سکتا ہے اور آخر میں جب وہ سیلز مین دفتر کے چکر کاٹ کاٹ کے تھک جاتا ہے تو وہ زندہ ہوتے ہوئے بھی اپنے ہی ڈیتھ سرٹیفکیٹ کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔کیوں کہ وہ نہیں چاہتا ہے کہ اس کے بچوں کو بھی اس طرح کی کوئی پریشانی کا سامنا کرنا پڑے اس سے وہ اپنے زندہ رہتے ہوئے ہی اپنا ڈیتھ سرٹیفیٹک بنوانے کی عرضی پیش کرتا ہے۔

آپ خود اس افسانے کو پڑھ کر اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مصنف نے کس انداز میں کہانی کا تانا بانا بنا ہے۔ایک زندہ انسان کا اپنی زندگی میں ہی مر جانے کی تصدیق کی خواہش انسانیت کے نام پر حیوانیت کی موہر لگ جاتی ہے۔سیلز مین کو جب شناختی کارڈ کی ضرورت پڑتی ہے تو سرکاری آفیسر کا رویہ دیکھئے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''یہ وزارت داخلہ کی رپورٹ ہے۔ پچھلے سال جو حکومت مخالف جلوس نکلے تھے تم ان میں پیش پیش تھے...........ہم م م م...........یہ لکھا ہے...........تم اچھل اچھل کر نعرے لگا رہے تھے شہری جواب دیتا ہے:

وہ تو غیر سیاسی تحریک تھی...........

یقیناً...........کمشنر میز پر ہاتھ مار کر دہاڑا اور اسی لیے خطرناک تھی...........سیاسی تحریکوں کو توڑا جا سکتا ہے...........کیونکہ ان کے مفادات حکومت سے مختلف نہیں ہوتے''۔(124)

بلراج بخشی کا افسانہ ''مشترکہ اعلامیہ'' بھی کافی اہمیت کے حامل ہے۔ یہ افسانہ دونوں ملکوں ہندوستان اور پاکستان کی حقیقت نگاری کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ اس میں مصنف نے دکھایا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کی جیلوں میں بے شمار ملزم قید کی زندگی کاٹ رہے ہیں۔ ان قیدیوں میں بہت سارے قیدی ایسے بھی ہیں جو قصوروار بھی نہیں ہیں مگر پھر بھی قید میں ہیں اور کبھی قیدی قصوروار ہیں۔ اور ایسے میں دونوں ملکوں کے بڑے بڑے افسروں کی میٹنگ ایک عالیشان عمارت جس میں چاروں طرف ایئر کنڈیشن ہیں، میں ہو رہی ہے۔ افسانہ نگار نے دونوں ملکوں کی طرف سے دو آفیسر پیش کیے ہیں جن میں ایک طرف سے راؤ رتن سنگھ ہے اور دوسری طرف سے پیرزادہ نصرف یار خاں۔ وہ دونوں آفیسر انسانی حقوق اور انسان کی قدروں کے ساتھ انصاف کی بات کرنے میں مشغول تھے لیکن اسی دوران جب دونوں طرف کے بے گناہ قیدیوں کا جائزہ لیا جاتا ہے تو ان کے حالات دیکھ کر دونوں ملکوں کے درمیان انسانیت کی بے قدری کی وجہ سے آفیسروں کی زبان پر تالا لگ جاتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''سورج بھاٹیہ نے دائیں ہاتھ سے کان کھجلانے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ نہ صرف اس کا دایاں ہاتھ کلائی کے جوڑ سے ٹوٹا ہوا تھا بلکہ تین انگلیاں بھی غائب تھیں۔ اس کا چہرہ جذبات سے قطعی عاری تھا اور اس کی آنکھیں بھنچی ہوئی تھیں جیسے وہ آنکھوں پر زور ڈال کر کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کی حالت دیکھ کر سب کے چہرے فق ہو گئے تھے۔ کسی کو بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ کسی انسان کی یہ ہیئت بھی کبھی بن سکتی ہے اور اس طرح دکھائی دینے والی کوئی مخلوق کبھی انسان کہلاتی ہوگی۔ بدترین قسم کے حادثے میں بھی کوئی انسان اس ہیئت کذائی میں نہیں آ سکتا تھا۔ واضح تھا کہ سورج بھاٹیہ منظّم اور دانستہ جسمانی تشدد کا شکار ہوا

ہوگا''۔(125)

دراصل اس افسانے کا موضوع کو نیا موضوع نہیں ہے۔ایسے قصے ہر دور میں گزرتے رہتے تھے مگر اس افسانے کی حساسیت اور انداز بیان میں ایک نیا انداز معلوم ہوتا ہے۔مصنف نے اس کہانی میں دونوں ملکوں کی انسانیت کی بے قدری اور انسانی حقوق کی نابرابری کا سارا سچ سامنے لاکر رکھ دیا ہے کہ کس طرح سے دونوں ملکوں ہندوستان و پاکستان کی جیلوں میں بے قصور معصوم اور بے گناہوں کو بند کر کے رکھا ہے۔اور دونوں ملکوں میں سیاست کس طرح سے انسانیت کا خون چوس رہی ہے۔ایسے ہی سوالوں کے جواب اس کہانی میں دیکھے جاسکتے ہیں۔اور مصنف نے پوری کہانی کو سوال اور جواب میں بیان کی ہے۔مصنف نے اپنے دور کے حکومتی نظام کے دوکھے اور غریب کاریوں کی بہترین عکاسی کی ہے اور یہ بات بالکل درست تھی کہ ہندوستان کی جیلوں میں معصوم اور بے قصور پاکستانی قیدی اور پاکسان کی جیلوں میں ہندوستان کے بے گناہ اور معصوم قیدی نہ جانے کس جنم کی قید کاٹ رہے تھے یہ کہانی ایسے قیدیوں پر مبنی ہے۔اس کہانی کے مطالعے سے قاری کے ذہن میں بہت سارے سوال پیدا ہوجاتے ہیں،اور قاری یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ سیاست کس حد تک اپنے مفاد کے لیے غریب عوام کو موت کے کنویں میں ڈھکیل دیتی ہے۔قاری کے ذہن میں یہ سب سے بڑا سوال پیدا ہوجاتا ہے کہ کیا سیاست اتنا گھناؤنا کام بھی کرسکتی ہے۔آخر میں اس افسانے کی کہانی سے قاری کے ذہن میں یہ اثر طاری ہوتا ہے کہ پوری انسانیت جیسے ایک بند کمرے میں بند ہوچکی ہے۔

بلراج بخشی کو کہانی لکھنے کا ہنر بخوبی آتا تھا۔ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی کہانی کے آخر میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو نچوڑ کر پیش کردیتے ہیں ان کی ہر کہانی کا آخری اقتباس بہت ہی دلچسپ ہوتا ہے۔ملاحظہ ہو اس کہانی کا آخری اقتباس:

> ''اس کے علاوہ............پیرزادہ نصرت یار خان نے چندہ پیشانی سے کہا............اس کے علاوہ آپ کے تعاون،معاملہ فہمی اور ملک کے وسیع تر مفاد کو ترجیح دینے کے............آپ کے میلان کو ملحوظ رکھتے ہوئے............حضرات............آپ کی اپنی اپنی حکومت............مشکرانے کے طور پر آپ کو ایک حقیر سا تحفہ بھی دیتی ہے............جو............ہوٹل میں آپ کے اپنے اپنے کمروں میں رکھے............ایک بریف کیس میں آپ کا انتظار کررہا ہے............سب کے چہرے کھلے ہوئے تھے''۔

متذکرہ بالا اقتباس سے آپ کو بھی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ سیاست ہر دور میں اپنا فائدہ اٹھانے کے لیے سمجھوتہ

کر لیتی ہے مگر بے قصور اور عام لوگوں پر کس طرح کی مشکلات آتی ہیں اس سے دونوں ملکوں کی سیاست کو کوئی مطلب نہیں ہوتا ہے۔

علی احمد فاطمی صاحب اپنے ایک مضمون میں بلراج بخشی کی دو کہانیاں ''ڈیتھ سرٹیفکیٹ'' اور مشترقہ اعلامیہ'' کے بارے میں اپنے خیالت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''کہانیاں اور بھی ہیں لیکن ان دو کہانیوں کے بارے میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس دور میں نئی اردو کہانیوں کی بھیڑ میں کم از کم میری نظر سے ایسی سماجی اور سیاسی نوعیت کی کہانیاں نہیں گزریں ....بلراج بخشی کی ان دونوں کہانیوں اور چند اور کہانیوں کو پڑھنے کے بعد ہلکا سا اختلاف کرنے کو جی چاہتا ہے۔ ہر چند کہ یہ دونوں کہانیاں ہندوستان سے زیادہ ہندو پاک کے سیاسی رشتوں ہی کو چھوتی ہیں لیکن پہلی کہانی ''ڈیتھ سرٹیفکیٹ'' میں ایک انسان کے وجود، عدم وجود اور سماج کے ترقی یافتہ دور میں اس کی اصل شناخت کیا ہے۔ اس پر گہرا سوال کرتی ہے۔............ یہ دونوں کہانیاں صرف دو ملکوں کا نہیں آج کے افسانوں کا اعلامیہ بلکہ المیہ ہیں''۔(127)

بلراج بخشی کی ایک اور کہانی ''کیا نہیں ہو سکتا'' بہت ہی اہمیت کے حامل ہے اس کہانی میں انھوں نے زیادہ تر سیاسی واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کہانی کی تکنیک بھی مذکورہ دو کہانیوں کی طرح کی ہے مگر مصنف نے اس میں غریبی، مہنگائی، لاچاری، بے بسی اور کرپشن پر براہ راست کوئی بات نہیں کی ہے جس طرح سے انھوں نے ''ڈیتھ سرٹیفکیٹ'' اور ''مشترقہ اعلامیہ'' میں کی ہے۔ اس کہانی میں بھی سیاسی اور سماجی باتوں کی پیش کش میں آخر تک خطرہ بنا رہتا ہے۔ اس کہانی میں انسانی دکھ درد اور سماجی بصیرت کی بہترین عکاسی ہے۔ مصنف نے اس کہانی کو اس طرح سے پیش کیا ہے کہ وزیر اعظم کی طرف سے عوام تک یہ اعلان کیا جا رہا ہے کہ کل سے ہمارے ملک میں کرپشن، مہنگائی، غریبی وغیرہ کا خاتمہ ہو جائے گا۔ مگر ساری عوام وزیر اعظم کی اس بات سے حیران ہے کہ آج تک ہمارے سماج سے ان تین بیماریوں کا خاتمہ نہ ہو پایا تو اچانک سے کیسے ہو پائے گا اور وہ بھی ہمیشہ کے لیے اتنی جلدی یہ سب کیسے ممکن ہے۔ ساری عوام چاروں طرف اس ہی بحث مباحثہ میں مبتلا ہے کہ یہ سب کیسے ہو سکے گا۔

وزیر اعظم کی طرف سے دوسرے دن پھر سے حیران کرنے والا جواب آتا ہے۔ اصل میں دوسرے دن وزیر

اعظم قانون بناتا ہے کہ لغت میں سے ان تینوں لفظوں ،غریبی ،مہنگائی اور کرپشن کو نہ صرف غائب کیا جاتا ہے بلکہ آئندہ کے لیے ایسے الفاظ آدہ کرنے پر قانونی کاروائی کی جائے گی ۔ یہ فیصلہ سن کر غریب عوام کے منہ پر تالا لگ جاتا ہے۔

اس کہانی کے خاتمہ پر مصنف نے کچھ طنزیہ الفاظ پیش کیے ہیں۔جس سے انھوں نے اس طنزیہ اشارہ پیش کر کے اس میں معنویت پیدا کی ہے اور سیاست کا مبادا سچ عوام کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔اس حوالے سے افسانہ کے ایک اقتباس مندرجہ ذیل ہے:

> ''ہمارے عظیم ملک میں غریبی ،مہنگائی اور کرپشن کے الفاظ ....آج سے کہیں نہیں ملیں گے..........اور کیونکہ..........جب یہ الفاظ کسی بھی ملکی زبان کی ڈکشنری میں ہیں ہی نہیں ....تو ان الفاظ کو بولنا..........یا لکھنا..........خلاف قانون قرار دے دیا گیا ہے۔ ....لہٰذا یہ واضح ہو جانا چاہیے کہ..........قانون بن گیا ہے..........آج کے بعد کوئی آدمی یا عورت..........چھوٹا یا بڑا..........عوامی طور پر..........یا اپنے گھر میں.......... سنجیدگی سے..........طعنے کے طور پر..........یا مذاق میں بھی غریبی ،مہنگائی اور کرپشن کے الفاظ منہ سے نہیں نکالے گا..........اور نہ ہی لکھ گا..........ان تینوں میں سے کسی لفظ کو نکالا ہے یا لکھا ہے..........تو..........ملزم کو خود ہی ثابت کرنا پڑے گا کہ اس نے ایسا نہیں کیا ہے۔ان تینوں الفاظ میں سے کسی کو بھی منہ سے نکالنا یا لکھنا ملک کے خلاف غداری ہوگی ....اور یہ جرم..........ملک کو بدنام کرنے والا یہ گھناؤنا جرم..........ایک سنگین جرم سمجھا جائے گا جس کی سزا دس سال یا اس سے زیادہ قید با مشقت تک ہو سکتی ہے.......... لہٰذا میں اعلان کرتا ہوں کہ آج کے بعد اس ملک سے غریبی ، مہنگائی اور کرپشن کو ختم سمجھا جائے..........''۔(128)

اس متذکرہ اقتباس سے مصنف نے سیاست کو ننگا کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ ہر ملک کے سیاسی حالات کو سامنے لا کر کھڑا کر دیا ہے اور سیاست چاہے تو کچھ بھی ہو سکتا ہے یہی اس افسانے کا بھی عنوان ہے کہ ''کیا نہیں ہو سکتا'' اس اندھیر نگری میں۔

بقول ڈاکٹر مشتاق احمد وانی:

''جہاں تک ان کے افسانوں کا تعلق ہے۔انھوں نے اپنے مخصوص طنزیہ لہجے میں ان عناصر وعوامل کی نشاندہی کی ہے جو ہمارے ملک وقوم کی سالمیت اور ترقی کے لیے خطرہ بنے ہوئے ہیں۔جنسی مسائل کو بھی انھوں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے''۔(129)

بلراج بخشی کا مجموعہ ''ایک بوند زندگی'' بہت ہی قابل تعریف ہے۔انھوں نے اس مجموعے کے ذریعے سے قارئین کو بے پناہ تجسس فراہم کیا ہے۔ان کے افسانے ''ایک بوند زندگی'' ہر انسان کے ضمیر کی عکاسی کرتا ہے۔کہانی کو پڑھتے ہوئے قاری کو اس کہانی میں اکتاہٹ ضرور ہوتی ہے مگر اس کے اصل معنی تک پہنچتے پہنچتے قاری اس سے لطف اندوز ہونے لگتا ہے یہ افسانہ نگار کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

مصنف نے اس افسانے میں مکالمے کے ذریعے سے تجسس کا جمال پیدا کر دیا ہے تا کہ قاری ان کی کہانی کے اگلے موڑ کو جانے کے لیے بے چین رہے۔ڈاکٹر مولا بخش اس افسانے کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں کہ:

''یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جسے کسی تمہیت پر بھی غلامی،خصوصاً ذہنی غلامی، منظور نہیں۔شاید اسی لیے وہ اس جگہ سے بھاگ جانا چاہتا ہے جہاں انسان پر طرح طرح کے پہرے بیٹھا دیے گئے ہیں''۔(130)

متذکرہ بالا تمام افسانوں کے مطالعے سے یہ اندازہ ہو گیا کہ بلراج بخشی سماج کی عکاسی کرنے اور سماجی حقائق کو پیش کرنے میں کسی تعریف کے محتاج نہیں ہیں۔انھوں نے سماج کے ایسے حقائق منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے جو ہمارے معاشرے کو بہت زیادہ متاثر کرتے ہیں۔ان کی یہ ایک بڑی خوبی ہے کہ وہ کسی بھی معمولی واقعے کو کہانی کے طور پر پیش کر لیتے تھے۔انھوں نے بہت ساری کہانیوں میں مختلف موضوعات کو جگہ دی تھی اور نفسیاتی اور طنزیہ کہانیاں لکھنے میں بھی انھیں کمال حاصل تھا۔بہر حال ان کی تخلیقات کے بارے میں مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر چہ انھوں نے بہت کم لکھا تھا مگر اس کے باوجود بھی جموں خطے کے ساتھ ساتھ اردو ادب میں ان کی کہانیاں ایک اضافہ کرتی ہیں۔بلراج بخشی کو زبان و بیان میں بھی قدرت حاصل تھی ان کی کہانیاں اپنی سلاست،روانی،شگفتگی کی وجہ سے قابل تعریف ہیں۔یہی وجہ ہے کہ انھیں خطہ جموں میں کہانی کار کے طور پر ایک اچھا مقام حاصل ہے۔

امین بنجارا:

ان کا اصلی نام نصیر احمد قریشی تھا مگر ادبی دنیا میں انھیں امین بنجارا کے نام سے شہرت حاصل ہوئی۔ وہ بیک وقت ممتاز صحافی ، افسانہ نگار، محقق اور ناقد ہیں۔ ان کی پیدائش خطہ جموں کے علاقے سانبہ میں 26/نومبر 1961ء کو ہوئی تھی۔

امین بنجارا کے افسانوی مجموعے میں،''اک بنجارا گائے (افسانوی مجموعہ)''،''الاؤ (افسانوی مجموعہ)'' ہیں ۔امین بنجارا عرصہ دراز تک اتحاد انسانیت اور سیکولر روایات کے ساتھ علمی، ادبی، سماجی وغیرہ تنظیموں سے جڑے ہوئے تھے اس کے علاوہ امین بنجارا جموں وکشمیر میں اردو کے ادباو شعراء کو سالانہ نوازے جانے والی بڑی تنظیم ''جموں وکشمیر اردو فورم'' کے بھی صدر رہ چکے ہیں۔ اسی طرح سے وہ انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ جموں کے آرگنائزنگ سکریٹری کی حیثیت سے بھی کام کر چکے ہیں۔

جموں خطے میں 1960ء کے بعد اہم افسانہ نگاروں میں امین بنجارا کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ اگر چہ انھوں نے افسانہ نگاری میں بہت کم طبع آزمائی کی تھی لیکن اس کے باوجود بھی انھیں ایک اہم افسانہ نگار مانا جاتا ہے۔ ان کے افسانوں کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ امین بنجارا کے افسانوں میں انسان کی روزمرہ کی مشکلات کی عکاسی نظر آتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے ہمارے سماج میں کوئی وحشی درندا آ گیا ہے جو بار بار انسان کو اس کے وجود سے نکالنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔

امین بنجارا کے افسانوں میں سماج کی وہ حقیقت سامنے آجاتی ہے جو مختصر افسانہ نگاروں نے بیان کی ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہمارے سماج میں آج بھی ایسے بھیڑیے اور وحشی درندے موجود ہیں جو انسان کی مختلف شکل میں سامنے آتے ہیں اور بلاوجہ عام انسان کو پریشان کرتے رہتے ہیں۔ ایسے ہی وحشی درندوں کی وجہ سے ہمارا معاشرہ چین کی نیند نہیں ہوسکتا ہے۔

امین بنجارا کے افسانوں میں ہمیں دو چیزوں کا ذکر ملتا ہے۔ ایک طرف وہ انسان ملتے ہیں جو نیک اور ہمدرد انسان ہیں جو اپنے سماج کی ہر مشکلات کو ایک دوسرے کا سہارا بنتے ہیں جن کی وجہ سے ہمارا سماج آج بھی ترقی کرتا ہوا نظر آتا ہے، اور دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو کسی کسی شکل میں آ کر سماج میں مشکلات پیدا کرتے ہیں چاہے وہ رشوتخوری ہو، غریبوں پر ظلم و جبر ہو یا پھر ایسے لوگ جو اپنے ہی سماج میں نفرت پھیلانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھتے ہیں۔ یہی سب

مصنف کی تحریروں میں زیادہ تر دیکھنے کو ملتا ہے۔

امین بنجارا نے افسانہ نگاری میں تقریباً 1980ء میں قدم رکھا تھا اور ان کا سب سے پہلا افسانہ ''رنگے سیار'' کے عنوان سے لگ بھگ 1980ء کے آس پاس منظر عام پر آیا تھا اس حوالے سے انھوں نے خود ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''آج سے چودہ پندرہ سال قبل یہی افسانہ ''رنگے سیا'' لکھا''۔(131)

اس کے بعد ان کے کئی افسانے وقتاً فوقتاً ریاست کے مختلف رسائل وجرائد میں منظر عام پر آتے گئے جن میں خاص طور پر ''مجبور''، ''حق ادا نہ ہوا''، ''گناہ عظیم''، ''کتا''، ''الجھنیں''، ''اکیلا ہوں''، ''دل پکاؤ ہے'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اس افسانے کے تین مرکزی کردار ہیں جن میں جگتاور، اس کی ماں کلونت اور بہن پریتو ہے۔ان کی تین کرداروں کے گرد یہ پوری کہانی تیار کی گئی ہے۔

امین بنجارا کی تخلیقات میں اکثر لوگوں کو پریشان حال دیکھا جاسکتا ہے۔اسی وجہ سے مصنف نے سماج کی تلخ حقیقتوں کو اپنے افسانوں کے ذریعے منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ان کا ایک افسانوی مجموعہ ''الاؤ'' کے عنوان سے 1995ء میں منظر عام پر آیا تھا۔اس مجموعے میں ان کا سب سے اہم اور مشہور افسانہ ''رب کی مار'' ہے اس میں مصنف نے زندگی کی تلخ حقیقتوں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔

جگتاور سنگھ کوئی بڑا انسان یا کوئی منتری نہیں تھا۔اس کو سماج اور گاؤں میں زیادہ پہچان بھی نہیں تھی وہ سماجی یا سیاسی بغاوت میں بھی شامل نہیں ہوتا تھا وہ تو صرف ایک عام انسان تھا۔جگتاور سنگھ کا بڑا بھائی ایک حادثے کا شکار ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اس کی موت ہو گئی تھی۔اب جگتاور اپنی ایک لوتی بہن پریتو کے ساتھ اپنے غریبی کا وقت بڑی مشکل سے گزار رہا تھا۔ایک دن اچانک سے گاؤں میں فساد برپا ہو گیا اور ان فسادیوں نے پورے گاؤں پر حملہ بول دیا او ریہاں تک کہ سکھ کے مذہبی استھان گوردوارہ کو بھی جلانے کی کوشش کرنے لگے۔ایسے میں گاؤں کے سارے نوجوان فسادیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے نکل پڑے اور جگتاور بھی ان نوجوانوں کے ساتھ فسادیوں کے منصوبوں کو ناکام کرنے نکل پڑا۔فسادیوں کا مقابلہ کرتے کرتے جگتاور سنگھ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا اور اس حادثے میں وہ ایک فسادی کے چھرے کا شکار ہو گیا۔جگتاور سنگھ کے پھر میں اب ماتم چھا گیا گھر میں صرف بوڑھی ماں اور بہن رہ گئی۔

جگتاور کے جانے کے بعد کلونت اور پریتو کا دونوں عورتوں کا گزارا بڑی مشکل سے ہوا۔یہاں پر مصنف نے اس افسانے میں صرف ایک کہانی کو ہی پیش نہیں کیا ہے بلکہ سماج کی سچی تصویر کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔پریتو

کی ماں ایک طرف اپنے اور اپنی بیٹی کے لیے دو وقت کا کھانا تلاش کررہی تھی اور دوسری طرف اسے پریتو کی شادی کا خیال بار بار ستا رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ جلد سے جلد پریتو کی شادی کر دی جائے مگر اس کے لیے تو ہمارے سماج میں ایک روایت ہے کہ لڑکی کی شادی کے لیے اچھا خاصہ جہیز ہونا ضروری ہے ایسے میں پریتو کی ماں کے جہیز پورا کر سکتی تھی۔ مگر ایسے میں کی کہ جب خدا دیتا ہے تو کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی ایسا ہی کچھ اس افسانہ میں مصنف نے پریتو اور اس کی ماں کی امید کو پورا کرتے ہوئے دکھایا ہے۔

اب حکومت نے فیصلہ کیا تھا کہ گاؤں کے نوجوان جو فسادیوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے ان قصوروار لوگوں کو حکومت کی جانب سے مالی امداد دینے کا فیصلہ ہوا ہے۔ چنانچہ جگتاور سنگھ کی شہادت کے لیے حکومت کی جانب سے پچیس ہزار روپے کا معاوضہ منظور کیا گیا تھا جس سے اس کے گھر کا گزر بسر ہو سکے۔ ایسے میں جب کلونت کو اس بات کی خبر ہوئی تو وہ دونوں ماں بیٹی جگتاور کی موت کو بھول کر پریتو کی شادی کے لیے خوش ہوگئیں۔ اس خوشی سے مراد مصنف نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ایک غریب انسان کو اس کے سماج میں یہی سب دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایک عام انسان چند روپیوں کی خوشی میں ہی اپنی ساری پریشانیوں کو چھوڑ کر نئی راہ اختیار کرتا ہے اور یہی ہمارے سماج کی حقیقت نگاری ہے۔ بہر حال کلونت اور پریتو کی جو پریشانی تھی جہیز کو لے کر اب انھیں یہ خبر سن کر ایک امید کی کرن نظر آرہی تھی۔ مگر جیسا ہونا تھا ویسا نہیں ہوا، یہاں پھر مصنف نے کہانی میں ایک نیا موڑ پیدا کیا ہے کہ ہمارے سماج کے کچھ ایسے لوگو جو غریبوں کا ہی خون چوسنے پر تلے ہوئے ہیں۔ یہ رشوت خوری اور بے ایمانی صدیوں سے ہمارے سماج کا حصہ بنی ہوئی ہے۔ امین بنجارا نے بھی یہی سب اس کہانی میں دکھایا ہے۔

حکومت کی جانب سے امدادی رقم کے پریتو کی ماں نے ایک کاغذ پر دستخط کیے اور اسے پچیس ہزار کے بجائے صرف پندرہ ہزار وصول ہوئے۔ کلونت کو یہ دیکھ کر بہت حیرانگی ہوئی۔ اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ''بابو جی یہ تو پندرہ ہزار ہیں'' پریتو نے افسر کی طرف دیکھتے ہوئے۔ پندرہ ہزار'' کلونت کو ر دھیرے سے بڑبڑائی'' ''بچو! کٹ کٹا کر پندرہ ہزار ہی بنتے ہیں''۔ آفیسر نے یقین دلواتے ہوئے کہا'' آپ تو کہہ رہے تھے کہ پچیس ہزار روپے ملیں گے؟'' ''ہاں ہاں منظور پچیس ہزار ہی ہوتے ہیں لیکن کٹ کٹا کراتنے ہی بنتے ہیں'' ''پچیس منظور ہوئے ہیں تو پورے پچیس دونا'' پریتو نے التجا کی'' نہ دیں تو کون سامہا پر لے آجائے گا۔ مفت میں پندرہ ہزار روپے مل

رہے ہیں خاموشی سے لینے کے بجائے شور مچارہے ہو‘‘۔(132)

اس متذکرہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے سماج کی ہر شئے کی باریک بینی سے عکاسی کی تھی اور یہ حقیقت بھی ہے ہمارے معاشرے میں غریب لوگوں کو ایک تو خدا کی طرف سے غریبی کی مار اور اوپر سے سماج کے رشوت خوروں ظلم و جبر، بہرحال دس ہزار روپے اہلکاروں نے ہڑپ لیے۔اب پریتو اور کلونت کور پھر سے پریشان ہو گئیں کیوں کہ تیس ہزار کی جہیز کی رقم میں ابھی صرف پندرہ ہزار ہی جمع ہوئے۔

اب کلونت کور کے ذہن میں ایک اور نیا خیال پیدا ہوا کہ اگر ایک اور فساد ہوا تو وہ اس میں حصہ لے گی تاکہ حکومت پھر سے مرنے والوں کو معاوضہ دے گی۔اور اب وہ اگلے فساد کا انتظار کرنے لگی۔جب فساد کی خبر آئی تو کلونت کور نے اپنے چاروں طرف ایک حسرت بھری نگاہ سے دیکھا اور پریتو کو سمجھانے لگی کہ پندرہ ہزار اب کی بار اور آجائیں گے اور اس سے پریتو کی شادی ہو جائے گی۔ یہاں پر جس انداز میں مصنف نے جذبات نگاری سے کام لیا ہے قابل تعریف ہے۔اقتباس پیش ہے:

’’بی جی۔باہر خون خرابا ہو رہا ہے‘‘’’مجھے معلوم ہے دھیے‘‘۔’’تو پھر کس لیے جارہی ہے؟‘‘

’’تجھے رب کی مار کلموئیے..........کتنی بار سمجھایا کہ کہیں باہر جاتے ہوئے روکا ٹوکا نہ کر ....پریتو کو ڈانٹ پلاتی ہوئی بوڑھی کلونت کور گلی میں نکل آئی’’بی جی رک جا‘‘ پریتو معصوم بچوں کی طرح بلکنے لگی۔’’کلموئیے اتنا یاد رکھنا کہ اب اگر کوئی کلکٹر صاحب کے دفتر سے آئے تو جو دے چپ سادھ کے رکھ لینا بحث نہ کرنا سمجھی‘‘ پریتو کی آنکھیں پتھرا گئیں‘‘۔(133)

ایک غریب معصوم اور لاچار انسان کے لے پیسہ سب کچھ ہوتا ہے وہ چند روپیوں کے لیے اپنی جان پر کھیل لیتا ہے۔یہی مجبوری پریتو کی ماں کو اپنی زندگی سے پوری کرنی پڑی۔امین بنجارا نے کئی موضوعات پر قلم اٹھایا تھا’’امن کے لیے‘‘ عنوان سے ان کا ایک اچھا افسانہ ہے۔اس کہانی میں مصنف نے گل بانو اور رحمٰن بیگ کو مرکزی کردار کے طور پر پیش کیا ہے اور دونوں میاں، بیوی کی محبت بھری کہانی دیکھنے کو ملتی ہے مگر یہ محبت صرف کچھ ہی عرصہ کے لیے ایک دوسرے کی خوشیاں چھین لیتی ہے۔رحمٰن بیگ فوج میں بحیثیت کیپٹن تھے اور وطن کی محبت ان کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اسی دوران 1971ء کا واقع پیش آتا ہے جس میں رحمٰن بیگ دشمنوں کے ہاتھوں شہید ہو جاتے ہیں۔

رحمٰن بیگ کے دو بیٹے تھے اور دونوں بہت ہمدرد تھے بڑا بیٹا عباس بیگ جو ایک جرنلسٹ کی پوسٹ پر تھا۔وہ

امن اور انسان دوستی میں کافی یقین رکھتا تھا۔ایک دن اچانک سے فساد برپا ہوا تو کچھ فسادی ہندوؤں کے مذہبی استھان یعنی مندر کو توڑنے کی کوشش کرنے لگے اور عباس بیگ اس مندر کو بچاتے بچاتے خود فسادیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔رحمٰن بیگ کا دوسرا اور چھوٹا بیٹا بہت ہی ہوشیار اور شرارتی تھا۔

امن بیگ اور گل بانو عباس بیگ کی موت سے بہت پریشان تھے۔اب امن بیگ کے ذہن میں دن رات اپنے بھائی کی موت کے بدلے کی آگ بڑھتی جا رہی تھی۔ چنانچہ وہ ایک دن بھائی کے دشمنوں سے بدلہ لینے کے لیے ایک تخریبی جماعت کے ساتھ گھر سے بھاگ گیا۔اس کے کچھ دن بعد وہ جب گھر آیا تو گل بانو اس کو دیکھ کر پہلے تو بہت خوش ہوئی مگر بعد میں جیسے ہی اسے پتہ چلا کہ امن بیگ نے غلط راستہ اپنا لیا ہے وہ بہت غم زدہ ہوگئی۔اس نے اپنے بیٹے امن بیگ کو بہت کوشش کی کہ وہ اس راستے کو چھوڑ کر واپس اپنی ایک نئی زندگی شروع کرے مگر اس کے لاکھ سمجھانے کے بعد بھی امن بیگ نہیں مانا۔اب گل بانو کے پاس کوئی اور چارہ نہ بچا اس نے سوچا کہ امن بیگ اسے بھی کسی کے ہاتھوں مارا جائے گا مگر اس کی موت سے رحمٰن بیگ کی وطن کی محبت پر داغ لگ جائے گا۔اس لیے گل بانو نے اپنی پوری ہمت سے امن بیگ کے پستول سے ہی اس کی چھاتی چھلنی کر دی اور ساری گولیاں امن بیگ کے سینے میں ڈال دیں۔وہ جانتی تھی کہ اگر وہ اسے نہ مارتی تو اس سے پورے سماج میں امن اور انسان دوستی کی مثال پر دھبہ لگ جائے گا اور اس لیے اس نے اپنے ہی ہاتھوں اپنے ہی بیٹے کو مار دیا۔ملاحظہ ہو ایک اقتباس:

> ''اب وہ لفظ و بیان کی جنگ بھی اختتام پر تھی ''فیصلہ'' الفاظ اور بیان کی حدود سے نکل کر ''ضمیر'' پر اثر کر چکا تھا اور جب فیصلے کا اثر ضمیر پر ہو جائے تو مزید بیان یا دلیل کی ضرورت نہیں رہتی۔گل بانو زخمی شیرنی کی طرح تھیلے پر جھپٹی اور پستول اس کے ہاتھ میں تھا۔''امن کل جنگ نہیں ہوگی'' اماں جنگ ہوگی''،''اب میں جنگ نہیں ہونے دوں گی''،''اماں''، ''اب کیپٹن بیگ نہیں مرے گا''،''عباس کے سینے میں خنجر پیوست نہیں ہوگا''،''اماں''، ''مائیں چھاتیاں نہیں پیٹیں گی''،''سہاگنیں بیوہ نہیں ہوں گی''،''بچے یتیم نہیں ہوں گے''، ''دھواں نہیں اٹھے گا''،''اماں'' اس نے جست لگا کر تھیلہ اٹھایا اور باہر کی طرف بھاگا لیکن ....ٹھاک............ٹھاک............ٹھاک............پستول کی نلی نے............اگلا اور امن کے بدن میں سما گیا''۔(134)

امین بنجارا کے افسانوں کا مطالعہ کرنے سے اس بات کا اندازہ ہوجاتا ہے کہ وہ ہر موڑ پر انسان اور انسانیت کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں اور امن اور انسانیت اور انسان دوستی کی مثال کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔اس کام کے لیے چاہے انھیں اپنی اولاد کو ہی کیوں نہ داؤ پر لگانا ہوگا مگر وہ انسانیت کو ہر مشکل کوشش سے زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔انھوں نے بار بار اپنے افسانوں کے ذریعے سے مختلف کرداروں اور اشاروں کنایوں سے بھائی چارے اور محبت وانسانیت کی بات کی ہے ۔اس حوالے سے ان کے کئی افسانے منظر عام پر آئے ہیں جن میں ''پھرکیاں''،''آنسو چنار کے''،''فیاض''وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

امین بنجارا نے جس طرح سے انسان اور انسانیت اور انسان دوستی کی مثالیں دیں قابل تعریف ہیں۔انھوں نے سماجی حقیقت نگاری کو اپنے افسانوں کے ذریعے سے منظر عام پر لانے کی کوشش کی تھی۔''الاؤ'' بھی ان کا ایک قابل ذکر افسانہ ہے۔اس میں مصنف نے سماج میں پلنے والے بڑے بڑے مکاری اور رشوت خوروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک ہری سیٹھ کے کردار کے ذریعے سے سماج کے ٹھیکیداروں کو بے نقاب کیا ہے اور وہیں دوسری طرف کچھ معصوم ،لاچار اور مجبور لوگ جو چند پیسوں کی خاطر اپنا ضمیر بیچ دیتے ہیں اور خود کو غلط کام میں شامل کردیتے ہیں ایسے لوگوں کی سب سے بہتر مثال اس افسانے میں پیش کی ہے۔اس افسانے میں سجاد کا کردار ہے وہ ہری سیٹھ کی باتوں میں آکر سماج کا مجرم بن جاتا ہے اور ہری سیٹھ بھی سجاد کی کمزوری کو اچھے سے جانتا تھا اس لیے وہ سجاد جیسے کئی عام آدمی کو اس کی مجبوری سے انھیں استعمال کرتا ہے ملاحظہ ہو اقتباس:

> ''اسی لیے بار بار تاکید کررہا ہوں کہ تمہیں صرف وہی کرنا ہے جو کہا گیا ہے''۔''پر اگر میں کسی چکر میں پھنس گیا تو''۔''ایک لمحے کے لیے فکرمندی کے آثار اس کی پیشانی پر ابھر آئے ''۔''پھر وہی بات ....اچھا اگر ایسا ہو بھی گیا تو ہم کس لیے ہیں؟''۔''تھینک یو ہری سیٹھ،آپ کا کام ہوجائے گا''۔''شاباش........... یہ لو پورے دس ہزار ہیں،دس ہزار کام ہوجانے کے بعد''۔(135)

متذکرہ بالا اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ صرف مصنف نے اپنے دور کے واقعات ہی پیش نہیں کیے ہیں بلکہ دور حاضر میں بھی ہمارے معاشرے میں ہری سیٹھ جیسے کافی لوگ موجود ہیں جو غریب،معصوم اور مفلس لوگوں کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ہر حال ان کا یہ افسانہ ہمارے سماج اور معاشرے کی حقیقت نگاری پر مبنی ایک

اچھی مثال ہے۔

امین بنجارا کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ وہ سماجی شعور اور سوجھ بوجھ سے اچھی طرح سے کام لیتے ہیں اور ان کا اسلوب قاری کی دلچسپی کا باعث بن جاتا ہے جس سے قاری مزے مزے سے ان کے افسانوں کا لطف اٹھاتا ہے اور ان کے افسانوں سے قاری یہ سبق حاصل کرتا ہے کہ زندگی ایک کھیل ہے اس کو جس طرح سے چاہے انسان کھیل سکتا ہے۔ انسان اپنے اچھے اور برے اعمال سے اچھی طرح واقف ہے۔ اس کے علاوہ مصنف کی ایک اور خوبی ان کی تخلیقات میں یہ دیکھنے کو ملتی ہے کہ وہ اپنی طرف سے کوئی بھی واضح دلیل یا تقریر پیش نہیں کرتے بلکہ وہ ایک صاف سادہ اور آسان نکات کا استعال کر کے دردمند آواز میں واقعے اور المیے کو بیان کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانے قارئین کو اپنی طرف راغب کر دیتے ہیں۔ صاف طور پر یہ کہا جائے تو امین بنجارا کو زبان و بیان کے معاملے میں قدرت حاصل تھی ۔مگر اس سے بھی زیادہ ان کی تخلیقات میں ایک فنی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے افسانوں میں کردار نگاری سے بڑی ہنر مندی سے کام لیا ہے۔ جس کا اندازہ آپ کو خود ان کے افسانوں کے مطالعے سے لگ جائے گا۔ بقول عرش صہبائی:

> ''جناب امین بنجارا کے افسانوں میں جو بات قاری کو خاص طور سے اپنی طرف کھینچتی ہے وہ ان کی کردار نگاری ہے۔ وہ جب بھی کوئی افسانہ تخلیق کرتے ہیں۔ اپنے آپ کو اس افسانے کا جزو بنا دیتے ہیں اور اس کے کرداروں میں سما جاتے ہیں۔ اس طرح یہ کردار ان کی نظریات زندگی اور اسلوب سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے''۔(136)

امین بنجارا کی کردار نگاری کے حوالے سے واقع ہی یہ بات قابل غور ہے کہ ان کے افسانوں کے کردار کافی حد تک رجائیت کا مادہ رکھتے ہیں۔ اور یہ رجائیت یا امید ان کے اندر کبھی ختم نہیں ہوتی۔ ان کے کردار اخلاقی قدروں کا دامن کبھی بھی اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور اگر کبھی حالات ایسے پیدا ہو جائیں کہ جس سے ان کرداروں کو گمراہ ہونا پڑے تو ان کا ضمیر انہیں ایسا کرنے سے روک لیتا ہے جس سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ وہ تعمیری نظریہ کو کسی بھی حال میں نظر انداز نہیں کرتے ہیں۔ امین بنجارا کو افسانہ نگاری میں خوب دلچسپی تھی اور انھوں نے انسان کی زندگی کو بھی اچھے سے پڑھ لیا تھا۔ ان کا ماننا ہے کہ افسانہ اور زندگی دونوں ایک ہی سکے کے دو پہلو ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے ساتھ چلتے ہیں اور دونوں کا وجود ایک دوسرے کے لیے بے حد ضروری ہے۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ:

> ''میں افسانہ کی تعریف ہمیشہ تین لفظوں میں پیش کرتا ہوں کہ ''افسانہ زندگی ہے'' افسانہ سے

اگر زندگی کو خارج کر دیا جائے تو افسانہ افسانہ نہیں رہتا بلکہ کچھ بھی نہیں رہتا''۔(137)

امین بنجارا نے صرف افسانہ نگاری میں طبع آزمائی نہیں کی تھی بلکہ وہ بیک وقت فکشن نگار، نقاد اور محقق بھی تھے۔ ان کی دیگر غیر مطبوعہ افسانوی مجموعوں خاص طور پر''بندے ماترم''،''ستیہ میو جیتے''اور''توی کے کنارے''وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

جوتیشور پتھک:

1970ء کے بعد اردو کے بڑے کہانی کاروں میں ان کا شمار کیا جاتا ہے۔جموں کے افسانہ نگاروں میں ان کا نام منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ان کے ابتدائی دور کے افسانوں میں سب سے مشہور جن میں''ٹوٹے رشتوں کا روگ''اور ''اپنے گھاؤ کا درد''وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ان افسانوں میں مصنف نے فاشسٹ قوتوں کے خلاف محنت کش طبقے کی جدوجہد اور بغاوت کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔اور ساتھ ہی ساتھ انھوں نے ان افسانوں میں انسان کے داخلی انتشار کا احوال بھی پیش کیا ہے۔اگرچہ جوتیشور پتھک اپنے ابتدائی دور سے لکھتے آرہے تھے۔مگر اردو ادب کی دنیا میں انھیں 1970ء کے بعد ہی مقبولیت حاصل ہوئی۔ان کی ایک مشہور کہانی 1995ء میں''جزیرہ''کے عنوان سے ریاستی کلچرل اکیڈمی کے رسالے شیرازہ کی اشاعت میں شامل کی گئی تھی۔ جسے ریاست کے ادیبوں نے کافی سراہا تھا۔ انھوں نے اردو شعر وادب میں کئی کارنامے انجام دیے تھے ان کے فن نے کئی موڑ لیے لیکن ان کی کہانیاں ہر لحاظ سے اپنی شکستہ و مجروح شخصیت کو یکجا کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہیں۔انھوں نے موجودہ دور کے انسان کی کھوکھلی زندگی اور بے کیف زندگی جیسے موضوعات کو اپنی کہانیوں میں پیش کیا۔وہ انسانی نفسیات کا اچھی طرح مطالعہ کر کے اپنی کہانی میں پیش کرتے ہیں۔ان کی بہت سی کہانیاں ملک کے مختلف رسائل وجرائد میں منظر عام پر آتی رہیں۔ان کی تحریروں میں ایک خاص خوبی یہ بھی ہے کہ ان میں خوردگی کا درد اکثر دیکھنے کو ملتا ہے۔بقول جان محمد آزاد:

> ''آپ نے ہر سنگ میل پر آج کے انسان کی کھوکھلی اور بے کیف زندگی کو موضوع سخن بنایا۔ اس خوردگی کا درد لیے آپ کی تحریریں ملک کے معتبر اور ممتاز رسائل میں شائع ہوتی رہیں''۔(138)

اس کے علاوہ انہوں نے ناول نگاری میں بھی طبع آزمائی کی تھی۔جس کا ذکر ناول کے باب میں کیا جائے گا۔

شیخ خالد کرار:

ان کا اصلی نام شیخ خالد محمود تھا مگر ادبی دنیا میں وہ شیخ خالد کرار کے نام سے مشہور ہوئے۔ان کی ولادت خطہ جموں کے ضلع پونچھ کے ایک دیہاتی علاقہ سرنکوٹ میں 19 ؍دسمبر 1976ء کو ہوئی۔انھیں شاعری کے حوالے سے زیادہ اہمیت حاصل ہوئی تھی۔ان کی شاعری بہت ہی بلند درجہ رکھتی ہے۔

شیخ خالد کرار ریاستی سہ ماہی ''سیاق'' میں مدیر کی حیثیت سے بھی کام کر چکے ہیں۔انھوں نے شاعری کے علاوہ ادب کی دیگر اصناف میں بھی طبع آزمائی کی تھی جس میں افسانہ،صحافت،مضمون نگاری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ان کی ادبی تحریروں کے حوالے سے چھ تصانیف اب تک منظر عام پر آچکی ہیں جن میں ان کا افسانوی مجموعہ ''آخری دن سے پہلے'' کے عنوان سے 2000ء میں منظر عام پر آیا۔اس کے بعد ان کے تین شعری مجموعے شائع ہوئے جس میں پہلا مجموعہ ''آنگن آنگن پت جھڑ'' 2002ء میں شائع ہوا''سوا نیزے پر سورج'' 2007ء میں منظر عام پر آیا اور تیسرا شعری مجموعہ ''ورود'' کے عنوان سے 2011ء میں شائع ہوا۔افسانہ اور شاعری کے علاوہ انھوں نے مضامین بھی لکھے تھے۔اس حوالے سے ان کے مضامین کا مجموعہ ''فکاہیہ مضامین'' کے عنوان سے 2015ء میں شائع ہوا۔شیخ خالد کرار کے افسانوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کے کچھ واقعات کو افسانہ نگاری کے ذریعہ سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔اس کے علاوہ بھی انھوں نے اپنے افسانوں میں کئی موضوعات کو پیش کیا ہے۔اور زیادہ تر ان کے افسانوں میں علامتوں اور استعاروں کا استعمال دیکھا جا سکتا ہے۔اگر چہ ان کا ایک ہی افسانوی مجموعہ منظر عام پر آیا ہے لیکن اس میں انھوں نے اپنے گرد کے ماحول کی بہترین انداز میں عکاسی کی ہے۔ڈاکٹر مشتاق احمد وانی ان کی ادبی زندگی کے بارے میں اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''ان شعری مجموعوں کے علاوہ خالد کرار کے افسانوں کا ایک مجموعہ ''آخری دن سے پہلے'' 1997ء میں شائع ہوا۔وہ اپنے افسانوں میں بیان کی شگفتگی ، علامتوں ، استعاروں اور تشبیہات کے برمحل استعمال ادبی لطافت پیدا کرتے ہیں ان کے افسانے پڑھتے ہوئے ان کے ذاتی درد وکرب کا احساس بھی جھلکتا ہے''۔(139)

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی:

مشتاق احمد وانی ریاست جموں وکشمیر کے ایک اہم قلمکار ہیں۔خطہ جموں میں ان کا نام افسانہ نگاروں کی فہرست

میں شمار کیا جاتا ہے۔ان کی پیدائش ریاست جموں کشمیر کے ضلع ڈوڈہ تحصیل مرمت بہوتہ میں 3/مارچ 1960ء کو ہوئی۔ مشتاق احمد وانی ضلع ڈوڈہ کے ایک پہاڑی علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔مگر اس پہاڑی علاقہ سے بہت سارے اردو دان پیدا ہوئے ہیں جن میں ایک نام ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کا بھی ہے۔

مشتاق احمد وانی تقریباً گزشتہ دو دہائیوں سے اردو ادب کی دنیا میں بڑی محنت اور لگن سے اردو زبان و ادب کو فروغ دینے میں اپنی کوشش جاری رکھے ہوئے ہیں۔اردو ادب کے ساتھ انھیں ابتدا سے ہی رغبت تھی۔یہی وجہ ہے کہ انھیں نہ صرف ریاست جموں وکشمیر میں شہرت حاصل ہوئی بلکہ پورے برصغیر میں آج انھیں ایک اچھے افسانہ نگار اور محقق ونقاد وغیرہ کے نام سے مقبولیت حاصل ہے۔انھیں ادبی تخلیقات کی ایک لگن ہے وہ جب بھی لکھتے ہیں سوچ سمجھ کر لکھتے ہیں وہ اپنی تحریروں میں جذبات واحساسات کی گہرائی تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔وہ اپنے گرد ہونے والے واقعات کی ترجمانی بہترین انداز میں کرتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے سماج کی حقیقت نگاری کو بیان کیا ہے۔انھوں نے کئی موضوعات کو اپنی تحریروں میں جگہ دی ہے۔

مشتاق احمد وانی کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ انھوں نے عصری حالات وواقعات کا بہت ہی گہرائی سے مشاہدہ کیا ہے۔اس طرح سے ان کی تخلیقات میں بہت سارے نئے موضوعات دیکھنے کو ملتے ہیں۔عورتوں کے حقوق کے بارے میں بھی انھوں نے کئی سوالات اٹھائے ہیں۔اس حوالے سے ان کی ایک اچھی کتاب ''اردو ادب میں تانیثیت '' بھی منظر عام پر آچکی ہے۔جس کے بارے میں آگے بات کی جائے گی۔ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کی ابھی تک پندرہ کتابیں منظر عام پر چکی ہیں جس میں انھوں نے متعدد موضوعات کی عکاسی کی ہے۔ان کی تصانیف میں خاص طور پر ''ہزاروں غم''، ''تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران''، ''آئینہ در آئینہ''، ''میٹھا زہر''، ''اعتبار ومعیار''، ''اردو ادب میں تانیثیت''، ''شعور بصیرت''، ''اندر کی باتیں''، ''انہام وتفہیم زبان وادب''، ''قبر میں زندہ آدمی''، ''تناظر وتفکر''، ''کیا حال ہے جاناں''، ''نئی تنقیدی معنویت''، ''زبان وبیان''، ''تنقید فکر وفن''، ''کہکشان خیال'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مشتاق احمد وانی بیک وقت ایک اچھے افسانہ نگار، محقق اور نقاد ہیں۔ابھی تک ان کے افسانوں کے پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔جن میں ''ہزاروں غم''، ''میٹھا زہر''، اندر کی باتیں''، ''قبر میں زندہ آدمی'' اور'' کیا حال ہے جاناں'' قابل تعریف ہیں۔

مشتاق احمد وانی کا پہلا افسانوی مجموعہ ''ہزاروں غم'' 2001ء میں جے کے آفسیٹ پریس دہلی سے منظر عام پر آیا

تھا۔اس مجموعے میں مصنف کے کل 16 افسانے شامل ہیں۔انھوں نے اپنی کہانیوں میں بہت صاف اور سادہ اور عام فہم زبان کا استعمال کیا ہے۔ان کہانیوں میں بہت سارے واقعات کی ہو بہو تصویر کشی دیکھنے کو ملتی ہے جس کو مصنف نے بڑی عمدگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اس مجموعے کی بیشتر کہانیاں روزمرہ زندگی سے جڑے اہم واقعات کی نشاندہی کرتی ہیں۔کہانیوں کی خوبی یہ ہے کہ ان کی ابتدا ایک معمولی واقع کے ساتھ ہوتی ہے اور افسانہ نگار کہانی میں اس طرح سے جان ڈال دیتا ہے کہ قاری کی گرفت آخر تک کہانی میں بنی رہتی ہے۔یہی ایک افسانہ نگار کی قابلیت ہوتی ہے۔ان کہانیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی افسانہ نگاری کے فن سے اچھی طرح واقف ہیں انھیں کہانی بننے کا ہنر اچھی طرح سے آتا ہے۔''اجنبی دودل اجنبی'' ان کی ایک اچھی کہانی ہے اس میں مصنف نے دو اہم کرداروں کی زندگی کے کچھ اہم واقعات کو پیش کیا ہے اس کہانی کے مرکزی کردار فرزانہ اور شہباز ہیں۔دونوں پڑھے لکھے ہیں اور دونوں کی شادی اچانک سے کردی جاتی ہے شہباز ضلع ڈوڈہ کے ایک پہاڑی علاقہ سے تعلق رکھتا ہے اور اس نے اپنی زندگی میں بہت مشکلات اور غریبی دیکھی ہیں۔اس نے بہت ہی محبت سے اپنی پڑھائی مکمل کی تھی جب وہ فرزانہ کو اپنے بارے میں بتاتا ہے تو کہتا ہے۔

> ''مجھے بھلیسہ چھوڑے ہوئے پانچ سال ہوئے ہیں میرا بچپن، میرا لڑکپن وہیں گزرا ہے۔ پہاڑوں کے دامن میں پل کے جوان ہوا ہوں کیا تم یقین کروگی کہ میں نے بھیڑ بکریاں چرائی ہیں اور اپنی ماں کے حکم گوبر سے بھری ٹوکریاں کھیتوں میں پہنچائی ہیں۔میں نے آج تک غربت کے کئی تھپیڑے سہے ہیں بھوکا اور ننگے پاؤں اسکول گیا ہوں۔گلی کوچوں میں کورے کاغذ چن کر ان کی شیرازہ بندی کر کے کاپیاں تیار کی ہیں اور اپنے ہم جماعتوں سے دوستی کر کے سیاہی اور پنسل حاصل کر کے لکھا ہے............اور پورا شہر مجھے آج ڈاکٹر شہباز کے نام سے جانتا ہے''۔(140)

دراصل اس افسانے میں مصنف نے ایک میاں بیوی کی شادی کی پہلی رات کی کہانی کو بڑے خوبصورت، رومانی اور جذباتی انداز میں پیش کیا ہے۔وہ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے شادی سے پہلے اجنبی تھے شہباز بھیلہ سے تعلق رکھتا تھا اور فرزانہ ادھم پور تحصیل رام نگر سے۔پہلے دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اجنبی جیسا سلوک

کرتے ہیں مگر پھر دونوں اپنی اپنی کہانی ایک دوسرے کو بتا کر ایک اچھی زندگی گزارنے لگتے ہیں۔ اس افسانہ میں دو چیزوں کی خاص اہمیت ہے ایک تو یہ ہے کہ مصنف نے پہاڑی علاقوں میں رہنے والے لوگوں اور محنت کش لوگوں کی عکاسی کی ہے۔ دوسرا اس افسانے میں دو، اجنبیوں میں محبت کا انداز دیکھا جاسکتا ہے۔ حقیقت میں شادی کے کیا معنی ہیں، ان سب چیزوں کی نشاندہی اس افسانہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔ ایک جگہ پر مصنف نے بڑے اچھے انداز میں زندگی کی حقیقت کو بیان کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''میں اس بات پہ رورہی ہوں کہ آپ کی باتوں نے پہلے مجھے حیران کر دیا پھر بہت خوش کیا اور آخر پر انتہائی مایوس کیا۔ یقیناً ہم دونوں ماضی میں ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ پھر شادی جیسے مقدس رشتے میں بندھ کر اب ہم دونوں کی قدرت اختیار کر گئے ہیں۔ یعنی ہماری اجنبیت، اپنائیت میں بدل گئی ہے۔ لیکن ایک دن پھر اجنبی بن جائیں گے۔ کیونکہ موت ہمیں ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے جدا کر دے گی۔ گویا ہم پہلے بھی اجنبی تھے اور بعد میں بھی اجنبی بن جائیں گے اور معلوم یہ ہوا کہ یہ دونوں کا ساتھ بہت دیر پا نہیں، یہی احساس مجھے آنسو بہانے پر مجبور کر رہا ہے''۔(141)

''مکّار'' بھی ان کا ایک اچھا افسانہ ہے۔ اس میں انھوں نے دیہاتی زندگی کو پیش کیا ہے۔ اور خاص طور پر مصنف نے ضلع ادھم پور کے ایک علاقہ کرلاہ کی تصویر کشی کی ہے وہاں کے لوگوں کے رہن سہن ان کے کلچر اور تہذیب کے بارے میں ہو بہو تصویر کشی کی ہے۔ اور سب سے خاص بات اس میں انھوں نے یہ پیش کی ہے کہ دیہات میں بسنے والی لڑکیوں کی عزت پر بہت سارے مکّار لوگ اپنے جال میں پھنسا کر ان کی عصمت کے ساتھ کھلواڑ کرتے ہیں۔ چونکہ وہ لڑکیاں اپنی غربت اور لاچاری کی وجہ سے بہت جلد شیطانوں کے جھانسے میں آجاتی ہیں مگر ان میں ایک سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی عزت کو بھی داغ نہیں لگنے دیتی ہیں یہی سب کچھ اس کہانی کے ذریعے مصنف نے پیش کیا ہے۔ اس افسانے میں تاجدین اور عبداللہ ٹھیکیدار کے خاندان کو پیش کیا ہے اور مراد حسین اور جان بی بی کو مرکزی کردار کے طور پر پیش کیا ہے۔ تاجدین ایک بکریاں چرانے والا غریب آدمی تھا۔ اچانک اس کی موت ہو جاتی ہے اور اس کے گھر میں اس کی سب سے چھوٹی بیٹی جان بی بی ایک بیٹا شاکر علی اور مستوراں آیا (تاجدین کی پری) ہیں۔ شاکر علی کی جلد شادی کرادی جاتی ہے اور جان بی بی اب بکریاں چرانے کے لیے اکیلی کرلاہ کے گھنے جنگلوں میں پھرتی رہتی ہے۔ اسی دوران اس کی ملاقات مراد حسین سے ہوتی ہے اور وہ اپنی دسویں کی پڑھائی کر کے بکریاں چرانے اسی جنگل

میں رہا تھا دونوں کی دوستی ہوئی اور دونوں ایک دوسرے کو چاہنے لگے اور شادی کا فیصلہ بھی کرلیا۔ جان بی بی بہت ہی خوبصورت تھی اس نے اپنی عزت پر کبھی داغ نہیں لگنے دیا تھا۔ دونوں خاندان میں جب رشتہ ہوا تو ایک دن پولیس کی بھرتی میں مراد حسین کا آرڈر ہوگیا۔ سب خوش تھے اب مراد حسین اپنی ٹریننگ کے دوران اپنی غریبی اور دیہائی زندگی سے نفرت کرنے لگا دن بدن اس کے من میں امیر آدمی کے خواب آنے لگے۔ ایک دن وہ چھٹی پر اپنے ہونے والے سسرال گیا اور رات کے وقت جان بی بی کو اپنی وراثت سمجھ کر شادی سے پہلے ہی غلط حرکتیں کرنے لگا مگر جان بی بی اتنی پاک تھی کہ اس نے اپنی عزت پر داغ نہیں لگنے دیا اسی وجہ سے مراد حسین شادی کرنے سے انکار کردیا مگر جان بی بی کو اس بات کا فخر تھا کہ اس نے اپنے والد کی لاج رکھ لی جو اس کے والد نے مرتے وقت اسے کہا تھا۔ اقتباس:

> ''پھر ایک دن عبداللہ ٹھیکیدار نے مراد حسین کا لکھا ہوا خط ایک آدمی کے ہاتھ سے جان بی بی کی ماں کے لیے بھیج دیا۔ شاکر علی نے مراد حسین کا لکھا ہوا خط پڑھا تو جان بی بی کی ماں پر غشی طاری ہوگئی۔ شاکر علی بھی رو پڑا۔ لیکن جان بی بی بالکل نہیں روتی تھی کیونکہ اسے وہ رات یاد آرہی تھی جس رات مراد حسین اس کی عزت وعصمت لوٹنے اس کے پاس آیا تھا اور وہ ایک خونخوار شیرنی کی طرح اس پر بپھر پڑی تھی۔ وہ اپنی عصمت بچانے اور مرحوم والد تاجدین کی لاج رکھنے میں کامیاب ہوئی تھی''۔(142)

اس افسانہ کے فن پر نظر ڈالیں تو کردار نگاری کے حوالے سے مصنف نے کہیں کہیں پر طویل مکالمے استعمال کیے ہیں۔ مگر اس افسانے میں انھوں نے تصویر کشی پر بہت زیادہ زور دیا ہے جو اس افسانے کی ایک اہم خوبی ہے۔

''ہزاروں غم'' مشتاق احمد وانی کا اولین مجموعہ ہے جسے اردو دنیا میں کافی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ اس مجموعے میں انھوں نے جس طرح کے موضوعات کو جگہ دی ہے قابل تعریف ہے۔

''بھولی بھولی سی صورت'' بھی ان کا ایک اچھا افسانہ ہے۔ اس افسانے میں مصنف نے مریم کو مرکزی کردار کے طور پر پیش کیا ہے۔ مصنف نے اس میں شعور کی روح کا استعمال کیا ہے۔ وہ اپنے کالج کے دنوں کی کہانی کو بیان کیا ہے۔ یہ ایک رومانی کہانی ہے جس کو مصنف نے بڑے اچھے انداز میں ادا کیا ہے اور مریم جو کہ ایک امیر خاندان کی بیٹی تھی اور ادھم پور کالج میں پڑھتی تھی وہیں پر اسے ایک غریب خاندان کے لڑکے سے محبت ہو جاتی ہے۔ وہ لڑکا اپنی غریبی کی وجہ سے محبت کا اظہار نہیں کر پاتا ہے اور کالج کے آخری وقت تک دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ملتے ہیں مگر لڑکا اپنی

محبت کا اظہار کرنے سے ڈرتا ہے۔ عادلہ مریم جبیں کی ایک سہیلی ہے اور وہ اپنا سارحال عادلہ کو بتاتی ہے۔لڑکا غریب خاندان سے تعلق رکھتا تھا مگر پڑھائی میں بہت تیز تھا اور بہت ہی شریف اور سلجھا ہوا تھا اس کی عادتیں دیکھ کر مریم جبیں کو محبت ہوگئی تھی۔مریم نے ایک دن اس سے اس کی کاپی مانگی تھی کچھ نوٹس بنانے کے لیے اور جب مریم نے اسے کاپی واپس کی تو ساتھ ہی ساتھ اپنی محبتوں کا اظہار بھی کاپی کے ایک صفحہ پر کر دیا تھا۔ملاحظہ ہو اقتباس:

''مریم کے چلے جانے کے بعد میں نے کاپی کھولی اور اس کی ورق گردانی شروع کر دی تو اچانک میں نے اس کے ایک صفحے پر نرگس کے پھول کو ایک دھاگے سے ٹنگا ہوا پایا۔اس کے نیچے یہ شعر لکھا تھا۔

کتنے چہروں نے مجھے دعوتِ جلوہ بخشی
کوئی صورت نہ ملی آپ کی صورت کے سوا

محبت کے ساتھ''۔(143)

اس طرح کے دیگر کئی افسانے مصنف نے اس مجموعے میں قلمبند کیے ہیں۔ڈاکٹر مشتاق احمد وانی کا تعلق چونکہ جموں کے ایک پہاڑی علاقہ ضلع ڈوڈہ سے تھا اس لیے ان پہاڑی علاقوں سے اور ان علاقوں میں بسنے والوں اور ان کی تہذیب وثقافت کی وہ اچھی طرح واقف تھے۔انہی سب چیزوں سے متاثر ہو کر انھوں نے اپنی کئی کہانیوں میں اپنے گرد کے ماحول کو بیان کیا ہے۔ان کی تحریروں میں پہاڑی علاقوں کی زندگی، چھوٹے چھوٹے قصبوں کی رکی رکی سی زندگی، مزدوروں اور کسانوں کے حالات ان کی روزمرہ زندگی وغیرہ جیسی چیزوں کو خاص طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے عورتوں کے بنیادی حقوق، انسان کی ذہنی ونفسیاتی الجھنوں کی تصویر کشی، غریب لوگوں کے درد وکرب جیسے موضوعات کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ان کے افسانوں میں کئی جگہ پر ان کی اپنی ذاتی زندگی دکھائی دیتی ہے۔ خاص طور پر انھوں نے افسانہ ''اجنبی دو دل اجنبی'' میں جن حالات کو پیش کیا ہے اس میں بہت سارے واقعات ان کی ذاتی زندگی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

مجموعہ ''ہزاروں غم'' کے بعد ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''میٹھا زہر'' کے عنوان سے 2008ء میں ایجوکیشنل ہاؤس دہلی سے منظر عام پر آیا۔اس مجموعے کو بھی کافی شہرت حاصل ہوئی ہے۔اس مجموعے میں کل 12 افسانے شامل ہیں۔ اردو کے بڑے بڑے قلمکاروں نے ان کے اس مجموعے کی کھل کر تعریف کی ہے ان میں پروفیسر گوپی چند

نارنگ، پروفیسر ظہور الدین، وہاب اشرفی، حامدی کاشمیری، قمر رئیس، جوگندر پال، عتیق اللہ، ارتضٰی کریم، علی احمد فاطمی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ بقول پروفیسر ظہور الدین:

''افسانے کے پلاٹ میں غیر ضروری طوالت یا غیر ضروری واقعات کی موجودگی اس کے لئے سم قاتل ثابت ہوتی ہے۔اسی طرح کردار نگاری کے سلسلے میں ان اعمال کا انتخاب ضروری ہوتا ہے''(144)

مشتاق احمد وانی کے افسانوں کا مطالعہ کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے وطن، کلچر، رسم ورواج سے گہری واقفیت اور لگاؤ رکھتے ہیں۔اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں مذہبی واخلاقی رنگ بھی دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔دراصل وہ معاشرے کو ایک الگ راہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں جس کی وجہ سے ہمارا معاشرہ، سماجی برائیوں سے اٹھ کر ایک سمت کی راہ پر گامزن ہو۔اس حوالے سے ان کے افسانوں میں خاص طور پر میٹھا زہر، کوفت، مجبوری، شرافت وغیرہ بہترین مثالیں ہیں۔افسانہ ''میٹھا زہر'' میں دو بچپن کے دوستوں رامیشور اور بلبیر کی کہانی کو پیش کیا ہے اور رامیشور ایک سیدھا سادھا انسان تھا مگر بلبیر کے کہنے پر وہ غلط راستے پر لگ جاتا ہے۔رامیشور کو رات بھر اپسراؤں کے گندے گندے خواب آتے تھے جس کی وجہ سے وہ دن رات کمزور ہوتا جا رہا تھا اور پھر بلبیر اپنے ٹرک میں اسے کلکتہ کے طوائفوں کے اڈے پر لے گیا جہاں رامیشور چاروں طرف کا نظارہ دیکھ کر خوشی سے جھومنے لگا کیونکہ اب تک وہ اپنے بڑے شہر میں پھیل گیا تھا۔مگر اس بات کی اسے کیا خبر تھی کہ وہ اس شہر میں ایڈز کی بیماری کا شکار ہو جائے گا۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''جب رامیشور کے ٹیسٹ کی رپورٹ ڈاکٹر مزمل کے پاس پائی تو رپورٹ پڑھتے ہی ڈاکٹر مزمل کو دھچکا سا لگا۔انھوں نے ایک گہری سانس لی اور نہ معلوم کن خیالوں میں چند لمحوں کے لیے گم ہو گئے، پھر وہ رامیشور کے بھائی سکھ دیو کو اسپتال سے باہر لے گئے اور اسے کہنے لگے، دیکھئے آپ کا بھائی رامیشور ایڈز کا مریض ہے۔نہ معلوم اس نے کیا غلط راستہ اختیار کیا ہے۔جس کی وجہ سے اس نے اپنی زندگی کو ہمیشہ کے لیے عذاب بنا دیا ہے۔ایڈز کا پوری دنیا میں علاج نہیں ہے''۔(145)

دراصل میٹھا زہر مصنف کا ایک ایسا افسانہ ہے جس کے ذریعے سے افسانہ نگار نے سماج میں اچھے اور برے کی تمیز سکھائی ہے اور سماج میں پھیلنے والی بیماریوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور ایڈز اس میں ایک سب سے خطرناک بیماری

سے جولا اعلاج ہے۔

افسانہ ''جنم بھومی کے آنسو'' بچپن اور جنم بھومی میں ڈوبی ہوئی یادوں کی حقیقت بیانی ہے۔اس افسانہ میں مصنف نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ انسان چاہے جتنا ہی دور کیوں نہ چلا جائے پر جنم بھومی اس کے دماغ میں ہمیشہ گھر کر جاتی ہے جسے وہ کبھی بھول نہیں پاتا ہے۔ کیونکہ بچپن کی یادیں اور وہاں کی مٹی میں جتنا سکون ملتا ہے ایسا کہیں اور نہیں مل سکتا۔اس لیے بچپن کے گزرے چند لمحات کو انسان چاہ کر بھی بھلا نہیں سکتا۔

اس افسانے کا مطالعہ کرنے سے یہ بات بخوبی ظاہر ہوتی ہے کہ مشتاق احمد وانی صاحب کی شخصیت خود اس کہانی میں کہیں نہ کہیں سامنے آجاتی ہے۔ جسے انھوں نے ایک کہانی کے ذریعے سے بیان کیا ہے۔اس افسانہ میں مصنف نے خاص طور پر منظر نگاری اور جذبات نگاری کو پیش کیا ہے۔وانی صاحب نے اس کہانی میں حقیقت نگاری سے کام لیا ہے چونکہ جب انسان اپنی جنم بھومی سے دور جاتا ہے تو اس پر اس وقت کیسی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ واقع ہی آنکھوں میں آنسوں آجاتے ہیں ملاحظہ ہو افسانے کا ایک اقتباس:

> ''سارے براتی چہروں پر افسردگی سی لیے بس میں سوار ہوگئے۔دلہن ہلکی ہلکی سسکیاں لیتی ہوئی دلہے کے ساتھ کار میں بیٹھ گئی اوہ روتے ہوئے مڑ مڑ کر اپنی جنم بھومی کی طرف دیکھ رہا تھا۔اس کے سمندر تخیل پر اس کا بچپن اور لڑکپن تازیانے لگا رہا تھا۔اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ واپس دوڑ کر جائے اور اپنی جنم بھومی کے ہر شجر وحجر کو چومے انہیں گلے لگا کر جی بھر کر روئے لیکن اب وہ کار میں بیٹھ چکا تھا۔ڈرائیور نے کار کی رفتار تیز کردی تھی پھر اس کی جنم بھومی آہستہ آہستہ اس کی نظروں سے اوجھل ہونے لگی تھی''۔(146)

''دوہری مار'' افسانہ ریاست جموں وکشمیر کے پس منظر پر مبنی ہے اس میں مصنف نے ایک ایسے کردار کو پیش کیا ہے کہ اسے نہ جانے اور کتنے بےقصور اور معصوم افراد جو اپنی معصومیت اور ایمانداری کی وجہ سے فوجیوں اور دہشت گردوں کے ظلم وستم سہتے ہیں۔

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ مشتاق احمد وانی کے افسانوں میں سماجی رشتوں کی قدریں، سماج میں ہونے والے ظلم وستم، ناانصافیاں، مہنگائی، بھوک مری، بے ایمانی، لاچاری، چوری، ڈکیتی، عورت پر ظلم وجبر، مرد احساس معاشرہ وغیرہ جیسے موضوعات کو دیکھا جاسکتا ہے۔ جسے انھوں نے بڑی عمدہ طریقے کے ساتھ عوام تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

2015ء میں مشتاق احمد وانی کا تیسرا افسانوی مجموعہ ''اندر کی باتیں'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔اس مجموعہ میں ان کے کل بارہ افسانے شامل ہیں۔افسانہ ''اندر کی باتیں'' میں افسانہ نگار نے یونیورسٹیوں میں ہونے والی رشوت خوری کو موضوع بنایا ہے۔اور یونیورسٹیوں میں کی جانے والی کرپشن اور گرافٹنگ کے خلاف آواز اٹھانے کی بات پر زور دیا ہے اور ایسے کاموں کو جڑ سے ختم کرنے کی آواز کو مصنف نے افسانہ کے ذریعے سے بلند کیا۔حالانکہ اس بات پر غور کیا جائے کہ ہمارے ملک میں کئی اسے ایمانداری اور قابل پروفیسروں کو دیکھا جا سکتا ہے لیکن باوجود ان کے رشوت خور، اور بے ایمان لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے۔درسگاہیں اور دارالعلوم بھی ہمارے سماج کا ایک اہم حصہ ہیں،مگر آج جن تعلیمی اداروں کو پاک سمجھا جاتا ہے انہی اداروں میں چند لوگ اداروں کی حیثیت کو کرپشن کے اڈے بنا دیتے ہیں۔اساتذہ کا ہمارے معاشرے میں ایک اہم کردار ہے جس کی کوششوں سے طالب علموں کا مستقبل روشن ہوتا ہے۔مگر آج ان ہی دانش گاہوں میں رشوت خوری سے طالب علموں اور ریسرچ اسکالروں کے ساتھ دھوکہ کیا جاتا ہے یہی سب اس افسانہ میں بھی مصنف نے بتانے کی کوشش کی ہے۔

افسانہ نگار نے اس افسانہ میں کمل کانت کی درد بھری کہانی کو بیان کیا ہے جو اسسٹنٹ پروفیسر کے لیے دارالعلوم کے شعبہ تاریخ میں آسامی کے لیے فارم بھرتا ہے،مگر اس کے ساتھ بری طرح سے بدسلوکی کی جاتی ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''یا ایک اور سانحہ آپ کی ذات سے منسوب کرتا ہوں،مثال کے طور پر آپ جون یا جولائی کے مہینے میں ایک تپتے ہوئے ریگستان سے تن تنہا گزر رہے ہوں اور پیاس کی شدت سے آپ کی زبان منہ سے باہر لٹک رہی ہو کہ اچانک ایک شخص ہنستا مسکراتا آپ کو نظر آجائے اور وہ آپ کو یہ یقین دلائے کہ میں آپ کی رہبری کروں گا بس تھوڑی دور آگے میرے ساتھ چلیں وہاں پانی سے بریز ایک کنواں ہے۔ہم دونوں وہاں پانی پئیں گے۔ظاہر ہے آپ کی آدھی پیاس اس شخص کی باتیں سنتے ہی بجھ جائے گی،لیکن جب آپ اس کنوئیں پر پہنچتے ہیں تو کنواں بالکل خشک ہے اور کنوئیں میں نیچے جھانکتے ہی وہ شخص آپ کو دھکا دے کر کنوئیں میں گرا دیتا ہے۔رانا صاحب! مجھے بتائیے اس وقت آپ کے دل پہ کیا بیتے گی! بس میرے ساتھ بھی کچھ اسی طرح کا سلوک کیا گیا ہے میرے بھائی!''۔(147)

مصنف نے اس افسانہ میں رشوت خور لینے والوں کی دھجیاں اڑا دی ہیں کہ کس طرح سے ماہرین اور ایکسپرٹ کے نام پر بدعنوانیوں میں ملے ہوئے لوگ انٹریو بورڈ میں اکٹھا ہوئے ہیں او رشریف اور ایماندار امیدواروں سے رشوت کھاتے ہیں۔

اگرچہ مشتاق احمد وانی صاحب نے اس افسانہ میں جگ بیتی کو بیان کیا ہے لیکن کہیں نہ کہیں انھوں نے یہ رشوت خوری کو ننگا کر دیا ہے۔اور یہ بات حقیقی ہے کہ چاہے وانی صاحب نے اس واقعہ کو کہانی کے طور پر پیش کیا ہے لیکن دور حاضر میں یہ سب عام بات معلوم ہوتی ہے کہ جہاں ایک پروفیسر دارالعلوم میں درس وتدریس کا کام انجام دیتا ہے وہاں ایسے اداروں میں کرپشن ایک دھبہ ہے جو آنے والی نسلوں کو تباہ و برباد کر سکتا ہے۔یہی سب مصنف نے بھی اس افسانے میں بتانے کی کوشش کی ہے۔

''چھپا سانپ'' بھی مشتاق احمد وانی کے بہترین افسانوں میں سے ایک ہے۔اس افسانے میں انھوں نے سماج میں پنپنے والی ایک جنسی بیماری کو افسانہ کا موضوع بنایا ہے۔افسانہ نگار کا کمال یہ ہے کہ کہانی کو انھوں نے اس انداز میں بیان کیا ہے جیسے کوئی فلم دکھا رہا ہو۔کہانی میں مشتاق احمد وانی نے قارئین کا بہت خیال رکھا ہے کہ جس کی وجہ سے کہانی ذہن میں جلد اثر کر جاتی ہے۔

اس میں مشتاق احمد وانی نے ایک پنڈت رتن شاستری کے کالے کارناموں کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے جو جنسی ہوس کی آگ میں اتنا آگے بڑھ چکا ہے، کہ اب وہ اپنے ہی گھر میں اپنے ہی بیٹے کی بیوی میناکشی پر غلط نظریں جمائے ہوئے ہے۔اور ایک دن وہ اپنی بہو کے ساتھ زور زبردستی سے زنا کر بیٹھتا ہے اور بہو سماج کے ڈر سے اپنی عزت کو بچانے کے لیے اندر ہی اندر کمزور پڑ جاتی ہے اور اس سنگین جرم پر پردہ ڈال دیتی ہے۔پنڈت رتن شاستری اپنی بہو کی خاموشی کا پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔اب اس کے ذہن میں ہر وقت سانپ نما شیطان کھل کر سامنے آنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔بہو ہر وقت پریشان رہنے لگتی ہے وہ اس گھنونی حرکت کو کسی کے ساتھ کھل کر بیان بھی نہیں کر سکتی اور نہ ہی اپنے سسر کے اس وحشی پن کو قبول کر سکتی تھی۔

جب پنڈت رتن شاستری کی غلط حرکتیں حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہیں تو مناکشی اب اس پردے کو فاش کرنے کی ٹھان لیتی ہے۔مناکشی بہت ہی پاکیزہ صاف اور سمجھدار لڑکی تھی۔ابھی اس کی عمر بھی بہت کم تھی وہ اپنی تین سالہ بچی کے ساتھ بہت ہنسی خوشی سے رہتی تھی مگر اس کے سسر کی وجہ سے مناکشی اپنی زندگی کا خاتمہ کرنا چاہتی تھی اسے اب جینے کی خوشی

نہیں رہی تھی وہ اندر ہی اندر دن بدن مرتی جارہی تھی۔ مناکشی ایک دن پنڈت رتن شاستری کے کالے کارناموں کو سب کے سامنے لاتی ہے اس کی گھناونی حرکتوں کو سب کے سامنے ننگا کر دیتی ہے مگر خود بھی خودکشی کر لیتی ہے۔ خودکشی کے بعد مناکشی کے پاس سے ایک خط ملتا ہے جس میں پنڈت رتن شاستری کے اس سنگین جرم کا پتہ چلتا ہے۔

مشتاق احمد وانی نے پنڈت رتن شاستری اور مناکشی کی کہانی سے یہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہمارے سماج میں ایسے نہ جانے کتنے لوگ ہیں جو اپنے ہی گھر کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں اور اپنی ہی بہو بیٹیوں پر غلط نظریں ڈالتے ہیں۔ لیکن اس افسانے میں عورت کا کردار ایک کمزور کردار نظر آتا ہے چونکہ خودکشی کسی بھی چیز کا حل نہیں ہوسکتا ہے بجائے اس کے افسانہ نگار نے عورت کے کردار کو اگر طاقتور یا کسی دوسرے زمرے میں پیش کیا ہوتا تو شاید زیادہ بہتر رہتا۔ بہرحال افسانہ فنی خوبیوں میں بھرپور نظر آتا ہے۔

''سرگوشی'' افسانہ میں مشتاق احمد وانی نے سماج میں پنپنے والی ایک برائی کو موضوع بنایا ہے جس سے ہنستے کھیلتے گھر برباد ہو جاتے ہیں۔ سرگوشی یعنی پیٹھ پیچھے کسی کی برائی کرنا۔ ہمارے بزرگوں میں ایک وہ زمانہ تھا جب کہ لوگ ایک دوسرے کی حمایت اور دکھ درد میں ساتھ دیتے تھے اور سماج میں آپسی بھائی چارہ بنا کر زندگی بسر کرتے تھے مگر آج وہ زمانہ ہے کہ جہاں لوگ ہنستے کھیلتے گھروں کو اجاڑنے کا کام کرتے ہیں اس افسانہ میں بھی مصنف نے کچھ اسی طرح کے منظر کو پیش کیا ہے۔

دراصل اس افسانے میں دو کردار خوشحال اور گوپال ہیں جو دونوں اپنے بچپن کے دوست تھے اور دونوں نہایت ہی شرارتی، بدمعاش، کام چور تھے۔ دونوں محلے عجیب عجیب کام کرتے تھے۔ کبھی کتوں کو لڑاتے تھے اور کبھی محلے میں مرغوں کو پکڑ پکڑ کر لڑاتے تھے۔ اس کام میں انھیں بہت مزا آتا تھا۔ لیکن ایک دن وہ اپنی حد کو پار کر دیتے ہیں اور دو محبت کرنے والے جوڑے کو اپنی سرگوشی سے ان کے راستے میں پھوٹ ڈال دیتے ہیں اور کچھ ہی دیر میں وہ ہنستے کھیلتے محبت کرنے والے دو انسان کو باتوں باتوں میں لڑنا شروع ہو جاتے ہیں۔ اور دونوں کی لڑائی اتنی حد تک بڑھ جاتی ہے کہ اب دونوں کے دل میں محبت کی جگہ نفرت لے لیتی ہے۔

مشتاق احمد وانی کا یہ مختصر سا افسانہ ہے جس میں انھوں نے سماج میں پلنے والے گوپال اور خوشحال جیسے لوگوں کے کارناموں کو سامنے لایا ہے۔ اس میں انھوں نے منظر نگاری کو بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔

''باہر اور اندر کا منظر'' مشتاق احمد وانی کا ایک ایسا افسانہ ہے جس میں انھوں نے سوچھتا پر طنز کسا ہے۔ اس میں

انھوں نے یہ بات سامنے لانے کی کوشش کی ہے کہ اندر کا منظر کچھ اور ہوتا ہے اور باہر کا کچھ اور کیوں کہ جو لوگ دکھاوے کے لیے کام کرتے ہیں اس کی بنیاد زیادہ مضبوط نہیں ہوتی ہے مگر جو لوگ بنا کچھ دکھائے کام کرتے ہیں اس کام میں بہت طاقت اور عزت ہوتی ہے۔ اسی طرح سے مصنف نے بھی اشاروں اور کنایوں میں بہت ساری باتوں کا منظر اس افسانے میں دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اس کہانی میں تین اہم کردار ہیں جن میں سیوناتھ، احسان الحق اور رادھے شام۔ ان تینوں کے گرد پوری کہانی کو تیار کیا گیا ہے۔

سیوناتھ ایک دکان دار ہے جو اپنی مٹھائی کی دکان کے حوالے سے کافی مشہور ہے کہ اس کی دکان میں اصلی گھی میں مٹھائی بنائی جاتی ہے اس وجہ سے کئی لوگ وہاں سے مٹھائیاں خریدنا پسند کرتے تھے۔ مگر اچانک سے ایک دن احسان الحق اور اس کا جگری دوست رادھے شام اس دکان میں پہنچ جاتے ہیں اسی دوران دکان کے اندر کا دروازہ کھل جاتا ہے اور دنوں دوستوں کی نظر اندر تک جاتی ہے اور انھیں دکان کے اندر کی سچائی دکھائی دے جاتی ہے کہ جس دکان میں لوگ اتنے بھروسے سے مٹھایان خریدتے ہیں اس دکان میں لوگوں کے ساتھ دھوکا ہوتا ہے۔ دراصل سیوناتھ اصلی گھی کے نام پر روغن سے مٹھائیاں تیار کرتا ہے اور اپنے مفاد کے لیے لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک دیتا ہے کہ یہ مٹھائیاں اصلی گھی کی ہیں۔ اور دکان کے اندر صفائی کا ذرا بھی دھیان نہیں رکھا جاتا ہے اس وجہ سے دونوں دوست وہاں سے ناراض ہوکر واپس چلے جاتے ہیں۔

اس افسانے میں جیسا کہ راقم الحروف نے متذکرہ بالا ذکر کیا ہے کہ مشتاق احمد وانی اس افسانے میں ایک طرح سے لوگوں کی سچائی کو سامنے لانے کی کوشش کرتے ہیں اور دیکھا جائے تو یہ بھی ایک کرپشن کا ہی مسئلہ ہے جس کے خلاف آواز بلند کی جانی چاہیے۔

افسانہ ''چہرہ چھپائے لوگ'' میں انھوں نے کالج اور یونیورسٹی وغیرہ میں پڑھنے والے طالب علموں کی اخلاقی تعلیم کو موضوع بنایا ہے۔ جس میں انھوں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ دور حاضر میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبا و طالبات گھر سے پڑھائی کے لیے آتے ہیں مگر وہ اپنی اخلاقی تعلیم اور ادب و آداب کو بھول کر عیاشی کرنے لگتے ہیں۔ وہ اس عیاشی اور بے غیرتی میں اتنا رنگ جاتے ہیں کہ اپنے والدین کی عزت کا بھی خیال نہیں رکھتے ہیں اور بہت سارے بالغ لڑکے اور لڑکیاں موٹر سائیکل پر شہر سے دور اپنے اپنے چہرے چھپائے رنگ رلیاں مناتے نظر آتے ہیں۔ اور لوگوں کے ڈر سے اپنے منہ کو ڈھانپ لیتے ہیں تا کہ انھیں کوئی پہچان نہ پائے۔ یہ سب اس افسانے میں مشتاق احمد وانی

صاحب نے دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کچھ تعلیم یافتہ نوجوان لڑکے اورلڑکیاں غلط راستوں پر اپنے والدین کے عزت کو خراب کرتے ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ اپنے مستقبل کو بھی برباد کردیتے ہیں۔اور سماج میں بھی ان حرکتوں سے وہ ایک دھبہ سا بن جاتے ہیں۔

مشتاق احمد وانی کے اس افسانوی مجموعے میں دواور مختصر افسانے ہیں ’’بابا کو کچھ ہوگیا‘‘ اور ’’ایک اہم سوال‘‘ قابل ذکر ہیں۔’’ایک اہم سوال‘‘ میں مصنف نے ایسے کردار کو پیش کیا ہے جو اپنے اونچے عہدے سے سبکدوش ہو چکا ہے اور اب رشوت لینے اور دینے اور ہیرا پھیری میں کافی مشہور ہے۔ان ہی تمام کارناموں کو اس افسانہ کا موضوع بنایا گیا ہے اوراسی طرح سے’’بابا کو کچھ ہوگیا ہے‘‘ میں ایک فردوس احمد کی کہانی کو موضوع بنایا گیا ہے۔فردوس احمد جو ایک سرکاری ہائیر سکنڈری اسکول میں مدرس کی حیثیت سے کام کرتا ہے وہ اپنے پیشے کو ایک عبادت کی طرح دیکھتا ہے۔

مشتاق احمد وانی کا چوتھا افسانوی مجموعہ ’’قبر میں زندہ آدمی‘‘ کے عنوان سے 2019ء میں منظر عام پر آیا۔ دراصل اکیسویں صدی میں مادہ پرستی کا دارومدار اس حد تک آتے بڑھ چکا ہے کہ روزمرہ کے معاملات کو بھی غلط نظریے سے دیکھنے کے بجائے نفع اور نقصان کی بنیاد پر دیکھا جانے لگا جس کی وجہ سے اس کے غلط اثرات سامنے آنے لگے جن میں بدعنوانی، دہشت گردی، مذہبی لڑائی، جنسی معاملات یعنی عورتوں اور نابالغ لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ، فسادات وغیرہ جیسی چیزیں دیکھنے کو ملتی ہیں ان ہی موضوعات کو مشتاق احمد وانی نے اپنے افسانوں میں ڈھالنے کی بہترین کوشش کی ہے۔جس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔ان کا افسانہ’’قبر میں زندہ آدمی‘‘ بہت ہی اچھا افسانہ ہے جس میں انھوں نے ایک ایسے شخص کو پیش کیا ہے جو چند پیسوں میں اپنے آپ کو بہت بڑا سمجھنے لگتا ہے اور چند پیسوں میں عیاشی کرنے لگتا ہے۔اس افسانے میں تین اہم کردار ہیں۔ یارخان جو کہ مرکزی کردار ہے اور اس کی بیوی حسینہ بیگم اور رجنی دوضمنی کرادار ہیں۔

یارخان قومی شاہراہ پر ٹنل تعمیر کرنے والی ایک آسٹریلین کمپنی کے ساتھ اے کلاس کا ٹھیکیدار تھا۔ پیسہ اتنا کما لیا تھا کہ اب بس وہ عیش ہی عیش کرنا چاہتا تھا اس کی عمر لگ بھگ ساٹھ کے قریب تھی مگر پیسوں کے لالچ میں آکر وہ اپنے آپ کو جوان سمجھتا تھا۔اسی چکر میں رجنی نام کی کالج میں پڑھنے والی لڑکی کو اپنی دوسری بیوی بنانا چاہتا تھا۔مگر اچانک ایک دن وہ بیوی بچوں کے ساتھ شادی میں گیا ہوا تھا کہ اچانک اسے بیت الخلا میں جانا پڑا اور وہی پر وہ دروازہ لاک ہونے کی وجہ سے دو گھنٹے تک اندر رہا اس دوران اس نے بہت لوگوں کو آوازیں لگائیں اور فون بھی کیا مگر کوئی آنہ سکا ان دو

گھنٹوں کے درمیان وہ اپنے آپ کو زندہ قبر میں محسوس کرنے لگا اور اپنے خدا کو یاد کرنے لگا۔ یہاں اس کا سارا گھمنڈ ٹوٹ گیا۔اس کے بعد وہ صحیح راستے پر چلنے لگا اور رجنی سے فون پر بات بند کرکے اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ عیش و آرام کی زندگی گزارنے لگا۔ ملاحظہ ہو اقتباس:

''میں جیتے جی قبر میں پہنچ گیا تھا۔اوپر والے کی مہربانی کہ زندہ ہوں، دنیا والوں! زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، کب اوپر والے کا بلاوا آئے۔اس لیے سنبھل جاؤ۔ اچھے برے کا خیال رکھو'' .... یارخان اب وہ پہلے جیسے یارخان نہیں رہے تھے ہر نیک کام میں پہل کرنا اب انھوں نے اپنا شعار بنالیا تھا۔ان کی زندگی دینی رنگ میں رنگ چکی تھی۔تمام نیکیاں انھوں نے اپنے دامن حیات میں سمیٹ لی تھیں''۔(148)

مشتاق احمد وانی کے افسانوں کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات ضرور معلوم ہو جاتی ہے کہ ان کے اکثر افسانوں میں ان کی ذاتی زندگی کی محرومیوں کو کئی جگہوں پر دیکھا جاسکتا ہے۔ان کا دامن بہت وسیع تھا،اس معاشرے کی بھرپور تصویر کشی ان کے افسانوں میں دیکھی جاسکتی ہے۔ پھر چاہے وہ ندی نالے، بلند و بالا پہاڑ ہوں، بل کھاتی ندیاں ہوں، یا پھر گنگناتے صاف وشفاف چشموں کا نظارہ ہو،غرض انھوں نے اپنے بچپن کی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم، گاؤں کی زندگی سے لے کر شہر کی زندگی کا سفر اور تعلیم کے بعد روزگار کی تلاش ان تمام باتوں کا ذکر کہیں نہ کہیں ان کے افسانوں میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔''معاوضہ'' افسانہ میں انھوں نے اپنی متذکرہ بالا باتوں کا اظہار کیا ہے۔مثال کے طور پر افسانہ کا ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

''پروفیسر دھرم چند کے چہرے پہ افسردگی کے آثار نمودار ہوئے پھر کچھ توقف کے بعد کہنے لگے''کرم دین یار، مجھے ایک بات کا بہت دکھ ہے کہ تو اردو کا پروفیسر نہیں بن پایا۔ حیرت تو یہ ہے کہ دو یونیورسٹیاں تجھ پہ ڈاکٹریٹ کی ڈگری ایوارڈ کرواچکی ہے اور تین یونیورسٹیوں میں تجھ پہ ڈاکٹریٹ کا کام ہو رہا ہے۔ بلکہ میں تو خود اپنے ہندی وبھاگ میں''کرم دین کی کہانیوں میں ناری واد'' کے موضوع پر ریسرچ کروا رہا ہوں۔ ڈیڑھ درجن سے زیادہ معیاری کتابوں کے قلمکار، بہت سارے پرسکار، بہت سی ڈگریاں اور اتنا نام و کام ہونے کے باوجود ابھی تک میرے دوست تو اردو کا پروفیسر نہیں بن پایا۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا

ہے کہ اسے مقدر کہوں یا ظلم؟'' ۔(149)

دراصل اس افسانے میں مشتاق احمد وانی نے دو کرداروں کو مرکزی کرداروں کے طور پر پیش کیا ہے جس میں ایک کریم دین ہے اور دوسرا ہندی کے پروفیسر دھرم چند۔ دونوں گہرے دوست تھے۔ دھرم چند کو پروفیسر بنے عرصہ ہو چکا تھا مگر کریم دین کے ساتھ ناانصافی ہوئی تھی اتنی قابلیت کے باوجود اسے پروفیسر کے عہدے پر نہیں لیا گیا تھا۔ اس کہانی میں انھوں نے کہیں نہ کہیں آپ بیتی کو پیش کیا ہے۔ جہاں انھوں نے اپنی ذاتی زندگی میں ملازمت کے دوران اسی طرح کی ٹھوکریں کھایں تھیں۔ اس بات کا اظہار جموں وکشمیر کے مشہور ومعروف ادیب پروفیسر قدوس جاوید نے بھی کیا ہے جس میں وہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''اردو میں ایم اے، بی ایڈ، پی ایچ ڈی، نیٹ اور ڈی لیٹ کیا۔ مطالعہ وسیع تھا اور ذہن زرخیزہ کم عمری سے ہی افسانے اور تحقیقی وتنقیدی مضامین لکھنے لگے تھے۔ ادب کے حوالے سے کام بھی اور نام بھی۔ لیکن اس کے باوجود تنگ نظر پروفیسروں نے مشتاق احمد وانی کو کسی کالج یا یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر نہیں دیا۔ جب کہ ایسے ایسے نااہلوں کو پروفیسر بنایا گیا جو صلاحیت کے حوالے سے مشتاق احمد وانی کے پاؤں کی دھول کے برابر بھی نہ تھے۔ دراصل کئی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پروفیسر کے لیے صلاحیت کے بجائے کچھ اور باتوں کو اہمیت دی جانے لگی ہے'' ۔(150)

مشتاق احمد وانی کے افسانوں میں دینی اور اخلاقی موضوعات کے علاوہ دیگر کئی موضوعات دیکھے جاسکتے ہیں۔ عصر حاضر میں پیش آنے والے کئی سنگین مسائل کو انھوں نے اپنے افسانوں میں ڈھالا ہے جس میں ایک خاص موضوع طبقہ نسواں کو پیش آنے والے چیلنجوں کے حوالے سے ان کا ایک بہترین افسانہ ''عورت'' ہے۔ یہ افسانہ تانیثی ڈسکورس کی ایک نئی جہت کو پیش کرتا ہے جس میں مصنف نے ایک تعلیم یافتہ اور ہوشیار رام دلاری جیسے کردار کو پیش کیا ہے۔ جو خود سامنے نکل کر کہتی ہے کہ ہمارے معاشرے میں عورتوں پر ہونے والے ظلم وستم کی ذمہ دار خود عورت ہی ہے چونکہ اگر ہمارے سماج میں یا ملک میں تمام عورتیں اپنی تہذیب، کلچر اور اخلاقی تعلیم کے راستے پر پوری طرح سے چلیں تو شاید کچھ حد تک عورتوں پر یہ ظلم وستم ختم ہوسکتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''چیرمین صاحب نے رام دلاری سے پوچھا ''مس رام دلاری، آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ

''عورت'' پردے میں رکھی جانے والی چیز ہے؟ اور مجھے آپ کی باتوں سے لگتا ہے کہ آپ عورت کو پردے میں رکھنا چاہتی ہیں۔ جب کہ کچھ لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ پردہ عورت کی ترقی میں حائل ہوتا ہے۔ اس لیے مجھے آپ سے اس سلسلے میں کوئی معقول دلیل چاہیے۔ رام دلاری کہنے لگی'' سر............ میں آپ کو یقین سے کہہ رہی ہوں کہ ہمارے ملک میں عورتوں پر ظلم وستم، ان کی خودکشی اور اغوا کی بنیادی وجہ ان کی بے پردگی ہے۔ اگر ہمارے ملک کی تمام عورتیں بلا لحاظ مذہب وملت اور پردے کو بطور تحفظ عزت وعصمت اپنائیں تو عورتوں سے جڑے ان تمام ظلم وزیادتیوں اور جرائم کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔ جن کی وجہ سے پورا معاشرہ ایک طرح کی بحرانی صورت اختیار کر چکا ہے''۔(151)

مشتاق احمد وانی نے کھوئے ہوئے کل کو پھر سے واپس کر دکھایا ہے۔ یعنی اس افسانے میں انھوں نے اپنی تہذیب اور کلچر کو نئی نسل کے نوجوانوں میں خاص طور پر لڑکیوں کی اخلاقی تعلیم اور کلچر پر بحث کی ہے کہ کس طرح سے نئی نسل میں بھی کھوئی ہوئی تہذیب واپس اپنی جگہ لوٹ رہی ہے۔

اسی طرح سے ان کا ایک اور دلچسپ افسانہ ''واپسی'' ہے اس میں انھوں نے دلت سماج کو افسانہ کا موضوع بنایا ہے اور یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ آج جب ہم اکیسویں صدی سے گزر رہے ہیں اور اپنے دور میں بھی بعض علاقوں میں اور چھوٹے چھوٹے دور دراز قصبوں میں نچلے طبقے کے لوگوں کے ساتھ چھوت چھات کو دیکھتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''تب نیلم کماری سسکیاں لیتی ہوئی بولی'' کہاروں کے محلے کی دو عورتوں نے باولی پہ میری گگریا ٹیک دی، بولیں تو پہلے پانی نہیں بھرے گی۔ تم اچھوت، سودر لوگ ہو۔ پہلے ہم پانی بھریں گے''۔(152)

نہ صرف دلتوں کے لیے پانی کے کنوئیں ہی نہیں بلکہ ان کے لیے شمشان گھاٹ بھی ایک الگ جگہ پر بنایا جاتا ہے۔ ایسی ہی کہانی مشتاق احمد وانی نے اپنے افسانہ ''واپسی'' میں بیان کی ہے جس میں نہ صرف انھوں نے دلت طبقہ کے مسائل کو اجاگر کیا ہے بلکہ مسلم معاشرہ میں بھی چلنے والی فرقہ پرستی کو طنزیہ طور پر پیش کیا ہے۔ اس افسانہ کا مرکزی کردار دیارام ہے اور فنی لوازمات کے ساتھ یہ ایک عمدہ افسانہ ہے۔

''انتظار مرگ'' بھی مصنف کا ایک قابل ذکر افسانہ ہے اس میں انھوں نے نئی نسل کے نوجوانوں کی بات کی ہے

کہ کس طرح سے والدین اپنے بچوں کو پڑھا لکھا کر اور خود در بدر کی ٹھوکریں کھا کر اپنے بچوں کی پرورش کرتے ہیں مگر وہی بچے جوان ہو کر اپنے ہی والدین کو ایک بوجھ کی طرح سمجھنے لگتے ہیں۔

اسی وجہ سے اس افسانہ میں بھی انھوں نے اس طرح کی کہانی کو بیان کیا ہے اور جب والدین اولاد کا سکھ نہیں حاصل کر پاتے ہیں تو وہ اپنی آخری سانسیں گنتے رہتے ہیں اور ہر وقت موت کے انتظار میں لگے رہتے ہیں۔اس افسانہ میں مصنف نے پچھتر سالہ ایک بزرگ سلام دین کی کہانی کو پیش کیا ہے اس کی بیوی دس سال پہلے فوت ہو چکی ہے اب وہ بہو، بیٹے اور پوتے کے ساتھ رہتا ہے مگر بہو اور بیٹا اس کی بالکل بھی دیکھ بھال نہیں کرتے ہیں اور وہ ایک بوجھ بن چکا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''سسر جی بوڑھے ہو چکے ہیں۔ان سے کوئی بھی کام نہیں ہوتا ہے۔بس ہر وقت تسبیح پھیرتے رہتے ہیں اور مرنے کے بعد کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔انھوں نے تو ہمارا جینا حرام کر دیا ہے۔رات کو بیچ بیچ میں کھانستے رہتے ہیں۔میں آپ کو کئی دن سے کہہ رہی ہوں کہ انھیں کھانسی کی دوائی لا کر دیجیے تا کہ ان کی کھانسی ہماری نیند میں خلل نہ ڈالے''۔(153)

افسانہ''سب کی ماں''میں وانی صاحب نے ہندوستان کی ملتی جلتی تہذیب یعنی مشترکہ تہذیب یا جس کو گنگا جمنی تہذیب کے نام سے بھی جانا جاتا ہے کو اس افسانہ کا موضوع بنایا ہے۔اس میں''بہاراں''ایک دائی کو مرکزی کردار کی شکل میں پیش کیا ہے۔بہاراں کی عمر تقریباً بیاسی سال کی ہے۔وہ اپنے دو بیٹے اور بیٹیوں کے ساتھ رہتی تھی۔جب اس کی وفات ہو جاتی ہے تو ہندوستان میں رہنے والے تمام مذاہب کے لوگ اس کی صورت پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔جو ایک مشترکہ تہذیب و کلچر کی بہترین مثال ہے۔اقتباس ملاحظہ ہوں:

''بہاراں مائی، کی موت ہم سب کی موت ہے۔کیونکہ اب ہمارے قصبے کی کوئی بھی عورت بغیر آپریشن کے بچہ نہیں جنے گی''۔(154)

اس کے بعد مشتاق احمد وانی کا پانچواں مجموعہ''کیا حال ہے جاناں''کے عنوان سے 2019ء میں منظر عام پر آیا۔مشتاق احمد وانی نے کردار نگاری کے حوالے سے عمدہ مثالیں پیش کیں ہیں جیسے انہوں نے ایک کردار جیون کے ذریعے سے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جو بھی سچا انسان ہوتا ہے اس کے لیے انسانیت کا دھرم سب سے بڑا ہوتا ہے وہ ذات پات اور سماج، اونچ نیچ اور سماجی جھگڑوں سے ایک الگ سوچ رکھتا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''میرے دیش میں بسنے والے بھائیوں ، بہنواور بزرگوں! ہم سب انسان ہیں مگر مختلف فرقوں، ذاتوں اور رسموں رواجوں میں بٹے ہوئے ہیں۔کوئی اپنے آپ کو ہندو کہتا ہے کوئی مسلمان، کوئی سکھ، کوئی بدھ اور کوئی جین کہتا ہے۔اس کے علاوہ بہت ساری ذاوں میں ہم بالکل سمٹ کے رہ گئے ہیں۔ان مذہبوں، دھرموں اور ذاتوں کی بنیاد پر ہم ایک دوسرے کا خون بہاتے ہیں۔قتل وغارت گری کا بازار گرم کرتے ہیں۔ہم نے ان چیزوں کو اتنی اہمیت دے رکھی ہے کہ ہمارا ملک ترقی کے بدلے انتہائی تنزلی کا شکار ہو کے رہ گیا ہے۔اس لیے اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں امن وامان اوخوشحالی قائم ہو، ہمارا ملک ہر طرف سے ترقی کرے اور ہمیں صحیح زندگی کا لطف حاصل ہو تو اس کے لیے آپ میری باتوں پر عمل کیجیے۔میری رائے یہ ہے کہ آپ تمام..........مذہبوں، ذاتوں اور رسموں ورواجوں سے اپنا دامن حیات چھڑا لیجیے۔آپ کا کوئی بھی دین دھرم نہ ہو نہ کوئی ذات ہو بلکہ آپ صرف انسان بن کے رہیں ۔کوئی بھی مذہبی پابندی نہ ہو، کیونکہ مذہبی جیون ہماری تمام آزادیاں اور عیاشیاں ختم کر دیتا ہے''۔(155)

پروفیسر بیگ احساس ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ان کے افسانے کسی پیچیدہ صورت حال کو پیش نہیں کرتے ۔ وہ روزمرہ کے واقعات سے کہانی کا خمیر تیار کرتے ہیں ان کے کردار سیدھے سادے ہیں۔کسی نفسیاتی الجھن کا شکار نہیں ہیں۔ اس لیے وہ تحلیل نفسی سے کام نہیں لیتے بلکہ ان کے اوصاف بیان کرتے ہیں''۔(156)

مشتاق احمد وانی کو افسانہ نگاری کے فن پر مہارت حاصل ہے۔انھوں نے جس معاشرے میں زندگی بسر کی اسی معاشرے کی منظر نگاری اور سماجی مسائل کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔ان کے افسانوں کے موضوعات میں خاص طور پر دیہاتی لوگوں کا شہر کی طرف منتقل ہونا، سماجی نابرابری، رشوت خوری، ذات پات، عورت سے چھیڑ چھاڑ، تعلیمی نظام کی خامیاں، ابورشن، پردے کی اہمیت، جنسی معاملات، نوٹ بندی، اولاد کا والدین کے ساتھ برا سلوک، فرقہ پرستی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

زنفرکھوکھر:

محترمہ زنفر کھوکھر جموں سے تعلق رکھنے والی ایک ذہین اور قابل خواتین قلم کاروں میں سے ایک ہے۔ان کا اصلی نام زنفر بیگم ہے اور وہ اپنے قلمی نام زنفر کھوکھر کے نام سے اردو ادب کی دنیا میں جانی جاتی ہیں۔ان کی پیدائش جموں کے دور دراز دیہات میں بسنے والے گاؤں کانڈی کلوہتہ، تحصیل مینڈر، ضلع پونچھ میں 19/دسمبر 1957ء کو ہوئی تھی۔ضلع پونچھ سے ہی انھوں نے اپنی تعلیم بھی حاصل کی اور پھر لکچرار کے عہدے پر عرصہ دراز تک فائز رہیں پھر وہ سینئر لیکچرار کی حیثیت سے کام کرتی رہیں اور اب وہ اپنی ملازمت سے سبکدوش ہو چکی ہیں۔

اردو ادب کے میدان میں انھیں ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔یہ بات بڑی قابل تحسین ہے کہ وہ جموں کے ایک دور دراز علاقہ سے تعلق رکھتے ہوئے جہاں اکثر خواتین کو ادبی دنیا سے رشتہ قائم کرنے کے بہت کم مواقع فراہم ہوتے ہیں،مگر اس کے باوجود زنفر کھوکھر نے ادبی میدان میں قدم رکھا۔

زنفر کھوکھر کا پہلا افسانہ ''نصیحت'' کے عنوان سے 1988ء میں منظر عام پر آیا تھا۔زنفر کھوکھر کے اب تک چار افسانوی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں،ان کا پہلا مجموعہ ''خوابوں کے اُس پار'' 1999ء میں فیض آفسیٹ پرنٹرس دہلی سے منظر عام پر لایا گیا تھا۔اس کے بعد ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ 2004ء میں ''کانچ کی سلاخ'' کے عنوان سے کریسنٹ ہاؤس پبلی کیشنز جموں کے زیر اہتمام شائع کیا گیا۔محترمہ زنفر کھوکھر کا تیسرا افسانوی مجموعہ 2010ء میں ''عبرت'' کے نام سے کریسنٹ ہاؤس پبلی کیشنز جموں کی جانب سے منظر عام پر لایا گیا۔ان کا چوتھا افسانوی مجموعہ ''ہم سب ایک ہیں'' کے عنوان سے 2017ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ان کے اکثر و بیشتر افسانے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔اور اسی طرح سے ان کا پانچواں افسانوی مجموعہ ''پتھر کی سل'' کے عنوان سے ہے مگر یہ مجموعہ ابھی زیر ترتیب ہے اور بہت جلد اسے بھی منظر عام پر لانے کی کوشش کر رہی ہیں۔اس کے علاوہ مصنفہ کے دو انشائیوں کے مجموعے ہیں جن میں ان کا پہلا انشائیوں کا مجموعہ ''ہم سب ایک ہیں'' کے عنوان سے کریسنٹ ہاؤس پبلی کیشنز جموں سے 2016ء میں شائع ہوا ہے اور دوسرا ان کا انشائیوں کا مجموعہ ''چھچے'' کے نام سے جو پہاڑی زبان میں ہے 2016ء میں شائع کیا گیا۔

مصنفہ کا پہلا افسانوی مجموعہ ''خوابوں کے اس پار'' ۔جس میں کل تیس افسانے ہیں۔ پہلے حصے میں چودہ افسانے ہیں جو مصنفہ نے مزاحیہ انداز میں بیان کیے ہیں اور دوسرے حصے میں سولہ افسانے ہیں جن کو زنفر کھوکھر نے

سنجیدہ انداز میں پیش کیا ہے۔

محترمہ زنفر کھوکھر نے پہلے حصے کے تمام افسانے مزاحیہ ہیں۔مزاح نگاری ایک بہت ہی سخت اور مشکل کام ہے اور بہت لوگ اس میں کامیاب ہوتے پاتے ہیں۔اردو ادب میں چند ہی ایسے نام ہیں جو اس کام کو پورا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔زنفر کھوکھر نے بھی اپنی کوشش کو کافی حد تک کامیاب بنانے کی کوشش کی ہے حالاں کہ کہیں نہ کہیں انھوں نے لفظی اور روزمرہ کے الٹ پھیر کے بجائے ڈرامائی انداز کو زیادہ جگہ دی ہے مگر باوجود اس کے ان کے افسانوں میں بہت ساری فنی خوبیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔

''گھر پیارا گھر''میں مصنفہ نے خوبصورت انداز میں کرائے پر مکان لینے کے لیے در بدر کی ٹھوکریں کھانے اور کرائے پر گھر نہ ملنے کے حالات اور رسوائی کو مزاحیہ انداز میں بیان کیا ہے۔مصنفہ کے مزاحیہ افسانے پڑھ کر اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ انھوں نے اسلوب اور مکالمہ نگاری پر خاص زور دیا ہے۔شروع شروع میں ان کے افسانوں میں اگر چہ کچھ فنی خامیاں ضرور تھیں لیکن آگے چل کر وہ بہترین افسانہ نگاروں میں شامل ہو گئیں۔

''گھر پیارا گھر'' کا اگر مطالعہ کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مصنفہ نے ایک چھوٹے سے واقعہ کو مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے لیکن غور کرنے پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے روزمرہ کے اخراجات پورے نہیں ہوتے ہیں جس کی وجہ سے اس کو در بدر کی ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''چاروناچار ہوٹل میں چند ہی دن اور گزارے کہ جیبیں ہلکی پھلکی محسوس ہونے لگیں۔اوسط نکالے تو صرف دس دن کا خرچ باقی رہ گیا تھا۔ دل پکڑ کے رہ گئے۔''اف اللہ! زمین فروخت کی تو ملازمت ہاتھ لگی۔اب گھر بھی فروخت کر دیں تو اس کنگال ہوٹل پہ گزارہ ممکن نہیں''۔(157)

افسانہ''انتخاب''میں مصنفہ نے ایک عاشق کی کہانی کو بیان کیا ہے۔حالانکہ افسانہ میں کردار نگاری سے بہت کم کام لیا گیا ہے،صرف یہ بتایا ہے کہ ایک شخص جو بہت ہی سیدھا اور شریف تھا وہ اپنی جوانی کی عمر کو پار کر چکا تھا صرف اپنے والدین کے کہنے پر کہ وہ کبھی کوئی غلط کام نہیں کرے گا مگر اچانک اسے خیال آیا کہ اس کی جوانی ابھی باقی ہے اور وہ دوستوں کی صلاح لے کر ایک خاتون کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے۔مگر بعد میں اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی کی عورت ہے اور خوب جوتوں کی مار پڑتی ہے۔اقتباس ملاحظہ ہوں:

''ایک دلفریب تبسم بکھیرتے ہوئے کہا'' آپ چائے پیں گے'' جی ہاں! ضرور پیئیں گے چلیے ہم نے ایک ریستوران کی طرف قدم بڑھایا۔ ''ریستوران میں نہیں ہمارے گھر پر'' اس نے ملائیت سے کہا۔ ہم اپنی خوش نصیبی پر نازاں محبت کے عجیب سے نشے میں سرشار اس کا فرادا حسینہ کے شانہ بشانہ چلتے گئے ....اس نے اپنی موٹی موٹی آنکھوں پر سے لمبی لمبی اور بوجھل پلکیں اٹھا کر ایک نگاہ ہمارے سر پر ڈالی اور پاؤں میں پڑی چپل آگے کھسکا کر سامنے کھڑی نازنین کو آنکھ سے ہلکا سا اشارہ کیا۔ ہمیں ایک جھٹکا سا لگا بس پھر کیا تھا۔ ان کی چپل تھی اور ہمارا سر''۔(158)

''ہم ہندوستانی ہیں'' افسانہ میں مصنفہ نے حب الوطنی کے جذبات دکھائے ہیں۔ یہ افسانہ ان کے بہترین افسانوں میں سے ایک ہے اور کہیں نہ کہیں انھوں نے اس افسانے میں حقیقت نگاری سے کام لیا ہے۔ چونکہ اکثر جب ہندوستان اور پڑوسی ملک پاکستان کا کرکٹ میچ ہوتا ہے تو گھر گھر میں دو ٹولیاں بن جاتی ہیں ایک ہندوستان کی حمایت میں اور دوسری پاکستان کی۔ اور اسی بات کو لے کر بھی کبھی خود اپنے ہی گھر میں جھگڑا شروع ہو جاتا ہے۔

اس افسانے میں بھی مصنفہ نے ایک گھر کی کہانی کو بیان کیا ہے جہاں ممی پاکستان کی ٹیم کو سپورٹ کرتی ہے اور پاپا اور بھائی ہندوستان کی ٹیم کو کرتے ہیں۔ کبھی کبھی دونوں کی بحث بھی ہو جاتی ہے مگر آخر میں خود ممی بھی ہندوستانی ٹیم کی حمایت میں آ کر اپنے لڑکے اور اپنے شوہر کو خوش کر دیتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''مگر بھیاّ کو اب بھی شک ہے۔ وہ بار بار ممی کی طرف دیکھتا ہے اور پھر مخاطب ہوتا ہے۔ ''ممی تم صرف ہمیں خوش کرنے کے لیے خوش ہو رہی ہو۔ تم ہمارے بیچ اس لیے آ کر بیٹھ گئی ہوتا کہ گھر میں لڑائی جھگڑا نہ ہو جائے۔ ممی تمہاری نیت میں اب بھی کھونٹ ہے۔ تم صرف ناٹک کر رہی ہو۔ ''نہیں بیٹا نہیں! ممی بھیاّ سے لپٹ کر کہتی ہیں'' ناٹک تو میں پہلے کر رہی تھی۔ میری نیت میں رائی برابر بھی کھوٹ نہیں ہے۔ مجھے اپنا ملک اتنا ہی پیارا ہے جتنا تمہیں اور تمہارے پاپا کو ہے''۔(159)

افسانہ ''نصیحت'' میں مصنفہ نے ایک تحصیل ایجوکیشن آفیسر اور کچھ اساتذہ کی میٹنگ کو اس کہانی کا موضوع بنایا ہے۔ اور مدرسین اور اساتذہ کے خلاف کچھ شکایتیں ہیں جن کو آفیسر صاحب نے دور کرنے کی کوشش کی ہے کہ کچھ

اساتذہ بچوں کی تعلیم وتربیت میں اچھا برتاؤ نہیں کرتے ہیں اوراسکول میں کم دھیان دیتے ہیں۔

مصنفہ نے ہرافسانہ ایک نصیحت کے طور پر پیش کیا جس میں ایک بڑے آفیسر صاحب نے اساتذہ کو ان کی ذمہ داری کا احساس دلایا ہے اور انھیں وقت پر اسکول آنے کی حدایت دی ہے۔

> ''نیز اسکولوں میں رہ کر بھی بچوں کو نہ پڑھانا، رشوت خوری سے کسی طرح بھی کم ہے؟ جب تک ٹیچر لوگ اپنی اپنی خامیوں کو دور نہیں کریں گے اپنے کام میں دیانتداری نہیں برتیں گے ۔سماج میں ٹیچر کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوگی''۔(160)

افسانہ ''جوابی کاروائی'' میں مصنفہ نے ایک گھر کی کہانی کو موضوع بنایا ہے جس میں انھوں نے ایک شوہر اور بیوی کی بحث کو مزاحیہ طور پر بیان کیا ہے۔شوہر ہر وقت گھر والوں سے انپڑھ ہونے کے طعنے سنتا رہتا ہے اور بعد میں وہ اپنی خالہ کے ساتھ مل کر دوسری شادی کر لیتا ہے۔

محترمہ زنفر کھوکھر نے اس مجموعے کے پہلے حصے کے تمام افسانوں کو مزاحیہ طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر اس مزاح نگاری میں وہ کچھ حد تک ہی کامیاب ہو پائی ہیں چونکہ انھوں نے کئی جگہوں پر مکالمہ نگاری کے بجائے ڈرامائی انداز سے افسانوں میں مزاح کی چاشنی پیدا کی ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے اس بات کی طرف بھی کم توجہ دی ہے کہ کن حالات میں اکثر انسان کس طرح کے ردِعمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔اور یہ خوبی ایک بہترین مزاح نگار کے اندر ضرور پائی جاتی ہے اور مزاح نگار کا بنیادی اصول بھی یہی ہے کہ وہ ایک انسان میں اتنا حوصلہ ہو کہ وہ خود بھی مزاح نگاری کے سانچے میں ڈال پائے اور خود کو مزاح کا نشانہ بنا پائے۔بہرحال ایک آدھ خامی کے باوجود مصنفہ کے مزاحیہ افسانے بہت ہی قابل ذکر ہیں۔پروفیسر ظہورالدین صاحب نے مصنفہ کے افسانوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''ہاں اتنی البتہ مشورے کے طور پر ضرورت کہی جاسکتی ہے کہ مزاح ڈرامائی صورت حال کی بجائے اگر الفاظ اور روزمرہ کے الٹ پھیر سے پیدا کیا جائے تو اسے زیادہ جاگزیں تصور کیا جاتا ہے۔مثلاً کیچڑ میں اچانک پھسل کر گر پڑنے سے قہقہ چھوٹتا ہے اس سے کہیں بہتر وہ قہقہ ہوتا ہے جو الفاظ کے الٹ پھیر سے پیدا ہوتا ہے۔اس بات کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے پطرس کا مضامین کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے''۔(161)

اس مجموعے کے دوسرے حصے میں محترمہ زنفر کھوکھر نے اپنے سولہ سنجیدہ افسانوں کو مختلف موضوعات پر پیش

کیا ہے۔

''خوابوں کے اس پار'' ان کا ایک المیہ افسانہ ہے۔اس افسانے میں انھوں نے صادق صاحب اوراس کے گھر کی کہانی کو بیان کیا ہے۔صادق صاحب غریب گھرانے کےلڑکے تھے اور انھوں نے پڑھائی کر کے اسکول ماسٹر کی نوکری حاصل کی تھی اس کے بعد شادی کی اور تعلیم کو بھی جاری رکھا۔ایل ایل بی کرنے کے بعد انھوں نے ٹیچر کے پیشے سے استعفیٰ دے کر وکالت شروع کردی۔اس کے بعد وہ سیاست میں حصہ لینے لگے اور جلد ہی ایم ایل اے بن گئے۔ اب ان کے پاس بہت ساری دولت، گاڑیاں، بنگلے اکٹھا ہو گئے۔ان کا ایک بیٹا بھی تھا جس کا نام شکیل تھا۔

صادق صاحب اب دیہات سے اٹھ کر شہر کی زندگی میں زیادہ مصروف تھے مگر ان کی بیوی شہر کی زندگی میں خوش نہیں تھی اس لیے وہ پھر سے اپنے گھر دیہات میں چلی گئی۔اسی دوران صادق صاحب کو دوسری شادی کی ترتیب سوجھی ۔مگر اب ان کا بیٹا بھی جوان ہو چکا تھا وہ بھی شادی کے لائق بن چکا تھا۔ایک بار اچانک گورنر راج نافض ہوا تو صادق صاحب بھی اب شہر سے دیہات میں آ گئے اس دوران انھیں ایک خوبصورت نوجوان لڑکی زہرا دکھائی دی پوچھ تاچھ سے معلوم ہوا کہ وہ ایک غریب گھر کے فضلو یعنی فضل دین کی بیٹی ہے۔صادق صاحب بھی اپنی بیوی کے کہنے پر اپنے بیٹے کے لئے دیہاتی لڑکی ڈھونڈ رہے تھے۔جب شکیل اور زہرا کا رشتہ پکا ہوا تو اچانک سے صادق صاحب کے ذہن میں شیطان آ گیا اور اب وہ زہرا کو اپنی بیوی بنانے لگے۔جب زہرا کے والدین کو یہ معلوم ہوا تو وہ بہت ہی مایوس ہوئے مگر وہ مجبور بھی تھے کیونکہ فضلو کا سارا قرض صادق صاحب نے دے دیا تھا۔اور دراصل صادق صاحب خود وہاں جا کر اپنے ہی بیٹے کی برائی کرتے ہیں تا کہ وہ اپنا ہاتھ جما سکیں۔حالانکہ شکیل ذہین اور پڑھا لکھا تھا۔وہ بھی دل و جان سے زہرا کو محبت کرتا تھا۔مگر صادق صاحب اپنے ہی بیٹے کے دشمن بن گئے۔اب وہ پیسوں کے لالچ میں آ کے صادق صاحب کو اپنی بیٹی زہرا کا ہاتھ دینے کے لیے راضی ہو گئے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''دیکھ بیٹی دیکھ! انکار مت کرنا۔تجھے میری جان کا واسطہ ہے۔اپنے سکھوں اور خوشیوں کو لات مت مارنا۔صاحب کا لڑکا تمھیں پسند نہیں کرتا ہے۔باپ نے اسے تمہارے ساتھ شادی کے لیے مجبور کیا تو اس نے تمھیں آوارہ بدچلن تک کہہ دیا ہے۔اور بیٹی! دولت سے بھرا پڑا گھر تجھے اور کہاں نصیب ہوگا اور بیٹی پھر اس گھر کو بھی دیکھ کل تک ہم بھوکے مرتے تھے اور آج کیا نہیں ہے ہمارے گھر میں۔اور پھر یہ بڑے لوگ جتنے مہربان ہوتے ہیں اتنے ہی

خطرناک بھی ہوتے ہیں ان کو نراض کرنا مہنگا ثابت ہوسکتا ہے۔کل کو یہ تمہیں کہیں اٹھوا لے جائیں تو............‘‘۔(162)

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مصنفہ نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ سیاست دان کسی کے سگے نہیں ہوتے ہیں وہ لالچ میں آ کر خود کے گھر کو بھی بر باد کر دیتے ہیں اور بعد میں جب صادق صاحب کی شادی زہرا کے ساتھ ہوتی ہے تو اس کے بعد کبھی کبھی زہرا کو شکیل کے ساتھ دیکھ کر صادق صاحب اپنے ہی لڑکے کو مارنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں اور آخر میں المیہ یہ ہوتا ہے کہ شکیل یونیورسٹی سے واپس آتے وقت ایک کار حادثے میں جاں بحق ہو جاتا ہے۔ بعد میں صادق صاحب کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ زہرا کی شادی کے بعد شکیل زہرا کو اپنی ماں کی طرح دیکھتا تھا۔

اس افسانے میں مصنفہ اپنی پوری منی لوازمات کے ساتھ کہانی کو پیش کرنے میں کامیاب رہی ہیں بس اتنا سا فرق رہ گیا ہے کہ اگر شکیل کی موت ایکسیڈنٹ کے بجائے صادق صاحب کی وجہ سے کروائی جاتی تو شاید المیہ میں زیادہ اضافہ ہوسکتا تھا۔ بہر حال افسانہ کا پلاٹ بہت ہی بہترین ہے جس میں کوئی جھول دیکھنے کو نہیں ملتا ہے اور قاری اس افسانے کو مزے مزے سے پڑھتے ہیں۔

افسانہ’’بے بسی‘‘ میں مصنفہ نے بہت ہی بہترین الفاظ میں ایک رومانی کہانی کو بیان کیا ہے۔ اور اس میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح سے دور دراز کے علاقوں میں آج بھی ذات پات کے نام پر لوگوں میں فرقہ دیکھا جاسکتا ہے۔ مصنفہ نے ذات پات کے موضوع کو ہی اس کہانی میں پیش کیا ہے۔ جس میں ایک بڑے گھر کا لڑکا دو سال بعد روشن جہاں کو دیکھتا ہے۔ روشن جہاں ایک موچی کی بیٹی ہے اور وہ لوگوں کے گھر گھر جا کر کام کرتی ہے چند پیسوں کے لیے کیونکہ اس کا کوئی بھائی نہیں ہے وہ صرف اپنے غریب باپ کے ساتھ ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں رہتی ہے۔ وہ دیکھنے میں بہت ہی خوبصورت تھی اور لڑکے کو اپنے پورے کالج کے دوران ایسی لڑکی نہیں ملی۔ اسی دوران وہ باتوں باتوں میں اپنی محبت کا اظہار کرتا ہے مگر لڑکی اس کی بات کو سمجھتے ہوئے بھی ناسمجھ بننے کی کوشش کرتی وہ اپنی اوقات کو ہرگز بھولنا نہیں چاہتی تھی۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

’’تم بہت خوبصورت ہو روشن جہاں! میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ہوں تو موچی کی بیٹی نا‘‘ اس نے یہ کہتے ہوئے منہ دوسری طرف پھر لیا۔ اس کے جواب میں ایک درد تھا۔ ایک شکایت تھی۔ اور جب میں گھوم کر اس کے سامنے گیا۔ تو اس کی آنکھوں آنسو

اتر آئے تھے میں نے اس سے پینے کے لیے پانی مانگا۔ وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب واپس آئی تو اس کے ساتھ پڑوس کی ایک لڑکی تھی جس کے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا جاؤ بابو جی کو پانی پلاؤ اس نے لڑکی سے کہا۔'' کیوں روشن جہاں! تمہارے گھر میں پانی نہیں تھا۔ میں نے پوچھا'' پانی تو بہت ہے بابو جی۔ مگر میں اتنی ناسمجھ تھوڑی ہوں''۔(163)

آخر میں وہ لڑکا اپنی محبت کو پانے میں ناکام رہتا ہے۔ کیونکہ اس ذات پات اور اونچ نیچ کے بندھن سے اٹھ کر اس نے اپنی محبت کو پانے کے لیے اپنی ماں سے بھی بات کی مگر اس کی ماں نے ایسے سماج اور رسم ورواج اور رشتے ناتے میں فرق سمجھا کے اس کی ایک نہ سنی۔ اور اس لڑکی کی شادی دوسری جگہ کر دی مگر روشن جہاں اس کے دل میں ہمیشہ کے لیے بس گئی تھی جسے وہ کبھی بھلا نہیں پایا۔

محترمہ زنفر کھوکھر نے جس انداز میں اس افسانے میں محبت بھر کہانی کو پیش کیا ہے قابل تعریف ہے۔ اس افسانے میں انھوں نے مکالمہ نگاری اور جذبات نگاری سے زیادہ کردار نگاری پر زور دیا ہے۔ لیکن فنی خوبیوں کی وجہ سے یہ افسانہ ان کے شہکار افسانوں میں سے ایک ہے۔

افسانہ'' گھر میں مصنفہ نے اپنے گاؤں کی عکاسی کی ہے کہ کس طرح سے جنگ کے حالات میں غریب عوام کی خوشیوں پر پانی پھر جاتا ہے اور ان کی رہائش گاہوں کو ان کی آنکھوں کے سامنے ہی جلایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس افسانے میں مصنفہ نے غدر کے حالات کو بھی بیان کیا ہے کہ کس طرح سے دونوں ملکوں میں جب بھی جنگ ہوئی تو اس وقت بھی غریب عوام ہی کا نقصان ہوتا ہے اور دونوں طرف کے ملکوں کی جانب سے فوجی کاروائی میں غریب اور دور دراز کے علاقوں میں بسنے والے لوگوں کے گھر تباہ و برباد کر دیے گئے۔ اس افسانے میں جس طرح سے مصنفہ نے عوام کا درد بیان کیا ہے واقع ہی قابل تعریف ہے۔ مثال کے لیے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''بیٹی دونوں جنگوں میں ہمارے بھرے پڑے گھر جلا دیئے گئے اور تمہیں بتاؤں کہ جلائے کس نے .... آہ! اپنے ہی ملک کی فوجوں نے محض اس شک پر کہ ان گھروں میں دشمن کی فوجوں نے پناہ لے رکھی ہے۔ ہمارے پاس کشادہ مکان تھا۔ زندگی آرام سے گزری تھی کہ 1947ء کا غدر پھوٹ پڑا۔ اور ہمیں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگنا پڑا ہم سات سال تک

مہاجر نے رہے''۔(164)

اس طرح کے کئی افسانے محترمہ زنفر کھوکھر نے اردو ادب کی دنیا میں اضافہ کے طور پر پیش کیے ہیں۔اگر چہ ان کے ابتدائی افسانوں میں کچھ فنی خامیاں ضرور تھیں مگر آگے چل کر انھوں نے فکشن نگاری کے میدان میں کافی حصہ لیا جس میں وہ کافی حد تک کامیاب ہوئیں۔اور ایک دور دراز گاؤں میں رہے کے انھوں نے اس میدان میں کامیابی حاصل کی اس حوالے سے ان کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔اس حوالے سے ڈاکٹر صابر مرزا کہتے ہیں:

''مزید برآں زنفر کھوکھر اس لیے بھی مبارکباد کی مستحق ہیں کہ وہ ایک پسماندہ اور دور افتادہ علاقے سے تعلق رکھنے کے باوجود بھی ادبی ذوق کو اپنی رگ وپے میں سموئے ہوئے ہیں۔ ان کا یہ ادبی ذوق ان کی صلاحیتوں اور روزمرہ زندگ کے تجربات سے عبارت ہے اور یہی بات ہے کہ ان کی یہ تخلیق ہر نئے انداز فکر کو اجاگر کرتی دکھائی دیتی ہے''۔(165)

اسی طرح سے ریاست جموں وکشمیر سے تعلق رکھنے والے مشہور افسانہ ڈاکٹر مشتاق احمد وانی لکھتے ہیں کہ:

''زنفر کھوکھر نے اپنے افسانوں میں عصری سماج کی بداعمالیوں اور بداطواریوں کو موضوع بنایا ہے۔ان کے افسانے سیدھا سادے اور دلچسپ لب ولہجے میں آغاز سے انجام کو پہنچتے ہیں۔وہ تانیثی فکروشعور کے تحت عورتوں کے مسائل کو ابھارتی ہیں''۔(166)

محترمہ زنفر کھوکھر جس دور میں اردو ادب میں اپنی کہانیوں سے روبرو ہو رہی تھیں ایسا نہیں ہے کہ اس دور میں دوسری خواتین قلم کار نہیں تھیں مگر یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ کشمیر سے تعلق رکھنے والی حبہ خاتون کے نظریئے سے ریاست جموں وکشمیر کی کئی خاتون اپنی قلم کے زور سے منظر عام پر آ رہی تھیں اور عصر حاضر میں بھی بہت ساری خواتین اردو ادب کے میدان میں حصہ لے رہی ہیں۔زنفر کھوکھر کی ہم عصر جن خواتین قلم کاروں نے اردو زبان وادب میں اپنی شہرت حاصل کی ہے یا پھر ابھی بھی کر رہیں ہیں ان میں خاص طور پر نصرت چودھری، شگفتہ پروین، نصرت رشید، عابدہ احمد، رخسانہ جبین، ترنم ریاض، شبنم ہاشمی، نکہت فاروق، پروین راجہ، سیدہ نسرین نقاش، نیلوفر ناز نحوقادری، رفعت حجازی، فریدہ کول وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر نکہت فاروق نظر:

ریاست جموں وکشمیر سے تعلق رکھنے والی ایک اچھی شاعرہ اور نثر نگار ہیں۔ان کا بنیادی طور پر کشمیری گھرانے

سے تعلق ہے مگر دوران ملازمت انھوں نے اپنی زندگی کا ایک لمبا عرصہ جموں میں گزارا تھا۔اور یہی سے انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز بھی کیا تھا۔

اردو ادب کی دنیا میں انھیں ایک اچھی شاعرہ کی حیثیت سے کافی شہرت ملی ہے۔مگراس کے باوجود وہ اردو ادب کی دیگر نثری اصناف میں بھی طبع آزمائی کرتی رہی ہیں۔انھیں ایک اچھے افسانہ نگار کی حیثیت سے بھی جانا جاتا ہے۔ ابتدائی دور میں ان کے کئی افسانے ریاست کے مقامی رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے۔اس کے بعد ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''قہر نیلے آسمان کا'' کے عنوان سے 2008ء میں منظر عام پر آیا۔اس مجموعے میں مصنفہ نے خاص طور پر کشمیر کی زندگی وہاں کے عوام کے دکھ درد کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔اس مجموعے میں ان کے قابل ذکر افسانے ''قہر نیلے آسماں کا''، ''شفیق رنگ شباب،،اور زمین جاگ اٹھی''، ''ایک خواب ادھورا سا''، ''ریزہ ریزہ وجود'' وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

ان کے افسانوں میں زندگی کے نشیب وفراز روزمرہ زندگی میں ہونے والے تمام مسائل،غریب عوام کی بے بسی وغیرہ جیسے موضوعات کو دیکھا جاسکتا ہے۔اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں تہذیبی وقار،انسانی رشتوں میں آپسی دوری،خاندانی رشتوں میں ٹوٹے ہوئے خواب،عورتوں کی نفسیاتی قدریں وغیرہ دیکھا جاسکتا ہے۔

ان کے افسانوں میں ایک چیز کی فنی خامی یہ ہے کہ منظر نگاری سے نظر نہیں آتی ہیں۔وہ اکثر افسانوں میں خود کو قاری کی نظر سے نہیں دیکھتی ہیں۔جب قاری ان کے افسانوں کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے منظر نگاری سے لطف نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں کردار نگاری، پلاٹ، جذبات نگاری وغیرہ اہم درجہ کی پائی جاتی ہیں۔جس سے قاری بہت ہی لطف اندوز ہوتا ہے۔

اردو افسانے کے علاوہ نکہت فاروق نظر ایک اچھی شاعرہ بھی ہیں۔اور نعت خوانی میں بھی انھیں مہارت حاصل ہے۔اس حوالے سے ان کے دو حمد و نعت کے مجموعے بھی منظر عام پر آچکے ہیں۔ڈاکٹر مشتاق احمد وانی صاحب سیدہ نکہت فاروقی کی ادبی کاوشوں کا مطالعہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> ''نکہت فاروقی نظر شاعری کے ساتھ ساتھ افسانے بھی لکھتی ہیں۔ان کے افسانوں کا مجموعہ ''قہر نیلے آسماں کا'' شائع ہو چکا ہے ان کے اثر افسانوں میں کشمیر کے بحران حالات و واقعات کا ذکر آیا ہے''۔(167)

ان متذکرہ بالا فکشن نگاروں کے علاوہ جموں خطے میں بہت سارے ایسے فکشن نگاری کے اس میدان میں طبع آزمائی کر رہے ہیں جن میں راز مناوری، ڈاکٹر عبدالمجید بھدرواہی، نثار راہی، شہباز راجوری، سوتنتر دیو کوتوال، شام طالب، عبدالسلام بہار، ڈی مبئی، اسلم مرزا، اقبال نازش، پرویز مانوس، شیخ خالد کرار، اقبال شال، مہر طلعت، چاند نرائن چاند، شام طالب، شاہ محمد خان، شیخ آزاد، ایوب شبنم، امتیاز جانی، الطاف کشتواری، ضیاالدین، نصرت چودھری، نواب دین کسانہ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

جموں میں اردو ناول:

جب ہم اردو ناوول نگاری کے حوالے سے بات کرتے ہیں تو اردو ناول نگاروں کی بھی ایک بڑی تعداد ملتی ہے، جنہوں نے عمدہ ناول تخلیق کیے ہیں، اگرچہ جموں میں اردو ناول کی روایت کوئی زیادہ پرانی نہیں ہے لیکن پھر بھی ناول کی صورت میں جو سرمایہ موجود ہے وہ قابل قدر ہے۔ جموں میں اردو ناول نگاری کے حوالے سے بھی سب سے پہلا نام محمد الدین فوق کا آتا ہے ان کا پہلا ناول "انارکلی" کے عنوان سے 1890 میں لاہور سے شائع ہوا تھا۔ جس میں مصنف نے حسن وعشق کی داستان کو نہایت ہی عمدہ طریقے سے پیش کیا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ تعلیم نسواں کے فوائد، عورتوں کی جانباز بہادری، مراٹھوں کی جانب داری، ایک عشقیہ قصے کے پیراے میں دکھائی گئی ہے۔ اس ناول کے بہت سارے قصے حقیقت پر مبنی ہیں۔ اس کے علاوہ محمد الدین فوق کے ناولوں میں "اکبر" ناصح مشفق" "غریب الدّیار"، " نیم حکیم " وغیرہ قابل ذکر ہیں، ناول "اکبر" کو لوگوں نے بہت ہی پسند کیا یہ بھی تاریخی ناول میں درجہ امتیاز رکھتا ہے کیونکہ اس کے اکثر واقعات بھی حقیقت پر مبنی ہیں۔

نرسنگھ داس نرگس:

جموں کے نامور صحافی، شاعر، ادیب، مورخ اور محقق دیوان نرسنگھ داس نرگسؔ ایسے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے بزرگوں نے ریاست جموں وکشمیر کی تشکیل وترقی میں بے پناہ خدمات انجام دیں تھیں۔ نرسنگھ داس نرگس کا خاندان جموں میں بڑا بلند درجہ رکھتا تھا اسی لیے نرگس صاحب کو خود پھلنے پھولنے کا موقع ملتا رہا۔ انھوں نے نہ صرف عوام کی فلاح و بہبود کے لیے کارنامے انجام دیئے بلکہ علمی وادبی دنیا میں بھی کافی شہرت حاصل کی۔ نرسنگھ داس نرگس بیک وقت صحافی، شاعر، مورخ اور فکشن نگار تھے۔ انھوں نے اردو ادب میں خطہ جموں کے حوالے سے بہت مقبولیت حاصل کی ہے۔ ان کے کئی کارنامے وقتاً فوقتاً منظر عام پر آتے رہتے تھے۔

''پریم منوہر'' کے قلمی نام سے انھوں نے بہت سے ناول لکھے تھے۔ جن میں خاص طور پر پاربتی، نرملا اور جانکی قابل ذکر ہیں۔ نرسنگھ داس شاعری بھی اچھی کر لیتے تھے۔ ان کے معاصرین کا ذکر کیا جائے تو اس وقت کے بڑے بڑے شاعروں کا نام سامنے آتا ہے جنھوں نے جموں خطے میں اردو شاعری میں چار چاند لگائے۔ ان میں خاص طور پر غلام رسول نازکی، دیا کرشن گردش، کشن سمیل پوری، بھوشن بزاز، اثر عسکری، اثر لکھنوی، اثر صہبائی، گلزار احمد فدؔا وغیرہ قابل ذکر شعراء نے اپنی خدمات کو انجام دیا۔

نرگس ایک حقیقت نگار اور مقصدیت کے حامی ادیب اور صحافی تھے وہ منفی سیاست کے خلاف تھے اور اپنی تحریروں میں ہمیشہ حقیقت پسندی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اسی لیے اگر چہ کچھ لوگ ان سے ناخوش رہتے تھے تو اس بات کا ان کو کوئی غم نہ تھا کیوں کہ ان کے علاوہ بیشتر لوگ ان کی قدر بھی کرتے تھے۔

اگر چہ انھوں نے صحافت میں زیادہ نام کمایا مگر اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ صحافت کے علاوہ بھی انھوں نے اردو ادب کی دیگر اصناف میں اچھی خاصی مقبولیت حاصل کی۔ جس کا ڈاکٹر دلجیت ورما نے بھی اپنے ایک مضمون میں کیا تھا۔ ملاحظہ ہو ان کا ایک اقتباس:

> ''نرسنگھ داس نرگسؔ ریاست کے ان برگزیدہ ادیبوں اور صحافیوں میں سے ایک ہیں جنھیں بہت حد تک فراموش کر دیا گیا ہے لیکن ان کی ادبی اور صحافتی خدمات کی اہمیت آج بھی کم نہیں ہوئی ہے۔ نرگس (1973-1902) بیک وقت صحافی، شاعر، مورخ اور فکشن نگار تھے۔ انھوں نے عوامی اصلاح اور بیداری کے لیے ''چاند'' اور ''پریم'' کے نام سے مشہور اخبار اور رسالے نکالے۔ پریم منوہر کے قلمی نام سے پاربتی، برملا اور جانکی جیسے ناول لکھے اور مولا رام کوئی کے قلمی نام سے افسانوں کے مجموعے دکھیا دیس، سندیہ اور پردیسی پریم، لکھے۔ جن میں ریاست کے عوام کے دکھ درد کا بیان اور اصلاح وترقی کا جذبہ ملتا ہے......''

(168)

کرشن چندر:

جموں خطے کے دور دراز علاقہ پونچھ کو یہ فخر حاصل ہے۔ کہ اس سرزمین میں کرشن چند کا بچپن گزرا ہے، کرشن چندر نہ صرف جموں وکشمیر میں فکشن کے حوالے سے بڑا نام ہے، بلکہ اردو فکشن میں وہ ایک عظیم شخصیت کے مالک ہیں۔

انھوں نے ایسے دور میں فکشن نگاری کے میدان میں قدم رکھا جب اردو فکشن اپنے عروج پر تھا۔کرشن چندر کے اردو فکشن میں داخل ہونے سے اردو افسانے کو وہ تنوع، ہمہ جہت و ہمہ گیر، وسعت و گہرائی عطا کی جس سے اردو اردو فکشن میں چار چاند لگ گئے۔

کرشن چندر اگر چہ جموں میں پیدا نہیں ہوئے تھے لیکن جموں وکشمیر کے ساتھ ان کی بہت ساری یادیں جڑی ہوئی ہیں اوران کی زندگی کا ایک بڑا حصہ جموں وکشمیر میں گزرا ہے۔اور یہاں تک کہ ان کا بچپن بھی جموں خطے کے علاقہ پونچھ میں گزرا۔اس دوران میں انھوں نے اپنے بہت سارے افسانے اور ناول کشمیر کی عکاسی میں تخلیق کیے ہیں۔اس حوالے سے جموں کے فکشن نگاروں میں کرشن چند کا ذکر بے حد ضروری ہوجاتا ہے۔اگر چہ انھوں نے اردو فکشن میں متعدد افسانے اور ناول لکھے ہیں لیکن راقم ان کی مختلف افسانوں اور ناولوں کا ذکر جو انھوں نے جموں وکشمیر کے حوالے سے لکھے تھے۔چوں کہ کرشن ایک ایسی شخصیت کے مالک ہیں جن کی تخلیقی ادب پر درجنوں کتابیں تحریر کی جاسکتی ہیں۔

کرشن چندر کی ولادت 23/نومبر 1913ء کو بھرت پور ریاست راجستھان میں ہوئی تھی۔ان کے والد گوری شنکر چوپڑا جو بحثیت ڈاکٹر تھے اور جموں خطے کے دور دراز علاقہ پونچھ میں ڈاکٹر کے عہدے پر تعینات کیے گئے تھے۔کرشن چندر کی پیدائش کے پانچ برس بعد گوری شنکر چوپڑا کا تبادلہ جموں خطے کی سرزمین پونچھ میں ہوا تھا۔جہاں وہ کرشن چندر کو بھی اپنے ساتھ لے کر آئے اور پونچھ کے پرائمری اسکول میں ان کی تعلیم کی ابتدا کی۔یہاں سے کرشن چندر نے اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔اس حوالے سے بہت سارے قلمکاروں نے یہ لکھا ہے کہ کرشن چندر کی پیدائش پونچھ میں ہوئی تھی جو بے بنیاد ثابت ہوئی بلکہ نئی تحقیق کے مطابق یہ بات قابل ذکر ہے کہ کرشن چندر کی پیدائش راجستھان میں ہوئی تھی اور وہ اپنے والد کے ساتھ پونچھ میں آئے تھے۔اس حوالے سے پروفیسر بیگ احساس نے لکھا ہے کہ:

> ''کرشن چندر 23/نومبر 1913ء کو بھرت پور راجستھان میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد میڈیکل افسر کے طور پر ملازم تھے۔پانچ سال کی عمر میں وہ مینڈر کے پرائمری اسکول میں داخل ہوئے''۔(169)

کرشن چندر نے اپنی پرائمری تعلیم مینڈر اسکول سے حاصل کرنے کے بعد وکٹوریہ جوبلی اسکول پونچھ میں آئے جہاں سے انھوں نے 1929ء اپنی میٹرک کی تعلیم اچھے نمبروں کے ساتھ مکمل کی۔اس کے بعد وہ 1933ء میں لاہور چلے گئے جہاں سے انھوں نے بی اے کی پڑھائی مکمل کی اسی طرح سے 1935ء میں کرشن چندر نے ایم اے انگریزی

میں کیا اور 1937ء میں لاہور کالج سے ایل ایل بی کی ڈگری بھی حاصل کی۔ اگر چہ انھوں نے وکالت کا امتحان پاس کیا تھا۔ مگر انھیں اس میدان میں کوئی دلچسپی نہ تھی جس کی وجہ سے مزید تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگے وہ ''اقبال بحثیت شاعر'' کے موضوع پر اپنی پی ایچ ڈی کا مقالہ مکمل کرنا چاہتے تھے مگر اس کام کو وہ مکمل نہ کر سکے۔ 1939ء میں لاہور ریڈیو اسٹیشن میں پروگرام اسٹنٹ کی ملازمت کے فرایض انجام دینے لگے۔

اردو ادب سے کرشن چندر کا گہرا لگاؤ تھا۔ انھوں نے اردو فکشن میں ایک نمایاں رول ادا کیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ادب کی دوسری اصناف پر بھی طبع آزمائی کی تھی۔ ان کی ادبی تخلیقات کے حوالے سے اگر سرسری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں تقریباً 32 افسانوی مجموعے، لگ بھگ پچاس سے زائد ناول، سات ڈراموں کے مجموعے دو رپورتاژ دو بچوں کی کتابیں وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جو ملک کے مختلف رسائل وجرائد اور اداروں کی جانب سے منظر عام پر آئے ہیں۔ ان کی ان متذکرہ بالا تخلیقات کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بہت سارے موضوعات پر قلم اٹھایا تھا۔ جن میں دنیا میں ہونے والے مظالم، عوام کی بے بسی، غربت وافلاس کے گھناؤنے منظر، نا انصافیوں سے تڑپتی ہوئی انسانی روح کی سسکیاں، لالچ، نفرت، مذہبی تفریق، رنگ ونسل، ذات پات، امن بھائی چارہ وغیرہ جیسے موضوعات قابل ذکر ہیں۔

جموں میں اردو فکشن کے حوالے سے کرشن چندر کا منفرد مقام ہے۔ ان کے رگ رگ میں جموں وکشمیر بسا ہوا تھا۔ ان کے جن ناولوں میں کشمیر کی جھلک دیکھنے کو ملتی ہے ان میں ''شکست''، ''میری یادوں کے چنار''، ''مٹی کے صنم''، ''طوفان کی کلیاں''، ''برف کے پھول'' اور ''پیار ایک خوشبو'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان تمام ناولوں میں کشمیر کا خوبصورت منظر، وہاں کے عوامی مسائل، عام انسان کے روزمرہ زندگی وغیرہ کی بھرپور عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کا ناول ''میری یادوں کے چنار'' کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''یہ اگست کا خوبصورت دن تھا۔ ہمارے باغ بہت سرخ ہو چکے تھے اور ناشپاتیاں بھی تاراں کے چہرے کی طرح سنہری ہونے لگی تھیں اور ان کی جلد بھی اسی طرح ملائم اور شفاف دکھائی دیتی تھی۔ چنار کے پتوں کو جیسے آگ نے چھولیا تھا۔ ستمبر میں یہ چنار کے پتے بالکل شعلوں کی طرح بھڑک جائیں گے اور کھڑ کھڑا کر نیچے گریں گے پھر میں اور تاراں ان پتوں میں کھیلیں گے، ہم لوگ ان سنہرے پتوں کے تاج بنائیں گے اور ایک دوسرے کو پہنائیں گے۔ تین

چار پتوں کو ملا کر انھیں ندی کے کنارے اگنے والے سرکنڈوں کی تیلیوں سے جوڑ کر کشتیاں بنائیں گے''۔(170)

کرشن چندر نے اس ناول میں اپنے بچپن کے وہ واقعات جو انھوں نے وادی کشمیر میں گزارے تھے ان کی ہو بہو عکاسی کی ہے۔ اس میں انھوں نے وادی کشمیر کے مناظر کو اس طرح سے دکھایا ہے کہ پورا کشمیر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اس حوالے سے جگدیش چندر ودھاون نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''میری یادوں کے چنار'' کا کینوس بہت ہی محدود ہے۔ زیادہ تر اس کا تعلق کرشن چندر کے لڑکپن اور ان کے والدین کی خانگی زندگی سے ہے''۔(171)

مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کرشن چندر کی فکشن نگاری نہ صرف کشمیر میں بسنے والے غریب، مظلوم، بے بس لوگوں کی زندگی کے دردناک مناظر کی عکاسی کرتی ہے، بلکہ پورے ملک کی انسانی قدروں، محنت کش لوگوں کی زندگی کو پیش کرتی ہے۔ ان کا ذہن صرف عشق و عاشقی کی طرف مائل نہیں تھا، بلکہ ان کی کہانیوں میں ان کے عہد کے تمام مسائل کی تصویر کشی نظر آتی ہے۔ ان کی کہانیوں میں حقیقی اور جیتے جاگتے کردار دکھائی دیتے ہیں۔ انھیں بہت سارے انعامات واعزازات سے نوازا جا چکا ہے اور انھیں بہت ساری زبانوں پر بھی دسترس حاصل تھی جن میں انگریزی، اردو، روسی، چینی ، فارسی، جرمنی، فرانسیسی وغیرہ۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ قاری کو ایک کھلی فضا میں لے جا کر سیر کرواتے ہیں ، جہاں رنگ برنگے نظارے دیکھنے کو ملتے ہیں اور آخر کار اردو ادب کا یہ روشن ستارہ 8/مارچ 1977ء کو ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ انھیں ضلع انتظامیہ کی جانب سے جموں کے علاقہ پونچھ میں سپرد آتش کیا گیا۔

ٹھاکر پونچھی:

ان کا اصل نام سوہن لال تھا لیکن ٹھاکر پونچھی کے قلمی نام سے شہرت حاصل کی۔ ٹھاکر پونچھی کے افسانوں اور ناولوں میں ہر وہ چیز مل جاتی ہے، جو ایک افسانے کو''افسانہ''اور ناول کو''ناول'' بناتی ہے۔ اسی وجہ سے ان کی فکشن نگاری میں بیانات کی دلچسپ تفصیلات اور اثر اس وجہ سے نمایاں ہے کہ وہ عموماً اپنی جانی بوجھی فضاؤں، شناسا ماحول، دیہات کی منظر کشی، گاؤں کی روزمرہ کی زندگی اور جانے پہچانے اشخاص سے متعلق لکھتے ہیں۔ پریم چند اور ٹھاکر پونچھی کی کہانیوں میں بہت جگہ مماثلت ملتی ہے۔ حالانکہ پریم چند اردو ادب کی دنیا میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں مگر پھر بھی جس طرح سے ہندوستان میں پریم چند کا گہرا اثر رکھنے والوں میں ایک نام ٹھاکر پونچھی کا بھی ہے۔ مثلاً ان کے ایک ناول

کا عنوان ''بادل برسے'' ہے جس میں ٹھاکر پونچھی کے اس ناول کا ہیرو ''ہردیس'' اپنے اصلاحی تصورات میں پریم چند کے بعض کرداروں سے بہت متاثر ہے لیکن ناول کے مطالعے سے اس بات کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ وہ پریم چند کے اس نوع کے کرداروں سے زیادہ رومانی ہے اور ہر وقت وہ دن میں خواب دیکھتا رہتا ہے۔ آگے چل کر اس ناول میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک بوڑھا پنڈت لبھو رام جس سے ایسے اصلاحی خیالات کی توقع نہیں ہو سکتی تھی وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اور اونچ نیچ، ذات پات کے بندھنوں کو توڑنے کے لیے میدان میں اتر پڑتا ہے۔ یہاں ہردیش کی زندگی میں ایک اہم موڑ آتا ہے اور اس کا کردار ایک منفی بن کر دیکھنے کو ملتا ہے۔ پریم چند کی کہانیوں میں جہاں خاص طور پر اپنے عقیدے کے مطابق انجام دکھانے کے لیے پریم چند واقعات کو رفتار کا فطری نتیجہ دکھاتے ہیں تو وہیں اس کے برعکس ٹھاکر پونچھی کی کہانیوں میں انجام واقعات کی رفتار کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔ اور یہی ان کے عہد تک فن کا ارتقا کا بھی نتیجہ رہتا ہے۔ کبھی کبھی ٹھاکر پونچھی کے ناولوں میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پریم چند کے سماجی شعور سے آگے بڑھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جس کا ذکر عبدالقادر سروری بھی کرتے ہیں کہ ٹھاکر کا سماجی شعور بھی پریم چند کے عہد سے آگے بڑھا ہوا ہے۔ اسی طرح سے دیوندر ستیارتھی صاحب بھی ٹھاکر پونچھی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کے مکالموں میں موقع محل اور کردار کی حیثیت کے مناسب اتار چڑھاؤ اور لوچ نہیں ہے۔

ٹھاکر پونچھی نے تقریباً تیس ناول لکھے تھے جن میں ان کا پہلا ناول ''رات کے گھونگھٹ'' ہے۔ اس کے علاوہ ان کے مشہور ناولوں میں خاص طور پر ''چاندی کے سائے''، ''قفس اداس ہے''، ''وادیاں اور ویرانے''، ''ڈیڈی''، ''یہ من بڑا چنچل ہے'' (1965ء) ''یادوں کے کھنڈر''، ''شمع ہر رنگ میں جلتی ہے''، ''زلف کے سر ہونے تک'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ''یادوں کے کھنڈر'' ٹھاکر پونچھی کا اردو ناولوں میں ایک منفرد انداز کا کارنامہ ہے۔ اس ناول میں انھوں نے پہاڑی سینی ٹوریم کی اس طرح سے عکاسی کی ہے اور ایسے ایسے منظر دکھائے ہیں کہ مانو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی فلم آنکھوں کے سامنے چل رہی ہو۔ یہی ان کے فن کی خوبیوں میں سے ایک خوبی ہے۔ پہاڑی سینی ٹوریم اس کی جائے وقوع دلکش ماحول، اور سب سے بڑھ کر زندگی کے موقع جو اس طرح سے ٹھاکر پونچھی نے پیش کیے ہیں، شاید ہی کوئی دوسرا ناول نگار پیش کر سکتا ہو۔ سینی ٹوریم اور اس کے دق کے مریضوں کی فضا خود ایک گھمبیر موضوع ہے۔ لیکن نینی اور رابرٹ کا المیہ اس ناول کا سب سے اہم اور دل دہلا دینے والا واقعہ ہے۔ جس کو ناول نگار نے بڑی ہنرمندی اور جذبات کے ساتھ حسن انجام کو پہنچایا ہے۔ اس طرح کی مثالیں بہت کم جموں کے کہانی کاروں میں دکھایی دیتی ہیں۔ ناول نگار نے نینی اور رابرٹ کی محبت کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ قاری ہر موڑ پر آگے کا منظر دیکھنے کے لیے بیتاب رہتا ہے۔ اسی وجہ

سے رابرٹ کی محبت میں ڈوبی ہوئی نینی ناول کی اصل ہیروین بن جاتی ہے اوراس کے مقابلے میں ڈاکٹر اور رحمٰن ان دو کرداروں کو ابھارنے کے لیے ناول نگار پوری کوشش کرتا ہے اس کے باوجود بھی یہ دو کردار ثانوی حیثیت سے ابھر کر اس ناول میں ہمارے سامنے آتے ہیں۔

ٹھاکر پونچھی نے جیسا کہ راقم نے ذکر کیا کہ انھوں نے نہ صرف ناول نگاری میں اہمیت حاصل کی ہے بلکہ ان کے افسانے بھی قابل ذکر ہیں۔انھوں نے اردو فکشن میں اپنی ساری زندگی صرف کر دی تھی۔انھیں نہ صرف جموں صوبہ کے اہم فکشن نگار میں شامل کیا جاتا ہے بلکہ اردو کے بڑے فکشن نگاروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے ایک اور اہم اور ادبی کارنامہ اپنی یادگار چھوڑ رہے جو نیلامبر دیو شرما کی ڈوگری ادب پر تصنیف کا اردو ترجمہ ''جدید ڈوگری ادب کا ارتقا'' کے عنوان سے ہے، اور اس کو بہت ہی آسان اور سلیس انداز میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ان کی ہر تصنیف ریاستی کلچرل اکیڈمی کی جانب سے شائع ہو چکی ہے۔

ٹھاکر پونچھی افسانہ نگاری میں تو مہارت رکھتے ہی ہیں مگر اس کے ساتھ انہوں نے کئی ناول بھی تحریر کیے تھے۔جو وقتاً فوقتاً ریاست اور بیرون ریاست کے رسائل واخبارات میں منظر عام پر آتے گئے۔ٹھاکر پونچھی کے ناول بھی دیہات کی زندگی پر مبنی ہیں۔انہوں نے غریب، مظلوم، بے بس لوگوں کی زندگی کو پیش کیا ہے۔ان کے ناولوں میں خاص طور پر ''رات کے گھونگھٹ''، ''وادیاں اور ویرانے''، ''شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک''، ''چاندنی کے سائے''، ''پیاسے بادل''، ''یادوں کے کھنڈر''، ''زلف کے سر ہونے تک'' اور ''اب میں وہاں نہیں رہتا'' کے نام اہمیت کے حامل ہیں واضح رہے کہ اسی عنوان سے دیپک بدکی کا آٹھواں افسانوی مجموعہ جو 2017ء میں منظر عام پر آیا۔ٹھاکر پونچھی کے ناول ہر لحاظ سے قابل قدر ہیں۔ان کے ناولوں میں فنی، تکنیکی، ہیئتی خوبیوں کے ساتھ ساتھ حقیقی زندگی کی عکاسی بھی دیکھی جاسکتی ہے۔جان محمد آزاد اپنی کتاب میں ٹھاکر پونچھی کی فکشن نگاری پر یوں رقم طراز ہیں:

> ''افسانہ نگار کی حیثیت ٹھاکر پونچھی فن کے ہر معیار پر کھرے اترتے ہیں۔لیکن ان کی فنی صلاحیتوں اور تخلیقی نزاکتوں کا صحیح اندازہ ان کے ناولوں سے ہی ہوسکتا ہے۔رات کے گھونگھٹ آپ کا پہلا ناول تھا جو 1960ء کے آس پاس شائع ہوا۔یہ ناول شروع سے آخر تک دلچسپیوں اور دلفریبیوں کا مرقع ہے جس میں نئی تہذیب کے ان فرشتوں کی کہانی ہے جنہیں نئے نظام کی تاریک راتوں نے جنم دیا۔ٹھاکر نے اس ناول میں سماج کے حسین

چہرے سے پارسائی کے رنگین گونگھٹ الٹ دئے ہیں۔''(172)

ان کا پہلا ناول ''ڈیڈی'' کے عنوان سے 1953 میں شائع ہوا۔دوسرا ناول ''رات کے گھونگھٹ'' 1960 میں منظر عام پر آیا۔یہ ناول شروع سے آخر تک دلچسپیوں کا مرقع ہے۔اس ناول میں سماج کے ٹھیکے داروں کی اصلیت کو سامنے لایا گیا ہے۔یہ ناول کل ۱۵۵ صفحات پر مشتمل ہے، ناول کے ہر باب میں مصنف نے رومانیت کا اثر دکھایا ہے۔اس ناول کی تکنیک مرزا ہادی رسوا کے ناول ''امراؤ جان ادا'' سے ملتی ہے۔ اسی طرح سے مصنف کا تیسرا ناول 1960 کے آس پاس ''شمع ہر رنگ میں جلتی ہے'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔شمع ہر رنگ میں جلتی ہے ٹھاکر پونچھی کا تیسرا اور اہم ناول ہے اس ناول میں انہوں نے ایک مصور کی کہانی کو پیش کیا ہے جس کا نام وریندر بابو ہے اسی کے ساتھ ساتھ دوسرا کردار راجیش جو وریندر کا سب سے خاص دوست اور کہانی کار ہے۔دونوں کی دوستی ایک ہی ملاقات میں بن جاتی ہے ناول دراصل ایک مصور کا المیہ ہے اس میں مصنف نے دونوں کے کرداروں کا درد و کرب اور سماج کے ہاتھوں ان پر روا رکھنے والے سلوک کو عمدہ طریقے سے بیان کیا ہے۔

مصور اور کہانی کار دونوں جب تک اپنے فن میں حقیقی زندگی اور داخلی احساسات و جذبات کی ترجمانی کرتے رہے، تب تک انہیں کوئی بھی خریدار نہیں ملتا ہے۔مگر جب دونوں اپنے طور طریقے بدلتے ہیں سچائی اور فن برائے فن کے نظریے کو قربان کر کے بناوٹ اور تصنع کا لباس پہنتے ہیں، اور اپنی فنکاری کے ذریعے سے ظاہری نمائش اور عورت کے حسن و جمال کو عریاں طریقے سے پیش کرتے ہیں تو پوری دنیا ان کو داد دیتی ہے۔

ناول کے آغاز سے ہی مصور اور کہانی کار کے فلسفہ فن اور فلسفہ حیات پر سیر حاصل بحث کرتے ہے۔کہانی کار شروع میں جب اپنی کہانیوں کو خون جگر سے قلم بند کرتا ہے، تب تک اسے نظر انداز کیا جاتا ہے مگر جیسے ہی وہ داخلی دنیا سے کنارہ کش ہو کر خارجی دنیا کو اختیار کرتا ہے تو عریانیت و شہوانیت ان کی کہانیوں کا اہم جزو بن جاتا ہے اور ہر طرف ان کی کہانیوں کے خریدار نظر آتے ہیں اقتباس ملاحظہ ہو۔

"ایک دن تم اپنی کہانیاں بیچ کر گزارہ کرتے تھے, وریندر بابو نے دبی زبان سے کہنا شروع کیا لیکن خوش تھے فٹ پاتھ پر سویا کرتے تھے لیکن آرام کی نیند سوتے تھے میلا کچیلا لباس پہنتے تھے لیکن دھلے دھلے سے دکھائی دیتے تھے، آج تمہارے پاس نوٹوں کے بنڈل ہیں بہت بڑی کوٹھی ہے سفید اجلا لباس ہے ہر طرف کی بھوک مٹانے کا سامان ہے، پھر بھی تم

خوش ہو، نہ تمہیں نیند آتی ہے اور نہ چہرے پر وہ پہلی سی شگفتگی ہے‘‘(173)

مصور اور کہانی کار دونوں اپنی دوستی کے ساتھ ساتھ مختلف مسائل جیسے فن کے لوازمات ادب پر بحث کرتے ہیں، مصور اپنی زندگی کے آخری لمحے تک فن کو پیسے اور دولت وشہرت کے لئے قربان نہیں کرنا چاہتا ہے۔مگر دوسری طرف کہانی کار اپنے فن کو اپنی بھوک کی کمی کے لیے دنیا میں دولت وشہرت حاصل کرنے کے لئے کہانیاں لکھتا ہے۔اس ناول میں مصنف نے دونوں کے کرداروں کی زندگی کو عمدہ طریقے سے پیش کیا ہے۔دونوں سماج کے ستائے اور ٹھکرائے ہوئے ہیں۔اس ناول میں مصنف نے بہت حد تک جذبات نگاری سے بھی کام لیا ہے کہانی کار راجیش کے لئے پیٹ کی آگ کو بجھانا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔وہ اپنے پیٹ کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتا ہے اقتباس ملاحظہ ہو۔

" آرٹ کی کتنی قدر وقیمت تھی، وہ سوچتا، کاش کہ وہ قدر وقیمت سارے ملک میں ہوتی سارے ملک میں اس کی اجیالی دھوپ کھلی ہوتی، گوشے گوشے میں اس کی قدر دان ہوتے اور پھر ملک کا کلا کار اپنی کلا پر زندہ

رہتا کہانی کار اپنی کہانی پر اور اپنی شاعری پر زندہ رہتا۔"(174)

روپ کا کردار بھی اس ناول میں ایک اہم کردار ہے وہ اپنی محنت اور لگن سے اپنی محبت کو حاصل کرنا چاہتی ہے، وہ اپنے والد وریندر بابو کے فن کی تعریف صرف اس لئے کرتی ہے، کہ وہ اپنی محبت میں کامیاب ہو سکے وہ اپنے والدین کو اپنی ضد کی وجہ سے کامیابی حاصل کرا لیتی ہے، مگر اس کے برعکس ناول کا ہیرو اپنی محبت کی ناکامی کا ذمہ دار خود ہوتا ہے۔ ٹھاکر پونچھی نے اس ناول میں کردار نگاری، منظر کشی اور جذبات نگاری کو بہترین انداز میں پیش کیا ہے، اس ناول کے بارے میں جان محمد آزاد لکھتے ہیں۔

"یہ ان مردوں کی کہانی ہے جو عورت کو ایسے عریاں انداز میں دیکھنے کی تمنا کرتے ہیں، جس پر سے نظریں پھسل پھسل جائیں، اس تخلیق میں ایک اجڑی ہوئی تہذیب کا سارا درد سمٹ آیا ہے یہ ایک نوجوان کا قصہ ہے جس کے ہاتھوں نے عورت کو حسن بخشا اسے خاتون خانہ بنا دیا۔‘‘(175)

اس ناول میں مسرت انگیز اور صحت مند رومانی تخلیق جس کے ہر جملے سے چاندنی راتوں کے ماحول کی پر فضا بہاریں، روزمرہ زندگی کی رعنائیاں نغمہ باز ہیں۔اس ناول میں ٹھاکر پونچھی نے ان مردوں کی کہانی کو پیش کیا ہے جو

عورتوں کے انگ انگ کو عریاں انداز میں دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔جن کی سوچ ہمیشہ عورتوں کی عصمت پر رہتی ہے۔اس ناول میں ایک اجڑی ہوئی اوردم توڑتی ہوئی تہذیب دکھائی دیتی ہے۔یہ ایک ایسے نوجوان انسان کی کہانی ہے جس نے اپنے ہاتھوں سے عورت کو حسن بخشا اور پھر اسے خاتون خانہ بنا دیا۔ڈاکٹر مشتاق احمد وانی ٹھاکر پونچھی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''ٹھاکر پونچھی کا مطالعہ نہایت وسیع اور مشاہدہ بہت گہرا تھا۔ وہ سماجی برائیوں اور انسانی نفسیات کی باریکیوں پر گہری نظر رکھتے تھے۔''(176)

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ناول ایک مصوراورایک کہانی کار کی ناکامی کا قصہ بیان کرتا ہےلیکن اصل میں ناول ایک ایسے سماج کی عکاسی کرتا ہے جو اندر سے کھوکھلا ہو چکا ہے جہاں پر بناوٹ اور تصنع ہے ناول نگار نے مصوراور کہانی کار کے فن کوتو پیش کیا ہےمگر ساتھ ہی ساتھ ان کوسماج کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہوابھی دکھایا ہے۔

''وادیاں اور ویرانے'' ٹھاکر پونچھی کا شہکارناول ہے۔اس ناول کو نہ صرف ریاست جموں وکشمیر کے ادیبوں نے سراہا ہے بلکہ پورے برصغیر میں اسے بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔اس ناول کو ناقدین نے ایک بہترین تہذیبی ناول قرار دیا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹھاکر پونچھی نے اس ناول میں عمدہ طریقے سے تہذیبی وسماجی عکاسی کی ہے۔ مصنف نے اس میں بنجر، بیانوں اور شاداب پہاڑوں کے ایک حسین وجمیل قصے کو پیش کیا ہے۔اس ناول میں پونچھ کے حسین مناظر اور پہاڑی رومانس اپنے شباب پر دکھائی دیتے ہیں۔اس ناول کے اہم اور مرکزی کرداروں میں خاص طور پر مدن، کیرتی، رائے سنگھ، مادھو، رانی، کرما، سیٹھ، رادھے شام اور سروپ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔انہی کرداروں کے اردگرد پوری کہانی گھومتی ہے۔یہ سب کردار زندہ جاویداور حقیقی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔اس ناول میں مصنف نے دکھایا ہے کہ خوشحال طبقہ کا ہر نوجوان بے غرض محبت کا متحمل نہیں ہوتا ہےاور نہ ہی اس کی روح اور تخیل میں کسی طرح کی کوئی بلندی پیدا ہوتی ہے۔ٹھاکر پونچھی کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے کرداروں کو انفرادی طور پر پیش کرنے میں ماہر ہیں۔ انہیں ناول نگاری کا فن اچھے سے آتا ہے۔ٹھاکر پونچھی کے کردار ہمیں روزمرہ کی زندگی میں دکھائی دیتے ہیں۔جن کا خاص طور پر دیہاتی زندگی سے تعلق ہوتا ہے۔ٹھاکر پونچھی کا یہ ناول اپنی فنی خوبیوں کی وجی سے مہارت رکھتا ہے۔اس ناول میں اسلوب، کردار نگاری اور منظرکشی وغیرہ کو مصنف نے بڑی عمدگی کے ساتھ برتا ہے۔ریاست جموں وکشمیر کے خوبصورت مناظر اور لالہ زاروں، پہاڑوں، قصبوں اور دیہات وغیرہ کی اس طرح سے عکاسی جموں وکشمیر کے ایک دو

ادیبوں کو چھوڑ کر شاید ہی کسی نے کی ہے۔ٹھاکر پونچھی نے دیہاتی زندگی کے ہر ذرے کو اپنے ذہن میں بسایا تھا اور اسی کو انہوں نے عملی جامہ پہنایا۔ان کی ان کوششوں کے اس بیش بہا ادب کو آنے والی نسلیں سالہا سال تک اپنے ذہن میں بسا کر رکھے گی۔اس ناول کا مطالعہ کرتے ہوئے اردو کے مشہور نقاد ڈاکٹر شکیل الرحمان صاحب رقم طراز ہیں:

''ملک کی تقسیم کے بعد جو ناول اردو میں لکھے گئے ہیں ان میں وہ جمالیاتی رچاؤ فنی پختگی نفسیاتی نکتے اور جذبات کے اتار چڑھاؤ کہیں نظر نہیں آتے جو مجھے ٹھاکر پونچھی کے ناولوں میں ملتے ہیں۔ بلاشبہ جدید دور میں ٹھاکر کے ناولوں نے اردو ادب کی لاج رکھ لی ہے۔ان کے فن سے ہماری روایتوں کو آگے بڑھنے کا موقع ملا ہے۔اس میں یقیناً ایک تاریخی حیثیت ہوگی۔''(177)

ٹھاکر پونچھی صاحب نے اپنی زندگی کے تقریباً بائیس برس دلی میں گزارے تھے۔مگر انہیں ہر وقت اپنے گاؤں کی یاد ستاتی رہتی تھی۔انہوں نے اپنی اداسی کو اپنے افسانوں اور ناولوں کے ذریعے سے بھی پیش کرنے کی سعی کی ہے۔بائیس برس دلی میں رہنے کے بعد پھر وہ اپنے وطن جموں میں چلے گئے تھے جہاں وہ آخری دم تک رہے۔ٹھاکر پونچھی خود ایک ترقی پسند تھے اور ان کے ناولوں میں ترقی پسندی کے رجحانات بھی کافی جگہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ بقول برج پریمی:

''ٹھاکر پونچھی کے ناولوں میں ایک طرف ترقی پسند یکے رجحانات کارفرما ہیں اور دوسری طرف ڈوگرہ طرز زندگی کی حقیقت آمیز تصویریں بھی ملتی ہیں۔''(178)

اس کے علاوہ ٹھاکر پونچھی کے دیگر ناولوں میں خاص طرو پر اداس تنہائیاں،کلیوں کا مزار، یہ رشتے یہ لوگ، چاندی کے ہاتھ بھنور، پت جھڑ کے بچھڑے، جب پتھر روتے ہیں وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ٹھاکر پونچھی کا آخری ناول ''سورج سمندر میں ڈوبتا ہے'' کے عنوان سے لکھ رہے تھے مگر یہ ناول مکمل نہ ہوسکا۔ اس ناول کی تکمیل سے پہلے ہی ٹھاکر پونچھی کی ایک جہت حادثے میں 14 اگست 1973ء کو ریڈیو اسٹیشن کے گیٹ کے باہر کشمیر میں وفات ہوگئی تھی۔

ٹھاکر پونچھی کے بعض ناولوں کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ان کے یہ ناول بہت ہی اہمیت کے حامل ہیں۔ان کے ناول ہندی، پنجابی، بنگالی وغیرہ میں ترجمہ کئے جاچکے ہیں۔مصنف نے خود بھی ایک تصنیف کا ترجمہ کیا تھا۔انہوں نے نیلا مبر دیو شرما کی معروف ومشہور انگریزی کتاب ''جدید ڈوگری ادب'' کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔جو بہت قابل داد ہے۔انہوں

نے اس ترجمہ میں نہایت سادہ اور سلیس زبان کو استعمال کیا ہے۔اس کا یہ اہم ترجمہ 1968ء میں منظر عام پر آیا تھا۔اسی ترجمے کی اشاعت ریاستی کلچرل اکیڈمی کی جانب سے کی گئی تھی۔ٹھا کر پونچھی کی دیگر قابل ذکر تصانیف میں خاص طور پر ڈیڈی، یہ من بڑا چنچل ہے، چاندی کے سائے، یادوں کے کھنڈر وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

''یادوں کے کھنڈر'' ناول ''بیسویں صدی'' رسالہ دہلی سے منظر عام پر آیا تھا۔''چاندی کے سائے'' ناول بھی قابل ذکر ہے اور یہ ناول بھی رسالہ ''بیسویں صدی'' دہلی سے شائع ہوا تھا۔ یہ ناول 166 صفحات پر مشتمل ہے۔''یہ من بڑا چنچل ہے'' تقریباً 112 صفحات پر محیط ہے۔ان کا یہ ناول 1965ء میں دہلی سے شائع ہوا تھا۔''ڈیڈی'' بھی مصنف کا ایک قابل ذکر ناول ہے۔ یہ ناول 147 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ ناول 1953ء میں منظر عام پر آیا تھا۔

کرن کاشمیری:

جموں کے ایک اہم ناول نگار تھے۔ان کی ولادت 1934ء میں جموں میں ہوئی تھی۔کرن کاشمیری کا اصل نام دیوراج چوپڑہ تھا مگر ادبی دنیا میں انھیں کرن کاشمیری کے نام سے جانا جاتا ہے۔کرن کاشمیری کا ایک ناول ''خوابوں کے قافلے'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔اس ناول میں رومانیت اور حقیقت کے رجحانات کا خوبصورت اور حسین منظر دیکھنے کو ملتا ہے۔کرن کاشمیری کا یہ ناول فنی اور تکنیکی لحاظ سے قابل تعریف ہے۔اس کے بعد دوسرا ناول ''رات اور زلف'' کے عنوان سے سہانت پرکاشن کے زیر اہتمام سے 1982ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ ناول چودہ ابواب پر مشتمل ہے۔اس ناول کی وجہ سے کرن کاشمیری کو نہ صرف ریاست جموں وکشمیر میں شہرت حاصل ہوئی بلکہ دیگر ریاستوں کے قلمکاروں نے بھی ان کی خوب حوصلہ افزائی کی۔اس ناول میں مصنف نے رومانی اور شاعرانہ انداز بیان اپنایا ہے۔ناول کا مرکزی کردار منورما ہے۔جو سماج میں بہت ہی بدنام ہو جاتی ہے۔اصل میں مصنف نے اس ناول میں لوگوں کی حقیقی زندگی کے واقعات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔جس طرح سے منورما کے ساتھ بدسلوقی ہوتی ہے ایسے بہت سارے لوگ ہمارے سماج میں موجود ہیں۔جس کی نشاندہی کرن کاشمیری نے کی ہے۔ایسے لوگ سماج میں انسانیت کے نام پر ایک دھبا سا بن جاتے ہیں۔جو کبھی لوٹتے اور کبھی لٹتے رہتے ہیں۔کبھی دولت کو لوٹتے ہیں اور کبھی عورت کی آبرو اور عصمت ان کا نشانہ بنتی ہے۔ایسا ہی کچھ اس ناول میں منورما کے ساتھ بھی حادثہ پیش آتا ہے جیسے وہ خودکشی کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ یہ ناول فنی اعتبار سے بہت ہی قابل قدر ہے اس ناول کا شاعرانہ اور رومانی انداز سب سے زیادہ قارئین کی دلچسپی کا باعث بنتا ہے۔مثال کے طور پر ناول کے کچھ اقتباس پیش کیے جاتے ہیں:

''منورما کے حسن میں مجھے اس کے بدنصیب شوہر کی آرزو اور ادھورے پنوں کے تازہ تازہ لو
کی جھلک دکھائی دی۔اس کے چہرے پر چڑھی ہوئی پاوڈر کی ہلکی تہہ دیکھ کر مجھے محسوس ہوا
جیسے یہ اس کے شوہر کے ارمانوں کی بجھی ہوئی راکھ ہے''۔

''دن کے اجالے میں جو لوگ بچھڑ جاتے ہیں وہ رات کے دھندلکوں میں نہیں ملا کرتے ۔
رات چاہے کتنی ہی خوبصورت کیونہ ہو۔ رات آخر رات ہی ہوتی ہے۔کبھی دن نہیں
ہوسکتی''۔(179)

کرن کاشمیری کی تخلیقات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک حساس دل فنکار تھے۔ان کا رابطہ ریاست بھر کے ادیبوں اور قلمکاروں سے بڑا گہرا تھا وہ اپنے سماج کے گرد پھیلی ہوئی برائیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے سماج کے مظلوم،غریب اور بے بس لوگوں کے ساتھ عورت پر ہونے والی بدسلوکیاں کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا ہے۔جس طرح سے انسانی نفسیات کے عمیق مطالعہ سے جو واقعات وہ قلم بند کرتے ہیں بہت ہی قابل تعریف ہوتے ہیں۔مثال کے طور پر کرن کاشمیری نے اپنے ناول''رات اور زلف'' کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا:

''رات اور زلف زندہ حقیقی لوگوں کی کہانی ہے جو ہر شہر اور ہر معاشرے میں موجود ہیں۔جو
لوٹتے ہیں اور لٹتے رہتے ہیں یہ لوٹ کبھی دولت کی ہوتی ہے اور کبھی آبرو اور عصمت کی۔
منورما رات کے اندھیروں میں گھر نہ جاتی تو کیا کرتی ۔رات کی سیاہ زلفوں کا پھندہ بنا کر
خودکشی کے علاوہ منورما کے پاس چارہ ہی کیا تھا۔رات اور زلف کی منورما نے بھی خودکشی
کرلی۔اپنے اس محبوب کے سامنے جو اسے چاہتے ہوئے بھی اپنانے کو تیار نہیں تھا۔یہ ناول
بہت پہلے چھپ جانا تھا مگر ناول کے مرکزی کردار کی گزارش پر اس کا مسودہ دبائے رکھنا پڑا
تاکہ اصل زندگی میں اسے نئی منزلوں پر پہنچ کر جم جانے کا موقع مل سکے''۔(180)

کرن کاشمیری نے ناول نگاری کے علاوہ افسانہ نگاری میں بھی طبع آزمائی کی تھی۔انھوں نے افسانہ نگاری کے میدان میں 1951ء کے بعد قدم رکھا تھا اس کے بعد ان کے کئی افسانے ریاست اور بیرون ریاست کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ان کا ایک مشہور افسانہ''تنہا درخت'' کے عنوان سے ہے۔

مالک رام آنند:

مالک رام آنند اردو افسانہ کے علاوہ ناول نگار بھی تھے۔ انھوں نے اپنا پہلا ناول 1958ء میں ''نئے خدا'' کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ دوسرے سال میں ایک اور ناول ''دہکتے پھول شبنم آنکھیں'' کے عنوان سے پیش کیا۔ یہ ناول کلدیپ بک ڈپو جموں سے 1962ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ اس کے بعد مالک رام نے دو اور ناول لکھے جن میں ''صلیب اور دیوتا'' اور ''اپنے وطن میں اجنبی'' 1964ء میں شائع ہوئے۔ اسی طرح ان کا ایک ناولٹ ''نئے دن پرانے سال'' 1967ء میں منظر عام پر آیا۔ 1967ء کے بعد ان کا ایک قابل ذکر ناول ''میں امن چاہتا ہوں'' کے عنوان سے شائع ہوا جس میں انسان اور انسانیت میں فرق واضح ہو جاتا ہے اس ناول میں انھوں نے امن اور بھائی چارے کی مثال پیش کی ہے۔ مالک رام آنند کے ناول اپنے پورے فنی لوازمات کے ساتھ ابھر کر سامنے آتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مالک رام آنند کو ناول نگاری میں کافی دسترس حاصل تھی۔ اور اس طرح وہ ریاست کے سیر حاصل قلمکاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اپنے ایک خط میں مالک رام آنند یوں رقمطراز ہیں کہ:

> ''اتنا کچھ لکھنے کے بعد بھی ابھی تشنہ ہوں کیونکہ بعد کے دو سالوں میں مطالعہ بھی کچھ کم ہوا اور لکھنا بھی۔ لیکن اس کی وجہ میں سمجھتا ہوں کہ اردو ادب پر خاص کر ہماری ریاست میں جو جمود طاری ہے اور ہمارے ماحول نے ہم ادیبوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا ہے اس نے ہمارے خلوص اور ادب پر مکمل یقین کو ٹھیس پہنچانے کی کوشش کی ہے لیکن فن کی خدمت اور ادب کی خدمت جیالے کرتے ہی رہیں گے۔ کیونکہ ہم اردو ادب کے مستقبل سے مایوس نہیں ہیں''۔(181)

متذکرہ بالا اقتباس کے علاوہ بھی انھوں نے اپنی تخلیقات کے بارے میں کچھ باتوں کا ذکر کیا ہے۔ اور یہ باتیں قابل ذکر ہیں کیوں کہ جب ان کی تخلیقات کا گہرائی سے مطالعہ کیا جاتا ہے تو وہ ساری باتیں ان کی جو انھوں نے اپنی تحریروں کے بارے میں بیان کیں ہیں قابل ذکر ثابت ہوتی ہیں۔ ان کی ان باتوں میں نہ خود سرائی ہے اور نہ ہی کوئی غلط فہمی، بلکہ یوں کہا جاتا ہے کہ یہ سب پڑھنے والوں کی رہنمائی ہے۔ انھوں نے اپنی تحریر میں ایک جگہ لکھا ہے کہ:

> ''ناول اور افسانے میں، میں نے عام روش سے ہٹ کر ایک نئی روش اپنانے کی کوشش کی ہے اور میں اس روش میں کہاں تک کامیاب ہوں یہ تو میری تخلیقات پڑھنے کے بعد ہی کوئی

اندازہ لگا سکتا ہے‘‘۔(182)

مالک رام آنند نے کہانیاں لکھتے وقت ایک الگ ہی انداز اپنایا ہے۔ وہ اپنی تخلیقات کو لکھتے وقت نئے نئے اسالیب، نئے نئے موضوعات اور نئی نئی تکنیک کو پیش کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔اس بات کا اندازہ ان کے ناولوں میں خاص طور پر ناول ’’جانے وہ کیسے لوگ تھے‘‘ سے لگایا جا سکتا ہے۔ یہ ناول اپنی پوری فنی خوبیوں کے ساتھ ابھر کر سامنے آتا ہے۔اس ناول کا مرکزی کردار سنتوش ہے جو اپنی خیالوں کی دنیا میں کھویا رہتا ہے۔اور اپنے خیالوں میں ہی اپنی محبوبہ کے ساتھ وہ ساری باتیں کہہ دیتا ہے جو حقیقی معنوں میں بیان کی جاتیں ہیں۔سنتوش اپنی محبوبہ کے ساتھ خیالوں ہی خیالوں میں اپنے سارے دکھ درد اور پریشانیوں کو سنا دیتا ہے۔مگر پھر خیالوں کی دنیا سے باہر نکل کر سوچتا ہے کہ ’’ایک سپاہی کے لاشعور میں یہ انتشار ایسا نہیں کہ اس کے فرض کو جھٹلا دے۔ یہ ماضی کے گزرے ہوئے ریزے، اڑتی ہوئی چنگاریوں کی طرح بجھ جائیں گے۔ یہ سفر بہت طویل ہے۔

جوتیشور پتھک:

جوتیشور پتھک بھی جموں خطے کے اردو ادیبوں میں ایک اہم نام ہے۔انھیں زیادہ تر اردو فکشن کے حوالے سے مقبولیت حاصل ہوئی تھی اگر چہ ان کی تخلیقات میں ناول اور افسانوں کی بہت کم تعداد ہے مگر ان کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں فن افسانہ نگاری اور ناول نگاری پر عبور حاصل تھا۔ جوتیشور پتھک کا اصل نام جیوتی پرکاش کنڈوترہ تھا۔ ان کی پیدائش 18؍اکتوبر 1940ء کو صوبہ جموں میں ہوئی تھی۔ابتدائی تعلیم انھوں نے جموں سے ہی حاصل کی تھی۔اردو زبان کے ساتھ ساتھ وہ انگریزی زبان میں بھی مہارت رکھتے تھے۔انھوں نے اپنی ایم۔اے کی تعلیم انگریزی ادب سے ہی حاصل کی تھی اس کے بعد وہ ریاستی محکمہ اطلاعات میں ملازم ہو گئے تھے۔دوران ملازمت سے ہی وہ اردو کہانیاں لکھنے میں دلچسپی لیتے رہے اور اس کے بعد ان کی کہانیاں کافی مقبول ہوتی گئیں۔

جوتیشور پتھک کے کئی افسانے اب تک منظر عام پر آ چکے ہیں وہ افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ ناول نگاری میں بھی مہارت رکھتے تھے اس حوالے سے ان کا مشہور ناول ’’ہجوم‘‘ کے عنوان سے 1985ء میں منظر عام پر آیا تھا۔اس ناول کی وجہ سے ریاست کی بڑے بڑے ادیب ان کی طرف پہلی مرتبہ متوجہ ہوئے اور اس ناول کی وجہ سے ریاست بھر میں جوتیشور پتھک کے کارناموں کے چرچے ہونے لگے۔مصنف نے اس ناول کو خاص طور پر نئی نسل کے مسائل پر تخلیق کیا تھا۔اس ناول میں انھوں نے تشدد کے رجحانات کا پیش بین بین کر موجودہ دور کی صورت حال کے مسائل کو ذہن

میں رکھتے ہوئے اور جرات مندانہ تجزیہ کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی۔مصنف نے خاص طور پر اس ناول میں نئی نسل کا استحصال واضح کرنے کی طرف نشاندہی کی ہے، کہ نوجوان، معصوم، ضرورت مند لوگوں اور بے بس لوگوں کو سیاست میں پھنسانے کے جو ہتھکنڈے ظالم اور سیاست داں اپناتے ہیں۔ان سب کو واضح طور پر مصنف نے اس ناول میں دکھایا ہے۔ایسی بہت سی مثالیں اس ناول میں مل جاتی ہیں جس میں معصوم لوگوں کو سیاست کا شکار بنایا جاتا ہے اور ان کی مجبوری کا فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔اس ناول کے دو مرکزی کردار ہیں ایک مدھوکر اور دوسرا سادھنا۔ان دونوں کرداروں کے اردگرد پوری کہانی کا تانا بانا بنا گیا ہے۔اور کردار نگاری کے لحاظ سے ان دونوں کرداروں کو مصنف نے بڑے اچھے طریقے سے پیش کیا ہے۔اور کردار نگاری اس ناول میں سب سے زیادہ اہمیت کا درجہ رکھتی ہے۔اس کے علاوہ اسلوب، منظر نگاری، جذبات نگاری وغیرہ کو جوتیشور پتھک نے اچھی طرح برتا ہے۔

اس کے بعد ان کا دوسرا ناول ''میلی عورت'' کے عنوان سے 1986ء میں شائع ہوا یہ ناول ''کانچ کے رقیب'' کے عنوان سے اخبار میں سلسلہ وار شائع ہوتا رہا۔اس ناول کا موضوع سماجی قدروں کی پامالی ہے۔یہ ناول ایک دیہاتی لڑکی کی زندگی کا المیہ ہے۔جو بھٹکتی ہوئی دہلی کی پرفضا میں تو آجاتی ہے۔مگر اسے کبھی خوشی میسر نہ ہوسکی۔اس ناول کا مرکزی کردار چندن ایک ہونہار لڑکی ہے، جو مردوں کے بنائے ہوئے نظام میں اس طرح پھنس جاتی ہے کہ اس نظام سے باہر نکلنا اس کے لئے دشوار ہوجاتا ہے۔مصنف کا یہ ناول فنی اعتبار سے کامیاب ناول ہے۔

تنویر بھدرواہی:

محمد الیاس ملک تخلص تنویر بھدرواہی۔ان کی پیدائش 29؍فروری 1940ء کو امرتسر پنجاب میں اپنے ننہال میں ہوئی تھی۔ان کے والد گرامی کا نام ملک غلام مصطفٰے تھا۔ابتدائی تعلیم انھوں نے پنجاب میں ہی حاصل کی تھی۔تنویر صاحب نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ناول نگاری سے کیا تھا۔انھوں نے 1957ء میں جب وہ بھدرواہ میں لیکچرار تھے۔ایک ناول ''دو آنسو'' کے عنوان سے لکھا تھا۔اس ناول میں مصنف نے دو یتیم بچوں کی ایک غمناک داستان کو بیان کیا ہے۔مصنف نے اس ناول میں اس دور کی غربت افلاس، بے روزگاری وغیرہ جیسی چیزوں کی بھرپور عکاسی کی ہے۔

تنویر صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز 1960ء سے شروع ہوا تھا۔انھیں 1960ء سے 1964ء تک جموں میں رہنے کا موقع ملا اور اس دوران ان کو قادر حسین مجروح کی وساطت سے ''بزم فروغ اردو جموں'' کے ہفتہ وار اجتماعات میں شرکت کے مواقعے بھی فراہم ہوئے۔ان ہی مجلسوں اور ادبی محفلوں کی وجہ سے تنویر صاحب کو بہت سے شعراء وادبا

سے ملنے کا موقع ملا جن میں مکیش کاشمیری، حکیم منظور، منظر اعظمی، نورالزماں صدیقی نور اور رجیش گو ہرو غیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ 1963ء میں بزم جموں کی جانب سے ایک کل ہند مشاعرے کا انعقاد ہوا جس کی صدارت آنجہانی جوش ملسیانی نے کی تھی۔اس دوران تنویر صاحب کو بھی اس مشاعرے میں اپنا کلام سنانے کا موقع میسر آیا تنویر صاحب کے مقالے کا عنوان ''مکیش کاشمیری کی شخصیت'' تھا اس مقالے نے سامعین اور مجلس اراکین کو بہت متاثر کیا۔میکش کاشمیری کو ہی بعد میں تنویر صاحب نے رسمی طور پر اپنا شعری استاد کا درجہ دیا تھا۔ان کے علاوہ تنویر صاحب نے میر تقی میر، غالب اور اقبال جیسے بلند پایہ شاعروں کے کلام کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہوا تھا۔

تنویر بھدرواہی نہ صرف ایک اچھے شاعر تھے بلکہ اچھے نثر نگار بھی جانے جاتے تھے۔انھوں نے کئی ڈرامے، ناول اور افسانے بھی لکھے تھے مگر ان میں سے ان کی تخلیقات کو نثر سے زیادہ شاعری کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی گئیں جس کی وجہ سے ان کی اکثر نثری تحریر زائع ہوگئیں۔ان کی نثری تخلیقات کے حوالے سے پروفیسر ظہورالدین صاحب نے اپنی کتاب میں لکھا ہے:

> "During his college days he wrote a number of Novels, Dramas and Short-Stories but the poet in him had a by far powerful influence, who therefore, diverted his attention entirely towards poetry".(183).

ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ کلام ''پرتو تنویر'' کے عنوان سے نومبر 1994ء میں منظر عام پر آیا تھا۔اس شعری مجموعے کا انتساب خود تنویر بھدرواہی نے لکھا ہے اور اپنے والدین مرحوم کے نام کیا ہے جن کے زیر سایہ تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ ان کے دل میں شعر وادب کے تئیں والہانہ ذوق وشوق پیدا ہوا تھا۔

وجے سوری:

وجے سوری نے افسانوں کے ساتھ ساتھ ناول نگاری میں بھی شہرت حاصل کی تھی۔ان کا ایک ناول ''ایک ناو کاغذ کی'' کے عنوان سے پہلی بار کتابی شکل میں 1965ء میں نئی دہلی سے منظر عام پر آیا۔اس ناول میں مصنف نے ایک نوجوان طالب علم پال جو اس کہانی کا مرکزی کردار ہے اور اس کی ہم جماعت طالبہ جوالا کی محبت کو پیش کیا ہے۔کہانی بہت ہی دلچسپ ہے۔مصنف نے اس میں ہئیت اور تکنیک سے بخوبی کام لیا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''تو تم سوچ رہے ہو گے کہ میں پھر سے ہون کنڈ ھ میں جلوں گی ، پھر کسی کے ساتھ زندگی بھر کے ساتھ کا وعدہ کروں گی ، پھر کسی کا ہونا اقرار کروں گی ، اگر تم نے ایسا سوچا ہے تو...... قطعی غلط سوچا ہوگا .... کسی کے ساتھ جیون بھر ساتھ کا وعدہ تو میں ایک بار کر چکی ہوں ہون کنڈ ھ میں کب کی جل چکی ہوں اب تو ایک ہی آگ میں جلنا ہے اور وہ آگ چتا کی آگ ہے .... دیکھو دیکھوں شاید تمہاری آنکھیں بھیگ گئی ہیں .... ارے پگلے! تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ تمہاری محبت جیت رہی ہے تمہاری جوالا زندگی کی آخری سانس تک تمہاری ہی رہی .... یہ جیون تو ایک کاغذ کی ناؤ ہے جسے آج نہیں تو کل فنا ہونا ہے .... جب یہ خط تمہیں ملے گا میں تم سے بہت دور جا چکی ہوں گی ۔ لیکن تمہیں قسم ہے کہ تم زندہ رہنا میری آخری خواہش ہے تم پر تمہارے دیش کا حق ہے تم ملک اور قوم کی امانت ہو .... ہندو دھرم کے مطابق میاں بیوی کا رشتہ جنم جنم کا ہوتا ہے اور اگر مجھے اس جنم میں تمہاری خدمت کا موقع نہیں ملا تو دوسرے جنم میں ضرور تمہاری داسی بنوں گی .... اچھا اب اجازت ....! تمہاری اور صرف تمہاری جوالا''۔(184)

مذکورہ بالا اقتباس سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وجے سوری کو فن افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ ناول نگاری میں کافی مہارت تھی۔

آنند لہر:

آنند لہر نے افسانہ نگاری کے علاوہ ناول نگاری اور ڈراما نویسی میں بھی خوب نام کمایا ہے۔ان کا پہلا ناول ''اگلی عید سے پہلے'' کے عنوان سے 1997ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ یہ ناول کل 110 صفحات پر مشتمل ہے۔آنند لہر نے یہ ناول کشمیر کی لڑائی میں مرنے والوں کے نام کیا ہے۔اس کے بارے میں انہی کی زبان سنیے: اقتباس:

''کشمیر کی لڑائی میں مرنے والے ان لوگوں کے نام جنھیں سیکورٹی فورسز کے سپاہی یا اگروادی کہا گیا۔ حالانکہ وہ بھی رشتوں ، ناطوں ، سلسلوں اور تعلقات میں بندھے تھے اور گھر کے دروازے ان کے انتظار میں بھی کھلے تھے''۔(186)

آنند لہر کے اس ناول کا گہرائی سے مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک کشمیری عوام کی درد بھری کہانی ہے۔

اس کو مصنف نے اپنے خون جگر سے سینچا ہے۔اس کہانی میں مصنف نے کشمیر میں بسنے والے تمام لوگوں کی تصویر کشی کی ہے۔مصنف نے اس کہانی میں ہندوستان کے بٹوارے سے لے کر تا حال تک سرزمین کشمیر کی ہر چیز کو ہو بہو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

آنند لہر نے سرزمین کشمیر کی جو درد بھری داستان بیان کی ہے وہ دراصل نصف صدی پر پھیلی ہوئی ہے۔اس داستان کو پڑھنے سے مانو ایسا لگتا ہے کہ جیسے کوئی فلم آنکھوں کے سامنے چل رہی ہو۔مصنف نے اس ناول میں قاری کی دلچسپی کا خاص خیال رکھا ہے۔پروفیسر جگن ناتھ آزاد اس ناول کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

''سرزمین کشمیر کی یہ درد بھری روداد جو نصف صدی پر پھیلی ہوئی ہے ایک ایسی روداد ہے جس میں روشنی اور اندھیرا ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔کہیں کہیں متصادم بھی ہو جاتے ہیں اور نتیجہ کہیں اندھیرا فتح یاب ہوتا ہے اور کہیں روشنی لیکن انجام روشنی ہی کامران و نصرت یاب ہوتی ہے۔''(186)

سرزمین کشمیر کی محبت ان کے روم روم میں بسی ہوئی تھی جس کا اندازہ اس ناول سے لگایا جا سکتا ہے۔شروع سے آخر تک اس ناول میں ربط برقرار ہے۔ناول نگار نے کہانی اتنی سادہ اور عام الفاظ میں بیان کی ہے جس سے کہانی کا پورا لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔اس ناول کی ایک خاص خوبی آنند لہر کا معروضی انداز بیان ہے اور موضوعی انداز بیان سے گریز ان کی ذہانت کی دلیل دیتا ہے۔معروضی انداز بیان کی پکڑ ہمیشہ انہوں نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے اور اس کو کہیں بھی اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔پھر چاہے وہ کشمیر کے لوگوں کی ہجرت مکانی ہو یا کوئی اور دوسری وجہ غرض کہ معروضی انداز بیان سے مصنف نے خاص طور پر کام لیا ہے۔اور ہندو مسلم اتحاد کی یہ ایک بہترین مثال ہے۔جس کا ذکر اس ناول میں بار بار کیا گیا ہے یہ ناول کل 110 صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں مرکزی کردار خاص طور پر عبدل، بدی، شانتی، سلیمان، اسلم، نارائین، اکبر، رشید وغیرہ اس کے علاوہ بہت سارے اس میں ضمنی کرداروں کو بھی پیش کیا ہے۔مگر کہانی کا تانا بانا ان ہی اہم کرداروں کے اردگرد بنا گیا ہے۔ان میں سب سے اہم کردار سلیمان، بدری اور عبدل ہیں۔اور تینوں بچپن کے دوست تھے۔عبدل کا کردار مصنف نے ایک علامتی طور پر پیش کیا ہے جو قومی یکجہتی کی سب سے بڑی مثال ہے۔عبدل کچھ زیادہ امیر آدمی نہیں ہے، کلچے بیچنے کا کام کرتا تھا۔مگر اس کا نعرہ بہت بڑا ہے اس کی زبان میں ہر وقت نعرہ

گونجتا ہے کہ ’’شیر کشمیر کا کیا ارشاد، ہندو مسلم سکھ اتحاد‘‘۔

اس ناول میں مصنف نے کشمیر میں ہونے والے تمام واقعات کو پیش کیا ہے کہ کس طرح سے قبائلیوں نے کشمیر کے لوگوں پر ظلم کیے اور یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کی رشاکشی کے درمیان کشمیر کے لوگوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ چاہے وہ ہندو ہوں، مسلمان ہوں یا پھر سکھ غرض تمام لوگوں نے صدیوں سے مشکلات کا سامنا کیا ہے مگر چین پھر بھی دونوں ملکوں میں سے ایک میں بھی نہیں آیا آخرکار پھر بھی لوگوں کو اپنی ہی سرزمین کشمیر کی یادیں ہی ستاتی ہیں۔ یہ ناول کشمیر کی بھرپور عکاسی کرتا ہے چاہے وہ تہذیب وثقافت ہو، کلچر ہو یا قومی یکجہتی، تمام طرح کی چیزیں مصنف نے اس میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس ناول کی شروعات بہت ہی محبت بھرے انداز میں کی ہے۔ عبدل اور سلیمان دونوں بدری کے گھر آتے تھے یہ ان کا دستور بن گیا تھا کہ جب تک وہ تینوں نہ ملیں ان کو ایک دوسرے کے بغیر چین نہیں آتا تھا۔ بدری کا کردار یہاں پورے کشمیری پنڈتوں کی عکاسی کرتا ہے۔ سلیمان کے والدین کی بچپن میں ہی وفات ہوگئی تھی اس کے بعد بدری کے والد نے اُسے پالا تھا اور پھر نماز کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ کشمیر کا خوشگوار ماحول دیکھ کر ہر کوئی حیران رہ جاتا تھا اور تمام لوگ چاہے وہ ہندو ہوں مسلمان ہوں یا سکھ ہر کوئی ایک دوسرے کے ساتھ ایکتا اور بھائی چارے سے رہتا تھا یہی سب اس ناول کے شروع میں مصنف نے بیان کیا ہے۔ اس ناول کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ناول کہیں نہ کہیں حقیقت پر مبنی ہے۔

ناول کے شروعاتی چند صفحات میں مصنف نے اس دور کی عکاسی کی ہے جب کشمیر میں سپاہیوں کا ظلم و جبر وہاں کے لوگوں پر ڈھایا جاتا تھا۔ سلیمان بدری اور عبدل تینوں اس ناول میں امن اور بھائی چارے کی مثال ہیں۔ چونکہ جب تک صبح بدری سنکھ نہیں بجاتا تھا تب تک عبدل اور سلیمان اور باقی نماز نہیں پڑھتے تھے اور چونکہ بدری کے سنکھ بجانے پر ہی عبدل اور سلیمان کو پتہ چلتا تھا کہ نماز کا وقت ہوگیا ہے یہی سب نہیں بلکہ بدری کی بیوی اور بیٹی کی جہاں عزت کا سوال ہوتا تو وہاں سب سے پہلے عبدل اور سلیمان آکر کھڑے ہو جاتے تھے۔ یہی سب کچھ دیکھ کر قبائلیوں نے اس امن اور بھائی چارے کی مثال کو توڑنے کی کوشش کی۔

ایک بار قبائلیوں میں سے ایک نوجوان بدری کے گھر سے سنکھ چرالایا تاکہ انھیں یہ پتا تھا کہ اگر سنکھ نہیں بجے گا تو لوگ نماز بھی نہیں ادا کر پائیں گے۔ اس بات کا بدری پر گہرا اثر ہوا اور نہ صرف بدری بلکہ سلیمان اور عبدل بھی چوری پر

کافی غم و غصے میں تھے۔ اگر چہ وہ سنکھ دیکھنے میں ایک معمولی چیز تھی مگر اس کی اہمیت اور طاقت کئی ہتھیاروں سے زیادہ تھی ۔ یہاں مصنف نے کس طرح سے الفاظ بیان کیے ہیں اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ''یہ لیجیے حضور سنکھ'' قبائلی حیرانگی سے اُس سنکھ کو دیکھنے لگے اور سناٹا چھا گیا۔ ان کے پاس بہترین اور جدید قسم کے ہتھیار تھے۔ وہ خونخوار بھی تھے اور ظالم بھی، مگر نہ جانے کیوں انھیں اس سنکھ سے ڈر لگنے لگا۔ کیپٹن نے سناٹا توڑتے ہوئے کہا۔ '' لگتا ہے اس لڑائی کو اب ہم جیت جائیں گے''۔ ''حضور یہی سنکھ ان کا محافظ تھا............ بڑا ناز کرتے تھے اس پر''۔
>
> 187)

اگر چہ قبائلیوں کے پاس بہت بڑے بڑے ہتھیار تھے مگر وہ ایکتا اور اتحاد کے ہتھیار سے بہت ڈرتے تھے اور عبدل ایک چھوٹا سا آدمی جو صرف کلچے بیچنے کا کام کرتا تھا مگر اس کے نعرے سے قبائلی کانپ جاتے تھے۔ اس طرح کی ایکتا اور بھائی چارہ کی کئی مثالیں مصنف نے اس ناول میں پیش کی ہیں۔ اس میں ایک ریشماں نام کی لڑکی جو کہ گاؤں کی ایک ادھیڑ عمر کی عورت ہے اس کا اس گاؤں میں داخل ہونے کا کچھ اتہ پتہ نہیں تھا اگر چہ وہ ان پڑھ تھی مگر ہندو مسلمان دونوں مذاہب کی قدر کرتی تھی اور اللہ اور اوم میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتی تھی وہ ایکتا کی ایک اچھی مثال ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''ریشماں گاؤں کی ایک ادھیڑ عمر عورت تھی ۔ وہ اس گاؤں میں کب اور کہاں سے آئی کسی کو معلوم نہیں مگر سب جانتے تھے کہ وہ ان پڑھ ہے۔ اتنی ان پڑھ کہ اپنا دستخط بھی نہ کر سکتی تھی۔ انگوٹھا لگاتی تھی۔ یہاں تک کہ اوم کو اللہ اور اللہ کو اوم پڑھتی تھی۔ کبھی کوئی اعتراض کرتا تو صرف اتنا کہتی یہ پڑھے لکھوں کا کام ہے وہ جانیں مجھے تو دونوں ایک ہی جیسے لگتے ہیں''۔(187)

اسی طرح سے ایک اور قومی یکجہتی کی مثال مصنف نے بڑے ہی اچھے انداز میں بیان کی ہے عبدل کو لگتا تھا کہ کشمیر میں جو کچھ بھی غلط ہو رہا تھا وہ سب کی وجہ تھی کہ لوگوں نے نماز چھوڑ دی ہے زکات دینی چھوڑ دی ہے اور دوسرے مذہب کو عزت کرنا چھوڑ دی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''جب کسی سے کوئی جواب نہ بن سکا تو ایک شخص نے عبدل سے پوچھا'' تم ہی بتاؤ ایسا کیوں

ہوا؟'''' ایسا اس لیے کیوں کہ تم لوگوں نے نماز پڑھنی چھوڑ دی، زکات دینی چھوڑ دی۔ کیونکہ سچ تو یہ ہے کہ جو خود نماز نہیں پڑھتا وہی دوسرے کی پوجا پر اعتراض کرتا ہے''۔(188)

بدری کے سنکھ کی چوری ایک معمولی چوری نہیں تھی بلکہ پوری کشمیری پنڈتوں، مذہب، عزت، تہذیب کی چوری تھی۔ مگر اس غم میں پوری کشمیری قوم بدری کے ساتھ تھی اسی لیے قبائلی بھی بھائی چارے یہ نہیں چاہتے تھے کہ کشمیری پنڈت اور کشمیری مسلمان ایکتا بنائے رکھیں۔ اور اس مذہبی پھوٹ کے علاوہ قبائلیوں کے پاس اور کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا جس سے وہ ہندو مسلمانوں کو الگ کر سکتے تھے اس لیے انھوں نے مذہبی سہارا لے کر دونوں کو الگ کرنے کی کوشش کی۔

اس ناول میں مصنف نے گاندھی جی اور نہرو جی اور ساتھ میں شیخ محمد عبداللہ کے سچے اصولوں کی بھی کئی جگہوں پر مثالیں دی ہیں۔

اس ناول میں مصنف نے کشمیر کی دو حصوں میں عکاسی کی ہے پہلے حصے میں یہ دکھایا ہے کہ کس طرح سے سرزمین کشمیر کے لوگ ایکتا، امن اور بھائی چارے سے زندگی گزارتے تھے۔ اور دوسرے حصے میں یہ دکھایا ہے کہ لوگ اپنی ہی دھن میں مگن رہتے ہیں کوئی کسی کے جذبات کو سمجھنے والا ہی نہیں ہے نہ کوئی عمر کا لحاظ رکھتا ہے اور نہ ہی کوئی امن، بھائی چارے کی بات کرنے والا ہے۔

مصنف نے عبدل کو جب ناول کے دوسرے حصہ میں دکھایا ہے تو وہ حیران ہو جاتا ہے اپنے ہی کشمیر کو دیکھ کر وہ اپنا سارا بچپن یاد کرتا ہے مگر اس کو اپنا ہی کشمیر اجنبی شہر لگنے لگتا ہے، اپنے ہی لوگ پرائے لگنے لگتے ہیں۔ کشمیر کی ہر چیز سے اسے ڈر لگتا ہے۔ وہ پورے کشمیر کا دورہ کرتا ہے مگر اس کو کہیں پر بھی سکون نہیں ملتا ہے۔ اسے اپنے بچپن کے سارے قصے یاد آتے ہیں مگر اب وہ خود کو ایک انجان جگہ پر پاتا ہے۔ وہ پورا کشمیر دوڑ دوڑ کر چھان مارتا ہے مگر اسے نہ وہ پرانے دوست دکھائی دیتے ہیں اور نہ ہی وہ تہذیب وغیرہ۔

جب عبدل کو سرزمین کشمیر میں کہیں پر بھی چین و سکون نہیں ملتا ہے تو وہ سمجھ جاتا ہے کہ جب سے بدری کشمیر چھوڑ کر گیا ہے تب سے لوگ ایک ساتھ سنکھ اور نماز نہیں پڑھ رہے ہیں، تب سے یہ ساری پریشانی ہو رہی ہے لہٰذا عبدل کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اب کسی بھی طرح سے بدری کو ڈھونڈنا ہوگا اور واپس کشمیر لانا ہوگا۔ اب عبدال جموں کی طرف روانہ

ہوتا ہے اور اسے کڑی مشقت کے بعد ایک ٹینٹ میں بدری کا پتہ مل جاتا ہے۔

جب عبدل نے جموں میں بھی اپنے لوگوں کی یہ حالت دیکھی تو اس سے رہا نہیں گیا اور واپس اُس نے راتوں رات بس پکڑی اور دوسرے دن صبح کشمیر پہنچا اب کشمیر کے لوگوں کو اس نے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ جو کچھ بھی کشمیر میں غم اور مشکلات اور دہشت گردی ہو رہی ہے یہ سب اس وجہ سے ہے کہ لوگوں نے نماز پڑھنا چھوڑ دی ہے اور اور بدری بھی کشمیر چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اب اگر کشمیر کے حالات ٹھیک کرنے ہیں تو ایک ساتھ سنکھ بھی بجنا چاہیے اور نماز بھی ہونی چاہیے اور اس کے لیے سب سے پہلے بدری کو واپس لانا ہوگا وہ بھی ''اگلی عیدہ سے پہلے''۔ اس اقتباس پر ناول کا انت ہوتا ہے اور اسی سے مصنف نے اس کا عنوان بھی یہیں رکھا ہے۔

آنند لہر کا یہ ناول ہر طرح سے ایک قابل قدر ناول ہے۔ فنی اعتبار سے بھی اس میں تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ اس ناول کے پلاٹ کی بات کریں تو یہی مربوط اور گتھا ہوا ہے اور کہیں بھی کوئی جھول نظر نہیں آتا ہے۔ کہانی قصہ در قصہ آگے بڑھتے جاتی ہے اور قاری اس کا لطف اٹھاتے رہتے ہیں اور آخر تک یہ سلسلہ یوں ہی برقرار رہتا ہے۔

کردار نگاری کے حوالے سے بھی یہ ایک اچھا ناول ہے۔ اس میں بدری کا کردار کشمیری پنڈتوں کی عکاسی کرتا ہے اور عبدل کا کردار ایک امن پسند ہے، جو ہر ممکن کوشش کر کے اپنے صحیح اور پکے اصولوں پر چلتا ہے۔ سلیمان کا کردار ایک سچے مسلمان کا کردار دکھایا ہے۔ جو قومی یکجہتی، امن اور بھائی چارے اور ایکتا کی ایک اچھی مثال ہے۔ مصنف نے کرداروں کے ذریعے سے اچھی طرح سے کام لیا ہے انھیں کرداروں کو ان کی شخصیت کے اعتبار سے کام لینا اچھی طرح آتا ہے۔ مثلاً وہ ایک جگہ پر کہتے ہیں کہ:

> ''کیپٹن تمھیں معلوم ہے ہم یہاں کیوں کامیاب نہیں ہوسکتے'' تم ہی بتاؤ کیپٹن نے سوالیہ لہجے میں بات کی۔ ''ایک نعرہ ہمیں کامیاب نہیں ہونے دیتا''۔ وہ کیا؟ ''کیپٹن نے پوچھا'' وہ نعرہ ہے ''شیر کشمیر کا کیا ارشاد، ہندو مسلم سکھ اتحاد'' قبائلی نے جواب دیا۔ ''یہ بالکل سچ ہے'' کیپٹن نے کہا............اسی نعرے نے تو جناح کو بھی کامیاب نہیں ہونے دیا۔ اور اس نعرے میں گاندھی کو روشنی کی کرن نظر آئی تھی''۔(189)

اسی طرح سے مصنف نے اس ناول میں منظر نگاری کو بھی بڑے اچھے طریقے سے پیش کیا ہے۔ کشمیر میں اس دور کی زندگی کے سارے واقعات ناول نگار نے اس طرح سے پیش کیے ہیں کہ پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی

ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''سلیمان وہاں سے سیدھا گھر گیا پھر اس نے اپنے سارے گاؤں کا چکر لگانا شروع کردیا۔ اس نے دیکھا کہیں اسکول بنانے کے منصوبے بن رہے تھے کہیں اسپتال بنانے کے کہیں سڑک بنانے کے بارے میں سوچا جارہا تھا۔قبائلی تقریباً صبح وردیاں پہن کر اسکول جاتے تھے تو لگتا تھا کہ زمین پر تتلیاں اُڑ رہی ہیں۔شام کو بوڑھے چنار کے درختوں کے نیچے بیٹھ کر گفتگو کرتے تھے۔لگتا تھا کہ چنار کے پتے کشمیر کی حسن کی دیوی کو چھپا کر رکھتے ہیں۔چنار کے درخت اگنے کے ساتھ ہی کشمیر کا وجود سامنے آیا تھا۔کبھی کبھی لگتا ہے کہ چنار کا بیج جنت سے فرشتوں نے یہاں پھینکا ہو''۔(190)

اس متذکرہ بالا اقتباس سے معلوم ہوجاتا ہے کہ آنند لہر کو ناول نگاری کے فنی لوازمات سے اچھی طرح واقفیت تھی۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس ناول میں ناول نگاری کی تمام فنی لوازمات کو قابو میں رکھا ہے۔اس ناول میں جذبات نگاری بھی کمال درجہ کی ہے۔

اس وقت کشمیر میں عام لوگوں پر کس طرح سے ظلم ہوتا تھا۔اور جس جگہ کو جنت مانا جاتا تھا اس کشمیر کے نام سے لوگوں کے اندر ڈر بیٹھ گیا تھا۔عرض کہ ان تمام باتوں سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آنند لہر نے جس دور میں یہ ناول لکھنے کی کوشش کی تھی اس دور کے سرزمین کشمیر میں ہونے والے تمام واقعات انھوں نے اس ناول کے ذریعے سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔اس ناول میں مصنف نے بالکل سادہ اور عام زبان کا استعمال کیا ہے یہی وجہ ہے کہ اگر اس ناول کو چاہے اس کے اسلوب یا پلاٹ یا کہانی کے حوالے سے پرکھا جائے یا اس کی دیگر خوبیوں کی وجہ سے پرکھا جائے ہر لحاظ سے یہ ایک کامیاب ناول دیکھا جاسکتا ہے۔

اس کے بعد آنند لہر کا دوسرا ناول ''سرحدوں کے بیچ'' کے عنوان سے 2004ء میں منظر عام پر آیا تھا۔مصنف کی اکثر تصانیف میں بے بس اور غریب لوگوں پر آئے دن گزرنے والے قصے کہانیاں دیکھے جاسکتے ہیں۔اس ناول میں مصنف نے سرحدوں کے بیچ ہونے والے تمام واقعات کو بیان کیا ہے۔

مصنف کا تیسرا ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' کے عنوان سے 2005ء میں منظر عام پر آیا تھا، یہ ناول کل 138 صفحات پر مشتمل ہے۔اس ناول میں بھی کئی قومی یکجہتی کی مثالیں ہیں۔اس ناول میں مصنف نے ایک ایسا موضوع

اپنایا ہے۔ جو دور حاضر کی بہترین عکاسی کرتا ہے مگر اس ناول کی نوعیت یہ ہے کہ ہر دور میں انسان نے طاقتور بننے کی کوشش کی ہے پھر چاہے وہ بھاگ دوڑ کے ذریعے سے ہو یا ہتھیاروں کے استعمال سے ہو، مگر انسان کے اس طاقتور بننے کے لیے جو ہتھیاروں کا سہارا لیا اس کے برے نتائج سے نہ صرف انسان اور جانور متاثر ہوئے بلکہ چرندے پرندے پر بھی گہرا اثر پڑا۔ چرند پرند بھی ان اثرات سے محفوظ نہ رہ پائے۔ اس ناول میں مصنف نے مغربی ممالک کی عکاسی کی ہے اور امریکہ اور عراق میں ہونے والی تباہی کو مصنف نے بڑے ہی خوبصورت انداز میں تصویر کشی کی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ انھوں نے دیگر انسانی مسائل کا بھی احاطہ کیا ہے جس کی چند مثالیں یہ ہیں جیسے پڑوسی ممالک کے آپسی تناؤ، انسانی رشتوں کا زوال اور ان کی بے حرمتی، اپنی طاقت سے ناجائز کام لینا، امیر اور غریب لوگوں کا استحصال، ہتھیاروں کا غلط استعمال کرنا، کم ظرف انسان کا فائدہ اٹھانا وغیرہ غرض کہ دور حاضر میں ہونے والے تمام انسانی مسائل کا احاطہ کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنند لہر نے انسانی ذہن کو اچھے سے سمجھ اور پرکھ لیا تھا۔ مگر ایک بات ان کے بارے میں حیران کن ہے کہ مصنف پیشے سے ایک وکیل تھے اور سپریم کورٹ کے وکیل ہونے کے باوجود انہیں کیا ہے اتنا وقت مل جاتا تھا جس سے وہ ناول نگاری میں مشغول ہو جاتا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اردو زبان وادب سے انہیں کتنا لگاؤ تھا جس کی بڑی مثال ان کے ناول اور افسانے وغیرہ ہیں۔

آنند لہر ایک امن پسند شخص تھے ان کی تخلیقات میں اکثر جگہ انسان دوستی، بھائی چارہ، قومی یکجہتی کی آوازیں گونجتی ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ وہ ایک ایماندار اور سچے انسان بھی تھے جس کا اندازہ ان کی تحریروں کے مطالعے سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ اور ایسا ہونا بھی ضروری تھا کیوں کہ ان کا ذاتی زندگی میں پیشہ ہی ایسا تھا جہاں ایماندار لوگ اپنی ایمانداری کے لیے اپنے حق کی آوازیں بلند کرتے تھے۔ جہاں غلط لوگوں کو سولی پر چڑھایا جاتا اور بے گناہوں کو باعزت بری کیا جاتا ہے۔ آنند لہر نے حقیقت میں بھی پوری زندگی حق اور انصاف کی لڑائی اور اپنی تخلیقات کے ذریعے سے بھی حق اور انصاف کے خلاف آواز اٹھائی۔ انہیں رشوت خوری، دہشت گردی، ناانصافی، بدامنی، ظلمت وغیرہ جیسی چیزوں سے سخت نفرت تھی۔ ایسی ہی مثالیں ان ہی کی تحریروں اور خاص طور پر ان کے ناولوں میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ انسانی رشتوں کی قدر کی ایک سب سے بڑی مثال ان کا ناول ''مجھ سے کہا ہوتا'' ہے۔ اس ناول میں مصنف نے پرندوں اور جانوروں کی زبانی سے انسانوں کے جذبات کو بیان کیا ہے۔ اس میں زمین پر ہونے والی تباہی کو محسوس کرتے ہیں کہ ایٹمی تباہی سے بے گناہ انسانوں کی تو جانیں جاتی ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ زمین، جنگل وغیرہ بھی جل کر خاک ہو گئے ہیں۔ ناول کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اسلوب پر گرفت بنائے رکھی ہے۔ اسی لیے قاری ان کے مکالموں سے بے حد

متاثر ہوتے ہیں۔

آنند لہر ایک انسان پرست شخص تھے انھوں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے سے انسان کے جذبات، دکھ درد، پریشانیوں کا سارا حال بڑے اچھے طریقے سے بیان کیا ہے۔اس ناول میں بھی انھوں نے انسان کی اصلی زندگی اور اس کے کارناموں کو پیش کرنے کی کوشش ہے۔اور بتانے کی کوشش کی ہے کہ پوری کائنات میں انسان کا درجہ ایک بلند درجہ ہے مگر پھر بھی وہ کبھی زمین کے جھگڑوں میں الجھا رہتا ہے تو کبھی خود بڑا بننے کے لیے دوسروں کے جذبات سے کھیلتا رہتا ہے۔اس ناول میں مصنف نے انسان سے زیادہ پرندوں اور جانوروں کے جذبات کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔

اس ناول کو پڑھنے سے ایسا لگتا ہے کہ انسانی زندگی جیسے اجڑ سی گئی ہو جیسے خزاں کا موسم آنے پر درختوں کے سارے پتے اجڑ جاتے ہیں مانو ویسا ہی اس ناول میں آنند لہر نے انسانی زندگی کی تصویر پیش کی ہے۔ایسا لگتا ہے کہ جیسے ہر چیز ہر طرف سے سوال پوچھ رہی ہے کہ جب قدرت کے نظارے جیسے موسم، دریا، پہاڑ، ندی، نالے، جنگل، وادیاں وغیرہ انسان کو جینے کی دعوت دیتے ہیں تو پھر انسان کیوں انسانیت کا قتل کرنے پر تلا ہوا ہے۔اس لڑکی سے نہ صرف انسان مرتے دیکھے ہیں بلکہ پہاڑ بھی ٹوٹتے دیکھے ہیں ندی نالے خراب ہوتے ہیں، پرندوں کا بھی جینا مشکل ہوجاتا ہے۔

مصنف اس ناول میں کائنات کی تباہی کا منظر پرندوں، جانوروں اور پیڑ پودوں کی زبانی بیان کرتا ہے اور انسان کی ساری کالی کرتوتوں کو بے نقاب کیا ہے اور ایسے ماحول میں جہاں انسان خود انسان کا دشمن ہوتا ہے وہاں جانوروں کی ہمدردی کو انسانی رشتوں سے بہتر ثابت کیا ہے۔اس ناول میں زیادہ تر کردار پرندے اور جانور ہیں جن میں خاص طور پر چڑیا، کوّا، کوئل، طوطا، گلہری، کتّا، خرگوش، بلّی، چوہا، چیل، بکری، شیر، چیتا، ریچھ، گینڈا، ہاتھی، گیدڑ، کبوتر، سانپ، چیونٹی، بکرا، ہرن وغیرہ اس کے علاوہ مصنف نے اس ناول میں کچھ انسانی کرداروں کا بھی ذکر کیا ہے جس میں خاص طور پر گل، ساحل، کلپنا، مریم، جان، موہن، راکیش، راجہ، رانی، نشر، نلنی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ناول میں مصنف نے انسان کی لڑائی غلط ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور پرندوں اور جانوروں کے ذریعے سے انسان کی اصل حقیقت بیان کی ہے حالانکہ پرندوں اور جانوروں کو بولنے کی صلاحیت نہیں ہے مگر پھر بھی وہ انسان کا درد دیکھ رہے ہیں۔اور انسان کو بولنے کی صلاحیت بھی دی گئی ہے مگر پھر بھی وہ اپنی ہی نسل کو تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ انسان صرف ہتھیار اور بارود بنانے میں لگا ہوا ہے مگر اس کے دل میں جذبات کو بیان کرنے کے باوجود وہ جنگ کی تیاری

کرتا ہے ایسے میں مصنف نے جانوروں اور پرندوں کے ذریعے سے انسان کے لیے ہمدردانہ سلوک کو پیش کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''وہ ہمیں تو کہاں اس زمین کو ہی ختم کرنا چاہتا ہے جو اسے دن رات پھول موسم اور زندگی کا مزا دیتی ہے اسی لیے اب ہم جانور انسان کی ہر نادانی کو معاف کردیتے ہیں کیونکہ ہمیں زمین سے از حد پیار ہے''پرندوں کی سوچ کی کوئی قیمت اس لیے نہیں کیونکہ پرندوں کا کوئی ملک نہیں ہے''۔دوسری چڑیا نے جواب دیا۔''پہلی چڑی یہ سن کر حیران ہوگئی او کہنے لگی ہاں بہن تم ٹھیک کہتی ہو چڑیوں کووّں کوئلوں کو سلطنت نہ ہے اور نہ کوئی راجدھانی ہے''۔(191)

سارے جانور اور پرندے ایک جگہ پر اکٹھے ہوکر انسان کی دردناک موت کو دیکھ کر آپس میں باتیں کررہے تھے۔وہاں ہر چھوٹی سی چھوٹی چیز بھی انسان کی تباہی پر رو رہی تھی۔مصنف نے اس ناول میں سب سے زیادہ اسلوب پر زور دیا ہے۔جس انداز میں مصنف نے جانوروں اور پرندوں کی زبان سے مکالمے ادا کروائے ہیں قابل تعریف ہیں۔ ملاحظہ کریں کچھ جانوروں اور پرندوں کے مکالمے:

''ایک گلہری بول پڑی''ہم پرندے اس بات کو سمجھ گئے ہیں کہ یہ چونچ اناج لانے کے لیے ہے دوسرے پرندے کا جسم نوچنے کے لیے نہیں مگر انسان انسان ہوکر بھی اس بات کو نہ سمجھ سکا''۔(192)

اسی طرح سے ایک چیل نے بھی انسان کی فطرت کو ظاہر کیا ہے کہ وہ صرف دوسرے انسان میں کمیاں ڈھونڈتا ہے اور اکٹھے بیٹھتے ہوئے بھی اسے یہ فکر ہوتی ہے کہ کون سا انسان کس ملک سے تعلق رکھتا ہے اور کس ملک کی نمائندگی کر رہا ہے،اقتباس ملاحظہ ہو:

''ایک چیل اچانک وہاں پر آگئی''انسان جب اکٹھے بیٹھتے ہیں تو ایک دوسرے کی رائے کا احترام نہیں کرتے ،لڑ پڑتے ہیں''مگر کیوں''چیل نے سوال دہرایا۔''کیونکہ وہ چھوٹے بڑے ملکوں میں بٹے رہتے ہیں وہ رائے کو اہمیت نہیں دیتے بلکہ اس بات کو اہمیت دیتے ہیں کہ کس ملک کا نمائندہ رائے دے رہا ہے اور جو رائے دے رہا ہے اس ملک کے پاس ایٹم بم کتنے ہیں،ہائیڈروجن بم کتنے ہیں''۔193)

مصنف نے اس ناول میں منظر نگاری سے بھی کام لیا ہے۔انھوں نے جنگ کے بعد ہونے والی تباہی کی عکاسی کی ہے جس میں یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ قدرت کی ہر چیز جنگ میں استعمال ہونے والے بارود سے متاثر ہے۔

آنند لہر کے اندر انسانی جذبات کی بہت قدر تھی وہ نہ صرف سماج کی زندگی کو اپنی تحریروں میں پیش کرتے ہیں بلکہ پوری انسانیت کے بارے میں سوچتے تھے۔اس لیے راقم الحروف کی نظر میں وہ ایک بہت بڑے انسان پرست شخص ہیں۔جیسا کہ ان کی تحریروں سے بھی معلوم ہوتا ہے۔اس ناول میں تو انھوں نے انسانیت کا ننگا ناچ دکھانے کی کوشش کی ہے اور انسان سے زیادہ جانوروں اور پرندوں کے احساس وجذبات کو پیش کیا ہے۔

اس ناول میں انسان کا حال اتنا خستہ تھا کہ ہر چھوٹے سے چھوٹا پرندہ اور جانور انسان کی مدد کررہا تھا یہاں تک کہ ایک چھوٹی سی چڑیا بھی اپنی چونچ میں انسان کو پانی دینا چاہتی تھی۔مصنف نے گل اور ساحل کو انسان کے روپ میں پیش کیا ہے جو جنگ سے پہلے دونوں ایک دوسرے کے دشمن تھے مگر جنگ کے بعد انھیں معلوم ہوگیا تھا کہ انسان ہی انسان کے کام آسکتا ہے۔اب انھیں اس لیے بھی احساس ہوگیا تھا کیونکہ جنگ میں ان کا بھی نقصان ہوا تھا۔جنگ کے دوران گل اپاہج ہوگیا تھا اور ساحل کی آنکھوں کی روشنی چلی گئی تھی مگر اب دونوں ایک دوسرے کی مدد کے لیے تیار تھے۔پرندے اور جانور انھیں دیکھ کر مسکرا رہے تھے کہ یہی سب ایک دوسرے کی مدد کرنا اگر انسان نے جنگ سے پہلے سوچا ہوتا تو شاید یہ حال نہ ہوتا۔

مصنف نے اس ناول میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جنگ کسی بھی حال میں کسی کو فائدہ نہیں دی سکی ہر طرف سے نقصان ہی نقصان پہنچایا جاسکتا ہے۔جنگ کسی بھی بات کا حل نہیں ہوسکتا ہے۔ایک جنگ کے بعد جو منظر دیکھنے کو ملتا ہے اس کی ایک بہترین مثال مصنف نے اس ناول میں پیش کی ہے جیسے۔

> ''اتنے میں ایک عورت ایک بچے کی لاش کو اپنے گلے میں ڈال کر ان کی طرف وہاں آگئی۔ اس نے وہ بچہ بازو پر اٹھایا ہوا تھا۔''یہ کیا ہے'' کلپنا نے پوچھا'' کچھ بھی نہیں بچے کی آدھی سڑی ہوئی لاش ہے''۔
>
> ''مگر تمہارے ہاتھ کہاں ہیں'' کلپنا نے پھر اس سے پوچھا''
>
> ''ہاتھوں کو چھوڑ و شکر کرو میرے پاؤں بچ گئے ہیں اور چہرے کی بناوٹ اس حد تک قائم ہے کہ تم نے سمجھ لیا کہ میں انسان ہوں''۔(194)

اس ناول میں اگرچہ پرندوں اور جانوروں کے کرداروں کو زیادہ پیش کیا ہے مگر کچھ انسانی کرداروں کو بھی پیش کیا ہے۔جس میں کلپنا، مریم، جان کاکا، موہن اور راکیش ہیں۔ان کو صرف اس لیے پیش کیا ہے کہ وہ جنگ سے پہلے چاند پر گئے تھے اور جب وہ اپنی کامیابی حاصل کر کے واپس آرہے تھے تو راستے میں آپس میں بات چیت کر رہے تھے کہ ہمیں زمین پر سارے انسان بڑے اچھے طریقے سے سمان کریں گے۔مگر جب وہ آپس آئے تو زمین کا منظر ہی بدلہ ہوا تھا۔اب اس کی کوئی بھی عزت کرنے والا نہیں تھا چاروں طرف راکھ اور بارود ہی دکھائی دے رہا تھا۔

آنند لہر نے اس ناول میں پرندوں اور جانوروں کی زندگی کو انسان کی زندگی سے بہتر بتایا ہے کیونکہ وہ کبھی ایک دوسرے سے نفرت نہیں کرتے اور بارود نہیں بناتے کبھی زمین کے لیے جھگڑا نہیں کرتے اور نہ ہی ان کا کوئی مذہب ہے اور نہ ہی ان کی کوئی سرحد ہے۔

اس ناول کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ آنند لہر نے نہ صرف اس دور کی بلکہ ہر دور کے ایک بہترین موضوع پر اپنا قلم چلایا ہے اور اسے بڑے ہی خوبصورت اور معروضی انداز میں پیش کیا ہے۔اس کی اس پیش کش سے ایسا محسوس ہوتا ہے، کہ جیسے وہ کوئی وکیل ہو اور بھری عدالت میں جج کے سامنے پورے ثبوتوں اور دلیلوں کے ساتھ پیش کرتا ہو۔اس ناول میں بھی مصنف نے کچھ اسی طرح کی کہانی کو پیش کیا ہے اور ان تمام واقعات کو پیش کیا ہے جو ماضی میں کیے جا چکے ہیں اور ان سب کا الزام انسان کے ہی سر جاتا ہے۔اس ناول میں خصوصاً دوسری جنگ عظیم کی کئی جھلکیاں دیکھنے کو ملتی ہیں جو افغانستان اور عراق کے درمیان ہوتی تھی اور اس جنگ کی تباہ کاریاں جن سے انسان تو کیا ہر جاندار چیز متاثر تھی ان واقعات کی تصویر کشی اس ناول میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

آنند لہر کے اس ناول کے اگر فن پر بات کی جائے تو صرف مکالمہ نگاری اس ناول کی اہمیت کی حامل ہے بلکہ اس کے علاوہ منظر نگاری پر بھی مصنف نے بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔ جہاں ایک طرف اس ناول کی فنی خوبیاں ہیں تو وہیں دوسری طرف کچھ خامیاں بھی نظر آتی ہیں مثلاً اس میں مصنف نے کردار نگاری کا بالکل خیال نہیں رکھا ہے۔حالانکہ اس کے باوجود بھی یہ ناول پورا کامیاب دکھائی دیتا ہے۔کردار نگاری کی طرف مصنف نے شاید یہ سوچ کر توجہ نہ دی کیونکہ وہ کردار نگاری سے نہیں بلکہ اس ناول کے اہم موضوع سے قارئین کو روشناس کرانا چاہتے تھے۔وہ اس بات سے پوری طرح واقف تھے کہ اگر قاری اس کہانی کے کردار نگاری میں الجھا رہا تو اصل مقصد تک نہیں پہنچ پاتا۔اس لیے انھوں نے اس میں کردار نگاری کی طرف بالکل دھیان نہیں دیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ قاری ان کے اصل موضوع پر اپنی گرفت بنا

لیتا ہے اور مکالمہ نگاری کے ذریعے ہی قاری کو انسانوں، جانوروں اور پرندوں کے جذبات پر زیادہ عمل کرتا ہے۔اس ناول کو اگر حقیقت نگاری کی روایت سے منسوب کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔مکالمہ نگاری کے حوالے سے اس ناول کے کچھ اہم مکالمے پیش کیے جاتے ہیں ملاحظہ کریں:

''انسان جب اکٹھے اٹھتے بیٹھتے ہیں تو ایک دوسرے کی رائے کا احترام نہیں کرتے ،لڑ پڑتے ہیں''۔

''جانور اپنی عقل کا استعمال کرنا جانتا تو ہے مگر استعمال نہیں کرتا''۔

''انسان تو ہتھیار جمع کرتا ہے، بارود جمع کرتا ہے یعنی کہ موت کا ذخیرہ کرتا ہے''۔

''اصل میں قدرت نے انسان کو اس طرح سے بنایا تھا کہ وہ ہر جانور کا زمین پر سہارا بن سکے''۔

پروفیسر ظہورالدین صاحب اس ناول کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس ناول کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس کے زیادہ تر کردار پرندے یا جنگلی جانور ہیں ....اس ناول کو پڑھ کر یونان کے مشہور طنزیہ نگار ارسطو رفانیس ڈراما ''پرندے'' یاد آجاتا ہے جس میں اس نے پرندوں کے ذریعے یونان کی زندگی ،تمدن اور سیاسی وسماجی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے فلسفے کے ایسے ایسے نکات بیان کیے ہیں جن کا کسی طریقے کے ذریعے پیش کیا جانا بڑا عجیب لگتا ہے''۔(195)

اس کے بعد آنند لہر کا ایک اور ناول ''یہی سچ ہے'' کے عنوان سے 2008ء میں دریا گنج ، دہلی سے منظر عام پر آیا۔ان کا یہ ناول 145 صفحات پر مشتمل ہے۔

ناول یہی سچ ہے دراصل زندگی کی سچائیوں کی بہترین ترجمانی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جو ایک کامیاب ناول کہنے کے لائق ہے۔اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عصر حاضر میں ایسا کوئی بھی شعبہ نہیں ہے جہاں پر انسانی بے ایمانی،غریبوں پر ظلم وغیرہ نہ ہو۔اس حوالے سے اس ناول کا ایک بہترین کردار مصنف نے پیش کیا ہے جس کا نام کوشل ہے۔اس ناول میں مصنف نے تین اہم کرداروں کو خاص طور پر پیش کیا ہے جس میں کوشل،شیو اور شنکر ہیں۔کوشل کو اپنی

ایمانداری پر بہت ناز ہےاور وہ اس ایمانداری پر فخر بھی محسوس کرتا ہے،مگر مصنف نے کہیں نہ کہیں اس میں کوشل کے اندر اس کی ایمانداری کو زیادہ ہی بہتر ثابت کیا ہے جو ناول کی خامی سی بن گئی ہے، کیونکہ کوشل ہر وقت اپنی ایمانداری پر فخر محسوس کرتا رہتا ہےاور دوسرے تمام افراد کو وہ بے ایمان سمجھتا ہے۔شیو کا کردار اس میں ایک رشوت خور کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔شیو اصل میں کوشل کا سالہ ہےاور وہ ہمیشہ رشوت لے کر دن رات خواب دیکھنے میں مشغول ہوتا ہےاور شنکر بھی کوشل کا دوسرا سالہ ہے مگر وہ اس کے دل میں خدا کا خوف ہے وہ بے ایمانی ورشوت وغیرہ کے نزدیک نہیں آنا چاہتا۔ان متذکرہ بالا کرداروں کے علاوہ مصنف نے ان کرداروں کی بیویوں اور بچوں کو ضمنی کرداروں کے طور پر پیش کیا ہے۔جس میں خاص طور پرناگپال،دھرم پال وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

کہانی کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنند لہر نے دو کرداروں شیو اور شنکر جو سگے بھائی ہیں ان دو کرداروں کے ذریعے سے مصنف نے امیری،غریبی،رشوت خوری،ظلم و جبر،سورگ،نرک وغیرہ کی اچھی اور جاندار مثالیں پیش کی ہیں۔جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب انسان کی روزمرہ کی زندگی میں ہوتا ہے۔ان دونوں بھائیوں کے درمیان جو انصاف اور بے ایمانی کی کشمکش چلتی ہے اس تصویر کو مصنف نے بہترین انداز میں قلم بند کیا ہے۔

شیو ہمیشہ یہ سوچتا ہے کہ اگر میں بے ایمانی کروں گا تو زیادہ سے زیادہ مجھے نرک میں جگہ ملے گی مگر اس بات سے وہ بالکل خوف زدہ نہیں ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ وہ اگر بے ایمان ہوگا لیکن اس کے بچے تو اچھی زندگی بسر کریں گے ۔شیو اس بات سے خدا سے معافی نہیں مانگتا کہ اس نے بے ایمانی کی ہے بلکہ یہ سوچتا ہے کہ اگر ایمانداری کے بھروسے رہے تو انسان کبھی آگے نہیں بڑھ سکتا ہے۔ایک پل کے لیے یہاں قارئین کو شیو کے کردار سے نفرت ہو جاتی ہے مگر جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیو یہ کام مجبوری میں کرتا ہے تو قاری شیو کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔یہی مصنف کے قلم کا کمال ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''شیو اسی کام کے پیسے لیتا ہے جو جائز ہو اور پھر وہ سارا پیسہ بانٹ کر کھاتا ہے،سب کو برابر کا حصہ دیتا ہے۔اس لیے دفتر میں چپڑاسی سے لے کر اونچے درجے کے تمام افسر اس سے خوش ہیں۔شیو جس سے رشوت لیتا ہے اس کا کام ضرور کرتا ہے کئی بار تو وہ جلدی کام کرنے کے الگ پیسے لیتا ہے مگر یہ سب کرتے ہوئے وہ شرمندہ ضرور ہوتا ہے ۔لوگ بھی شیو کو رشوت دینے میں خوشی محسوس کرتے ہیں............شیو بھگوان کی پوجا بھی ایمانداری سے کرتا

ہے۔اپنے گناہوں کی معافی نہیں مانگتا بلکہ دعا کرتا ہے کہ بھگوان میرے بیٹوں کو اس قابل بنا کہ اس دنیا میں جینے کے لیے انہیں ایسے گناہ نہ کرنے پڑیں۔ جو وہ کر رہا ہے............ وہ اپنے آپ پر ہونے والا ظلم برداشت کرسکتا ہے۔ وہ برداشت نہیں کرسکتا کہ اس کی بیوی کی جوانی مرجائے،اس کی خوبصورتی مرجائے، وہ نرک میں روٹی کے ایک ایک دانے کو ترسنے کو تیار ہے لیکن اس دنیا میں یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ اس کے بیٹے اور بیوی اس کی ایمانداری کی وجہ سے بھوکے رہیں۔ وہ خودغرض نہیں ہے''۔(196)

اسی طرح سے مصنف نے کوشل کے کردار کو ایک سچا اور ایماندار کے کردار میں پیش کیا ہے۔ اگر چہ وہ بہت زیادہ ایماندار ہے مگر اس کی اس ایمانداری سے صرف وہی خوش ہے باقی تمام اسے خودغرض اور لالچی سمجھتے ہیں۔

آنند لہر نے جس دور کی عکاسی کی ہے اس دور میں بھی رشوت خوروں اور بے ایمانوں کو زیادہ عزت بھی اور دور حاضر میں بھی ایماندار لوگوں کی عزت بہت کم ہے۔ اس ناول میں مصنف نے دو بھائیوں کے تضاد اور کشمکش کی بڑی عمدگی کے ساتھ تصویر کشی کی ہے۔ انسان کی قدریں پامال ہوتی ہوئی، سماج کے رشتے ٹوٹتے بکھرتے اور سماجی زندگی میں ہونے والے منفی اثرات غرض انہی تمام چیزوں کو مصنف نے اس ناول میں جگہ دی ہے۔

ناول کی ابتدا ایک چھوٹے سے منظر سے ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ اس کے کردار واقعات اور احساسات و جذبات سے سرشار ہوتے ہوئے قاری کی دلچسپی کا باعث بن جاتے ہیں۔ اس ناول کا پلاٹ، کردار نگاری، تصویر کشی، وغیرہ کمال درجہ کی ہے مگر راقم الحروف کی رائے کے مطابق اس ناول میں مصنف نے مکالمہ نگاری کو زیادہ بہترین طریقے سے نبھایا ہے۔ جس کا اندازہ آپ کو خود اس کے مکالموں سے ہوجائے گا مثال کے طور پر اس ناول کے کچھ مکالمے پیش کیے جاتے ہیں:

''جو اس دنیا میں دکھ بھوگتا ہے اسے ضرور مرنے کے بعد سورگ ملتا ہے''۔

''ہاں بھائی برداشت کرو۔ یہی زندگی کا اصل فلسفہ ہے''۔

''سچ یہ ہے کہ ایسے کرم کرو کے مرنے کے بعد سورگ ملے''۔

''مگر ضرورت برداشت کی سرحدوں کو نہیں مانتی''۔(197)

اس طرح کے کئی دیگر خوبصورت اور فکر و معنویت سے بھر پور مکالمے مصنف نے اس ناول میں استعمال کیے ہیں ۔جن سے احساسات و جذبات ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔

آنند لہر زندگی کے حقائق کو برتنے ، دیکھنے اور سمجھنے میں بہت ماہر تھے۔انھوں نے زندگی کے حقائق کو برتنے کا ایک الگ نظریہ اپنایا ہے۔اور وہ تخلیقی لمحوں میں اپنے کرداروں ، واقعات ،سانحات ،احساسات وجذبات کے ذریعے تمام داخلی اور خارجی زندگی کی ترجمانی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اس ناول میں مصنف نے کوشل کو ایسے انداز میں پیش کیا ہے کہ اسے اپنی ایمانداری پر اتنا فخر ہے کہ وہ اس فخر کو اپنے بیوی اور بچوں کے سامنے بھی دکھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور ہمیشہ اپنی افسری کا غرور دکھانے میں مشغول رہتا ہے۔مگر اس کے برعکس شیو کا کردار اگرچہ بے ایمانی کا ہے مگر وہ اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے رشوت لینے پر مجبور ہے اور یہاں تک کہ وہ اپنے بیٹے کو انجینئر بنانے کے لیے اس حد تک گزر جاتا ہے کہ اپنی بیوی کی عصمت تک کو داؤ پر لگا دیتا ہے۔دوسری طرف اسی کا بھائی شنکر جس کو اپنی غربت پر بھی بہت ناز ہے اس کا ماننا ہے کہ دنیا میں کیے گئے اچھے کام کرنے سے مرنے کے بعد سورگ میں جگہ ملے گی۔اسی وجہ سے لوگ اس کی عزت کرتے ہیں اور وہ عزت میں خوش رہتا ہے۔

اس ناول کی خاص بات یہ ہے کہ زندگی کے یہ نشیب وفراز بدلتے ہوئے وقت اور حالات ،عوام کا دکھ درد، خود غرضی ، رشوت خوری ، ایمانداری ، استحصال وغیرہ کو آنند لہر نے جس انداز میں بیان کیا ہے اس کی وجہ سے یہ ناول ایک کامیاب ناول کہلاتا ہے۔

ڈاکٹر سید احمد قادری صاحب اس ناول کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> ’’یہی سچ ہے‘‘ دراصل زندگی کی سچائیوں کی بھر پور ترجمانی کرتا نظر آتا ہے اور اس عمل میں بے حد کامیاب ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس ناول کی بازگشت دور تک اور دیر تک سنائی دے گی‘‘۔(198)

آنند لہر کو بہت سارے انعامات واعزازات سے بھی نوازا جا چکا ہے۔1975ء میں آل انڈیا کہانیوں کا مقابلہ منعقد ہوا جس میں آنند لہر کی ’’سپرن‘‘ کو اول درجہ کا مقام حاصل ہوا۔اس کہانی پر اول درجہ کا انعام سے نوازا جانے پر انھوں نے خود ایک جگہ لکھا ہے کہ:

''آل انڈیا کہانی مقالہ 1975ء میں منعقد ہوااس میں ملک بھر سے دس کہانیاں منتخب کی گئیں۔اس میں میری کہانی ''سپرن'' کے نام سے بھی شامل تھی۔اس کہانی کو درجہ اول ملا اور مجھے مناسب انعام سے سرفراز کیا گیا''۔(199)

اس کے علاوہ بھی آنندلہر کو کئی انعامات واعزازات سے نوازا جا چکا ہے ہے۔انھیں راجستھان اردو اکادمی، اتر پردیش اردو اکادمی، بہار اردو اکادمی کے انعامات سے نوازا جا چکا ہے۔اس کے بعد ان کی تخلیقات کی بنیاد پر انھیں چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی اردو ڈپارٹمنٹ اعزاز اور ساتھ ہی ساتھ جموں یونیورسٹی اردو پروفیشنل کورس اعزاز اور امریکن بایوگرافیکل انسٹی ٹیوٹ کا ''مین آف دی ائیر ایوارڈ'' وغیرہ ایوارڈ بھی دیے جا چکے ہیں۔

آنندلہر کو راشٹریہ سمان اپادھی سنستھان کی طرف سے ''ساہتیہ اکیڈمی'' اعزاز دیا گیا تھا۔اس کے بعد انھیں صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے افسانوی مجموعہ ''بٹوارہ'' پر پچاس ہزار روپیے (50000) بطور انعام پیش کیا گیا تھا۔

آنندلہر کی شخصیت پر بہت سارے رسالہ نمبر نکالے جا چکے ہیں جن میں خاص طور پر ماہنامہ ''شاعر'' ممبئی سہ ماہی ''رنگ'' دھنباد اور ''عصری آگہی'' اور کشتوار کا ''آنندلہر نمبر'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

جموں میں اردو ڈراما:

اردو ڈراما دیگر اصناف ادب کے بہت بعد میں پیدا ہوا تھا۔لہٰذا اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈراما کی تاریخ بہت مختصر ہے۔اس بات سے بھی ہم انکار نہیں کر سکتے کہ ڈراما نگاری کو اتنی اہمیت حاصل نہیں ہو سکی ہے جتنی ادب کی دیگر اصناف کو حاصل ہے۔یہی وجہ ہے کہ ریاست جموں وکشمیر میں بھی دیگر ریاستوں کی طرح ہی ڈراما نگاری پر کم توجہ دی گئی۔جموں وکشمیر میں ڈراما کی حیثیت اس لیے بڑھ جاتی ہے کہ کشمیر میں بھانڈوں اور نقالوں کی اہمیت کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔اس لئے بھانڈ، ڈفالی، نقل مکانی کا بھی ڈراما کے ساتھ ایک اٹوٹ رشتہ بن جاتا ہے۔چونکہ ڈراما کی تاریخ پر اگر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی دور میں قدیم سنسکرت ڈرامے زوال کا شکار ہو رہے تھے، تو اس وقت اسٹیج ڈراما ایک طرح سے ختم ہوتا جا رہا تھا۔ایسے دور میں عوام سے پیشہ وارانہ لوگوں نے اپنے جلوے دکھانے شروع کر دیئے اور عام اداکاروں نے بھانڈ پن، نقالی، ڈفالی وغیرہ کا سہارا لے کر عوام کو اپنی اداکاری سے وقت گزاری اور تفریح کا سامان مہیا کرتے رہے۔اس وقت سے یہ تمام چیزیں ڈراما میں شامل ہوتی گئیں۔

کشمیر بھانڈوں کا ذکر ہمیں اورنگ زیب کے عہد سے دیکھنے کو ملتا ہے۔اس وقت اورنگ زیب کے دربار

میں بہت سارے گائک، نقالی وغیرہ اورنگ زیب کے دربار میں بطور پیشہ یہ کام کرتے تھے۔اور ساتھ ہی ساتھ وہ پیشہ ورانہ لوگ تمام بازاروں میں گھوم گھوم کر عوام کو اپنی اداکاری کے جلوے دکھاتے تھے اور اسی طرح سے وہ لوگ اس پیشے کو اپنے روزگار کا ذریعہ بناتے تھے ۔ یہ بھانڈ اور نقالی کشمیر سے ہوتے ہوئے ہندوستان کے دیگر علاقوں میں بھی اپنے جلوے دکھانے لگے تھے اور شادی بیاہ جیسے موقعوں پر بھی ان ہی لوگوں کو بلایا جاتا تھا تاکہ محفلوں میں ایک رونق بنی رہے۔

بھانڈوں کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہ روپ بدلنے میں کافی ماہر تھے وہ اپنے ہی گروپ میں اپنے ہی لڑکوں سے زنانہ کردار کرواتے تھے۔جس سے عوام بہت زیادہ متاثر ہوتی تھی۔ بھانڈ دراصل ایک عوامی ڈراما تھا جو لوگوں کی وقت گزاری اور انھیں طرح طرح کے تہذیبی وثقافتی چیزوں سے روشناس کروایا جاتا تھا۔ بھانڈ کے بنیادی معنی ہیں مسخرے بازی اور پاتھر کے معنی کسی شخص کی نقل کرنا۔اس طرح کشمیر میں بانڈ پاتھر کا مقصد یہ تھا کہ جس سے کسی پہلو پر طنز بھی کیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ اس میں مزاج کا بھی خیال رکھا جائے جس سے عوام زیادہ متاثر ہو۔ بھانڈ پاتھر کے فنکار گاؤں میں گھومنا پسند کرتے تھے اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق عوام کے لیے تفریح کا سامان بھی مہیا کرتے تھے۔اس بھانڈ پاتھر کو چلتا پھرتا اسٹیج کہا جاتا تھا۔

ریاست جموں وکشمیر میں انیسویں صدی کے اواخر میں ڈراما نگاری کو عوام کی کافی سرپرستی حاصل ہوئی اور خاص طور پر خطہ جموں میں رام لیلا کے تہواروں سے ڈراما کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ان ناٹک منڈلیوں کی آمد کا سلسلہ جموں میں بھی بیسویں صدی کے ابتداء میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ان میں ڈراما کا ایک بڑا نام آغا حشر کاشمیری کا ہے۔وہ بھی دوسرے ڈراما نگاروں کے ساتھ وقتاً فوقتاً جموں میں آتے رہے تھے انہی کی وجہ سے جموں خطے میں اسٹیج ڈرامے کے اداکاروں میں بہت سے اداکار پیدا ہوئے جنھوں نے بعد میں کافی اہم رول ادا کیے۔ایسے اداکاروں نے نہ صرف ریاست میں اپنا نام روشن کیا بلکہ ملکی سطح پر بھی اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے۔ان میں خاص طور پر کے ایل سہگل، اوم پرکاش،سندر،رامانند ساگر وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

اردو ڈراما نگاری میں تھیئٹر کے حوالے سے بات کریں تو جموں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے جس کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔جیسا کہ پروفیسر ظہورالدین نے بھی ایک جگہ لکھا ہے کہ:

’’یہاں یہ کہہ دینے میں مجھے کوئی قباحت نظر نہیں آتی کہ انیسویں صدی کے ربع آخر کے بعد

ریاست میں جہاں تک اردو زبان وادب یا تھیئٹر کا تعلق ہے، جموں کو مرکزی حیثیت حاصل ہوئی۔ یہیں سے اردو تھیئٹر کی روایات نے وہ بال و پر حاصل کیے جنھوں نے اس کی ترقی کی رفتار میں سرعت پیدا کر کے اسے اس قابل بنایا کہ وہ ملک گیر پیمانے پر ہونے والے تجربات سے استفادہ کر کے آگے بڑھ سکے''۔(200)

پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب ناٹک کمپنیوں کی جموں میں آنے سے اپنی کتاب میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''ناٹک کمپنیاں تجارتی ادارے رہے ہیں۔ لیکن ان کے کام کا ایک تہذیبی وادبی پہلو بھی ہے۔ اہل جموں کے ذوق وشوق کی بدولت اکثر پارسی ناٹک کمپنیوں کو بار بار وہاں آنے اور اپنے تماشے پیش کرنے کی خواہش رہتی تھی۔ ان تماشوں میں عوام اور خواص بڑے شوق سے شریک ہوتے اور اس وسیلے سے بھی ان کے ذوق شعروادب کی آبیاری ہوتی اور وہ پران چڑھتا۔ ہر ایک معنی خیز بات ہے کہ اردو میں ناٹک، ڈراما اور اسٹیج کے موضوع پر سب سے پہلی یادگار تصنیف ''ناٹک ساگر'' جموں کے ہی دو صاحب ذوق اہل قلم محمد عمر اور نورالٰہی کا کاوشوں کا نتیجہ تھی''۔(201)

قدیم اردو اور ہندی ڈرامے میں بھی لیلاؤں سے ڈرامے کے بنیادی اجزا دیکھے جاسکتے ہیں مگر جموں میں بیسویں صدی کے ابتداء میں مہاراجہ پرتاب سنگھ کے دور حکومت میں ریاست کے باہر سے بہت سی لیلا پارٹیاں جموں میں ہونے لگیں۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے دربار میں بھی شروع شروع میں ایسے ڈرامے کا مقصد مذہبی قصوں کو عوام سے روشناس کروانا تھا۔ لیکن بعد میں ایسے ڈراموں کی وجہ سے سماج کے بہت سارے مسائل کو بھی ڈرامائی انداز سے پیش کیا جانے لگا۔ اس دور میں سب سے زیادہ دھوم پارسی تھیئٹر کی تھی اور آغا حشر کاشمیری جن کا ذکر نہ صرف جموں وکشمیر میں ڈراما نگاری کی حیثیت سے مشہور ہے بلکہ اردو ڈراما نگاری کے میدان میں ان کا ذکر فخر کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔ ان ہی کی وجہ سے پہلے جموں میں اور بعد میں کشمیر میں ڈراما نگاری کی اہمیت کو بڑھاوا ملا۔ مہاراجہ پرتاب سنگھ نے اپنے دور حکومت میں بہت ساری راس لیلا پارٹیوں کو بلا کر جموں اور سری نگر اسٹیج ڈرامے کروائے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ کوشش جموں میں ہوئیں اور ریاست بھر کے نوجوان اس میں شامل ہوتے گئے۔ اس دور میں ریاست میں سب سے اہم نام محمد

عمر نور الٰہی صاحبان کی جوڑی کا ہے جنھوں نے اپنی اداکاری سے اسٹیج ڈرامے میں کافی رول ادا کیا۔ ان کی دھوم ریاست اور بیرون ریاست میں بھی چھا گئی۔ انھوں نے نہ صرف اچھے ڈرامے لکھے بلکہ اردو ادب میں ڈراما نگاری کی تاریخ اور تنقید میں ''ناٹک ساگر'' کے عنوان سے 1924ء میں اپنی کتاب لکھ کر لاہور سے شائع کروائی۔ بعد میں اس کتاب کو پورے برصغیر میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان دونوں ڈراما نگاروں نے اس دور میں کئی ڈرامے اپنی یادگار چھوڑے۔ ان کے کئی قابل ذکر ڈرامے اپنی تخلیقات ہیں، جن میں خاص طور پر ''تین ٹوپیاں''، ''بگڑے دل''، ''ظفر کی موت''، ''سات ڈرامے''، ''سروپ''، ''روح سیاست'' وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان دونوں دوستوں کی جوڑی ڈراما نگاری کے میدان میں بہت کمال کی تھی۔ اس طرح سے ان دونوں نے مل کر ہندی، پراکرت اور سنسکرت زبانوں کے ڈراموں کو اردو ڈراموں میں منتقل کیا۔ اس حوالے سے ''مدرارا کھش'' قابل تعریف ہے۔ ان کے علاوہ ریاست جموں وکشمیر میں بعد میں بہت سارے ڈراما نگار پیدا ہوئے مگر جو مقبولیت محمد عمر اور نور الٰہی کو حاصل ہوئی وہ کسی کو حاصل نہ ہو سکی۔

خطہ جموں میں 1947ء سے پہلے جن ڈراما نگاروں اور ان کے ڈراموں کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں خاص طور پر ''جگدیش کنول، آذر عسکری، عزیز کاش وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان کے ڈراموں میں ''پردے کے پیچھے''، ''چار سو بیس''، ''نوشتۂ تقدیر'' جیسے ڈرامے اہمیت کے حامل ہیں۔

ڈاکٹر برج پریمی ریاست جموں وکشمیر کے ڈراما نگاری کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

> ''ریاست جموں وکشمیر میں اردو ڈراما کی کمی یا دوسرے اصناف کے مقابلے میں اس کی پس ماندگی قابل فہم ہے۔ لیکن اس کمی کے باوصف کشمیر میں ڈراما کی روایت سے انکار کرنا بھی ممکن نہیں۔ جب بھی مجموعی حیثیت میں اردو ڈراما کے اجزاء ترکیبی یا عناصر خمسہ سے بحث ہوتی ہے تو بھانڈوں کی نقلوں کا ذکر بھی ضرور آتا ہے''۔(202)

ریاست جموں وکشمیر میں تھیٹر کی تحریک کو بام عروج تک پہنچانے میں IPTA (اپٹا) کا بڑا کردار رہا ہے جس کی وجہ سے اس تھیٹر سے وابستہ جموں میں کئی اداکاروں نے حصہ لیا۔ اسی لیے عوامی تھیٹر کی اس تحریک سے جڑنے والے مشہور و معروف اداکار بلراج ساہنی کے ایما پر انڈین پیپلز آرگنائزیشن اپٹا (IPTA) کو ریاست میں منظم کرانے کی کوشش رہی۔ اسی لیے ریاست جموں وکشمیر سے تعلق رکھنے والے مشہور کہانی کار پریم ناتھ پردیسی نے اپنا ڈراما ''بتہ ہر''

کشمیری زبان میں تخلیق کیا تھا،مگر اسے حکومت نے ضبط کرلیا تھا۔

1947ء کے بعد ہندوستان کی دیگر ریاستوں کی طرح ہی جموں وکشمیر میں بھی افراتفری کا ماحول تھا۔کشمیر میں جب قبائلیوں کا حملہ ہوا تو اس وقت مہاراجہ ہری سنگھ ریاست میں حکمران تھے مگر قبائلی حملہ کی وجہ سے مہاراجہ ہری سنگھ اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر جموں کی طرف بھاگ گئے۔اس کے بعد نیشنل کانفرنس کے سربراہ شیخ محمد عبداللہ نے ایسے وقت میں کشمیر کی عام زندگی کو پھر سے دوبارہ پٹری پر لانے کی کوشش کی۔اس دور میں ریاست کے تمام دانشور،ادیب،شاعر اور اداکار سامنے آنے لگے اور انھوں نے ایسے حالات میں ایک ثقافتی محاذ کلچر فرنٹ کے عنوان سے تشکیل دیا۔اس کلچرل فرنٹ کی ایک خاص خوبی یہ تھی کہ یہ ایک طرح سے اپٹا ہی کو توسیع تھی۔اسی کلچرل فرنٹ کو بعد میں آل اسٹیٹ کانگریس کے نام سے جانا جانے لگا اور بہت سارے اسٹیج ڈراموں میں بھی طبع آزمائی ہونے لگی۔''آل اسٹیٹ کانگریس'' کے بنیادی طور پر تین شعبے بنائے گئے جن میں مختلف موضوعات پر کام ہونے لگا۔جس میں پہلا شعبہ ادیبوں اور شاعروں کا شعبہ تھا۔دوسرا شعبہ مصوروں کا تھا اور تیسرا شعبہ تھیئٹر شعبہ تھا۔اس دور میں اسٹیج سے پیش کیا جانے والا پہلا ڈراما مشہور ڈراما نگار پروفیسر محمود ہاشمی کا ''کشمیر یہ ہے'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا تھا جس کو ڈراما نگاری کے حوالے سے کافی مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔

ریاست جموں وکشمیر میں تھیئٹر سے تعلق رکھنے والوں میں سب سے اہم نام پریم ناتھ پردیسی،محمود ہاشمی،راج ہنس،کھنہ،دینا ناتھ نادم،علی محمد لون،صلاح الدین احمد،قیصر قلندر،گردھاری دھر،پران کشور،موہن لال ایما،شیلا بھاٹیہ، اوشا کشپ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

1947ء کے بعد جموں اور سری نگر دونوں جگہوں پر ریڈیو ڈراما شروع کیے گئے تھے جس میں بہت سارے لوگوں نے اپنی اداکاری سے نام کمایا۔اس دور کے نمایاں ادیبوں میں پریم ناتھ پردیسی،اختر محی الدین،رام کمار ابرول، سوم ناتھ زتشی،ٹھاکر پونچھی،سکھ دیو سنگھ،نرہری رائے زادہ،علی محمد لون،شنکر ناتھ،وجے سمن،زیڈ سیمی،وجے سوری،بنی نردوش،جتندر شرما،ویدراہی،دینو بھائی پنت،شبنم قیوم،ہری کرشن کول،ہردے کول بھارتی،شکیل الرحمٰن،آفاقی احمد، حامدی کاشمیری،اظہر عسکری،ایم اے عزیز،سمتر الکھوارا،سنتوش لکھوارا،اچلا سچدیو درگا سنگھ،ٹھاکر چڑھت سنگھ،شاد فرید آبادی،مشتاق فریدی وغیرہ کے نام قابل تعریف ہیں۔ان تمام متذکرہ بالا لوگوں نے نہ صرف ڈراما نگاری میں اہم رول ادا کیے بلکہ اردو ادب کی دیگر کئی اصناف میں بھی طبع آزمائی کی۔اس دور میں ڈراما نگاروں کے جو قابل ذکر ڈرامے

شائع ہو کر قارئین کی دلچسپی کا باعث بنے تھے ان میں خاص طور پر زیڈ سیمی کا ڈراما ''جہانگیر کی موت'' نرہری رائے زادہ کا ڈراما ''پرانے دیپ نئے اجالے'' دینو بھائی پنت کا ڈراما ''سورگ کی کھوج'' وجے سمن کا ڈراما ''انگ مان'' اور رام کما رابرول کے تین ڈرامے ''انسان جیت گیا''، ''چکی کے پاٹ''، ''دھرتی اور ہم'' وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ جموں کے ڈراما نگاروں کا ذکر مندرجہ ذیل ہے۔

محمد عمر نورالٰہی:

محمد عمر نورالٰہی ریاست جموں وکشمیر کے ایسے دو نام ہیں جنہیں سن کر کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ یہ ایک ہی شخص ہے لیکن جس طرح سے ان دونوں حضرات نے اردو ڈراما نگاری میں رول ادا کیا اسی کارنامے کی وجہ سے دونوں کا شمار ایک ساتھ کیا جاتا ہے۔ صاحبزادہ محمد عمر جموں وکشمیر کے ایک ادبی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی پیدائش (1946-1885) کے بارے میں زیادہ کچھ معلومات دستیاب نہیں ہوئی تاہم اتنا ضرور ہے کہ محمد عمر کا بچپن جموں میں ہی گزرا تھا۔ 1905ء میں جموں کے ایک اسکول ''سری رنبیر اسکول'' سے انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے فوراً بعد انھوں نے اپنی مزید تعلیم میں مصروف ہو گئے۔ علم حاصل کرنے کی لگن انھیں شروع سے ہی تھی مگر لاہور میں جا کر انھیں ادبی ماحول سے زیادہ دلچسپی ہوئی اس حوالے سے جموں کے ادیبوں میں تعلق رکھنے والے اہم شخص پروفیسر ظہور الدین صاحب لکھتے ہیں کہ:

> ''صاحبزادہ محمد عمر کے وجود میں اس چنگاری نے بچپن میں ہی سلگنا شروع کر دیا جس نے بعد میں شعلہ جوالا کی شکل اختیار کر کے ان کے ادبی ذوق وشوق کے لیے مہمیز کا کام انجام دیا۔ یہ چنگاری ان تھیٹریکل کمپنیوں نے بھڑکائی جو جموں میں ڈرامے دکھانے کے لیے اکثر آیا کرتی تھیں۔ اکبر اعظم، نامی کھیل دیکھتے ہی ننھے محمد عمر کے وجود میں ایک آگ سی دہک اٹھی۔ ڈرامے دیکھنے کا ایسا چسکہ لگا کہ بچپن میں ہی عینک لگ گئی۔ عینک بنوانے لاہور گئے تو وہاں نورالٰہی سے ملاقات ہوئی''۔(203)

متذکرہ بالا میں جن نورالٰہی کا ذکر ہوا یہ وہی ہیں جو بعد میں محمد عمر کے نام کا اٹوٹ حصہ بن گئے تھے۔ دونوں میں بہت ہی کم عرصے میں اتنی گہری دوستی ہو گئی تھی کہ ایک جان دو قالب ہو کر رہ گئے۔ دونوں کے اسمائے گرامی اس طرح سے لازم وملزوم ہو گئے تھے کہ بہت سارے لوگ انہیں ایک ہی نام سے جانتے تھے۔

صاحبزادہ محمد عمر نے 1908ء کے آس پاس ریاست جموں وکشمیر ہائی کورٹ میں مترجم کی حیثیت سے ملازمت اختیار کی تھی۔ جس کی وجہ سے انہیں بہت شہریت نصیب ہوئی۔ محمد عمر مترجم کی حیثیت سے کافی عرصہ تک ریاضت اور مہارت کا مظاہرہ کرتے رہے۔ اس کے بعد انھوں نے علمی اثاثوں میں بے حد وسعت پیدا کی چنانچہ اسی دوران پرتاپ کوڈ اور بعض دیگر قانونی دستاویزوں کا سہل اور سلیس اردو ترجمہ کرتے رہے اور ساتھ ہی ساتھ مغربی ادب کے بڑے قلمکاروں کو بھی اردو زبان میں منتقل کرنے کی طرف راغب رہے۔ محمد عمر کے تحریر کردہ بہت سے ڈرامے کئی زبانوں میں تراجمہ ہوئے ان میں خاص طور پر انگریزی و دیگر یورپی زبانوں کے تراجم زیادہ اہم ہیں۔ ان تراجم کی ایک خاص بات یہ ہے کہ ان تمام تراجم کا مرکزی خیال ان ڈراموں سے ہی ماخوذ ہے جو ان میں ایک خاصیت پیدا کر دیتا ہے۔

اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاتا ہے کہ صاحبزادہ محمد عمر کے تخلیقی مترجم کی عرق ریزی کا کمال ہی انہیں بلند شہرت عطا کرتا ہے اور اسی کی وجہ سے ان کے ترجمے کم اور طبع زاد زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔ محمد عمر کی جن تصانیف نے انھیں مقبولیت دلائی، ان میں خاص طور پر ''روح سیاست''، ''جان ظرافت''، ''بگڑے دل''، ''تزاق'' اور ''خواب پریشان'' وغیرہ ایسے ترجمے ہیں جن کی شہرت پورے برصغیر میں چھائی ہوئی ہے۔ ان کے اس فنی معراج کا اعتراف اور بہت سے لوگوں کے علاوہ خود علامہ اقبال اور بابائے اردو مولوی عبدالحق جیسی بڑی شخصیات نے تحریری طور پر کیا ہے۔ محمد عمر کے بہت سے ڈرامے اسٹیج کے لیے بھی طبع ہوئے جس میں ''پہلی پیشی''، ''چپ کی داد'' اور عشق ناز'' وغیرہ قابل ذکر ڈرامے ہیں۔

نور الٰہی جن کا ذکر بہت کم تصانیف میں ملتا ہے محمد عمر کی ملاقات نور الٰہی سے لاہور میں ہوئی تھی وہ بھی ڈراما نگاری میں کافی دلچسپی رکھتے تھے اس لیے دونوں نے مل کر ڈرامے میں نمایاں رول ادا کیا۔ نور الٰہی کے ابتدائی تعلیم اور پیدائش کے بارے میں کہیں بھی ذکر نہیں ملتا ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ ڈراما نگار کی حیثیت سے بہت سی تصانیف میں ان کا ذکر مل جاتا ہے۔ محمد عمر نور الٰہی نے اگرچہ دیگر کئی تصانیف میں مقبولیت حاصل کی مگر انہیں سب سے زیادہ شہرت ان کی تصنیف ''ناٹک ساگر'' کی وجہ سے ملی۔ یہ کتاب ڈراما کی پہلی تنقیدی تاریخ مانی جاتی ہے۔ 1924ء میں یہ تصنیف لاہور سے منظر عام پر آئی تھی۔ یہ کتاب آج تک اردو ڈراما کی حیثیت سے بلند مقام رکھتی ہے۔ ''ناٹک ساگر'' کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کتاب سنسکرت کے مختلف اور اہم ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ اسلوب کے لحاظ سے علامہ کیفی صاحب نے اس کتاب کو اردو زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف مانا ہے۔ راقم نے متذکرہ بالا میں اس بات کا ذکر کیا کہ محمد عمر نور الٰہی کا ذکر تاریخی نوعیت میں بہت کم تصانیف میں دیکھنے کو ملتا ہے اس حوالے سے جموں وکشمیر کے معروف

ادیب ڈاکٹر برج پریمی صاحب اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

> ''محمد عمر نورالٰہی صاحبان کی جوڑی نے اسٹیج اور ڈراما کے ساتھ اپنی بے پناہ دلچسپی کا اظہار کیا۔ انھوں نے نہ صرف خود ناٹک لکھے بلکہ اردو زبان میں ڈراما کی پہلی تاریخ اور تنقید ناٹک ساگر کے عنوان سے لکھی جو 1924ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب آج تک اردو ڈرامائی ادب میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ان دونوں حضرات نے اس زمانے میں کئی ڈرامے تصنیف اور تالیف کیے بعض ڈرامے دوسری زبانوں سے ماخوذ ہیں اور کئی طبع زاد ''۔(204)

''ناٹک ساگر'' کے علاوہ محمد عمر نورالٰہی نے کئی دیگر ڈرامے اپنی یادگار چھوڑے ہیں جن میں قابل ذکر ڈرامے ''تین ٹوو پیاں''، ''بگڑے دل''، ''روح سیاست''، ''سات ڈرامے''، ''سروپ'' وغیرہ شامل ہیں۔ان دونوں دوستوں نے مل کر ڈراما میں خوب نام کمایا اور سنسکرت، ہندی اور پراکرت کے کئی ڈراموں کو اردو زبان کا لباس پہنایا ہے اس حوالے سے ان کا ڈراما ''مدرارا کھشس'' قابل ذکر ہے۔اس کے علاوہ بیشتر ڈرامے تاریخی نوعیت کے تھے۔

صاحبزادہ محمد عمر نورالٰہی نے مشہور ڈراما نگار سید امانت لکھنوی کی ڈرامائی کاوش ''اندرسبھا'' کو بڑی محنت اور لگن سے ازسرنو ترتیب دیا تھا۔اس حوالے سے مسعود حسن رضوی نے جو محمد عمر نورالٰہی کے ساتھ جو خط وکتابت کی ہے اس سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تحقیق کے تقاضے میں محمد عمر نورالٰہی کس قدر مستحسن طریقے سے انجام دیتے تھے۔اسی دور میں محمد عمر نورالٰہی صاحب کے کئی تنقیدی مضامین یکے بعد دیگرے مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوتے تھے اور خاص کر ان کے تنقیدی مضامین انجمن ترقی اردو کے رسالے ''اردو'' میں منظر عام پر آتے تھے۔اس وقت حکومت کی جانب سے مضامین پر پابندی سے شائع کیے جاتے تھے اس لیے محمد عمر نورالٰہی ''تنقید ڈرامی'' کے ادبی نام سے اپنے تنقیدی مضامین شائع کراتے تھے۔جب کہ ان کی دیگر تصانیف ان کے اصلی نام محمد عمر نورالٰہی کے نام سے شائع ہوتی تھیں۔ اردو شعر وادب کی دنیا میں ان دونوں حضرات کا شماران کے اندازِ بیان کی وجہ سے ملک کے نامور ادیبوں اور نقادوں میں کیا جاتا تھا۔محمد عمر نورالٰہی نے نہ صرف ڈرامے لکھے بلکہ افسانے اور شاعری میں بھی طبع آزمائی کی تھی اس دور میں ان کے بیشتر افسانے اہم رسائل وجرائد میں شائع ہوتے تھے ان کے افسانوں کا موضوع ان ایام کے سلگتے ہوئے سماجی مسائل ہوتے تھے۔اس حوالے سے ان کا ایک قابل ذکر افسانہ ''ضیا پاش'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا تھا۔اس

افسانے کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ افسانہ نگاری میں بھی محمد عمر نورالٰہی پوری طرح سے کھرے اترتے ہیں۔

اس افسانے میں مصنف نے بیوپاریوں کی چاپلوسیوں کو عریاں کیا ہے۔جس کو دیکھ کر اس دور کے حالات آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں کہ کس طرح سے ٹیکس سے بچنے کے لیے بیوپاری کام کرتے تھے۔حالاں کہ اس افسانے میں مصنف کی زبان و بیان میں بہت جگہ کمی دیکھنے کو ملتی ہے مگر طنز کی کاٹ نے اسے موثر بنادیا ہے۔جس کی وجہ سے افسانہ کامیاب دکھائی دیتا ہے۔اس کے علاوہ محمد عمر اور نورالٰہی کی کئی نثری تصانیف منظر عام پر آئیں جن میں پنچم مدھم اور نواب سراج الدولہ وغیرہ قابل ذکر ادبی کاوشیں ہیں۔

محمد عمر نورالٰہی نے مشترکہ طور پر اردو زبان وادب میں ڈراما کے حوالے سے پہلی تاریخ اور تنقید ''ناٹک ساگر'' کے عنوان سے کتاب تحریر کی تھی۔ یہ کتاب اردو ڈرامائی ادب میں کافی شہرت حاصل کرچکی ہے اور پورے برصغیر میں اس کتاب سے اردو کے قلمکار متاثر ہوئے۔اس معترکۃ الآرا تصنیف میں دنیا کے مختلف ملکوں کے ڈرامائی روایت اور ساتھ ہی ساتھ اہم اور قابل ذکر ڈراما نگاروں کی خدمات کا سیر حاصل جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اگر چہ یہ کتاب ڈرامے کی جامع تاریخ میں پوری طرح سے مقبولیت حاصل نہیں کرپاتی ہے لیکن پھر بھی اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ''ناٹک ساگر'' کا موضوع اس قدر وسعت لیے ہوئے ہے کہ محض ایک نقش اول اس کے ساتھ پورا انصاف کرنے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔دیگر محققین اس بات کو مزید ترقی دے سکتے ہیں اور اس میں نئی منزلیں اجاگر ہوسکتی ہیں تاہم اب تک کی تحقیق کے مطابق یہ کتاب ریاست جموں وکشمیر میں عملی تنقید کا اولین درجہ حاصل کیے ہوئے ہے۔اس حوالے سے محمود الٰہی یوں لکھتے ہیں کہ:

> ''ڈرامے کے فن اور اس کے ارتقا پر اردو جو پہلی مبسوط کتاب لکھی گئی وہ ہے نورالٰہی اور محمد عمر صاحبان کی ''ناٹک ساگر'' اس سے استفادہ کیے بغیر ڈرامے سے متعلق ہمارا حاصل مطالعہ بڑی حد تک تشنہ اور ادھورا رہے گا۔اس کتاب کے حوالے سے جابجا ملتے ہیں مگر نفس کتاب عنقا ہوتی جارہی ہے اور بہت سے اچھے اور بڑے کتب خانے بھی اس سے خالی نظر آتے ہیں ۔اتر پردیش اردو اکادمی کے منصوبوں میں نادر اور کمیاب کتابوں کے عکس کو اشاعت بھی شامل ہے۔ناٹک ساگر کے عکس کی اشاعت اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے''۔(205)

محمد عمر نور الٰہی کی یہ کتاب اگر چہ تاریخ ڈراما نگاری کی پہلی تنقیدی تصنیف قرار دی جاتی ہے مگر اس بات پر محمد عمر نور الٰہی نے کبھی فخر نہیں کیا وہ خود کو بڑا درجہ نہیں دیتے تھے چونکہ اس وقت اردو شعر و ادب کی بڑی بڑی شخصیات ان کے سامنے تھیں جن میں سر سید احمد خاں، ابوالکلام آزاد اور سرشار وغیرہ قابل ذکر قلمکار گذر چکے تھے ایسے میں محمد عمر اور نور الٰہی ان بڑی شخصیت کا بڑے ادب و احترام کرتے تھے اور خود کی تحریروں کو ان کی تخلیقات کے سامنے ادنا سا محسوس کرتے تھے جس کا ذکر خود محمد عمر اور نور الٰہی نے کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''یہ دعویٰ نہیں کہ یہ کتاب جامع اور ڈراما کے جملہ کوایف پر محتوی ہے جس کتاب کی تکمیل کے لیے سر سید کی تحقیق، آزاد کا قلم، سرشار کی فطرت طرازی اور انسائی کلوپیڈیا کی کشادہ دامانی درکار ہو، وہاں ہمارا قلم کیونکر دو قدم چل سکتا ہے۔ اس لیے ہم ان اصحاب سے عذر خواہ ہیں جو کسی کتاب کا سرمایہ کمال فقط الفاظ کی نشت تراکیب کی چستی اور محاورے کے چٹخارے کو سمجھتے ہیں کہ ان کی ضیافت طبع کا بہت کم سامان یہاں مہیا ہے.......... یہ کتاب اسی سوال کا جواب ہے جس کے مطالعہ سے عیاں ہوگا کہ ملک وملت کی سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی ترقی کے لیے اسٹیج پرسیس اور پلیٹ فارم سے بدر جہا بہتر اور زود واثر کام دے سکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ ہندوستان میں ڈراما نابود ہے اور جو چیز ڈراما کے نام سے پیش کی جارہی ہے۔ اسے فن سے کوئی نسبت نہیں۔ ہم مانتے ہیں کہ مروجہ ڈرامے بے مدعا اور اصول وقداعد کے نقیض ہیں''۔(206)

محمد عمر نور الٰہی کی یہ کتاب پندرہ ابواب اور 479 صفحات پر مشتمل ہے اور مصنف نے ڈرامے کی پوری تاریخ کو اس مختصر کتاب میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک تصنیف میں ڈرامے کی تاریخ کے حوالے سے جن ممالک کا ذکر کیا ہے ان میں خاص طور پر یونان، روم و اٹلی، سپین، پرتگال، فرانس، انگلستان، جرمنی، سویڈن و ناروے، روس، ہالینڈ اور بلجیم، امریکہ، ہندوستان، ایران، چین و جاپان، عرب، ٹرکی، افغانستان، سیلون، افریقہ اور آسٹریلیا قابل ذکر ہیں۔ اس کتاب کا مقدمہ پنڈت برج موہن دتا تریا کیفی نے لکھا ہے اور جہاں انھوں نے محمد عمر نور الٰہی کی اس کتاب کے بارے میں اپنی رائے کا بھی اظہار کیا ہے۔ انھوں نے محمد عمر نور الٰہی کے بارے میں اپنے خیالت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''معلوم ہوتا ہے کہ قدرت حریض بھی ہے اور دیر گیری کے ساتھ سخت گیری بھی۔ یہ تو سنا تھا ''دادا کرے پوتا بھرے'' یہاں یہ مثل ہے پچھّم کرے پورب بھرے۔ یہ تو آپ نے دیکھا، حریض یوں ہے کہ ایک وقت میں ایک شکار سے اس کے انتقام کی شکم پری نہ ہوئی۔تو اس نے اب دو ن کی ٹھہرائی۔ یہ میاں نور الٰہی اور صاحبزادہ محمد عمر ناٹک ساگر کے مصنف ہیں ....پچھلے دس سالوں میں جو مساعی ناٹک کو اردو ادب کا ایک اہم جز قرار دینے بروئے کار لائے گئے۔ان میں میاں نور الٰہی صاحب اور صاحبزادہ محمد عمر صاحب کا حصہ کسی سے کم نہیں اور اب یہ ناٹک ساگر تو ناٹک کے لیے ان کی دلچسپی اور شفیقانہ مساعی کا گرانڈیل ثبوت ہے۔ میں مصنفین کو اس تاریخی تصنیف پر مبارکباد دیتا ہوں۔ان کی تلاش اور عرق ریزی مبصرانہ جانچ اور ژرف نگاہی قابل داد ہے۔آج تک ہندوستان کی کسی زبان میں ایسی بسیط اور ہمہ گیر کتاب نہیں لکھی گئی۔اردو ادب میں یہ مہتم بالشان اضافہ ہے اور ایسا اضافہ ہے جس کے لیے اردو دنیا مصنفین کے احسان سے سبکدوش نہیں ہوسکتی'' (207)

محمد عمر نور الٰہی نے جہاں دیگر ممالک کے ڈراما نگاری کے بارے میں بات کی ہے وہاں ہندوستان کے قدیم ڈراما اور ناٹک کے بارے میں بھی کافی دلچسپی سے روشنی ڈالی ہے۔جس طرح سے انھوں نے ہندوستان کے قدیم ویدوں اور شاستروں سے شروع ہونے والے ناٹک کا ذکر کیا اور قدیم دیوی دیوتاؤں کے بارے میں روشنی ڈالی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ہندوستان کے ساتھ ساتھ تمام ممالک کی تاریخ کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔اسی طرح سے انھوں نے ہندوستان کے قدیم ڈراما کے بارے میں لکھا ہے اقتباس ملاحظہ ہو:

''علمائے ہند دیگر ہندوستانی فنوں کی طرح ڈراما کی ایجاد کو بھی دیوتاؤں سے منسوب کرتے ہیں۔ چنانچہ روایت ہے کہ بہت سے دیوتا اندر کے پاس گئے اور اس سے گویا ہوئے کہ آسمانی بادشاہت کام کاج کی زحمت سے علاقہ نہیں رکھتی اور بیکار بیٹھے بیٹھے جی اکتا جاتا ہے ۔اس لیے آپ برہما کے حضور میں عرض کریں کہ وہ کسی ایسی تفریح کا ڈول ڈالیں جو چشم و گوش کی ضیافت کا سامان بہم پہنچائے۔اندر مہاراج تو ان باتوں کے رسیا ہی ہیں فوراً گئے اور برہما کی خدمت میں حاضر ہوکر تمام ماجرا عرض کردیا۔ برہما نے بحرفکر میں غوطہ لگایا اور نٹ وید کی شکل میں ایک درآبدار نکال لائے۔ یہ پانچواں وید کوئی نیا وید نہ تھا۔ بلکہ اس کی تدوین دیگر

ویدوں کی مرہون منت تھی۔ برہما نے رگ وید سے رقص، سام وید سے سرود، یجر وید سے حرکات وسکنات اور اتھر وید سے اظہار جذبات کا طریق لے کر اس وید کو تیار کیا۔ جب ڈراما کا وید مرتب ہو گیا تو آسمانی معمار وشوکرم کے نام حکم صادر ہوا کہ وہ اندا سن میں سٹیج تعمیر کرے۔ اسٹیج کی خدمات بھرت نامی ایک رشی یا منی کے سپرد ہوئیں جس نے ہدایت اسٹیج کے متعلق بھرت نٹ شاستر کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی۔ کالی داس نے اپنے ڈراموں میں اس کتاب کا اکثر حوالہ دیا ہے۔ یہ روایت کوئی باور کرے یا نہ کرے مگر اس میں کلام نہیں کہ چوتھی صدی قبل مسیح میں فن ڈراما ہندوستان میں ایجاد ہو چکا تھا''۔(208)

صاحبزادہ محمد عمر نے کافی عرصہ تک جج کی حیثیت سے بھی اپنے کام کو بخوبی انجام دیا تھا۔1936ء میں جب وہ جج کی ملازمت سے سبکدوش ہو گئے تو اسی سال ان کے عزیزی دوست نور الٰہی کی وفات ہوئی اس خبر کو سن کر انہیں صدمہ ہو گیا اس کے بعد تقریباً دس سال تک محمد عمر نور الٰہی کے بغیر بھی ڈراما نگاری میں طبع آزمائی کرتے رہے مگر کبھی بھی اپنے عزیزی کو خود سے دور نہ کر پائے اور 3/ اکتوبر 1946ء کو محمد عمر بھی اس دنیا سے انتقال کر گئے۔لیکن رفاقت کا یہ عالم تھا کہ نور الٰہی کی وفات کے بعد تقریباً دس برس تک صاحبزادہ محمد عمر نے جو کچھ بھی اپنی قلم سے تحریر کیا یا شائع کروایا اس پر نور الٰہی کا نام بھی بدستور مصنف یا مولف کے طور پر ان کے نام ساتھ ساتھ ہمیشہ شامل رہا۔اس کے بعد سے آج تک ان دونوں حضرات کی تحریروں میں دونوں کے ''محمد عمر نور الٰہی'' کے نام سے شائع کیا جاتا ہے۔ یہ اٹوٹ رشتے اب یادگار زمانہ بن کے رہ گیا ہے۔ جو کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں کیے جا سکتے ہیں اور نہ ہی کبھی ان کی کتاب ''ناٹک ساگر'' کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

جگدیش چند کنول:

ان کی ولادت 1920ء کے آس پاس جموں میں ہوئی تھی۔ جموں خطے میں افسانہ نگاروں میں انہیں کافی شہرت حاصل ہوئی تھی۔انھوں نے کئی ڈرامے بھی لکھے تھے۔اس حوالے سے ان کا مشہور ڈراما ''پردے کے پیچھے'' قابل ذکر ہے۔جس دور میں کنول صاحب نے اپنے ادبی زندگی کی شروعات کی اس دور میں ریاست میں کسی بھی ادبی تحریر کو شائع کرنے کی اجازت نہیں تھی تاہم انھوں نے لاہور کا رخ کیا جہاں سے ان کی ادبی تحریریں منظر عام پر آئیں۔ جگدیش چند کنول کے ہم عصروں میں نرسنگھ داس نرگس اور اظہر عسکری وغیرہ قابل ذکر ادیبوں میں شامل تھے۔

جگدیش کنول نے جموں میں اپنی بنک کی ملازمت کے دوران اپنی تخلیقات کو اکٹھا کر کے لاہور کے ادبی رسائل وجرائد میں شائع کروایا۔ کنول نے ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا تھا بعد میں دیگر اصناف سخن میں طبع آزمائی کی۔ 1947ء کے بعد جگدیش کنول کو شہر جموں کی سرزمین راس نہ آئی جس کی وجہ سے اس شہر کو خیر آباد کہا اور ممبئی میں جا کر آباد ہوئے جہاں انھوں نے باقی کی تمام زندگی گزاری۔

وجے سمن سوسن:

ان کا تعلق جموں خطے سے تھا۔ جموں کے مشہور ادیب شاعر اور صحافی میں ان کا شمار ہوتا ہے اور کئی اردو ڈراما بھی انھوں نے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ کئی عرصے تک انھوں نے ''قومی آواز'' جموں کے حلقہ ادارت میں بھی اپنے کام کو انجام دیا۔ 1947ء کے پہلے لکھنے والے بڑے قلمکاروں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ڈراموں کے علاوہ ان کے کئی افسانے بھی منظر عام پر آچکے ہیں۔ وجے سمن نہ صرف اردو زبان کے ساتھ وابستہ تھے بلکہ ہندی زبان میں بھی کافی مہارت رکھتے تھے۔ اردو فکشن کے ساتھ ساتھ انہیں ڈراما نگاری سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ 1969ء میں انھوں نے اپنا ایک ڈراما ''رنگمان'' کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ یہ ڈراما دراصل چین کا ہندوستان پر حملے کی مذمت میں لکھا گیا تھا۔ مصنف نے اس ڈرامے میں صرف ہیروئن کو پیش کیا ہے۔ اس پوری کہانی میں صرف ایک ہی خاندان کو پیش کیا ہے وہ خاندان جو ماں ، باپ اور بیٹی رنگمانی اور دو بیٹوں کی کہانی پر مشتمل ہے۔ اچانک سے ایک دن چینیوں نے ان کے اوپر حملہ کر دیا تھا اور دونوں بیٹے لڑتے ہوئے دردناک موت مارے گئے تھے۔ اس کے بعد چینی فوجیوں کی بری نظریں رنگمان پر پڑتی ہیں۔ اور ایک چینی فوجی رنگمان پر جانور کی طرح چل پڑتا ہے اس دوران کا منظر مصنف نے بہت ہی خوفناک طریقے سے پیش کیا ہے کہ کس طرح سے ایک چینی فوجی اپنی ہوس پوری کرنے کے لیے جانور کی طرح رنگمان کی عزت لوٹتا ہے۔ اس پوری کہانی میں ایک اہم موڑ تب آتا ہے جب وہی چینی فوجی بعد میں رنگمان سے شادی کرنے کے لیے راضی ہو جاتا ہے ۔ مگر وہیں دوسری طرف اس دردناک حادثے کا شکار ہو کر اس کا بھائی مر جاتا ہے۔ رنگمان کو فوجی سے ایسی نفرت ہو جاتی ہے کہ شادی کے بعد رنگمان کو لڑکا پیدا ہوتا ہے مگر وہ اپنی نفرت کو مٹانے کے لیے اپنی کوکھ سے پیدا ہوئے بچے کو پانی میں ڈبو کر مار دیتی ہے۔

اس ڈرامے کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مصنف نے حب وطن کے جذبات کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ اگرچہ اس ڈراما میں کوئی چونکا دینے والے ڈرامائی واقعات سامنے نہیں آتے مگر مکالموں کی بناوٹ سے مصنف نے

اس میں خوب ڈرامائی انداز پیدا کیا ہے اور یہی مکالموں کی برجستگی اس کی خوبی کا ایک عنصر بن جاتی ہے۔مکالمہ نگاری کے مناظر کو مصنف نے جس انداز میں کرداروں سے باتیں کروائی ہیں قابل تعریف ہیں۔مثال کے طور پر اس ڈرامے میں جب رنگمان کے باپ اور چینی فوج کی گفتگو آمنے سامنے ہوتی ہے تو اس دروان کا ایک منظر وجے سوسن کی مکالمہ نگاری کی نمائندگی کرتا ہے، اقتباس ملاحظہ ہو:

''پلجور: کون لوگ ہو تم؟

فنسخ: خدا کے بندے۔

پلجور: وہ تو میں بھی دیکھا رہا ہوں، میرا مطلب ہے ہماری طرح ہو۔

فنسخ: نہیں، ہم جھوٹ نہیں بولا کرتے۔

پلجور: تو پھر یہاں کیوں ٹھہرے ہوئے ہو؟

فنسخ: یہاں ٹھہرے ہو نہیں ہیں، یہ تو ہمارا گھر ہے۔(209)

اس ڈرامے کی یہ بات قابل قبول ہے کہ مصنف نے مکالمہ نگاری سے اس میں بہت کامیابی حاصل کی ہے۔ اس ڈراما کا پیش لفظ وجے سمن سوسن کی بیوی پسن مالا نے لکھا ہے۔جن کا تعلق پنڈت امر ناتھ شہید کے خاندان سے تھا۔ امر ناتھ شہید ریاست جموں وکشمیر میں گورنر اور لداخ کے وزیر وزارت بھی رہ چکے تھے۔انھیں اردو ادب سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔اس حوالے سے ان کا ایک مشہور ناول ''کملا'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا تھا۔اسی طرح سے ان کی ایک کتاب ''چراغ ہدایت'' کے عنوان سے منظر عام پر آئی جو انھوں نے بچوں کے لیے لکھی تھی۔

سپن مالا کو اردو زبان کے ساتھ ساتھ پنجابی زبان میں بھی دسترس حاصل ہے ان کی کئی اشعار پنجابی زبان میں بھی سامنے آئے ہیں۔اسی طرح سے انھوں نے کئی اشعار اردو میں بھی کہے ہیں۔انھوں نے ڈراما ''رنگمان'' کا پیش لفظ لکھتے وقت اس کا آغاز وجے سمن سوسن کے ایک مشہور شعر سے کرتی ہیں۔شعر ملاحظہ ہو:

ضبط کی تلقین کی یاد ے گئی دادِ وفا

کہہ گئی خاموش ہو کر شمع پروانے سے کیا

اس کے بعد وہ جے سمن سوسن کے اس شعر کی تعریف کرتی ہیں جو ان کی زندگی کا بہترین شعر بن گیا تھا اسی شعر کو

مدِ نظر رکھتے ہوئے وہ لکھتی ہیں کہ:

''میں نہیں جانتی کہ وجے سمن جی نے یہ شعر آج سے کئی سال پہلے کن احساسات کے تحت لکھا تھا مگر اتنا سمجھتی ہوں کہ اب یہ شعر ان کی پوری زندگی پر حاوی ہوکر رہ گیا ہے۔ یا یوں سمجھ لیجیے کہ ان کی زندگی اس شعر کی تفسیر بن چکی ہے''۔(210)

دیانند کپور:

بنیادی طور پر دیانند کپور کا شمار جموں کے صحافیوں میں ہوتا ہے۔ مگر انھوں نے صحافت کے علاوہ بھی دیگر اصناف ادب میں طبع آزمائی کی تھی۔ انھوں نے کئی ڈرامے اور افسانے اپنی یادگار چھوڑے ہیں جن کو ریاست اور دیگر ریاستوں میں کامیابی ملی۔ دیانند کپور کے بیشتر افسانے اور ڈرامے مختلف رسائل و جرائد اور جموں کے منتخب ادیبوں کے مجموعے میں شائع ہوتے تھے۔ ریاست جموں و کشمیر کے مشہور ادیب نند گوپال باوا کے مجموعے ''آدم کے بیٹے'' میں دیانند کپور کا ایک مشہور ڈراما ''تاج'' منظر عام پر آیا تھا۔

دیانند کپور نے ریڈیو کشمیر میں بھی عرصہ دراز تک ملازمت کی اور ساتھ ہی ساتھ اردو ادب میں بھی اپنے کارنامے انجام دیتے رہے۔

سی پروانہ اور لیش شرما:

دونوں کا تعلق جموں سے تھا اور دونوں ایک ہی دور کے قلمکار تھے۔ ان دونوں ادیبوں کو اردو زبان کے ساتھ ساتھ ہندی میں بھی گہرا لگاؤ تھا۔ سی پروانہ کا تعلق جموں خطے کے ایک متوسط خاندان سے تھا اور یہیں ان کی ولادت 1934ء میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم جموں کے ایک مڈل اسکول میں حاصل کی اور اسی دوران انہیں کہانی لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ انٹر تک تعلیم کو مکمل کیا اور پھر اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں ڈرامے لکھنے لگے۔ ان کے کئی ڈرامے منظر عام پر آچکے ہیں جن میں ان کا سب سے بہترین ڈراما ''نیم حکیم'' کے عنوان سے ہے۔ سی پروانہ کو اردو ہندی کے علاوہ پنجابی او رڈوگری زبان میں بھی مہارت تھی۔ انھوں نے کئی کہانیاں پنجابی اور ڈوگری میں بھی لکھی تھیں۔

سی پروانہ کے ہم عصر ادیبوں میں سب سے اہم نام لیش شرما کا ہے۔ اگر چہ لیش شرما کی پیدائش کے بارے میں معلومات دستیاب نہیں ہوئیں، مگر اتنا ضرورت کہا جاسکتا ہے کہ ان کی ابتدائی تعلیم جموں میں ہی ہوئی تھی۔ اس کے بعد انھوں نے بی اے بھی جموں سے کیا۔ اردو کے ساتھ ساتھ انہیں ڈوگری اور ہندی میں کافی شغف تھا۔ شاعری بھی کافی

اچھی کرلیا کرتے تھے ان کی شاعری زیادہ تر ڈوگری زبان میں دیکھی جاسکتی ہے۔انھوں نے کچھ اردو ڈرامے بھی لکھے تھے مگر ان کی ان تحریروں نے کچھ اردو ڈرامے بھی لکھے تھے مگر ان کی ان تحریروں میں ڈوگری کلام کے علاوہ کچھ بھی دستیاب نہیں ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب نے اپنی تصنیف میں ایک جگہ لکھا ہے:

''دیش شرما نے بی۔اے تک تعلیم حاصل کی ہے۔ یہ ڈوگری، اردو ہندی میں لکھتے ہیں۔شعر بھی کہتے ہیں اور زیادہ کلام ڈوگری میں ہے۔اردو میں کچھ ڈرامے لکھے ہیں''۔(211)

زیڈ سیمی:

جموں کے اچھے ادیب اور شاعر ہیں ان کی ولادت 1947ء سے پہلے جموں میں ہی ہوئی تھی۔انھوں نے کئی ڈرامے، مزاحیہ خاکے اور ریڈیو ڈرامے وغیرہ لکھے تھے۔انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں شروع کر دیا تھا۔ان کی ایک قابل ذکر تصنیف ''فلمی سیڑھیاں'' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔انہیں مزاحیہ خاکے لکھنے کا بہت شوق تھا اس حوالے سے ان کے دو مزاحیہ خاکے ''شاعری کا صارا'' اور ''قلمی قتلے'' قابل ذکر ہیں۔نثری ادب کے ساتھ ساتھ شاعری بھی اچھی کرلیا کرتے تھے انھوں نے کئی غزلیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں بعد میں ان سب کو اکٹھا کر کے ایک مجموعہ ''طلوع'' کے عنوان سے شائع کروایا۔

زیڈ سیمی نے بہت سارے ریڈیو ڈرامے بھی لکھے تھے ان کے ریڈیو ڈراموں کا مجموعہ ''جھنکار'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا تھا جو بہت ہی قابل ذکر ہے۔زیڈ سیمی کا ایک مشہور اور دلچسپ ڈراما ''جہانگیر کی موت'' کے عنوان سے نومبر 1962ء نیا کشمیر پریس، جموں سے منظر عام پر آیا تھا۔اس میں مصنف نے جہانگیر کی جو محبت کشمیر کے لیے تھی ان سب چیزوں کو مصنف نے دکھانے کی کوشش کی ہے۔اس بات سے تقریباً ہر شخص واقف ہے کہ جہانگیر کو کشمیر کی سرزمین سے کتنا لگاؤ تھا وہ خود وادیٔ کشمیر سے جدائی برداشت نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ ان کا انتقال بھی سفر کشمیر کے دوران ہی پونچھ کے بہرام گلہ میں ہوا تھا۔آج بھی یہ جگہ کافی مشہور ہے۔مغلوں کے عہد میں یہ مقام لاہور سے آنے والے راستے میں واقع ہے۔اسی مقام کے قریب ہی نوری چھم بھی ایک مشہور جگہ ہے جو مغلوں کے دور کے بعد نور جہاں کے نام سے موسوم ہوئی اس لیے کیوں کہ یہ جگہ نور جہاں کو بہت پسند تھی وہ اکثر سفر کشمیر میں کچھ دنوں کے لیے یہاں ضرور قیام کرتے تھے۔

اس ڈرامے میں مصنف نے پوری ہیئت اور تکنیک سے کام لیا ہے۔اس میں مکالمہ نگاری، جذبات نگاری کا

خاص خیال رکھا گیا ہے۔مصنف نے اس ڈرامے میں کہانی کو اس طرح سے بیان کیا ہے کہ پورا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اس ڈراما میں اہم کردار شاہد اور ناہید تاریخی مقامات کی سیر کو نکلتے ہیں۔ جب وہ راستے میں نوری آشار پہنچتے ہیں تو اس وقت مصنف جہانگیر اور نور جہاں کے اس مقام کی سیر کا منظر پیش کرتا ہے۔اس کے بعد ڈراما نگار نے نور جہاں اور جہانگیر کے دوران سفر کی جس طرح سے عکاسی کی ہے قابل تعریف ہے۔ وادیٔ کشمیر میں ہاتھی نالہ کے مقام پر جہانگیر بادشاہ کے لیے ایک خوبصورت محل سرا بنائی گئی تھی۔ یہ جگہ اس لیے بھی کافی مشہور تھی کیوں کہ یہاں جہانگیر ہمیشہ شکار کے لیے آیا جایا کرتا تھا۔ان سب واقعات کو ڈراما نگار نے بڑے اچھے طریقے سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔اس ڈراما کا خاکہ بہترین ہے اور مکالمے بھی بہت ہی دلچسپ ہیں۔نوری چھم پر جب نور جہاں اور جہانگیر قیام کرتے ہیں تو اس وقت کا منظر اور مکالمے ڈراما نگار نے بہت ہی عمدہ طریقے سے پیش کیے ہیں۔اقتباس ملاحظہ ہو جو عبدالقادر سروری صاحب نے بھی پیش کیا ہے کہ:

> ’’نور جہاں۔شہنشاہ جہانگیر جب بھی اس مقام پر آتے ہیں تو شہنشاہ کم اور شاعر زیادہ ہو جاتے ہیں‘‘۔
>
> جہانگری: ملکہ تم ٹھیک کہتی ہو۔کاش ہم صرف شاعر ہوتے اور دنیا وفانیہا سے بے خبر تمہارے اور قدرتی حسن میں کھو کر،ایک ایسا شاہکار تخلیق کرتے جو بے مثال اور لاجواب ہوتا۔کاش ہم مصور ہوتے تو اس خوبصورت منظر کو کاغذ پر منقش کر دیتے‘‘۔(212)

رام کمار ابرولؔ:

ان کی ولادت 1930ء کے آس پاس جموں میں ہوئی اور وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی اس کے بعد بی۔اے کا امتحان بھی پاس کیا بعد میں انہیں ریڈیو کشمیر جموں میں ملازمت مل گئی۔ یہاں انھوں نے کئی ریڈیو ڈرامے شائع کیے اوران کے ڈراموں کو کافی شہرت حاصل ہوئے۔رام کمار ابرول نے ریڈیو ڈرامے میں اپنی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔انہیں جموں کے مشہور ادیبوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ وہ اردو زبان کے ساتھ ڈوگری زبان میں بھی لکھتے تھے۔ان کی تخلیقات میں انسان دوستی اور خاص طور پر نچلے طبقے اور غریب اور خستہ حال لوگوں کی نامراد زندگی اور کسانوں کے نامساعد حالات کی بہترین عکاسی ملتی ہے۔اردو میں انھوں نے کچھ ہی افسانے لکھے تھے مگر ان کی قلمی صلاحیتیں، افسانوں سے زیادہ ڈراما نگاری میں تھیں۔

رام کمار ابرول کا ایک ڈراموں کا مجموعہ ''زندگی اور موت'' کے عنوان سے 1947ء میں نئی دہلی سے منظر عام پر آیا تھا۔ یہ مجموعہ ان کے چار ڈراموں پر مشتمل ہے۔ جن میں دوراہا، ایک قبر دو آنسو، سمادھی کی مٹی اور زندگی اور موت قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح سے مصنف کا دوسرا ڈراموں کا مجموعہ 1959ء میں ''دھرتی اور ہم'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد رام کمار ابرول کا ایک مشہور ڈراما کتابی صورت میں 1965ء میں ''انسان جیت گیا'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔ اس ڈرامے کو کافی سراہا گیا تھا اور جب اس کو اسٹیج پر پیش کیا جا رہا تھا تو اس وقت ریاست جموں وکشمیر میں وزیر ترقیات شر چونی لال کوتوال تھے اور وزیر اعظم جناب بخشی غلام محمد تھے ان کی صدارت میں اس ڈرامے کو اسٹیج کیا گیا تھا۔

رام کمار ابروال کا ڈراما ''انسان جیت گیا'' کا موضوع دراصل اجتماعی کاشت کاری کے فلسفے کی عام فہم تفسیر ہے۔ اس ڈرامے میں مصنف نے صدیوں کے سوئے ہوئے غریبوں، مزدوروں کی عکاسی کی ہے۔ انھوں نے یہ بھی دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اگرچہ تقسیم وطن کے بعد کسان نئی ترقی میں نکلا مگر اس کے کھیت اب بھی منتشر رہے۔ چھوٹے چھوٹے قطعوں میں بٹے ہوئے کھیت زمین کے بہاؤ اور کٹاؤ سے بہت متاثر ہو جاتے ہیں۔

رام کمار ابروال اپنی تخلیقات کے ذریعے سے یہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ کسان چاہے تو اپنی خود کی مدد کر سکتا ہے اس کا ذوق عمل اور سعی پیہم ہی اس کی بہترین رہبری کر سکتی ہے۔ ابرول صاحب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ عوام الناس کی خوشحالی میں پیش پیش رہتے ہیں۔ اس بات کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ابرول صاحب اس زمانے کی ترقی پسند تحریک سے براہ راست وابستہ نہ رہے ہوں لیکن ان کی تحریروں کے پس منظر میں اس ترقی پسند تحریک سے دلی وابستگی کا اظہار ضرور ہوتا ہے۔ اگرچہ مشترکہ عمل کی اہمیت وافادیت کو دیکھا جائے تو یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کسی سیاسی بازیگری کی تقریر کا موضوع ہو سکتا ہے لیکن کسی ادبی تخلیق کا محور ہرگز نہیں بن سکتا کیوں کہ بنیادی طور پر دیکھا جائے تو اس رجحان کی وجہ سے وہ ادب نہیں رہتا بے جا تشہیر کا ایک وسیلہ بن جاتا ہے۔ ابرول صاحب کی تخلیقات میں بھی بدقسمتی یہ رہی کہ ان کے یہاں یہ رجحان بجائے کم ہونے کے اور زیادہ بڑھتا دکھائی دیتا ہے۔ اور اس کا اثر نہ صرف ان کی اردو تحریروں پر پڑا بلکہ ڈوگری تحریر کردہ چیزوں میں بھی ہونے لگا۔

شروع شروع میں ناقدین نے ایسے ریڈیو ڈرامے کے وقتی اثر سے تعبیر کر کے اس کو نظر انداز بھی کرنا چاہا مگر وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ ابرول صاحب کے خطیبانہ اسٹائل میں کوئی تخفیف نہیں ہو سکی اسی وجہ سے ان تخلیقات میں چاہے وہ افسانے ہوں یا ڈرامے تمام تحریریں غیر حقیقی اور غیر فطری بن کر رہ گئیں۔ مگر اس کے باوجود اس بات کو کبھی

نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اگر رام کمار ابرول کے فن کو کسی چیز نے سہارا دیا تو وہ ہے ان کے کردار نگاری جس سے ان کی تخلیقات میں طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ ایک ایک کردار کو نہایت عرق ریزی سے تراشتے ہیں ان کے کرداروں میں بہت ہی متانیت اور سنجیدگی پائی جاتی ہے۔

ابرول صاحب کو لکھنے پڑھنے کو شوق ان کی ابتدائی تعلیم سے ہی ہو گیا تھا۔ انھوں نے جب اپنی بی۔اے تک کی تعلیم جموں میں حاصل کی تو اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ لکھتے بھی رہے۔ کچھ عرصہ تک انھوں نے آل انڈیا ریڈیو جموں میں ملازمت کی مگر اس میدان میں زیادہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ پھر انہیں فلمی دنیا میں جانے کا شوق پیدا ہوا اور وہ جموں سے بمبئی چلے گئے۔ وہاں جا کر کچھ عرصہ کام کیا۔ مگر یہاں بھی من نہ لگا اور بمبئی سے پھر واپس آ گئے اور لوٹ کر جموں میں محکمہ انفارمیشن میں ملازمت کر لی۔ فلمی دنیا میں دلچسپی کے باعث انھوں نے ڈوگری میں ایک فلم بھی بنائی تھی۔

رام کمار ابروال کے شاہکار ڈراموں میں ''انسان جیت گیا'' ہے اس کے علاوہ ان کے دیگر ڈرامے ''دھرتی اور ہم'' اور ''چکی کے پاٹ'' قابل ذکر ہیں۔ رام کمار ابروال کو ریڈیو ڈرامے لکھنے کا بھی شوق تھا اس حوالے سے ان کے ریڈیو ڈراموں کا مجموعہ ''زندگی اور عورت'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔ ابرول ڈراما ''انسان جیت گیا'' کا مرکزی موضوع ایک اجتماعی کاشت کاری ہے۔ اس ڈرامے میں رام کا کردار خود مصنف کا ہے۔ اس کے علاوہ اس ڈرامے کا مرکزی کردار مالتی ہے جو اس ڈرامے کی ہیروئن بھی ہے۔ اس کے علاوہ مالتی کا بھائی رتن بھی اس ڈرامے کا اہم کردار ہے۔ رام کمار ابرول کو ڈراما نگاری میں پوری مہارت حاصل تھی اس لیے اس ڈرامے کے مکالموں میں مزاج کی چاشنی ملتی ہے جو ڈرامے کو کامیاب بناتی ہے۔ اس کے علاوہ کردار نگاری اور منظر نگاری بھی اس میں اہم ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہوں:

''مالتی۔ آتا کیوں نہیں، تو نے تو مجھے ایک دم گنوار سمجھ رکھا ہے کیا؟

رتن۔ نہیں جی، رتن سے سمجھ دار آدمی کی دیدی گنوار ہو سکتی ہے بھلا؟

مالتی۔ اچھا تو تو آدمی ہے؟

رتن۔ تو کیا ہوں پھر؟

مالتی۔ میرا چھوٹا بھیا ....''(213)

رام کمار ابروال کا ڈراما ''انسان جیت گیا'' کے بارے میں عبدالقادر سروری صاحب نے اپنی کتاب میں لکھا

ہے کہ:

''ڈراما ''انسان جیت گیا'' جس کی ہدایت کاری کے فرائض خود انھوں نے (رام کمار ابروال) نے انجام دیئے تھے اپنے عہد کی بیداری کے شعور کو پیش کرتا ہے۔اس میں رجعت پسند قوتوں کا ترقی پسند قوتوں سے تصادم دکھایا گیا ہے اور ترقی پسند قوتوں کی فتحمندی نمایاں کی ہے ''۔(214)

اس متذکرہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدالقادر سروری صاحب نے ڈراما ''انسان جیت گیا'' کا گہرائی سے مطالعہ نہیں کیا تھا کیوں کہ انھوں نے اس میں جو لکھا ہے وہ بالکل غلط ہے چونکہ اس ڈرامے کی ہدایت کاری کے فرائض کا انجام جتیندر شرما نے دیا تھا اس بات کا اظہار جان محمد آزاد صاحب نے بھی اپنی کتاب میں کیا ہے۔اور پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب کی اس بات کو رد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ابرول نے ''انسان جیت گیا'' کی ہدایت بھی خود دی تھی جو کہ واقعتاً قطعی غلط ہے۔اس کھیل کی ہدایت کاری کے فرائض جتیندر شرما نے انجام دیئے تھے۔ابرول نے اس میں رام،کا مرکزی کردار ادا کیا تھا جس کا سروری نے کوئی ذکر نہیں کیا ہے''۔(215)

1970ء کے بعد رام کمار ابروال کا فن بھی جدید ادبی رجحانات سے متاثر ہوا۔انھوں نے اردو ادب میں جتنا بھی لکھا تھا وہ سب نئے تقاضوں کے مطابق تھا۔ڈرامے اور افسانے کے علاوہ رام کمار ابروال نے ناول نگاری میں بھی طبع آزمائی کی تھی اس حوالے سے ان کا مشہور ناول ''سحر ہونے تک'' قابل ذکر ہے۔یہ ناول ان کی تخلیقی سفر کا آخر پڑاؤ تھا۔ان کی ایک خصوصیت قابل ذکر ہے کہ انھوں نے ڈگر دیس کے عوام اور ان کے دکھ درد کی کہانی کی جو علامتی تفسیر پیش کی ہے وہ ان کے قارئین کی ہمیشہ یادگار رہے گی۔

''دوراہ'' ڈراما مصنف کا ایک مشہور ڈراموں میں ایک ہے یہ ڈراما ان کے مجموعہ ''زندگی اور موت'' میں شامل پہلا ڈراما ہے۔اس ڈرامے کو مصنف نے پانچ مناظر پر مشتمل کیا ہے۔اس میں بنیادی طور پر چھ کردار ہیں جن میں ریٹائرڈ کرنل، مالا، راج، انل، لتا اور لتا کی والدہ ہیں اس کے علاوہ کچھ ضمنی کردار بھی مصنف نے اس میں پیش کیے ہیں۔رام کمار ابرول کا یہ ڈراما طربیہ پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔اس کا مختصراً قصہ یوں ہے کہ ایک ریٹائرڈ کرنل کی بیٹی مالا بہت ہی حسن وخوبصورت ہے اس کا رشتہ ایک فوجی افسر سے طے ہوجاتا ہے دھوم دھام سے شادی ہوتی ہے اور شادی کے کچھ

عرصہ بعد جب راج واپس اپنی ڈیوٹی پر چلا جاتا ہے اسی دوران کرنل اور اس کی بیٹی مالا کو راج کے حادثے میں جاں بحق ہونے کی خبر ملتی ہے۔ بہت عرصہ ہوجاتا ہے مگر راج کا کچھ پتہ نہیں چلتا ہے۔اسی صدمے کی وجہ سے مالا ٹی بی کا شکار ہوجاتی ہے۔

کرنل اپنی بیٹی کی جان بچانے کے لیے اور اسے اس بیماری سے نجات دلانے کے لیے اچھے ہسپتال میں داخل کروادیتا ہے۔ جہاں اس کا علاج ڈاکٹر انل کے ہاتھوں شروع ہوتا ہے۔ڈاکٹر انل ایک یتیم تھا اور وہ انگلینڈ میں اپنی ڈاکٹری کرکے آیا تھا اور مالا اس کا پہلا کیس تھا۔ مالا صحت یاب بھی ہوتی رہتی ہے مگر اس دوران اسے ڈاکٹر انل سے محبت ہوجاتی ہے لیکن ڈاکٹر انل، لتا سے محبت کرتا ہے کیوں کہ لتا کی والدہ نے ہی اسے پال پوس کر بڑا کیا تھا جب مالا کو انل اور لتا کی محبت کا پتا چلتا ہے تو وہ پھر سے اسی صدمے کا شکار ہونے لگتی ہے۔اب ڈاکٹر انل پھر سے اس کی جان بچانے کے لیے مالا سے شادی کرنے کے لیے مجبوراً راضی ہوجاتا ہے اور اس کام میں لتا جانتے ہوئے بھی اپنے محبت کو قربان کرکے مالا اور انل کا ساتھ دیتی ہے۔لیکن عین اسی وقت راج کے زندہ واپس آنے کی خبر ملتی ہے۔تب ہی انل کو مالا اور راج کی شادی کی بات معلوم ہوتی ہے اور پھر یہ ڈراما کا قصہ ایک خوشی پر ختم ہوتا ہے۔اسی طرح سے انل اور لتا کی محبت بھی کامیاب ہوتی ہے اور راج مالا بھی اپنی محبت میں ہنسی خوشی سے رہنے لگتے ہیں۔

اس ڈرامے میں مصنف نے کہانی کو بہت بہترین انداز میں پیش کیا ہے مگر اس میں کچھ جگہوں پر جھول بھی دکھائی دیتا ہے جس سے قاری کے دل میں ایک اکتاہٹ سی محسوس ہونے لگتی ہے۔بقول پروفیسر ظہورالدین کہ:

> ''فنی اعتبار سے اس ڈرامے کے پلاٹ میں کچھ ایسے خوانچے اور جھول ہیں کہ اگر وہ نہ ہوتے تو نہایت ہی اچھا تھا''۔(216)

رام کمار ابرول نے یہ ڈراما فلمی انداز کی طرح اختتام تک پہنچایا ہے۔جس سے صاف طور پر دیکھا جاسکتا ہے کہ اس میں مصنف نے قارئین کی دلچسپی کا بہت کم خیال رکھا ہے۔

دینو بھائی پنت:

ان کی پیدائش جموں میں 1917ء کو ہوئی تھی۔دینو بھائی پنت کا شمار جموں کے ادبی حلقوں میں بہت ہی اہمیت کے حامل ہے۔وہ ڈوگری زبان کی وجہ سے ''ڈوگری سنستھا جموں'' کے صدر بھی رہ چکے تھے اور ڈوگری کے شاعروں میں ان کا شمار صفحہ اول میں کیا جاتا ہے۔انھوں نے اپنے کلام کا مجموعہ ''سرپنچ'' کے عنوان سے شائع کیا تھا جس پر انہیں

ریاست کلچرل اکادمی کی جانب سے 1962ء میں انعام سے نوازا گیا تھا۔

دینو بھائی پنت کا تعلق چونکہ محکمہ دیہات سدھار سے تھا۔ اس لیے ان کی تخلیقات میں غریب، مزدوروں، کسانوں اور نچلے طبقے کے لوگوں کی سماجی حالات کی عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ڈرامہ نگاری سے بھی انہیں کافی لگاؤ تھا چنانچہ اس حوالے سے اگر ان کے ڈراموں کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے دور کے سماج کی بہترین عکاسی کی تھی۔ انھوں نے اپنے بہت سارے ڈرامے اسٹیج پر بھی پیش کیے تھے۔

اردو زبان وادب کے حوالے سے دینو بھائی پنت کا سب سے اہم کارنامہ ان کا ڈراما ہے جو انھوں نے ''سورگ کی کھوج'' کے عنوان سے لکھا تھا۔ اس میں انھوں نے قدیم ویدوں اور پرانوں کے روایتی ستی سر سے کشمیر کی سرزمین کو برآمد کرنے کی ایک انسانی اور عقلیت پسند توجہ کی ہے۔ انھوں نے قدیم پرانوں سے بیشتر اشارے اکٹھے کر کے ایکی یقین آفیسر کی کہانی کے طور پر پیش کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس ڈرامے میں انھوں نے سنسکرت اور فارسی اور ایرانی کے اپنے متحدہ ماخذ سے انحراف کے کچھ دلچسپ اور خیالی منظر بھی پیش کیے ہیں جس سے کہانی میں لذت پیدا ہو جاتی ہے اور کہانی قارئین کی دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے۔

ڈراما کی اس پوری کہانی کا دارومدار ستی سر کی روایت اور کشپ رشی کی شخصیت پر مبنی ہے۔ اس کے دوسرے کردار بھی بہت اہمیت کے حامل ہیں جن میں خاص طور پر رودرا، اندرا، اور شاریکا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام کردار پرانوں سے متعلق ہیں۔ ستی سر کے وہی پرانے منظر اس میں مصنف نے دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ستی سر جھیل کے اطراف کی پہاڑیوں پر آبادی سے اس کی شروعات ہوتی ہے اور پھر کشپ اس پوری آبادی کے نمائندہ کردار اور سردار بن جاتے ہیں۔ اس کے بعد جیسے جیسے وہاں کی آبادی بڑھتی گئی تو لوگوں کے لیے ایک جگہ رہنا مشکل ہونے لگا اور ساتھ میں جانوروں کے لیے بھی چارہ میسر نہیں ہونے لگا۔ اس دشواری کو دور کرنے کے لیے رودر جو اس کا اہم اور نوجوان کردار ہے نے وہاں سے منتقل ہو جانے کی ترکیب سوچی اور سب کو اپنی اس تجویز سے آگاہ کیا۔ رودر کا ساتھ دینے کے لیے چند باغی طبیعت نوجوان اس کے ہم خیال ہو گئے۔ ابھی تک کشیپ رشی کو رودر کی اس تجویز کے بارے میں پتہ نہ چلا تھا چنانچہ جیسے ہی پتہ چلا تو انہیں اس بات کا بہت افسوس ہوا اس دوران انھوں نے نوجوانوں کو مادر وطن ترک کر جانے سے روکنے کی کوشش کی اور خود اپنی تجویز پیش کی کہ کشمیر کے بارہمولہ علاقہ کے پاس جو بڑی بڑی پہاڑیاں ہیں انہیں اگر کسی طرح سے کاٹ دیا جائے تو وہاں کا سارا پانی بہہ جائے گا اور زمین زراعت کے لیے اور رہنے کے لیے تیار کی جاسکتی ہے۔

کشیپ رشی کی تجویز کو سب نے خوشی سے قبول کیا اور پہاڑیوں کو کاٹنے کا کام شروع کر دیا مگر ایسے میں جب پہاڑیوں کے کاٹنے کا کام ابھی ابتدائی مرحلے میں تھا کہ ایک نئے انداز کا اجنبی شخص وہاں کا شرکی پہاڑیوں میں نمودار ہوتا ہے۔وہ شخص ہندوستان کے آریوں کا ایک ایرانی بھائی کہلاتا تھا جو وہاں کی ایک جنگ کے دوران اپنی جان بچانے کے لیے جنگ سے بھاگ کران پہاڑیوں میں پناہ لیے ہوئے تھا۔اس کے زخموں کے نشان ابھی بھی تازہ تھے اور خون بھی بہہ رہا تھا۔اسے کشیپ رشی کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔کشیپ رشی اس سے اپنے حالات دریافت کرواتے ہیں۔جب کشیپ رشی اس سے پوچھتا ہے تو جواب میں کہتا ہے کہ ''آفت زدہ ہستم'' اس جملے کو سن کر کشیپ رشی اور پنڈتوں کی طرح سمجھتے ہیں کہ وہ سنسکرت کے غلط لفظ استعمال کر رہا ہے اور پھر سارے اس شخص کی تصحیح میں مصروف ہو جاتے ہیں۔اس کے بعد کشیپ کو اجنبی شخص کے زخموں کو دیکھ ترس آجاتا ہے وہ اس پردیسی کو اس کے زخموں کو مرحم لگانے کے لیے اپرنا کے ساتھ بھیج دیتا ہے۔اس دوران پردیسی اور اپرنا کی جو آپس میں گفتگو ہوتی ہے مصنف نے اس کے مکالمے بہت ہی بہترین انداز میں پیش کیے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ فارسی اور سنسکرت کے ہم ماخذ الفاظ کو پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو۔جس کا ذکر عبدالقادر سروری نے اپنی کتاب میں کیا ہے۔

''اپرنا۔پردیسی یہ کیا ہوا؟

پردیسی۔زخم،خون۔

اپرنا۔خون نہیں،شون کہو شون۔

اپرنا۔(پردیسی کا ہاتھ چھوکر) یہ کیا ہے؟

پردیسی۔این دستِ من۔

اپرنا۔دست نہیں، ہست کہو، ہاتھ۔

پردیسی۔(اپرنا کے بازو کی طرف اشارہ کرکے) این چیست؟

اپرنا۔باہو ہے باہو۔

پردیسی۔کمال مشابہت...........خون،دست،ست،بازو،باہو''۔(217)

پروفیسر ظہورالدین صاحب دینو بھائی پنت کے ڈراما ''سورگ کی کھوج'' کے بارے میں اپنے خیالات

کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"The language of the play is highly impressive because the author has, no purpose, used an diction which contains both Hindi and Urdu words".(218)

اس متذکرہ بالا اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دینو بھائی پنت کو مکالمہ نگاری میں دسترس حاصل تھی۔ پردیسی بھی اس ڈرامہ کا ایک اہم کردار ہے۔ یہ پردیسی پہاڑیوں کے اندر تھا جس کے ساتھ تانبے کی ایک دھات تھی۔ اسی دھات کے ساتھ پھر بعد میں خوب کام لیا جاتا ہے۔اس دھات کی مدد سے رودرااور اندراپنی دیگر فوج کے ساتھ پہاڑ کو کاٹنے کا کام کرتے ہیں۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد جب چٹان کے آخری حصہ میں پہنچے تو رودروہاں سے بھاگنے میں ناکام ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے چٹان اس کے اوپر گر جاتی ہے اور وہیں دب کر اس کی موت ہوجاتی ہے۔اسی دوران چٹان کا گرنا تھا کہ ستی سر کا پانی دوسری طرف بہہ گیا اور زمین کا حصہ ایک خوبصورت نظارہ بن گیا۔

اس ڈرامے کی ہئیت کے بارے میں اگر بات کی جائے تو اس کا پلاٹ، مکالمہ نگاری اور منظر کشی قابل قبول ہیں۔ڈراما عہد کی مدامت ،موضوع کی دلکشی اور سب سے اہم بات اس کی پیش کش کے انداز بیان کی وجہ سے ایک نیم کلاسیکی فضا کا ماحول پیدا کردیتا ہے۔دینو بھائی پنت نے قدیم کشمیر کی پوری تاریخی کہانی کو اس ڈرامے میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ڈراما کئی بار اسٹیج پر بھی پیش کیا جاچکا ہے۔ 1963ء میں یہ ڈراما پہلی بار کتابی صورت میں ڈوگری سنستھا کی جانب سے منظر عام پر آیا تھا۔

جتندر شرما:

دینو بھائی پنت کے ہم عصر ادیبوں میں جتندر شرما کا نام بھی اہمیت کے حامل ہے۔ان کی ابتدائی تعلیم جموں میں ہوئی تھی اس کے بعد انھوں نے اپنی بی۔اے کی تعلیم مکمل کرنے کے فوراً بعد ملازمت کرلی۔انہیں شروع سے ہی ڈراما نگاری کا بے حد شوق تھا کئی اردو ڈراموں کا مطالعہ اپنی تعلیم کے دوان ہی کرلیا تھا۔اس کے بعد انہیں ڈراما لکھنے میں دلچسپی پیدا ہوئی۔اس کے علاوہ وہ اداکاری میں بھی ماہر تھے۔انھوں نے اپنی ایک ڈوگری فلم بھی تیار کی تھی جس کو انھوں نے ''گلاں ہویاںبتیاں'' کے عنوان سے پیش کیا تھا۔اس فلم میں جتندر شرما نے خود ہیرو کا کردار نبھایا تھا۔

جتندر شرما کلچرل اکادمی کے ڈپٹی سیکریٹری بھی رہ چکے تھے اور اس کے علاوہ انھوں نے ریڈیو کشمیر جموں کے شعبہ

ڈراما میں مددگار پروڈیوسر کی حیثیت سے بھی عرصہ دراز تک اپنے کام کو بخوبی انجام دیتے رہے۔انھوں نے ملازمت کے ساتھ ساتھ اپنے کئی ریڈیو ڈرامے بھی لکھے جو بعد میں بہت مقبول ہوئے۔

جتندر شرما کے والد صاحب ریاست جموں و کشمیر کی فوج میں لفٹنٹ کرنل کی حیثیت سے انجام دیتے تھے۔مگر جتندر شرما کو والد صاحب کی پدری کا سایا بہت کم نصیب ہوا۔ وہ ابھی کم عمر ہی تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ پڑھائی میں اپنا نام کمانا چاہتے تھے مگر ساتھ ہی ساتھ گھر کا سارا بوجھ بھی ان کی سر تھا لہٰذا انہیں اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ گھر کا سارا کام کاج بھی کرنا پڑتا تھا۔

پنڈت گوپی ناتھ کوشک اور شری رام شرما:

دونوں کا شمار جموں کے ادیبوں میں ہوتا ہے، دونوں ایک ہی دور کے ادیب تھے اور دونوں کی دلچسپی بھی ایک ہی ادبی میدان میں تھی۔ پنڈت گوپی ناتھ کی ولادت کشمیر میں 1916ء کو ہوئی تھی اور کشمیر میں ہی انھوں نے اپنی تعلیم بھی حاصل کی۔اگرچہ ان کا تعلق سرزمین کشمیر سے تھا مگر ریڈیو کشمیر جموں کے حوالے سے انھوں نے کئی ڈرامے اپنی یادگار چھوڑے ہیں اس لیے ان کا شمار دونوں جگہ جموں اور کشمیر میں یکساں طور پر کیا جاتا ہے۔

پنڈت گوپی ناتھ نے ڈراموں کے علاوہ کچھ کہانیاں بھی لکھی تھیں جو وقتاً فوقتاً ریڈیو کشمیر جموں سے انھوں نے خود کشمیر کی گئیں تھیں۔انہیں اردو زبان کے علاوہ ہندی اور پنجابی میں بھی مہارت حاصل تھی۔ریڈیو کشمیر جموں اور سری نگر میں انھوں نے کافی عرصہ تک ملازمت کی تھی۔اسی طرح سے شری رام شرما کا شمار بھی جموں کے قلمکاروں میں بڑا ادب و احترام سے کیا جاتا ہے۔ وہ ڈرامہ نگاری سے بے حد دلچسپی رکھتے تھے۔ان کی ولادت اور ابتدائی تعلیم کے بارے میں کچھ معلومات دستیاب نہیں ہیں، مگر انھوں نے ڈراما نگاری کی حیثیت سے خوب نام کمایا تھا۔

شری رام شرما کا اردو ڈرامے میں ایک اہم کارنامہ ہے کہ انھوں نے ایک رشوت خوار ناظم تعلیم کی زندگی کا ایک رخ اپنے ڈرامے میں بھرپور انداز میں پیش کیا تھا۔اس ڈرامے کا عنوان ''امر جیوتی'' رکھا تھا جس کی وجہ سے انہیں ریاست بھر میں ادبی احترام سے نوازا گیا تھا۔انھوں نے اس ڈرامے میں پیش کیا ہے کہ ناظم کے پاس ملازمت یا مدرسین کے بدلے میں ہر چیز کی قیمت مقرر تھی۔ملازمین سے اس کا یہ اعتذار یہ تھا کہ اگرچہ ملازمت نہ ملی تو ایک سال یوں بھی گزر جاتا ہے۔سال بھر کی جو بھی تنخواہ تھی وہ ملازمت کے لیے گراں معاوضہ نہیں تھا اس لیے نئے اسکول قائم کرنا اوران اسکولوں میں اوپر کی جماعتیں کھولنے،غرض کہ ہر ایک کام کے لئے نقدی صورت میں رشوت ستانی کا رواج چلا

آ رہا تھا۔جیون مل کے پاس اپنے لڑکے کی نوکری کے لیے روپیہ دینے کے لیے نہیں تھا۔اسی دوران جیون مل کی مدد کرنے کے لیے ایک ایماندار آفیسر نمودار ہوتا ہے وہ آفیسر ایک انکم ٹیکس کا ملازم تھا۔جو اسے یہ اپنی پوری بات سمجھا تا ہے کہ اپنی آمدنی کو گھٹا کر لکھا دے اور اس کے بعد اس سے اپنے لڑکے کی نوکری کی بھی صورت کہیں نہ کہیں سے نکل آئے گی،اور ساتھ ہی ساتھ خود اس آفیسر کا بھی فائدہ ہو جائے گا۔اس کہانی کو شری رام شرما نے اس خوبصورتی سے پیش کیا ہے کہ سارے کے سارے دھنگ رہ جاتے ہیں۔سماج کے اخلاق کی یہ حوصلہ فرسا تصویر جو بڑی ذہانت سے شری رام شرما نے کھینچی ہے وہ قابل ذکر ہے۔ڈراما کے فن کے لحاظ سے اگر چہ اس میں کچھ کمیاں ضرور دیکھنے کو ملتی ہیں خاص کر ڈرامہ کے آخری حصہ میں مگر باوجود اس کے شری رام شرما کا یہ ڈرامہ ایک اچھا سماجی اور اخلاقی ڈراما ہے۔

نارہری رائے زادہ:

ان کی ولادت جموں میں 1945ء کے آس پاس ہوئی تھی انہیں جموں کے نوخیزہ ڈراما نگاروں میں شامل کیا جاتا ہے۔اگر چہ انھوں نے ڈرامہ نگاری کے علاوہ بھی دیگر اصناف ادب میں طبع آزمائی کی تھی مگر اس حوالے سے ان کی ایکا دکا تحریریں ہی سامنے آتی ہیں۔

رائے زادہ کو ڈراما نگاری کا بچپن سے ہی شوق تھا اور اپنے خاندان میں بزرگوں سے کہانیاں بہت سنتے تھے چنانچہ انھوں نے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ڈراما نگاری کے میدان میں حصہ لینا شروع کیا۔انھوں نے کئی قابل ذکر ڈرامے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ان کے ڈراموں کا مجموعہ ''اردو ڈرامے'' کے عنوان سے 1964ء میں منظر عام پر آیا تھا۔جس میں کل پانچ ڈرامے ''ایک پتھر ایک محل''،''شمع جلاؤ شمع بجھاؤ''،''ہار کی پر چھائیں''،''تاش کا گھر''اور''پنجرا'' قابل ذکر شامل ہیں۔اس مجموعے میں ان کا سب سے اہم ڈراما ''ایک پتھر ایک محل'' ہے اس کا موضوع ایک سنگتراش کی کہانی سے جڑا ہے۔سنگتراس کا کردار اس ڈرامے میں اہم ہے وہ نارائن گڑھ کی راج کماری کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔اس ڈرامے کی پوری کہانی تقریباً ان ہی دو کرداروں کے ارد گرد گھومتی ہے۔ایک طرف سنگتراش کو راج کماری سے محبت سے مگر دوسری طرف راج کماری سے شیو پوری کے راج کمار کو بھی گہرا عشق ہے۔وہ اپنی محبت کا اظہار کرنے کے لیے راج کمار کو ایک تحفہ دینا چاہتا ہے۔جس سے راج کمار خوش ہو جائے اس دوران وہ سنگتراش سے راج کماری کا ایک خوبصورت اور بے مثال مجسمہ بنواتا ہے تا کہ راج کماری اس تحفہ کو دیکھ کر فدا ہو جائے۔

سنگتراش اپنے کاریگری سے کافی جانا جاتا تھا۔وہ جب مجسمہ بناتا ہے تو سنگتراش کی سنگ کاری دیکھ کر راج

کماری اس سے محبت کر بیٹھتی ہے۔اور اپنا محل چھوڑ چھاڑ کے سنگتراش کے پاس چلی جاتی ہے۔

اس ڈرامے میں رائے زادہ نے جس کہانی کو پیش کیا ہے وہ قدیم کہانیوں پر مبنی کہانی ہے مگر جس انداز بیان سے انھوں نے پیش کیا ہے ایسا لگتا ہے جیسے نئی کہانی پیش کی گئی ہو۔ بہر حال رائے زادہ کو ڈراما نگاری میں پوری قدرت حاصل تھی۔

رائے زادہ کا دوسرا ڈراما ''شمع جلاؤ شمع بجھاؤ'' ایک تاریخی واقعے کو بیان کیا ہے۔اس ڈرامے میں مصنف نے سکندر اعظم کے ہندوستان پر حملے کا ایک رخ پیش کیا ہے۔جس میں اپنے وطن کی سرزمین کے ساتھ ڈراما نگار کی محبت کی ایک جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کے جذبات اپنے وطن کے لیے قابل تحسین ہیں۔اسی طرح سے رائے زادہ کا ایک اور اہم ڈراما ''ہار کی پرچھائیں'' بھی کافی مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔اس ڈرامے کا موضوع بھی تاریخی زمانے پر مبنی ہے۔مصنف نے اس میں آریہ نسل کے لوگوں کی ہندوستان میں کس قدر آمد ہوتی ہے وہ سب کچھ اس میں دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔اس ڈرامے میں آریہ قوم کے ہندوستان میں آمد کے ساتھ ساتھ سنتھال قوم کے واقعات کو بھی پیش کیا ہے۔سنتھال قوم کی شکست کے چوکھٹے میں آریہ راج کماری روہنی سنتھال افسر، شیلاج سے محبت کر بیٹھتی ہے اس سارے واقع کو مصنف نے ایک کہانی کے طور پر اس ڈرامے میں سمویا ہے۔

شیلاج اس ڈرامے کا ایک اہم اور مرکزی کردار ہے۔ جو روہنی سے محبت تو کر لیتا ہے مگر اس کی محبت کی حیثیت تک خود کو وہ بلند درجے تک نہیں لے جا پاتا ہے۔ جب لاکھ کوششوں کے باوجود وہ کامیاب نہیں ہو پاتا ہے تو روہنی اسے ٹھکرا دیتی ہے اور اس کی محبت کو ترک کر دینے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔

''تاش کے گھر'' ڈراما بھی مصنف کا اہم کارنامہ ہے۔اس میں مصنف نے ایک نوجوان انسان سبھاش اور ایک نوجوان عورت کی محبت کو پیش کیا ہے۔اس ڈرامے میں ایک معشوق کی عاشق پر بے وفائی اور دھوکہ دھڑی کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

''پنجرا'' رائے زادہ کا اس مجموعے کا آخری ڈراما ہے۔''پنجرا'' اور تاش کے گھر'' دونوں ڈراموں میں سماجی زندگی کے نقوش کو دیکھا جا سکتا ہے۔''پنجرا'' کے موضوع دونو جوان عاشق اور معشوق کی کہانی کو منظر عام پر لانے کی عکاسی کی گئی ہے۔اس ڈرامے میں ایک گھر کے پریوار کی کہانی کو سامنے لایا ہے۔جس میں دونوں میاں بیوی پڑھے لکھے اور ذہن ہیں جن کا تعلق یورپ سے ہے ان کی ایک چھوٹی سے بچی ہے جس کو ماں اپنا دودھ دینے سے روکتی ہے۔مگر دن

بدن بچی بہت زیادہ کمزور ہونے لگتی ہے آخر میں ماں کو لگتا ہے کہ اسے بچی کی ضد کو پورا کرنا چاہیے۔ اس ڈرامے میں مصنف نے انسانیت کی ایک اچھی مثال قائم کی ہے جس میں انھوں نے دکھایا ہے کہ انسان کے جذبات، اس کے احساسات سے بڑی کوئی چیز نہیں ہوتی ہے۔ اس حوالے سے پروفیسر ظہور الدین صاحب لکھتے ہیں کہ:

"The child weekends day by day and ultimately the mother is forced to succumb to her child's demand.....

As has already been said these are one act plays and both plot and characterization is impressive all the characters have been humanly delineated. They are real and maintain their individuality at all costs. The writer has also presented beautiful specimens of human psychology". (219)

رائے زادہ کا آخری ڈراما ''پرانے دیپ نئے اجالے'' کے عنوان سے 1966ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ یہ ڈراما بھی تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ اس ڈرامے کے بارے میں مصنف نے خود کہا تھا کہ یہ ڈراما قدیم ہندوستان کی سیاسی تاریخ پر مبنی ہے۔ یہ ڈراما تین ایکٹ پر مشتمل ہے اور ہر ایکٹ میں مصنف نے بڑی دلچسپی سے کام کیا ہے۔ اس میں جو کردار زیادہ اہمیت کے حامل ہیں ان میں چندر گپت، چانکیا، چھورودتا اور چندر یخا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس کہانی کا سارا تانا بانا چندر گپت موریا اور چانکیا کے ارد گرد بنا گیا ہے۔

اس ڈرامے کے فن پر روشنی ڈالی جائے تو کردار نگاری کے لحاظ سے ایسا لگتا ہے کہ ڈراما نگار نے کرداروں کے مکالمے پر کافی زور دیا ہے جس سے ڈراما میں خوبصورتی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ منظر نگاری اور جذبات نگاری بھی ڈرامے کی قابل ذکر ہے۔ پروفیسر ظہور الدین ڈرامے کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنے خیالات کا اظہار کرتی ہیں:

"The plot is, though, based on a vast span of period. Yet it is interesting and compact. Not a single incident appears to be disjointed or unnatural. The language, however, is not

as forceful as, being a historical play, it ought to have been".(220)

اگر چہ رائے زادہ صاحب کے ڈراموں میں کہیں کہیں زبان و بیان اور دوسری خامیاں ضرور پائی جاتی ہیں مگر باوجود اس کے ان کے ڈرامے قابل تعریف ہیں۔ خاص طور پر ان کے آخری ڈرامے ''پرانے دیپ نئے اجالے'' کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہیں قدیم ہندوستان کی تاریخ پر عبور حاصل تھا۔

نریندر کھجوریا:

جموں کے ڈراما نگاروں میں نریندر کھجوریا کا ذکر بھی قابل ذکر ہے۔ ان کی ولادت تقسیم وطن سے پہلے جموں میں ہوئی تھی۔ ابتدائی تعلیم بھی جموں سے ہی حاصل کی تھی اس کے بعد ڈراما نگاری میں اتنا شوق ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے جموں کے بڑے ڈراما نگاروں میں ان کا شمار کیا جانے لگا۔ نریندر کھجوریا کے ہم عصر ڈراما نگاروں میں وجے سمن اور نارہری رائے زادہ کا شمار کیا جاتا ہے۔ اگر چہ ڈراما نگاری کے علاوہ دیگر اصناف سخن میں بھی نریند کھجوریا نے طبع آزمائی کی تھی مگر جتنی شہرت انہیں اس میدان میں حاصل ہوئی اتنی کسی دوسری صنف ادب میں نہیں ہوئی۔ انھوں نے کئی ڈرامے تحریر کیے تھے ''راستا کانٹے اور ہاتھ'' کا سب سے بہترین ڈراموں کا مجموعہ ہے جو 1964ء میں شائع ہوا اس مجموعے میں ان کے تین ڈرامے قابل ذکر ہیں جن میں ''راستا کانٹے اور ہاتھ''، ''گہری ندیا کی دھار'' اور پیاسی دھرتی'' اہمیت کے حامل ہیں۔ اس میں ان کا پہلا ڈراما اسٹیج ڈراما ہے اور آخری کے دو ڈراما ریڈیو ڈرامے ہیں۔ جو اپنے فنی لحاظ سے کافی مقبول ہوئے تھے۔ مصنف نے اس سے قبل ڈرامے میں فنی خوبیوں کو کامیاب بنانے کے لیے کافی محنت کی تھی۔ اس ڈرامے میں نریندر کھجوریا نے زبان و بیان، اسلوب، مکالمہ نگاری اور منظر نگاری کو بہترین انداز میں بیان کیا ہے۔ اور سب سے خاص بات اس میں مقالے کو بڑے اچھے انداز میں پرویا ہے۔ جس کا ذکر پروفیسر ظہور الدین نے بھی اپنی کتاب میں کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

"Plot construction is also artistically accomplished. Presentation of each action heights the curiosity of the reader. Diction is superb. Every dialogue is carefully selected, the entire action flows in a rhythmical member"(221).

نریندر کھجوریا کا دوسرا ڈراما ''گہری ندیا کی دھار'' بھی قابل ذکر ہے۔ یہ ایک ریڈیو ڈراما ہے مگر جس انداز سے مصنف نے اس کو پیش کیا ہے قابل تعریف ہے۔ یہ ڈراما سماجی حالات پر مبنی ہے جس میں مصنف نے ایک مولانا کی کہانی کو پیش کیا ہے اس ڈرامے کا سب سے اہم کردار ملا کا ہے جو ایک کشتی چلاتا ہے۔ اس کے علاوہ ''بابو'' نام کا ایک شخص جو کہ امیر گھرانے سے تعلق رکھتا ہے وہ ملا کی تقدیر بدلنا چاہتا ہے اور ملا کو گمراہ کرنا چاہتا ہے۔ مگر بعد میں کشتی والا بابو کے خلاف ہو جاتا ہے۔ اس ڈرامے کے دیگر کرداروں میں راہسا، اور پھولاں کا بھی ایک اہم کردار ہے۔

نریندر کھجوریا کا تیسرا ڈراما ''پیاسی دھرتی ہے'' اس میں ڈراما نگار نے سماجی برائیوں کو نشانہ بنایا ہے اور اس ڈراما کا مطالعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جموں کے پہاڑی علاقوں میں دوہری شادی کا ایک رواج چلا آ رہا تھا۔ جس میں مرد کی ایک شادی ہونے کے باوجود لڑکی کو ایک بزرگ سے دوھری شادی اس کی مرضی کے خلاف کروائی جاتی تھی۔ اسی کہانی مین مصنف نے اس دور کا پورا نقشہ کھینچا ہے۔ بعد میں اسی ڈرامے پر ایک ڈوگری فلم ''گلاں ہویاں بتیاں'' کے نام سے بنائی گئی تھی۔ اس ڈرامے میں اسلوب اور کردار نگاری کی وجہ سے ڈرامے کو بلند رتبہ حاصل ہے۔

جموں میں اردو ڈراما (1947ء کے بعد):

جموں خطے میں 1947ء کے بعد جن ڈراما نگاروں نے اہم رول ادا کیا ہے ان میں بہت سارے ایسے ڈراما نگار ہیں۔ جو تقسیم وطن کے پہلے بھی لکھتے رہے اور بعد میں بھی وہ ڈراما نگاری میں وقتاً فوقتاً طبع آزمائی کرتے رہے۔ راقم نے اس مقالے میں ان کا تاریخ پیدائش کے حوالے سے مطالعہ کیا ہے۔ جن کا ذکر متذکرہ بالا میں کیا جا چکا ہے اور کچھ ایسے ڈراما نگار ہیں جن کا ذکر 1947ء کے بعد کے لکھنے والوں میں بہت ہی اہمیت کے حامل ہیں۔

پروفیسر ظہور الدین:

''جدید اردو ڈراما'' بھی ظہور الدین کی ایک اچھی کتاب ہے۔ یہ کتاب 1987ء میں نئی دہلی سے منظر عام پر آئی تھی۔ یہ بھی ایک ضخیم کتاب ہے جو 358 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے جن موضوعات کو زیر بحث لایا ہے ان میں خاص طور پر مندرجہ ذیل ہیں۔ اصل میں مصنف نے اس کتاب کو دو حصوں میں پیش کیا ہے۔ پہلا حصہ ایپک تھیٹر اور دوسرا حصہ لایعنی ڈراما ہے۔ ڈراما نگاری پر پروفیسر ظہور الدین کو خاص دسترس تھی۔ انہوں نے متعدد کتابوں کا ، مطالعہ کیا تھا اور اس کتاب کو لکھنے کے لیے انہوں نے جن کتابوں کا مطالعہ کیا تھا اس کی فہرست انہوں نے اس کتاب کے ابتدا میں دی ہے اور پھر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''ان کتب کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ڈاکٹر عطیہ نشاط کے سوائے اور کسی مصنف نے جدید اردو ڈرامے پر قلم نہیں اٹھایا ہے۔لیکن موصوفہ نے بھی بس سرسری طور پر چند صفحات میں ڈرامے کے ان نئے رجحانات کا ذکر کر دیا ہے۔ان عناصر سے بحث نہیں کی جو دراصل اپیک اور رہسبر ڈ تھیٹر کی بنیادی شناخت ہیں اور جن کے بغیر ڈرامے کی ان روایتوں کو نہ سمجھا جا سکتا ہے اور نہ سمجھایا جا سکتا ہے۔ان رجحانات سے کما حقہ واقف ہونا جدید اردو ڈرامے کے طالب علم کے لیے اتنا ہی ضروری ہے کہ جتنا کلاسیکی ڈرامے کو سمجھنے کے لیے ارسطو کے نظریات سے روشناس ہونا۔''(222)

پروفیسر ظہورالدین نے اس کتاب میں زیادہ تر اپیک تھیٹر اور رہسبر ڈ تھیٹر پر ہی زیادہ بحث کی ہے اور ساتھ ہی ساتھ مصنف نے اس میں ان ڈراموں کا جائزہ پیش کیا ہے جو 1950ء کے بعد لکھے گئے تھے۔اس مقالے میں مصنف نے اسلوب پر زیادہ توجہ دی ہے اور آسان اور عام فہم زبان استعمال کی ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے ابتدا میں ایسے نقادوں کی آرا درج کر دی ہے جنہیں متعلقہ موضوع پر اسناد کا درجہ حاصل ہے۔اس کے بعد پروفیسر ظہورالدین نے ان آرا سے حاصل ہونے والے نتائج کو زیر بحث لایا ہے۔محاکمہ متعلقہ موضوع کی حتمی صورت بنیادی اوکارو نظریات اور فنی تقاضے سامنے آئیں۔اس کے بعد انہوں نے یورپی فن کاروں کے ڈراموں کا تفصیل سے جائزہ پیش کیا ہے۔اور آخر میں ان ڈراموں پر مصنف نے روشنی ڈالی ہے جنہیں موضوعی یا معروضی یا دونوں اعتبار سے متعلقہ رجحانات سے منسوب کیا گیا ہے۔پروفیسر ظہورالدین نے اس کتاب میں جتنے ڈراموں کا ذکر کیا ہے ان کا انہوں نے بہت گہرائی سے مطالعہ کیا تھا اور ان ڈراموں کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی تھی۔جدید اردو ڈراما کے سلسلے میں انہوں نے حبیب تنویر، محمد حسن، امجد اسلام، ابصار عبدالعلی، اشفاق احمد، شمیم حنفی، کمار پاشی، انور عظیم اور زاہدہ زیدی جیسے مشہور و معروف ڈراما نگاروں کے ڈراموں کو زیر بحث لایا ہے۔

پروفیسر ظہورالدین کی یہ کتاب موضوع کے اعتبار سے ڈراما نگاری کے حوالے سے بہت اہم مقام رکھتی ہے۔یہ تصنیف ان تمام ڈرامائی تصانیف سے الگ مقام رکھتی ہیں جس کی وجہ سے اردو ڈراما کی اہمیت ہے۔ڈراما کی تنقید میں یہ ایک اہم اور قابل قدر اضافہ ہے۔یہ کتاب مصنف کی ان کاوشوں کا ثمرہ ہے جو انہوں نے یورپ کے جدید ادب کے مطالعے سے حاصل کیا ہے۔مصنف کو یورپی ادب سے کافی دلچسپی رہی تھی اور کئی مغربی مصنفین کی تخلیقات کا مطالعہ کر چکے تھے۔انہوں نے انگریزی کی وساطت سے جرمنی اور فرانسی ادب کے ڈراموں کا بھی مطالعہ کیا تھا اور ان کے

تاریخی اور تکنیکی رجحانات پر بھی روشنی ڈالی تھی۔اس کتاب میں مصنف نے مغربی ڈراما نگاروں کے ڈراموں کا موازنہ اردو کے ڈراما نگاروں سے کیا ہے۔وہ ایک جگہ پر لایعنی ڈراما کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''ہمیں معلوم ہے لایعنی ڈرامازندگی کی نامعقولیت و بے معنویت کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن یہ کام اس وقت تک سرانجام نہیں دیا جاسکتا کہ جب تک ان تمام تصنیفات کا بھرم نہ توڑ دیا جائے کہ جو انسان زندگی کو معنویت عطا کرنے کے لیے، وقتاً فوقتاً گھڑتا رہا ہے۔ان تصنیفات کا تعلق مذہب سے بھی ہوسکتا ہے اور اخلاق، فلسفہ، روایت، قانون اور تاریخ سے بھی یعنی ان کا تعلق ان تمام تصنیفات سے ہوسکتا ہے جو اسے اپنے ماضی سے بطور ورثہ ملے ہیں۔چناں چہ اس بوڑھے کو ہم مذہب، اخلاق، اسطور، روایت، قانون اور تاریخ یعنی اس ڈرامے کے کرداروں کو اپنے ماضی کی طرف سے روثے کے طور پر ملنے والی تمام قدروں کا علامیہ قرار دے سکتے ہیں۔''(223)

حقیقت نگاری اور ڈراما نگاری:

پروفیسر ظہور الدین کو ڈراما نگاری پر کافی مہارت حاصل تھی۔ان کی یہ کتاب ڈراما نگاری کے حوالے سے کافی اہمیت کی حامل ہے۔یہ کتاب 343 صفحات پر مشتمل 1984ء میں جموں سے شائع ہوئی تھی۔اس کتاب میں مصنف نے مغربی اور مشرقی ڈراما کے بارے میں اہم معلومات فراہم کی ہے۔ان کی اس کتاب کا مقصد اردو ڈراما کی حقیقت کو بیان کرنا تھا۔اس لیے انہوں نے ڈرامے کی پوری تاریخ کا مطالعہ کیا اور اس کے بعد یہ کتاب پائے تکمیل تک پہنچی۔اس کتاب میں انہوں نے ورپی ڈرامے میں حقیقت نگاری کی تحریک سے قاری کو روشناس کرایا ہے۔مصنف نے اس کتاب میں ناول، شاعری اور ڈراما تینوں اصناف کو زیر بحث لایا ہے۔جس کی وجہ سے ان تینوں اصناف سخن میں ہونے والے اہم تجربوں کا تجزیہ کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔کیوں کہ مصنف کا مقصد یہاں تینوں اصناف سخن کو قارئین میں روشناس کروانا ہے۔مگر اس کتاب کا بنیادی مقصد صرف ڈراما نگاری پر مبنی ہے۔پروفیسر ظہور الدین نے اس تصنیف میں مغربی ڈراما نگاروں کے اہم ڈراموں کا تجزیہ کیا ہے۔جس سے حقیقت پسند ڈراموں کی پہچان کی جاسکتی ہے۔اس کتاب کے آخر میں مصنف نے چند اہم ڈراموں کا جائزہ لیا ہے۔جس سے انہوں نے دلیلوں کے ساتھ اردو کے ڈراموں میں حقیقت پسندی کے ثبوت دیے ہیں۔ان کا مقصد بھی یہی تھا کہ ایسے اردو ڈراموں کو بھی منظر عام پر لایا

جائے جن میں حقیقت پسندی ہو۔غرض کہ اس کتاب میں مصنف نے اردو ڈراما کی تاریخ کو تنقیدی نظریے سے پیش کیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ اردو میں جتنے بھی ڈرامے لکھے گئے ہیں۔ان سب پر ایک بار پھر سے روشنی ڈالنی ضروری ہے تا کہ اردو ڈرامے کی روایت کا پتا چل سکے اور اردو ڈراما نگاری کے فن کو معلومات حاصل ہو سکے ملاحظہ ہو ایک اقتباس:

> ''مجھے یہاں صرف اتنی بات کہنی ہے کہ آج اردو ڈرامے کے بارے میں ہم جو کچھ کہتے آئے ہیں جدید معلومات کی روشنی میں اس پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔یہی نہیں ہمیں اپنے سارے سرمائے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے اپنے سابقہ نتائج کی صحت کو درست کرنا چاہئے۔یہ بات شاید کہنے کی ضرورت نہیں کہ اردو ڈرامے نے اپنی ملکی روایت سے جس قدر استفادہ کیا ہے اس سے کہیں زیادہ غیر ملکی روایات سے مستفید ہوا ہے۔جب تک ان سبھی روایات سے پوری واقفیت نہ ہوگی ہم اپنے ڈراموں کو نہ تو خود اچھی طرح سمجھ پائیں گے اور نہ ہی دوسروں کو سمجھا سکیں گے۔''(9224

پشکر ناتھ:

جموں خطے میں اردو ڈراما نگاری کے حوالے سے 1947 کے بعد سب سے اہم اور بڑا نام پشکر ناتھ کا ہی ملتا ہے۔اگر چہ ان کا تعلق بنیادطور پر وادئ کشمیر سے تھا مگر ان کی زندگی کا بیشتر حصہ جموں میں گزرا تھا۔ان کی ولادت 31رمئی 1932ء کو سری نگر کے محلّہ بتہ پار میں ہوئی تھی اور وہیں سے انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ 1950ء میں انھوں نے امر سنگھ کالج سری نگر سے اپنا بی اے کا امتحان کامیاب کیا۔راقم نے ان کی حالات زندگی کے بارے میں تفصیل سے اردو فکشن کے باب میں ذکر کیا گیا ہے۔

پشکر ناتھ کے اب تک 300 سے زائد اردو ڈرامے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ان میں اکثر ایسے ڈرامے ہیں جو انھوں نے ریڈیو کے لیے لکھے تھے اور ریڈیو ڈراما کی حیثیت سے انھیں 1947ء کے بعد کے جموں کشمیر کے ڈراما نگاروں میں سب سے خاص مقام حاصل ہے۔ان کا پہلا ڈراما ''چندر مکھی'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا تھا یہ ڈراما ان کے اپنے افسانے ''راز دل'' کی کہانی پر مبنی تھا جو دہلی کے ریڈیو اسٹیشن سے نشر کیا گیا تھا۔اس کے بعد پشکر ناتھ کے جس طرح سے ڈراما نگاری کی روایت کو آگے بڑھایا وہ بہت ہی قابل تعریف ہے۔ان کے بہت سارے ڈرامے نہ صرف ریاست جموں وکشمیر بلکہ ملک کے بیشتر ریڈیو اسٹیشن سے نشر کیے جا چکے ہیں۔پشکر ناتھ نے ریڈیو ڈرامے کے ساتھ ساتھ ٹی وی

ڈراموں میں بھی کافی مہارت حاصل کی تھی۔ان کے ریڈیو ڈراموں میں خاص طور پر سنتا، آخری دروازہ، تیس منٹ، پت جڑ، آدھی رات کا بادل، آخری منزل، تاپا تال، اجنبی رہنے دو، کالے من کی چھایا، پت جڑ کا آنچل، اندھے چاند کا آخری سفر، بہروپ، تن کی اگنی من کی ہلچل، لمحہ لمحہ زندگی، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا، نئی راہ کا مسافر، نہ بول اتریا کاگا، سانجھ ڈھلے، متواہ گھر آجا، آخری منزل پہلا پڑاؤ، تاریک مکان روشن دریچے، آخری منزل، کوئی داستان ہوں، اندھے راستے، بوند بوند ترسے، کون سا سپنا دیکھوں، احساس کی دوری، سپنوں کی دنیا، تین منٹ انچا آسمان، اندھے چاند کی رات، اس پار کا سچ، اس کا سچ، من کے نہیں حاضر، پہلی بارش، مجھے روکو، سارے رنگ تمہارے، بوند بوند زہر، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

''ساون جلے بھادو جلے'' پشکر ناتھ کے ایک مشہور ریڈیو ڈراموں میں سے ایک ہے۔اس ڈراما پر انھیں آکاش وانی کی جانب انعام سے بھی نوازا گیا تھا۔اس ڈراما کی خاص خوبی یہ ہے کہ مصنف نے اس میں عام روزمرہ کی زندگی کے واقعات کو بہت ہی بہترین انداز میں پیش کیا ہے۔اس کہانی میں انھوں نے یہ بتایا ہے کہ ایک دیہاتی خاندان دیہات سے منتقل ہو کر نرمل کے گھر کے سامنے ایک مکان خرید کر اس میں رہنے لگتا ہے۔وہ خاندان بیوپاری تھا ان کے گھر میں تین لڑکیاں تھیں ان میں سے ایک بہت ہی سادہ تھی اور اب وہ شہر میں بھی اپنی زندگی سادہ پن میں گزارتی ہے ۔اس سادہ اور شریف لڑکی کا نام گومتی تھا۔اس ڈرامے میں گومتی کے ساتھ ساتھ مرکزی کرداروں میں نرمل، ونود، نرمل کی والدہ گومتی کی والدہ اور والد قابل ذکر ہیں۔اس کے علاوہ کچھ ضمنی کردار بھی ہیں جن میں تاجر بنارسی داس وغیرہ قابل ذکر ہیں۔گومتی کے علاوہ دوسری دو لڑکیاں دیہات کی تہذیب سے کنارہ کش ہو کر شہری زندگی کو اپنا لیتی ہیں۔ان کے گھر میں اگرچہ رامائن کا پاٹھ ہوتا تھا مگر ساتھ ہی ساتھ ڈسکو اور مغربی گانا بجانا بھی ہوتا تھا۔گومتی کا آنا جانا نرمل کے گھر شروع ہو جاتا ہے۔اسی دوران ان دونوں کو آپس میں محبت ہو جاتی ہے۔گومتی کے والدین کے پہلے سے ہی جانتے تھے کہ لڑکیوں کی شادی کے لیے جہیز کی ضرورت پڑے گی اس لیے انھوں نے پہلے سے ہی لڑکیوں کی شادیوں کے لیے ڈیڑھ ڈیڑھ لاکھ کا جہیز جمع کر دیا تھا تاکہ شادیوں کے عین وقت پر کوئی پریشانی نہ ہو۔نرمل کا ایک جگری دوست ونود جو نرمل کی مدد کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا وہ نرمل کی ماں سے گومتی اور نرمل کے رشتے کی بات کرنے کو نرمل کی ماں کو گومتی کے گھر بھیجتا ہے۔اس دوران نرمل کی ماں گومتی کے گھر جاتی ہے اور وہاں سے نراش ہو کر آجاتی ہے چونکہ گومتی کی ماں نے نرمل کی ماں کو نہ صرف رشتے سے انکار کیا بلکہ کھری کھوٹی سنا کر گھر بھیج دیا۔اس لیے چوں کہ نرمل کا خاندان غریب تھا اس کے بعد گومتی کی ماں ایک بڑے تاجر کے بیٹے سے گومتی کے رشتے کی بات لگاتی ہے۔وہ تاجر کا بیٹا نہ صرف نوویں جماعت تک پڑھا لکھا ہے بلکہ اس میں بہت سارے عیب بھی تھے۔اس کے برعکس اگر دیکھا جائے تو نرمل بہت ہی

شریف، سمجھدار اور نیک انسان تھا مگر تاجر بنارسی داس ایک نمبر کا شرابی اور جواری تھا۔لیکن نرمل سے کئی گنا پیسے والا امیر تھا اور بینک میں ملازم بھی تھا۔

اس ڈراما میں اہم موڑ تب آتا ہے جب بنارسی داس رشتے سے صرف اس لیے انکار کر دیتا ہے کیوں کہ جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ لڑکے کے گھر والوں نے صرف ڈیڑھ لاکھ کا جہیز رکھا ہے۔اسے یہ رقم بہت کم لگتی ہے اور وہ اس رشتے سے انکار کر دیتا ہے۔اس کے بعد گومتی ہیرا چاٹ کر خودکشی کر لیتی ہے اور نرمل بھی گومتی کی یاد میں دن رات بستر پر پڑا تڑپتا رہتا ہے۔

اس ڈرامے کے فنی لوازمات کی بات کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ پشکر ناتھ کو ڈراما نگاری سے کافی واقفیت حاصل تھی۔اس وجہ سے ان کا یہ ریڈیو ڈراما اپنی پوری فنی خوبیوں کے ساتھ کھرا اترتا ہے۔مکالمہ نگاری کے حوالے سے یہ ڈراما قابل تعریف ہے۔جس طرح سے مصنف نے اس میں جملے ادا کیے ہیں اور ان جملوں میں جذباتی انداز بیان کیا ہے اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

''آج تمہیں دیکھتے ہی رہنے کو دل چاہتے ہے جیسے جیسے کوئی کسی کو آخری بار دیکھ رہا ہے''۔

گومتی: تمہیں یاد ہے نرمل۔ایک دن تم نے کہا تھا ہم ماں باپ کہاں رہے ہیں۔ہم تم اپنے بچوں کا مقدر ہو گئے ہیں۔

گومتی: (خوابیدہ آواز میں) ہم اپنے بچوں کا مقدر نہیں بنیں گے۔اپنی اپنی تقدیر کے حوالے کر دیں گے انھیں۔

نرمل: (پھیکی ہنسی) ہمارے بچے؟ یہ۔یہ دل توڑنے والا مذاق کیوں کر رہی ہو۔

گومتی: (بھرائی آواز) کیا کلپنا کرنا بھی پاپ ہو گیا ہے ہمارے لیے؟

نرمل: پاپ اور پنیہ کا مجھے نہیں معلوم گومتی۔مجھے صرف اس چٹان کا احساس ہے جو میں نے اپنے دل پر رکھی ہے۔(بھرآئی آواز میں) اور جس کے نیچے میرے پریم کا ننھا سا پودا ہوا کے ای جھونکے کے لیے، بارش کے ایک قطرے کے لیے ترس رہا ہے۔

گومتی: (بھرائی آواز میں) بس کرو نرمل۔بس کرو۔

نرمل: اس ننھے سے پودے کی تقدیر میں فقط جلنا لکھا ہے۔ گومتی یہ ساون بھی جلے گا، بھادو بھی جلے گا۔ مگر کبھی اف نہیں کرے گا۔ کبھی اف نہیں کرے گا گومتی''۔(225)

اس ڈرامے میں کردار نگاری کے حوالے سے جہاں نرمل، گومتی کے مکالمے اوران کے کردار کی بات آتی ہے تو مصنف نے بڑی چابکدستی سے ان دونوں کرداروں کو پیش کیا ہے۔ اور یہ ریڈیو ڈراما ہے اس لیے بھی مصنف نے ان تمام کرداروں کے مکالموں پر زیادہ زور دیا ہے۔ تا کہ سننے والے لطف اٹھا سکیں۔ اس ڈرامے میں گومتی کا کردار نرمل سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ کیوں کہ نرمل اتنا پڑھا لکھا، باوفا، نیک ہونے کے باوجود کبھی کسی بلندی تک نہ پہنچ پایا تھا۔ گومتی کو اس ڈرامے میں اس لیے مصنف نے بلند مقام حاصل کروایا کیوں کہ یہ ایک المیہ ڈراما تھا اور گومتی کی موت پر اس کا اختتام کرنا تھا۔ اس لیے اس کا بنیادی مقصد بھی یہی تھا کہ گومتی کی موت سے قاری کو بھاری صدمہ پہنچے۔ اور یہ ڈراما المیہ پر اختتام پذیر ہو۔ زبان و بیان کے معاملے میں بھی یہ ڈراما قابل تعریف ہے صرف کچھ جگہوں پر مصنف نے اردو کی جگہ ہندی الفاظ کا ذکر کیا ہے مگر اس کے باوجود بھی یہ ڈراما ریڈیو ڈراما نگاری کی روایت میں ایک اضافہ کرتا ہے۔

''دل کی وادیاں'' بھی پشکر ناتھ کا کافی اچھا ریڈیو ڈراما ہے۔ جس میں انھیں آل انڈیا ریڈیو کی جانب سے منعقد کروائے گئے ڈراموں کے مقابلے میں ایک انعام سے نوازا گیا تھا۔ اس ڈرامے میں جن کرداروں کو پیش کیا گیا ہے ان میں شری کانت جوشی، واگلے، سواتی (اچلا) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

شری کانت جوشی کا کردار اس ڈرامے میں یہ ہے کہ وہ ڈراما ''دل کی وادیاں'' کے عنوان سے ایک سیریل لکھتا ہے اور اسی ڈراما کو بعد میں جو کھانی سیٹھ پروڈوس کر کے قسط وار شائع کرواتا ہے۔ سیریل کے ڈائرکٹر کا نام واگلے ہے اور سیریل کے پروڈکشن منیجر کا نام ساونت ہے۔ اس ڈرامے کا اہم کردار یعنی اس کی ہیروئن جس کا نام سواتی ہے مگر وہ اس ڈرامے میں اچلا کے نام سے اپنے کردار کو انجام دیتی ہے۔

دراصل شری کانت جوشی اس ڈرامے میں جن واقعات کو پیش کرتا ہے وہ سواتی کی زندگی کے حقیقی واقعات ہوتے ہیں۔ سواتی کا کردار اس ڈرامے میں اس لیے بھی اہم ہے کیوں کہ وہ اپنی ہی زندگی کو از سرنو ڈرامے میں بہت ہی بہترین انداز میں ادا کرتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس سیریل کو اتنی بلندی حاصل ہوتی ہے کہ سیریل دوم درجے پر پہنچ جاتا ہے۔ مگر ایک دن اچانک اس ڈرامے کے ڈائرکٹر واگلے کی جانب سے سری کانت کو ایک خط جاری کیا جاتا ہے کہ سواتی کے کردار کو اب ختم کر دیا جائے اور ڈرامے میں یہ دکھایا جائے کہ وہ کسی حادثے کا شکار ہوگئی ہے اس لیے اس کا

کردار آگے نہ بڑھ سکے گا۔ تا کہ لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ سواتی سچ میں کسی حادثے کا شکار ہے چونکہ اس سیریل میں لوگوں نے سواتی کے کردار کو بہت زیادہ پسند کیا ہے۔ مگر سری کانت یہ بات سن کر غصہ میں آجاتا ہے۔ وہ اس بات کو قبول کرنے کے لیے راضی نہ تھا کہ سواتی کا کردار روک دیا جائے۔ مگر سری کانت اس سوچ میں بے چین رہتا ہے کہ آخر وہ کون سی وجہ ہے جس کی وجہ واگلے سواتی کا کردار ختم کرنا چاہتا ہے۔ آخر کار اسے واگلے سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ ایک دن جب وہ اس بارے میں اچلا یعنی سواتی سے بات کرتے ہوئے اس کہنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ اس کے کردار کو بلا دکار کر کے اختتام کر دینا چاہتا تھا۔ مگر جیسے ہی اچلا کو اس کی حقیقت معلوم ہوتی ہے تو وہ واگلے کو اپنی نظروں سے گرا دیتی ہے اور اسے ایک گھٹیا اور بدمعاش قرار دیتی ہے اسی وجہ سے اب اچلا کے کردار کو واگلے ختم کر دینا چاہتا ہے، تا کہ وہ اپنی عزت کو بچانے میں کامیاب ہو جائے کہ اس کا سامنا اچلا کے ساتھ نہ ہو۔

اس کے بعد شری کانت جوشی اچلا سے ملنے جاتا ہے مگر اچلا یہ سمجھتی ہے کہ وہ بھی واگلے کی ہی طرف سے بات کرنے آیا ہے مگر وہ اب جوشی سے برابرتاؤ کرنے کے بجائے اسے سب کچھ بول دیتی ہے اور کہتی ہے کہ جو ڈرامے کی کہانی میں پیش کیا جا رہا ہے وہ حقیقی زندگی میں اچلا کے ساتھ بیت چکا ہے مگر اس بات کا جوشی کو کوئی اندازہ بھی نہیں ہے کہ وہ جو کہانی لکھ رہا ہے وہ کسی کے ساتھ حقیقت میں پیش بھی ہوا ہو سکتا ہے۔ مگر جیسے ہی اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہانی اچلا کی حقیقت ہے تو وہ حیران ہوتا ہے کہ وہ کیسے اپنی قلم سے یہ سب لکھ رہا ہے۔ جوشی کو اس بات کا صدمہ لگ جاتا ہے اور وہ دن بدن سوچ سوچ کر کمزور اور بیمار ہوتا جاتا ہے پھر وہ واگلے اور جو کھانی سے ملنے جاتا ہے مگر تب تک اس کی حالت بہت ہی غیر ہو چکی تھی۔ وہ کئی راتوں سے سو بھی نہ پایا تھا اب وہ بہکی بہکی بات کرتا ہے کہ جیسے اس نے کسی کا خون کر دیا ہو۔ پھر ایک دن وہ دیکھتا ہے کہ اس کے ہاتھ میں جو قلم ہے وہ کپڑے میں لپٹی ہوئی تھی۔ وہ قلم کو کھول کر دیکھتا ہے تو اسے غصہ میں آکر توڑ دیتا ہے اور آئندہ کچھ نہ لکھنے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔

مصنف کے اس ڈرامے کو سواتی کے کردار کی وجہ سے بہت ہی پسند کیا گیا تھا۔ مصنف نے اس ڈرامے کے پلاٹ کو جس انداز میں پیش کیا ہے قابل تعریف ہے اس میں انھوں واقعات کو ایک موتی کی لڑی کی طرح پرویا ہے۔ پلاٹ میں واقعات قصہ در قصہ آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں اس کے علاوہ پشکر ناتھ کے اس ڈرامے میں منظر نگاری، کردار نگاری، مکالمہ نگاری کو بڑے اچھے طریقے سے پیش کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہوں:

”سواتی: (روتے ہوئے) میں نے ہر زخم دوبارہ کھایا ہے۔ ہر چوٹ دوبارہ برداشت کی ہے

۔مگر اس ......اس بلات کار کو ہولنا کی اور روح فرسائی اور وحشیانہ بربریت کو دوبارہ کیسے Enact کرتی۔

جوشی: یہ............ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں سواتی جی؟

سواتی: (روتے ہوئے) میں اس بربریت کا شکار ہو چکی ہوں--- اور اسے بھلانے کی بہت کوشش کرتی ہوں--- (روتی ہے) بہت کوشش کرتی ہوں۔

جوشی: (گلوگیر آواز میں) بس! بس سواتی جی! آگے کچھ مت بولیے--- میرا کلیجہ پھٹ جائے گا۔

سواتی: (روتے ہوئے) اس واقعے کے بعد میں نے مرنا چاہا--- مگر نہ مر سکی شاید میری تقدیر میں ایک بار مرنا نہیں لکھا ہے۔اس لیے میں بار بار مر رہی ہوں۔

(ہچکیاں لیتے ہوئے) بار بار مر رہی ہوں جوشی جی۔ بار بار مر رہی ہوں۔(رونے لگتی ہے۔ دیر تک روتی رہتی ہے) (226)

پشکر ناتھ کے اس ڈرامے کو قارئین نے بہت پسند کیا تھا۔اس ڈرامے کے بارے میں پروفیسر ظہور الدین لکھتے ہیں کہ:

''اس ڈرامے کے مطالعے سے یوں لگتا ہے کہ جیسے پشکر ناتھ نے فرائڈ اور یونگ کے لاشعور، تحت الشعور، اجتماعی لاشعور اور انفرادی لاشعور کے بارے میں شہرہ آفاق موشگافیوں سے استفادہ کر کے ایک ایسے نفسیاتی ڈرامے کو تخلیق کیا ہے جس کا مقصد اس حقیقت کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ ادیب وفن کا لاشعور کے انھیں مینوں سے استفادہ کرتا ہے جنھیں پوری کائنات کے رازوں کا خزانہ قرار دیا جاتا ہے''۔(227)

''ایک لکیر درد کی'' بھی پشکر ناتھ کا ایک اچھے ڈراموں میں شمار کیا جاتا ہے۔اس ڈرامے کو پیش کیے جانے پر پشکر ناتھ کو آکاش وانی کے سالانہ مقابلے میں انعام سے نوازا گیا تھا۔اس کہانی میں چار اہم کردار ہیں۔منا، ماسٹر عنایت (منا کا والد)، شنکر سنگھ اور منا کی ماں۔اس کہانی میں مصنف نے یہ بتایا ہے کہ تقسیم وطن کے غدر کے دوران اجمیر شریف

میں رہنے والا ایک مسلم خاندان جو اپنی خوش حال زندگی گزار رہا تھا مگر غدر کے دوران وہ کنبہ فسادیوں کے ڈر سے اپنی جان بچا کر اجمیر شریف کو الودہ کر کے وہاں سے بھاگ جاتے ہیں۔ وہ میاں بیوی اپنی جان سے زیادہ اپنے ایک ننھے بچے کو فسادیوں کے ڈر سے ایک برقعے میں لپیٹ کر درگاہ شریف میں چھوڑ دیتے ہیں اور خود وہاں سے بھاگ جاتے ہیں ۔مگر بھاگنے سے پہلے وہ چھپ کر دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس بچے کو کون اٹھاتا ہے۔

اس دوران بچے کی رونے کی آواز سن کر شنکر سنگھ جو ہر روز درگاہ شریف میں حاضری کے لیے آتا ہے۔ وہ بچے کو اٹھا کر دیکھتا ہے شاید اسے بچے کے ماں باپ کا پتا چلے مگر اسے وہاں کوئی نظر نہیں آتا۔ اسی وقت وہ درگاہ شریف کے مولانا سے دریافت کرتا ہے کہ شاید کہ درگار شریف کے اندر ہو جو اس بچے کا وارث ہو مگر مولانا اسے بتاتے ہیں کہ درگار شریف میں کئی دن سے کوئی بھی اندر داخل نہیں ہوا۔ پھر شنکر اس بچے کو اپنی حویلی میں لے آتا ہے وہ جان چکا تھا کہ وہ ایک مسلمان کا بچہ ہے۔اس کے بعد پھر وہ حویلی میں لے کر اس بچے کی اچھی طرح سے پرورش کرنے میں لگ جاتا ہے اور ساتھ ہی اسے اس کے دھرم سے واقفیت بھی کرواتا ہے اور اچھی تعلیم بھی دیتا ہے۔جس کی وجہ سے وہی بچہ بعد میں کالج کا پروفیسر بن جاتا ہے۔

ماسٹر عنایت اور اس کی بیوی اگرچہ پاکستان میں کئی عرصہ سے چلے گئے تھے مگر انھیں ایک پل بھی اپنا بچہ یعنی منا بھولتا نہیں ہے۔ وہ دن رات اپنے بچہ کی یاد میں سوچتے رہتے تھے۔ انھیں وہ شنکر سنگھ بھی یاد آتا ہے جس نے ان کا بچہ اٹھایا تھا۔ وہ پاکستان سے بہت کوشش کرتے ہیں کہ وہ اپنے بچہ کا پتہ لینے کے لیے ہندوستان جائیں مگر ان کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہو پاتی ۔مگر ایک دن اچانک سے انھیں ہندوستان آنے کے لیے پاسپورٹ بنوانے کے لیے منظوری مل جاتی ہے اور وہ ہندوستان آجاتے ہیں۔ اور جب وہ شنکر سنگھ سے دریافت کرتے ہیں تو شنکر سنگھ پہلے تو انھیں انکار کر دیتا ہے مگر بعد میں بہت ہی منت اور سماجت کے ساتھ منا سے ملنے کی اجازت دے دیتا ہے۔اس دوران منا نہ صرف انھیں زندہ نظر آتا ہے بلکہ اب وہ ایک پروفیسر بھی بن گیا ہے اور شادی کر کے ایک الگ مکان میں رہنے لگا ہے۔ ماسٹر عنایت اور اس کی بیوی اپنے بچوں کو دیکھتے ہی خوش ہو گئے ۔اس منظر کو دیکھ کر ہندوستان کے لوگوں میں جو پاکستانیوں کے لیے نفرت تھی ایک ہی منظر میں وہ ساری نفرت دور ہو جاتی ہے اور پھر وہ ہندوستان سے خوشی سے پاکستان کو جاتے ہیں۔

اس ڈرامے کا پلاٹ جس طرح سے پشکر ناتھ نے پیش کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ انھوں نے اس ڈرامے کو اس طرح سے پیش کیا ہے کہ پلاٹ کا آغاز ہی پاکستان سے ہوتا ہے مگر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مصنف نے اس ڈرامے کو

اجمیر سے کیوں نہیں شروع کیا۔اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ یہ ایک ریڈیو ڈراما ہے اوراگر اس کی شروعات اجمیر شریف سے کی جاتی تو فسادات کے وہ سارے منظر مصنف کو پیش کرنے پڑتے جو کہ ناممکن تھے کیوں کہ ریڈیو ڈرامے میں اتنی گنجائش نہیں ہوتی کہ ہر چیز کو ہو بہو پیش کیا جائے۔اس کے لیے مکالمے کے ذریعے فسادات کا وہ منظر دکھانا ناممکن تھا۔

دراصل اس ڈرامے کا مقصد صرف یہ نہیں تھا کہ 1947ء میں ہونے والے واقعات کو پیش کیا جائے بلکہ اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ غدر میں ان واقعات سے پیدا ہونے والی انسانی صداقتوں کا احساس دلانا۔تا کہ یہ سمجھنے میں آسانی ہو کہ آخر کن وجوہات پر غدر کے المناک منظر سامنے آئے ۔مصنف نے اس ڈرامے میں کردار نگاری ،منظر نگاری ، جذبات نگاری، مکالمہ نگاری سے خاص طور پر بہت ہی ہنر مندی سے کام لیا ہے۔

ٹھاکر پونچھی:

انھوں نے کئی ریڈیو ڈرامے بھی لکھے تھے ڈرامے کی طرف ان کی رغبت،آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے تھے۔ ٹھاکر پونچھی نے آغا کاشمیری کا گہرا اثر قبول کیا تھا۔اس کی خاص وجہ یہ بھی تھی کہ اس دور میں جموں میں تھیٹریکل کمپنیاں آغا حشر کے ڈرامے کو اسٹیج کرتیں تھیں جس سے ٹھاکر پونچھی نے بھی فیض اٹھایا۔ان کی نوعمری کا دوسرا شوق قوالی تھا۔

اس کے علاوہ ٹھاکر پونچھی نے ریڈیو کشمیر جموں میں کافی عرصہ تک کام کیا تھا جس کی وجہ سے انھیں کئی بار اس سلسلے میں دہلی بھی بھیجا گیا تھا۔اس دوران 1969ء میں حکومت کی جانب سے ان کا تبادلہ جموں صوبہ میں ہوا۔اس کے بعد پانچ چھ برس تک ریڈیو کشمیر جموں میں اپنی خدمات انجام دیتے رہے اوراس دوران انھوں نے کئی ریڈیو ڈرامے بھی لکھے۔

آنندلہر:

آنندلہر نے اردو ناول اورافسانوں کے علاوہ کئی ڈرامے بھی لکھے تھے۔ان کا ایک ڈراموں کا مجموعہ ''نروان'' کے عنوان سے 1988ء میں منظر عام پر آیا۔اس میں ان کے بہت چھوٹے چھوٹے ڈرامے ہیں۔ان کی یہ تصنیف کل 83 صفحات پر مشتمل ہے۔جس میں انھوں نے کل 6 ڈرامے شامل کیے ہیں۔اس کے بعد ان کا ایک اور ڈراما ''تپسوی کون'' کے عنوان سے 1994ء میں شائع ہوا۔یہ ان کا ایک طویل ڈراما ہے۔آنندلہر ایک انسان پسند شخص تھے انھوں نے اپنے دور میں انسانی زندگی پر جتنے بھی دکھ درد دیکھے ان سب کو اپنی تحریروں کے ذریعے سے منظر عام پر لانے کی کوشش کی جس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

جموں خطے میں اردو ڈراما کے حوالے سے جب بھی بات کی جائے گی تو اس میں ریڈیو کشمیر جموں کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔اس ادارے سے ریاست کے بہت سارے ادیبوں اور دانشوروں، قلم کاروں نے اپنی تخلیقات کو وقتاً فو قتاً نشر کیا ہے۔اردو زبان وادب کے حوالے سے ریڈیو کشمیر جموں ایک اہم رول ادا کرتا ہے، ریڈیو کشمیر جموں کی بنیاد 1948ء میں سب سے پہلے گورنمنٹ جونیئر ہائی اسکول کی ایک عمارت میں عمل میں آئی تھی ۔اس کے بعد اسے منتقل کر کے حویلی بیگم جموں میں اس ادارے کو ترقی دی جارہی ہے اور بہت ساری زبانوں کے پروگرام اس میں اب تک نشر کیے جا چکے ہیں۔اس ادارے کے ذریعے سے اردو ادب سے تعلق رکھنے والے بہت سارے ادبا وشعرا کی تخلیقات کو ملک کے کونے کونے تک پہنچایا گیا ہے اور ریاست کے دور دراز علاقوں میں بھی ریڈیو کشمیر جموں کی آواز کو پہنچایا گیا ہے۔اردو ادب کے حوالے سے اس ادارے میں اب تک شاعری، فکشن، ڈراما، تحقیق وتنقید، مضامین وغیرہ جیسے موضوعات کو منظر عام پر لایا گیا ہے۔

اب تک کی تحقیق کے مطابق 1973ء کے بعد اس ادارے سے تقریباً چار سو سے زائد پروگرام براڈ کاسٹ کیے جا چکے ہیں۔جن میں بہت سارے مشاعرے ونثری نمونے شامل ہیں۔1973ء کے بعد ریڈیو کشمیر جموں سے جو ادبی محفلوں میں پروگرام ہوئے ہیں ان کی فہرست مندرجہ ذیل ہے۔

نمبر	تاریخ	عنوان	موضوع	قلم کار
.1	02.04.1973	i) بدلتا سماج اور ادیبوں کے فرائض ii) چاندنی	گفتگو نظم	کرشن چندر، سلمٰی صدیقی، خواجہ احمد عباس، ٹھاکر پونچھی، ظ۔انصاری غلام راہ
.2	09.04.1973	i) آئینہ خیال ii) ہمیں کچھ کرنا چاہیے	غزلیں افسانہ	درشن کمار حسرت سلمٰی صدیقی
.3	18.04.1973	i) حیدرآباد کے مشہور کہانی کار واجدہ تبسم کے ساتھ انٹرویو ii) مولانا ابوالکلام آزاد شاعر کی حیثیت سے	انٹرویو تحقیقی مقالہ	ٹھاکر پونچھی وی۔پی۔سوری

4.	22.04.1973	علامہ اقبال کی شاعری اور فلسفہ حیات	گفتگو	جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر گیان چند جین، بلراج پوری
5.	25.04.1973	i) انشااللہ اور ماشااللہ ii) نظم iii) غالب اور بہشت	گفتگو کلام گفتگو	ڈاکٹر ظہور الدین علی سردار جعفری فضی الرحمٰن جاوید
6.	02.05.1973	i) بیگم ثمارو ii) دو غزلیں	گفتگو کلام	جاوید قاضی ساجد صدیقی
7.	09.05.1973	میرا مال	کہانی	عصمت چغتائی
8.	16.05.1973	i) اردو شاعری میں غم کی پرچھایاں	گفتگو	نور الزمن صدیقی
9.	18.05.1973	اس زمانے میں کون کس کا آشنا	گفتگو	وجے سومن
10.	23.05.1973	i) پرانی ادبی بیٹھکیں ii) ہمارے قومی رہنما سر سید احمد خان	تحقیق گفتگو گفتگو	ڈاکٹر منظر اعظمی جمیل کاظمی
11.	20.06.1973	لوب میں جدید ہند کا تصور	گفتگو	نور الزماں صدیقی، ڈاکٹر ظہور الدین ، جاویں قاضی، پروفیسر منظر اعظمی
12.	22.06.1973	پوگل پرستان کی بولیاں اور لوک گیت	گفتگو	اے۔ جی۔ منشور
13.	27.06.1973	i) چاندنی بے قصوں کے مزار پر ii) نئی روشنی میں پرانی کتابوں کا جائزہ یادگار غالب	گفتگو گفتگو	ہری مہتا تحمینہ اختر

.14	04.07.1973	i) توبہ کیوں ٹوٹی ii) غالب کا محبوب	گفتگو گفتگو	عبدالماجد گیان چند جین
.15	11.07.1973	i) صبح بنارس ii) نجومی	گفتگو خاکہ	حبیب الدین سالیمہ منظور
.16	18.07.1973	i) میدان صحافت کے سہسوار مولانا ابوالکلام آزاد ii) طنزومزاح کے ستون۔ مرزا فرحت اللہ بیگ	گفتگو گفتگو	وی۔ پی۔ سوری جاوید قاضی
.17	25.07.1973	i) اردو شاعری میں سنت کا رواج ii) ترقی کیوں نہیں ملی	گفتگو گفتگو	امر چند قیصد آر۔این۔چوپڑا
.18	01.08.1973	i) پریم چند کے ناولوں میں گاندھی واد ii) یادوں کی چاندنی	گفتگو نظم	مہر جہاں اندر جیت لطف
.19	08.08.1973	i) رام چرت مانس میں اردو، فارسی اور عربی کے الفاظ ii) غزل	گفتگو کلام	نورالزمان صدیقی رہبر جدید
.20	11.08.1973	زمانہ ہے پنی کا	گفتگو	ہری مہتا
.21	22.08.1973	i) اردو شاعری میں کرشن ii) نئی روشنی میں پرانی کتابوں کا جائزہ۔ آثارالصادید۔ سرسید احمد خان	گفتگو گفتگو	منظر اعظمی جمیل کاظمی

.22	29.08.1973	i) ہندوستانی ڈرامہ اور جدید اسٹیج ii) میرؔ کی نشتریت اور سادگی	گفتگو گفتگو	جتندر شرما پروفیسر محمد عیوب
.23	12.09.1973	میر حسن کی مثنوی سحرالبیان پر ایک نظر	گفتگو	محمد اسد اللہ دوانی
.24	14.09.1973	یہ شاخ گل بھی ہے تلوار بھی ہے عورت	گفتگو	وجے سومن
.25	19.09.1973	i) ڈر سے گھر کیوں لوٹے ii) اردو شاعری میں تاریخ گوئی کا فن	گفتگو گفتگو	عبدالماجد منظر اعظمی
.26	21.091973	بھارت کو صوفیوں اور درویشوں کی دین۔ قطب الدین بختیار کاکی	گفتگو	محمد نظام الدین
.27	26.09.1973	i) میرے ساتھ کے بیمار ii) اردو کہانیوں میں جدید رجحان	افسانہ گفتگو	ٹھاکر پونچھی رضیا واحید
.28	03.10.1973	i) ظفر کی ہندی شاعری ii) وہ کہیں اور سنا کرے کوئی	گفتگو گفتگو	حساب الدین آتوار بیگم
.29	10.10.1973	i) زندگی کی چار دیواری میں مولانا ابوالکلام آزاد ii) اک اداس iii) روپ کی دھوپ	گفتگو کلام افسانہ	وی۔ پی۔ سوری شام طالب ٹھاکر پونچھی

.30	12.10.1973	سارے جہاں کا جائزہ اپنے سے بے خبر۔آج کا انسان	گفتگو	مہر چند
.31	17.10.1973	i) رات کے اندھیرے میں چراغ کی آپ بیتی ii) سو تیر زمانے کے اک تیر نظر تیرا	گفتگو گفتگو	ہری مہتا نورالزمان صدیقی
.32	24.10.1973	i) آخر اس درد کی دعا کیا ہے بد زبان بیوی کے تازیانے ii) لہو کے پھول۔حیات اللہ انصاری	گفتگو تبصرہ	جتندر شرما منظر اعظمی
.33	26.10.1973	رمضان مبارک کی اہمیت اور برکت	گفتگو	حفیظ محمد،شمس اللہ قادری
.34	07.11.1973	i) شبلی کے خطوط ii) شام ارفان حضرت سیدنہ احرارالدین	گفتگو گفتگو	پروفیسر محمد اعیوب اے۔جی۔مست فریدی
.35	14.11.1973	یادوں کی کینڈل	نظم	محمد یٰسین
.36	21.11.1973	i) چرواہا ii) خالہ کی وصیتیں	خاکہ شاعری	او۔پی۔شرما حکیم منظور
.37	28.11.1973	i) تاریخ کشتواڑ عشرت کاشمیری ii) زندگی iii) یادوں کے آئینے میں صاحب زادہ عبدالرحمٰن ''زاقی''	تبصرہ شاعری گفتگو	محمد الدین بانڈے منور لال دل قاضی محمد نظام الدین

38.	30.11.1973	یہ میک اپ ہے یا خود فریبی	گفتگو	رضیا وحیدی
39.	05.12.1973	i) آخر اس درد کی دعا کیا ہے۔ نامہ بھر نہیں لوٹے ii) اندھیرے اجالے	افسانہ گفتگو	ڈاکٹر منظر اعظمی نور شاہ
40.	12.12.1973	زندگی کی کشمکش کا ادیب اور اس کی تخلیقات پر اثر	گفتگو	گیان چند جین، عبدالماجد، نورالزمان صدیقی
41.	12.12.1973	i) آب حیات کے لطیفے ii) ٹائپسٹ	گفتگو خاکہ	جاوید قاضی حبیب الدین
42.	26.12.1973	آل انڈیا مشاعرہ	شاعری	ممتاز مرزا، کمار ہاشمی، انور مرزا پوری، شہریار، عرش ملسانی، منظر سلیم، امر چند قیصد
43.		i) بے معنیٰ ہوتی ہماری زندگی اگر میخانے بند ہوتے ii) نیا سال iii) مہری	گفتگو نظم خاکہ	جتندر شرما محمد یٰسین خالیدہ سرور
44.	09.01.1974	i) بے مزا ہوتی ہماری زندگی اگر انتظار نہ ہوتا ii) چمن چمن کے پھول	گفتگو نظم	ادلین روہی اندر جیت لطف
45.	16.01.1974	i) غزل کی اہمیت ورمزیت ii) موچی	گفتگو خاکہ	محمد یعقوب غلام رسول اصغر
46.	30.01.1974	ادبی رسالے کے مدیر کے فرائض	گفتگو	موہن یاور
47.	06.02.1974	i) ماشقی ii) شاعری	خاکہ نظم	پشکر ناتھ زبیر رضوی

.48	20.02.1974	i) فراق کی رباعیوں میں ہندوستانی مزاج ii) غزل iii) مثنوی مولانا روم کا پیغام	گفتگو کلام گفتگو	گیان چندر جین شمیم اختر شمیم امر چند قیصد
.49	22.02.1974	i) اک عظیم عابد اور مفکر: مولانا آزاد	گفتگو	وی۔ پی۔ سوری
.50	27.02.1974	i) انگلیوں کی بھوک ii) جدید دور میں ناول	افسانہ گفتگو	ٹھاکر پونچھی سلطان محمد
.51	06.03.1974	i) بے مزا ہوتی ہماری زندگی اگر رومان نہ ہوتا ii) شاعری iii) نئی کتابوں پر تبصرہ شاعر اور نثر iv) مغربی ادب کے معمار	گفتگو نظم تبصرہ گفتگو	پرویز اختر عرش صہبائی شمس الرحمٰن فاروقی محمد ابراہیم
.52	13.03.1974	i) گھاٹی کی گونج ii) خاموشی	افسانہ نظم	ایس۔ این ڈوگرہ انجم ادھومپری
.53	20.03.1974	i) مالی ii) انیسویں صدی کی اردو شاعری کا فکری آہنگ	خاکہ گفتگو	آنندلہر محمد حسن

.54	27.03.1974	i) کیا غالبؔ پرستی ذوقؔ اوران کے ہمعصر کے ساتھ ناانصافی نہیں ii) شاعری iii) شاید آپ میری بات مانیں گے	گفتگو نظم گفتگو	مہر بانو کمال احمد صدیقی کماری ہرشیورت
.55	01.04.1974	i) ہمیں تو اس ادا نے مار ڈالا۔ پہلے آپ ii) باتل iii) ہوٹل بیرر	گفتگو نظم خاکہ	پی۔کے۔شرما پرتپال سنگھ بیتابؔ غلام رسول اصغر
.56	08.04.1974	i) جگر کا مستانہ رنگ تغزل ii) احساس کے گھاؤ	گفتگو افسانہ	ڈاکٹر تخمنہ اختر مالک رام آنند
.57	22.04.1974	i) چکبست کی منظر کشی ii) میرا غیر ملکی دورا اور تصورات iii) دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے: اس عمر میں میک آپ	گفتگو انٹرویو گفتگو	محمد اسداللہ وانی راج آنند رضیا وحیدی
.58	29.04.1974	آل انڈیا مشاعرہ	شاعری	پریم ور پرتانی، یاد دہلوی، شبیر بدر، جی۔آر تابان، جگن ناتھ آزاد
.59	06.05.1974	i) رفو گر ii) قطعات اور غزل iii) سجاد ظہیر کی ادبی شخصیت	خاکہ کلام گفتگو	جاوید قاصی شام طالب سید جمیل کاظمی

.60	13.05.1974	i) اقبال اور لالہ صحرا ii) گیان چند رجین کی دو کتابیں تفصیر غالب اور لسانی مطالعے iii) مومن کے مقطے	گفتگو انٹرویو گفتگو	سید جمیل کاظمی عشرت کاشمیری پروفیسر محمد عیوب
.61	20.05.1974	i) سیلانی فقیر ii) قطعات اور غزل iii) مثنویوں کی زبان	خاکہ شاعری	کشوری منچندہ اندر جیت لطف
.62	27.05.1974	ہمیں تو اس ادا نے مار ڈالا۔ میں چلی مائکے	گفتگو	جتندر شرما
.63		ابھی بہت دور جانا ہے	افسانہ	ٹھاکر پونچھی
.64	03.06.1974	i) ہمیں تو اس ادا نے مار ڈالا۔ معاف فرمایئے ii) غزل iii) اردو زبان میں برج بھاشا کے موتی	گفتگو کلام گفتگو	ادلین روہی درشن کمار پروفیسر ظہور الدین
.65	10.06.1974	i) آج کے ادیب کے مسائل ii) نظم اور غزل iii) نیند نہیں آتی	گفتگو کلام افسانہ	حکیم منظور منور لال دل پرویز اختر
.66	17.06.1974	i) اقبال اور پیغام عمل ii) نظم iii) بنجارے	گفتگو شاعری خاکہ	ماجد انور الخاضی ممتاز مرزا، انور مرزا پوری عبدالماجد

.67	24.06.1974	i) غالب کے خطوط میں ڈراما کا عکس ii) آگ iii) یہ محل یہ جھونپڑے	گفتگو نظم افسانہ	ڈاکٹر منظر اعظمی محمد شریف دینش ایس۔این۔ڈوگرہ
.68	01.07.1974	i) داغؔ میری نظر میں ii) غزل iii) مصیبت نہیں ہے یہ پھر اور کیا ہے مقرر ارشاد	گفتگو شاعری گفتگو	شمشیر چند ماتھر محمد یاسین ڈی۔ڈی۔گھوشلا
.69	08.07.1974	i) لائن مین ii) غزل	خاکہ کلام	اشفاق کاظمی عرش صہبائی
.70	15.07.1974	موسم برسات کی سرمستیاں	گفتگو	رضیا وحیدی
.71	22.07.1974	i) انسان ابھی زندہ ہے ii) شاعری	افسانہ	مالک رام آنند غلام رسول نازکی
.72	29.07.1974	i) مصیبت نہیں تو پھر کیا ہے۔ داماد کی ناز برداری ii) نظم اور غزل iii) کولفی والا	گفتگو گفتگو خاکہ	مہر جہان عباد مناوری موہن یاور
.73	05.08.1974	i) حالؔی کی ادبی خدمات ii) غزل iii) گھاس پر چلنا منع ہے	گفتگو افسانہ	سلطان محمد خان ہنس راج شادن ٹھاکر پونچھی
.74	12.08.1974	i) سونی ڈگر ii) غزل	افسانہ	غلام رسول اصغر طالب المان عابدی

.75	26.08.1974	i) اردو ہندی کا لسانیاتی رشتہ ii) اگلے وقتوں کے مشاعرے	گفتگو گفتگو	پروفیسر گیان چند جین امر چند قیصؔ
.76	02.09.1974	i) اقبال سے میری ملاقات انٹرویو: عزیز ولیم ii) غزل	انٹرویو	کمال احمد صدیقی اندجیت لطف
.77	09.09.1974	i) رزمیہ شاعری ii) غزل iii) کاتب	گفتگو خاکہ	عابد پشاوری آنند سروپ انجم بخشی منگت رام دت
.78	16.09.1974	i) عہد مغلیہ کی بیگمات ii) نظم iii) مصیبت نہیں ہے تو اور کیا ہے: شہر مزاج بی بی	گفتگو گفتگو	فقیر سنگھ کھورانہ محمد یاسین، حکیم منظور ظفر حسین
.79	23.09.1974	i) آج کے کہانی کار کا المیہ ii) کل iii) ظفر کے دل کی پکار	گفتگو نظم گفتگو	منظر اعظمی انجم محمد اسد اللہ دوانی
.80	30.09.1974	i) یاد آتے ہیں خشی محمد نظر ii) اردو زبان کی شیرانی مستانہ بنادے iii) شاعری	گفتگو گفتگو گفتگو	قاضی محمد نظام الدین محمد عیوب کماریاشی
.81	07.10.1974	i) علامہ اقبال کی شاعری اور فلسفہ حیات	گفتگو	گیان چند جین، جگن ناتھ آزاد، بلراج پوری

.82	14.10.1974	i) اردو ناول کا مستقبل	گفتگو	پروفیسر ظہور الدین
		ii) غزل	گفتگو	شام طالب
		iii) خود فریبی۔ بال کالے کرنا	گفتگو	ڈی۔ڈی۔کھوشلہ
.83	21.10.1974	i) گہنی کی شاعری	گفتگو	ڈی۔این۔دورانی
		ii) نظم	گفتگو	عرش صہبائی
		iii) عورت کے روپ	گفتگو	ڈی۔این۔قاضی
.84	04.11.1974	i) دورِ جدید میں کلاسیکی شاعری	گفتگو	عبدالماجد
		ii) آہ بھی جا		
		iii) سلگتے ارماں	شاعری	سریندر ساجد
			افسانہ	کشوری منچندہ
.85	11.11.1974	i) مولانا ابوالکلام آزاد اور قلعہ احمد نگر	گفتگو	وی۔پی۔سوری
		ii) غزل	گفتگو	منور لال دل
		iii) معیاری شوہر کی پہچان	گفتگو	پرویز اختر
.86	18.11.1974	i) صحت کے لیے مزا	گفتگو	سید جمیل کاظمی
		ii) بے نام رشتے غزل	شاعری	محمد یاسین
		iii) جاگتے رہو خبردار	کہانی	موہن یاور
.87	25.11.1974	i) یہ ہماری زبان ہے پیارے	گفتگو	پروفیسر گیاچند جین
		ii) شاعری		
		iii) ٹھنڈی چھاؤں	گفتگو	حکیم منظور
			افسانہ	ایس۔این۔ڈوگرہ

.88	02.12.1974	i) جاڑے کی بہار ii) بھاؤ iii) اردو نثر کا سفر فضلی سے غالب تک	گفتگو نظم گفتگو	اشفاق کاظمی مہندر رانا پروفیسر گوپی چند نارنگ
.89	16.12.1974	i) صحرا نوار دو پیر دل ii) بہتے رہیں گے دونوں دریائے روی اور چناب	افسانہ گفتگو	مالک رام ماجد انور الخازی
.90	16.12.1974	i) دو زبانوں کے سنگم امیر خسرو کی شاعری ii) کب ہوتی ہے دل کی دھڑکن تیز	گفتگو گفتگو	عابد پیشاوری ہری مہتا
.91	23.12.1974	i) بابا فریدی گنج شکر کی شاعری ii) غزل iii) سعتیں	گفتگو گفتگو افسانہ	محمد یونس حسرت نوشہری وجے سمن
.92	30.12.1974	i) دو دن بعد ii) علامہ اقبال کا نورِ بصیرت	گفتگو گفتگو	محمد صدیقی مولانا عبدالرحمٰن
.93	06.01.1975	i) داستانوں میں کردار نگار	گفتگو	گیان چند جین
.94	13.01.1975	i) اک کہانی کار جو میرا نہیں: ٹھاکر پونچھی ii) گھاس پر چلنا منع ہے iii) نظم iv) پس پردہ	گفتگو افسانہ گفتگو افسانہ	وجے سمن ٹھاکر پونچھی طالب پشکر ناتھ

.95	20.01.1975	i) اردو ادب پر مغربیات کی چھاپ	گفتگو	پروفیسر ظہور الدین
		ii) غزل	گفتگو	ودیا رتن آسی
		iii) غریب کا جوڑا	افسانہ	مالک رام آنند
.96	03.05.1975	جدید منہانی شاعری	گفتگو	عابد پشاوری
		ii) غزل		عابد مناوری
		iii) گلی کے موڑ پر	افسانہ	موہن یاور
.97	10.02.1975	i) جدید ادب زندگی کا عکس	گفتگو	حبیب الدین
		ii) غزل	گفتگو	منگو رام وفا
		iii) خاموش جھیل	افسانہ	ایل۔این۔ڈوگرہ
.98	17.02.1975	i) غالبؔ	گفتگو	محمد عیوب
		ii) غالب کا ایک شعر	گفتگو	منظر اعظمی
.99	24.02.1975	i) زاہد میخانے میں	گفتگو	ڈی۔ڈی۔کھوسلا
		ii) نظم	گفتگو	جگن ناتھ آزاد
		iii) اک حسین صنف سخن مستزاد	گفتگو	امر چند قیس
.100	03.03.1975	i) مولانا روم کی بانسری	گفتگو	ڈی۔ڈی۔دورانی
		ii) غزل	گفتگو	شہباز راجوروی
		iii) غزل	گفتگو	طالب ایمن آبادی
		iv) بچاؤ بچاؤ	افسانہ	محمد امین بیگ

.101	10.30.1975	i) مغل بیگمات کے لباس، زیور اور بناؤ سنگار ii) غزل iii) لیلا کا خط ماڈرن مجنوں کے نام	گفتگو گفتگو گفتگو افسانہ	فقیر سنگھ کھورانہ اندرجیت لطف پرویز اختر
.102	17.03.1975	i) سوکھا بادل ii) غزل iii) میرے دل کی آواز	افسانہ گفتگو	محمد انور الخاضی جاں نثار اختر
.103	24.03.1975	i) اردو شاعری میں نعت ii) غزل iii) کسائی گدائی	گفتگو افسانہ	پروفیسر گیا چند جین شام طالب غلام رسول اصغر
.104	31.03.1975	i) توبہ کیجیۓ بچت اور اس زمانے میں ii) غزل iii) میٹھی لگتی ہیں بیوی کی سلوٹیں	گفتگو گفتگو	رضیا وحید رہبر جدید آر۔کے۔شرما
.105	07.04.1975	i) اپنے بارے میں غلط فہمی ii) پردیسی iii) اختر کے ساتھ انٹرویو	گفتگو نظم انٹرویو	یوسف آنند سروپ انجم بودھراج شرما
.106	21.04.1975	i) اقبال اور نہرو ii) نظم iii) اقبال کا ایک شعر	گفتگو گفتگو	محمد یوسف ٹینگ منظر اعظمی محمد سلطان

107	28.04.1975	i) غالب زنداں میں ii) غزل	گفتگو	پروفیسر ظہور الدین منور لال دل
.108	05.05.1975	i) سرحد پار کے ادیبوں کے نام کھلی چٹھی ii) شاعری iii) غزل iv) اور شہنائی بجتی رہی	گفتگو گفتگو	جگن ناتھ آزاد جگن ناتھ آزاد آنند کمار سوز کشوری منچندہ
109	12.05.1975	i) روتے کیوں ہو شکل ہی ایسی ہے ii) نظم اور غزل iii) اردو شاعری میں بہار	گفتگو گفتگو	نور الزمان صدیقی نور سریندر ساجد محمد اسد اللہ دوانی
.110	19.05.1975	i) ناول نگار کی المیہ ii) غزل iii) اردو لفظیات میں افسانہ	گفتگو گفتگو	فاروق مفطر ہنس راج شادن پروفیسر گیان چند جین
.111	26.05.1975	i) انیس کی فصاحت ii) نظم اور غزل	گفتگو	جاوید قاضی حکیم منظور
.112	02.06.1975	i) دور حاضر میں املا کا المیہ ii) نظم اور غزل iii) سمندر اور ایک لڑکی	گفتگو افسانہ	پروفیسر محمد عیوب بلراج کمار سوز موہن یاور
.113	09.06.1975	i) اگر آج عابد زندہ ہوتے ii) جنم جلی	گفتگو افسانہ	وی۔پی۔سوری اختر جہاں

.114	16.06.1975	i) ڈولی کی بے بی ii) نظم ارتقا اور غزل iii) آل انڈیا مشاعرہ	گفتگو	بیگم مسیر جہاں بمل سنگھ بیتاب راز آلہ آبادی، جمیل بانو وغیرہ
.115	23.06.1975	i) غزل ii) ستاروں کے کلام پر	 گفتگو	منگو رام وفا سید جمیل کاظمی
.116	30.06.1975	i) ادب کبھی برا نہیں ہوتا ii) شاعری iii) دو دانے گلاس کے	گفتگو افسانہ	سید فتح حسین شاہ ظفر کاظمی، بانو دراب وفا پریم ناتھ در
.117	07.07.1975	i) تیسری آنکھ ii) تنہائی اور غزل	افسانہ نظم	موہن یاور جانثار اختر
.118	14.07.1975	i) کہانی ii) نظم اور غزل iii) تو کہاں ہے میری رادھا ایک تصوراتی خاکہ	افسانہ خاکہ	ٹھاکر پونچھی محمد شریف دانس ملک ستیندر سنگھ
.119	21.07.1975	i) محروم کے کلام میں ظرافت ii) عزم جواں iii) مشاعرہ iv) خیال کے درد انگیز نالے	گفتگو نظم گفتگو	جگن ناتھ آزار ڈی۔این۔مست کشمیری ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی دور شہوار
.120	28.07.1975	i) اردو شاعروں کی بزم		بشیر سروال، محمد شفی بلم، طالب حسین رند، محمد الیاس ملک، تنویر، پنڈت کنول نین، نگہت، غلام رسول، خطیب وزابھدرواہی

.121	04.08.1975	i) ادب میں پیایزم	گفتگو	پروفیسر ظہورالدین
		ii) نظم		درشن کمار حسرت
		iii) پائل کی چیخ	گفتگو	پرویز اختر
.122	18.08.1975	i) زندہ شاعری کے معرخات	گفتگو	عابد پشاوری
		ii) غزل	شاعری	عابد مناوری
		iii) آل انڈیا مشاعرہ	مشاعرہ	بشیر بدر
		iv) تاویک گھڑی	افسانہ	مالک رام آنند
.123	25.08.1975	i) مشاعروں میں دار کا سلیقہ	گفتگو	یوسف
		ii) غزل	کلام	منور لال دل
		iii) دریچے کا کرب	افسانہ	شام طالب
.124	11.08.1975	i) رسالے کی ترتیب وتدوین	گفتگو	شبیر احمد سلاریہ
		ii) نظم		طالب ایمن آبادی
		iii) آل انڈیا مشاعرہ	گفتگو	جمیل بانو
		iv) روشنی کی مچھلیاں	افسانہ	موہن یاور
.125	01.09.1975	i) امیر خسرو کی شاعری	گفتگو	ڈی۔این۔دورانی
		ii) تنہائی،غزل	نظم	آنند سروپ انجم
		iii) مغلیہ دور میں فنِ مصوری	گفتگو	فقیر سنگھ کھورانہ
.126	08.09.1975	i) زبان کے روپ انوپ	گفتگو	گیان چند جین
		ii) غزل	کلام	رہبر جدید
		iii) برش اور کنوس	افسانہ	کشوری منچندہ

.127	15.09.1975	i) اقبال کی پیشین گوئیاں	گفتگو	محمد عیوب
		ii) رقاصہ غزل	نظم	شہباز راجوروی
		iii) آل انڈیا مشاعرہ	مشاعرہ	شقیر احمد صوفی
		iv) کب دور ہوگی جہیز کی لعنت	گفتگو	تمیہ اختر
.128	29.09.1975	i) اردو ادب میں نئی حقیقت	گفتگو	فاروق مفطر
		ii) معلم	نظم	عشرت کاشمیری
		iii) میرا محبوب شاعر	گفتگو	پروین اختر
.129	06.10.1975	i) باندھے اک ڈور میں شمع پروانہ	گفتگو	حشیب الدین
		ii) تم	نظم	آنند ور ماسوز
		iii) آل انڈیا مشاعرہ	مشاعرہ	محمد یاسین
		iv) ڈراموں میں خود کلامی	گفتگو	دورشا پوار
.130	13.10.1975	i) سونے کے بلب	گفتگو	زینت فردوس زینت
		ii) غزل		پرتپال سنگھ بیتاب
		iii) آل انڈیا مشاعرہ	مشاعرہ	خلیل الرحمٰن اعظمی
.131	20.10.1975	i) ادب میں نراجہات	گفتگو	منظر اعظمی
		ii) غزل		احمد شناس
		iii) رند تشنہ کم ذرے میں	گفتگو	عابد پشاوری
.132	27.10.1975	i) منٹو کے افسانے	گفتگو	وی۔پی۔سوری پٹیالوی
		ii) غزل		
		iii) دامن کے پھوڑے	افسانہ	ایس۔این۔ڈوگرہ
.133	03.11.1975	اندھیرے کی کرن	فن موسیقی	کیلاش کمار مکیش

.134	10.11.1975	i) دعوت ناموں کی روایت	گفتگو	حکیم منظور	
		ii) غزل		بلراج کمار سوز	
		iii) غزل		تنویر بھدوہی	
		iv) بھوکے پیٹ عشق	افسانہ	موہن یاور	
.135	17.11.1975	i) بابانانک اور امتیاز کی نفی	گفتگو	این۔ڈی۔سوری	
		ii) غزل		محمد یاسین	
		iii) شیطان	افسانہ	مالک رام آنند	
.136	15.12.1975	i) جواب نہیں آپ کا	گفتگو	ڈی۔ڈی۔کھوشلا	
		ii) اس وقت میرے پاس چلی آنا تم۔غزل		سریندر ساجد	
		iii) تتلیاں اور پھول کے رنگ	گفتگو	مہر جہاں	
.137	22.12.1975	i) غزل میں طنز	گفتگو	عابد پشاوری	
		ii) غزل		شبیر مرزا	
.138	05.01.1976	i) فطرت کی گود میں خودفراموشی یا خودفریبی	گفتگو	سید جمیل کاظمی	
		ii) غزل		درشن کما حسرت	
		iii) غریب کی جوڑی	افسانہ	محمد امین بیگ	
.139	12.01.1976	i) جانکی داس	افسانہ	پریم ناتھ در	
		ii) غزل		منورلال دل	
		iii) ہندی کے پروڈیوسر مہندر کول کے ساتھ محمد یوسف ٹینگ کا انٹرویو	انٹرویو	محمد یوسف ٹینگ	

.140	19.01.1976	i) ہنستا چاند ii) غزل iii) خواتین ہند	افسانہ گفتگو	پرویز اختر کسان سمیل پوری عبدالخالق
.141	26.01.1976	i) بھارت ایک عظیم جمہوریہ ii) نظم iii) غزل	گفتگو	منظر اعظمی نورالزمان صدیقی طالب امین آبادی
.142	02.02.1976	i) سوگیز کی زبان ii) خراج تحسین: جوش ملسانی iii) کتے	گفتگو گفتگو افسانہ	زینت فردوس رہبر جدید بی۔آر۔آنند
.143	09.02.1976	i) ظفر آخری ایام میں ii) غزل iii) لے ڈوبا خاوند کا فلسفیانہ مزاج	گفتگو گفتگو	فقیر سنگھ کھورانہ محمد شریف دانش ملک دورِ شہوار
.144	16.02.1976	i) حقیقت کے آئینے زنگی ii) غزل iii) ایک انعامی کہانی	گفتگو افسانہ	حشیب الدین احمد شناس ترپتہ رائے زادہ
.145	23.02.1976	i) کتاب پر تبصرہ ii) شاعری iii) فیض کے کلام میں رومانی عناصر	تبصرہ گفتگو	گیان چند جین آنند ور ماسوز وی۔پی۔سوری

.146	15.03.1976	i) اردو شاعری میں ہولی	گفتگو	اجیت کمار بخشی
		ii) غزل		خورشید بسمل
		iii) بہت ہوتا ہے حلقہ سا تبسم بھی	گفتگو	محمد یوسف ٹینگ
.147	22.03.1976	i) بولیاں کیسے بنتی ہیں	گفتگو	گیان چند جین
		ii) آل انڈیا مشاعرہ		جمیلا بانو
		iii) افسانہ	مشاعرہ	کرتار سنگھ ڈوگل
.148	05.04.1976	i) غالب کی شخصیت کے چند پہلو: انٹرویو مالک رام	انٹرویو	رائیس فراز
		ii) شاعری		اختر حسین راز نارائین راز، شہاب جعفری
.149	17.05.1976	i) جہیز اچھا ملا	گفتگو	رضیا وحیدی
		ii) شاعری		آنند کمار سوز
		iii) کل جگ کا وشوامیتر	افسانہ	بی۔آر۔نندہ
.150	24.05.1976	i) اردو ناول کا ارتقاء	گفتگو	ضیاءالدین عثمانی
		ii) نظم اور غزل		پرتپال سنگھ بیتاب
.151	07.06.1976	i) اردو شاعری میں علامت نگاری	گفتگو	عابد پشاوری
		ii) شاعری		عابد مناوری
		iii) پنہاوں کا قہر اور بھگتے الفاظ	افسانہ	محمد اقبال نازش
.152	14.06.1976	i) اردو نظم میں حیات کے تجربے	گفتگو	محمد یوسف ٹینگ
		ii) نظم اور غزل		
		iii) پہلے پتوں کا دھواں		سریندر ساجد
			افسانہ	محمد امین بیگ

.153	21.06.1976	i) ادب میں انفرادیت کا تصور ii) شاعری iii) آدمی مشین اور تجوری	گفتگو افسانہ	ڈاکٹر منظر اعظمی منور لال دن موہن یاور
.154	28.06.1976	i) جدید ادب میں اساطیر ii) غزل اور گیت iii) طلوعِ صحر	گفتگو افسانہ	فاروق مفطر درشن کمار حسرت شام طالب
.155	05.07.1976	i) قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری ii) نظم اور غزل iii) لنگڑی سوچ	گفتگو افسانہ	حبیب الدین بلراج کمار سوز مالک رام آنند
.156	12.07.1976	i) خدا کے نام پر ii) شاعری iii) سڑک کی روداد	گفتگو افسانہ	محمد یوسف ٹینگ آنند سروپ انجم او۔پی۔شرما سرتھی
.157	19.07.1976	i) پدمہ سچدیو کا انٹرویو ii) نظم iii) بھیانک افسانہ	انٹرویو گفتگو	رائیس نواب رضوی رہبر جدید کے۔کے۔ڈوگل
.158	26.07.1976	i) ہم بھی شاعر ہیں ii) نظم اور غزل iii) آل انڈیا مشاعرہ	گفتگو مشاعرہ	ڈی۔ڈی۔گھوشلہ ہنس راج شودن فاروقی جعفری، کمار پاشی، زاہدہ زیدی، مظہر امام
.159	02.08.1976	i) بن بلائے مہمان ii) شاعری	گفتگو	عطاور بیگم اندر جیت لطف

.160	09.08.1976	i) کرشنا کرشنا	گفتگو	این۔ڈی۔سوری
		ii) شاعری		پرتپال سنگھ بیتاب
		iii) چائے کی پیالی	گفتگو	عبدالماجد
.161	16.08.1976	i) جدید غزل ایک جائزہ	گفتگو	گیان چند جین
		ii) نئے انسان کا جنم	افسانہ	موہن یاور
.162	06.09.1976	i) اردو ادب میں ڈراما نگاری	گفتگو	جاوید قاضی
		ii) نظم		شبیر مرزا
		iii) افسانہ		پرویز اختر
.163	13.09.1976	i) اردو تنقید کے پچھلے دس سال ایک جائزہ	گفتگو	منظر اعظمی
		ii) شاعری		نورالزماں صدیقی
		iii) سفید چھوری	افسانہ	بی۔آر۔نندہ
.164	20.09.1976	i) شاعری میں مشکل پسندی	گفتگو	ضیاالدین عثمانی
		ii) نظمیں		منور لال دل
		iii) ازلی تشنگی	افسانہ	محمد امین بیگ
.165	27.09.1976	i) احتشام حسین کا تنقیدی رویہ	گفتگو	اجیت کمار بخشی
		ii) آل انڈیا مشاعرہ		
		iii) نئی روشنی	مشاعرہ	بیکل عتناحی، اختر انصافی، ایس۔این ڈوگرہ
			افسانہ	
.166	04.10.1976	i) نئی شاعری میں خوف وتہیا ور کے عناصر	گفتگو	عابد پشاوری
		ii) نظم		حکیم منظور
		iii) بدروح	افسانہ	پروفیسر ظہورالدین

167.	11.10.1976	i) کلاسیکی اردو ادب اور امیر خسرو	گفتگو	دورِ شہوار
		ii) نظم اور غزل		طالب ایمن آبادی
		iii) مسکراہٹ کا رقص	افسانہ	مالک رام آنند
168.	18.10.1976	i) مشاعروں کی افادیات	گفتگو	یوسف
		ii) نظم اور غزل		محمد شریف دانش
		iii) نئے زاویے	افسانہ	شام سندر آنند لہر
169.	25.10.1976	i) ہم سخن فہم ہیں	گفتگو	رضیا وحیدی
		ii) آل انڈیا مشاعرہ	مشاعرہ	زیب گوری، مخمور سیدی
		iii) نیا سویرا	افسانہ	شام طالب
170.	01.11.1976	i) غالب چھوٹی شراب	گفتگو	ڈی۔ڈی۔کھوشلہ
		ii) نظمیں اور غزلیں		سریندر ساجد، درشن کمار حسرت
		iii) اک ٹھہرے ہوئے لمحے کی کہانی	افسانہ	محمد اقبال نازش
171.	07.11.1976	i) جدید غزل ایک جائزہ	گفتگو	گیان چند جین
		ii) نظم اور غزل		پرتپال سنگھ بیتاب
		iii) روشنی کے راستے	افسانہ	او۔پی شرما سرتھی
172.	15.11.1976	i) بچوں کی فوج	گفتگو	عطا ور بیگم
		ii) شاعری		رہبر جدید
		iii) زندگی اور سڑک	افسانہ	موہن یاور
173.	06.12.1976	i) بیس رنگوں کی دھنک	نظم	اندر جیت لطف
		ii) غزل		اندر جیت لطف
		iii) روح کی آواز	افسانہ	پرویز اختر

.174	27.12.1976	i) بیس نکھتی پروگرام کی تبلیغ و ترویج میں ادب کا رول ii) غزل iii) تالے اور چابیاں	گفتگو افسانہ	عابد پشاوری محمد یاسین پشکر ناتھ
.175	03.01.1977	i) ادب میں جدید رجحانات اور اثری تقاضے	گفتگو	آنند موہن زطشی، گلزار دہلوی، محمد یوسف ٹینگ، حکیم منظور، منظر اعظمی
.176	10.01.1977	i) اردو شاعری میں وطن پرستی ii) غزلیں iii) آتاری باڈر	گفتگو افسانہ	وی۔پی۔سوری نورالزماں صدیقی نور بی۔این۔نندہ
.177	14.01.1977	i) ہم سے بھول ہوئی ٹیلی ویژن خرید کر	گفتگو	ڈی۔ڈی۔کھوشلہ
.178	17.01.1977	i) اردو غزل میں ہیت کے تجربے ii) غزلیں iii) نئی زندگی	گفتگو افسانہ	فاروق مفطر عابد مناوری کشوری منچندہ
.179	31.01.1977	i) ن۔م۔راشد کی نظم نگاری ii) صبح ناوء iii) چاندی کا کلیپ	گفتگو نظم افسانہ	منظر اعظمی شہباز راجوروی مالک رام آنند
.180	07.02.1977	i) ادیب اور سماج ii) شاعری	گفتگو	قیصر قلندر، آنند موہن زطشی، گلزار دہلوی، ضیا عثمانی عرش صہبائی، رسا جاودانی

.181	28.02.1977	i) اک عظیم کہانی کار سعادت حسن منٹو کا انٹرویو برج پریمی کے ساتھ	انٹرویو	وی۔ پی۔ سوری
		ii) شاعری		محمد اقبال ملک دانش، تنویر بھدرواہی
.182	28.03.1977	i) شخصیت کے آئینے میں کرشن چندر	مکالمے	ڈاکٹر قمر رئیش، جگن ناتھ آزاد، محمد یوسف ٹینگ آزاد گلاٹی
		ii) غزلیں		
.183	11.04.1977	i) مشہور ادیب سوم ناتھ زطشی کا انٹرویو	انٹرویو	رئیس فراز رضوی
		ii) شاعری		منور لال دل
		iii) افسانہ		کشوری منچندہ
.184	25.04.1977	i) محبتِ اقبال	گفتگو	راؤ پریتم چند
		ii) شاعری		راجن سرحدی
		iii) بے خواب دریچے	افسانے	پشکر ناتھ
.185	02.05.1977	i) اقبال اور اردو شاعری	گفتگو	ڈاکٹر وحید اختر، ڈاکٹر عبدالحق، ڈاکٹر ایس۔ ایل کالرہ، عابد پشاوری
		ii) غزلیں		رشی پٹایلوی
		iii) روشنی کے راستے		او۔ پی۔ شرما سارتھی
.186	09.05.1977	i) شخصیت کے آئینے میں ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ	گفتگو	وی۔ پی۔ سوری
		ii) غزلیں		ودیا رتن آسی
		iii) میرا ساتھی میرا دوست	افسانہ	کشوری منچندہ

.187	16.05.1977	مشاعرہ: ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں	مشاعرہ	درشن کمار حسرت، آنند سروپ انجم، رہبر جدید، محمد یاسین، عابد مناوری، عرش مہبائی، مکیش کاشمیری
.188	30.05.1977	i) ریاست جموں وکشمیر میں افسانہ نگاری ایک جائزہ ii) غزلیں iii) کچھ نہ سوچو	گفتگو افسانہ	اسد اللہ دوانی شبیر مرزا آنند لہر
.189	06.06.1977	i) مصور کا فن اور نظریہ ii) غزلیں	گفتگو	جی۔آر۔سنتوش، ایس۔این وکھولو، اجیت کمار بخشی دینا ناتھ رفیق
.190	13.06.1977	i) یہ بھی ایک آرٹ ہے بات میں سے بات پیدا کرنا ii) غزلیں iii) ازلی راستے	گفتگو افسانہ	عبد الماجد ایس۔این۔نثار دہلوی محمد امین بیگ
.191	20.06.1977	i) جدید ادب میں خواتین کا رول ii) شاعری iii) بھنور کے قیدی	گفتگو	رضیا وحید بیکل عتصائی
.192	27.06.1977	i) اقبال کا تخلیقی زہن ii) شاعری iii) اندھی گھر	گفتگو افسانہ	پروفیسر حامدی کاشمیری بلراج کمار سوز پروفیسر ظہور الدین
.193	04.07.1977	i) آب حیات میں ظرافت ii) شاعری iii) کچھ دن کی شادی	گفتگو افسانہ	جاوید قاضی راجن سرحدی شمس الدین شمیم

.194	11.07.1977	i) بوپھی ڈیز	گفتگو	عبدالحق برق
		ii) شاعری		ہرچرن سنگھ میر
		iii) مری نئی کہانی	افسانہ	شام طالب
.195	18.07.1977	i) علی عباس حسینی کے افسانے	گفتگو	تحمینہ اختر
		ii) غزلیں		مہندر رینا
		iii) ہندوستان کے مشہور شعرا	مشاعرہ	پرن سنگھ ہونر
		iv) سفر	افسانہ	آنند لہر
.196	01.08.1977	i) پریم چند کے 97ویں یوم ولادت پر: آج کے دور کی ترجمان	گفتگو	بی۔ڈی۔مل شرما، عبدالماجد، وی۔پی۔سوری
.197	08.08.1977	i) ٹیگور کا آفاقی نظریہ	گفتگو	یوسف
		ii) غزلیں		منور لال دل
		iii) آل انڈیا مشاعرہ	مشاعرہ	شہریار
		iv) بے نام سسکیوں کا ماتم	افسانہ	محمد اقبال نازش
.198	11.08.1977	i) غالب ہمارے عہد کے شاعر	گفتگو	قاضی سلیم
.199	15.08.1977	فروزاں رہے شیمم آزادی	گفتگو	مکیش کاشمیری
.200	22.08.1977	i) اردو ادب میں جموں و کشمیر کا حصہ	گفتگو	غلام نبی خیال
		ii) غزلیں		نو بہار شبیر
		iii) پیراڈائز	افسانہ	زاکی انور
.201	28.08.1977	i) بنباس	افسانہ	موہن یاور
		ii) غزلیں		جگن ناتھ آزاد
		iii) خواجہ حسن نظامی	گفتگو	حسیب الدین

.202	05.09.1977	i) غزل ایک مطالعہ ii) غزلیں iii) ابھی بہت دور جانا ہے	گفتگو افسانہ	حکیم منظور ہنس راج شاداں ٹھاکر پونچھی
.203	08.09.1977	زمانہ ہے منی کا	گفتگو	جتیندر شرما
.204	12.09.1977	i) حالؔی کا سادہ ذہن اور انداز بیان ii) غزلیں iii) کاغذ کے پھول	گفتگو افسانہ	ضیاالدین عثمانی آنند ور ماسوز مالک رام آنند
.205	15.09.1977	شادی اشتہاروں کی معرفت	گفتگو	ڈی۔ڈی۔کھوشلا
.206	19.09.1977	i) اردو شاعری میں صنعت کاروائی ii) غزلیں iii) قربانی	گفتگو افسانہ	منظر اعظمی راجن سرحدی بی۔آر۔نندہ
.207	22.09.1977	محبت کے لیے ٹونیک ہنسی اور بے فکری	گفتگو	بی۔ایل۔بے حال
.208	26.09.1977	i) پونچھ کے پرانے ادبی معرکے ii) غزلیں iii) شعلے کی آگ	گفتگو افسانہ	دیانند کپور ودیا رتن آسی راج ٹھاکر
.209	29.09.1977	کہیں اور سنا کرے کوئی	گفتگو	نورالزماں صدیقی
.210	03.10.1977	برصغیر مشاعرہ	مشاعرہ	فضا نظامی کانپوری، نظر جعفری، عرش ملیانی، علی سردار جعفری وغیرہ

.211	10.10.1977	i) سماج کی تشکیل میں ادیبوں اور شاعروں کا رول ii) آل انڈیا مشاعرہ	گفتگو مشاعرہ	سلطان محمد ظہور الدین، بی۔ڈی۔مل شرما عادل منصوری
.212	17.10.1977	i) کھلی چٹھی بیوی کی شرابی شوہر کے نام ii) غزلیں iii) بیوقوف	گفتگو افسانہ	عطاور بیگم منور لال دل کشوری منچندہ
.213	25.10.1977	i) تاریخ کے دریچوں سے جب شاعری درباروں کی زینت تھی ii) غزلیں iii) بس اسٹاپ	گفتگو افسانہ	شبیر حسن شام طالب محمد امین بیگ
.214	31.10.1977	i) اردو شاعری میں موسم برسات ii) شاعری iii) آل انڈیا مشاعرہ iv) رات کے چشمے	گفتگو مشاعرہ افسانہ	علی سردار جعفری سریندر ساجد شہریار آنند لہر
.215	23..01.1978	ہندو پاک مشاعرہ	مشاعرہ	محترمہ شہاب قضا الیاش، مجروہ سلطان پوری، قتیل شفائی ، مخدوم محی الدین ، حبیب جالب، وغیرہ
.216	06.02.1978	i) شاعری ii) کالا بھوت	افسانہ	فاروق مفطر، پورن سنگھ ہنر موہن پاور

.217	09.02.1978	عجیب شوق ہے یہ بھی ناخن بڑھانے کا خطاب	گفتگو	ڈی۔ڈی۔کھوشلہ
.218	13.02.1978	i) پونچھ کا عظیم بیٹا کرشن چندر ii) غزلیں iii) بیوقوف	گفتگو افسانہ	کے۔ڈی۔معیانی محمد یاسین کشوری منچندہ
.219	15.02.1978	i) میں ہوں اپنی شکست کی آواز	گفتگو	مکیش کاشمیری
.220	20.22.1978	تجریدی ادب اور قاری کا المیہ	مکالمے	حکیم منظور، اجیت کمار بخشی
.221	27.01.1978	i) اردو میں علامت نگاری ii) شاعری iii) آل انڈیا مشاعرہ	گفتگو مشاعرہ	دورِ شہوار رفیق راز خلیل الرحمٰن اعظمی
.222	06.03.1978	i) صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ii) آل انڈیا مشاعرہ	گفتگو مشاعرہ	جگن ناتھ آزاد ساگر نظامی، یوسف نگہوں
.223	13.03.1978	i) اردو شاعری میں مزاح ii) شاعری iii) بنجارہ چاند	مکالمے افسانہ	عصمت چغتائی، یوسف نگہوں عرش صہبائی مالک رام آنند
.224	20.03.1978	i) فلمی نغمہ نگاری کا اردو شاعری پر اثر ii) شاعری iii) صدائے بازگشت ابھی بہت دور جانا ہے	گفتگو افسانہ	علی سردار جعفری بیتاب جیپوری، اختر انصاری ٹھاکر پونچھی

.225	23.03.1978	آل انڈیا مشاعرہ	مشاعرہ	پرتپال سنگھ بیتاب، نورالزماں صدیقی، عشرت کاشمیری، ظہورالدین، حکیم منظور، جگن ناتھ آزاد وغیرہ
.226	27.03.1978	i) پرانی ادبی بیٹھکیں ii) آل انڈیا مشاعرہ iii) نظم iv) خاندرت	گفتگو مشاعرہ افسانہ	منظر اعظمی زائدہ زیدی عبدالحق قاظمی گیان چند ناز
.226	20.04.1978	i) مشاعروں میں دار کا سلیقہ ii) شاعری iii) آل انڈیا مشاعرہ iv) گونگے لفظ کے مٹھی کا شکن	گفتگو مشاعرہ افسانہ	ڈی۔ڈی۔کھوسلہ اقبال فہم کمال احمد صدیقی محمد اقبال نازش
.227	22.04.1978	اسٹوڈیو مشاعرہ	مشاعرہ	حسرت نوشہروی، راز مناوری، بلراج کمار سوز، نثار دہلوی، سریندر ساجدہ، کرن کاشمیری، منور لال دل وغیرہ
.228	24.04.1978	بیویاں شوہر کا نام نہیں لیتی	گفتگو	مہری مہتا
.229	04.05.1978	i) غالبؔ کی فارسی شاعری ii) غزلیں iii) آل انڈیا مشاعرہ iv) ویراں رات کے شہر	گفتگو مشاعرہ افسانہ	سلطان محمد خان آر۔کے۔چندن عشرت کاشمیری محمد امین بیگ
.230	08.05.1978	لے ڈوبے زبان کے چسکے		

.231	18.05.1978	i) ٹھاکر پونچھی کے افسانوں میں دھرتی کی خوشبو ii) غزلیں iii) فاصل	گفتگو افسانہ	موہن یاور محمد الیاس ملک، تنویر بھدرواہی او۔پی۔شرما سارتھی
.232	01.06.1978	i) اقبال کی شاعری میں شاہین کا تصور ii) غزلیں	گفتگو	حکیم منظور، منظر اعظمی، جگن ناتھ آزاد، غلامی نبی گوئی عرش مہبائی
.233	15.06.1978	i) سجاد حیدر یلدرم ii) غزلیں iii) میری نئی کہانی	گفتگو افسانہ	وی۔پی۔سوری بمل کسان اشک کشوری منچندہ
.234	19.06.1978	مردانگی کا پوسٹر	گفتگو	ڈی۔ڈی۔کھوسلہ
.235	29.06.1978	i) اردو ادب میں ظرافت کے چانٹے ii) غزلیں iii) پانی کی لکیریں	گفتگو افسانہ	پی۔ڈی۔مل شرما دینا ناتھ کاشمیری آنند لہر
.236	06.07.1978	i) غالب کی شاعری میں جنت کا تصور ii) غزلیں iii) برگیڈیر بابا	گفتگو افسانہ	ضیاالدین، احمد عثمانی منور لال دل بی۔آر۔نندہ
.237	10.07.1978	i) ڈوگری لوک گیتوں میں مائکے اور سسرال کا تصور	گفتگو	جتیندر شرما

.238	20.07.1978	i) کہاں تک بات جا پہنچی نام پوچھ بیٹھے ii) غزلیں iii) نروان	گفتگو افسانہ	یوسف پرتپال سنگھ بیتاب مالک رام آنند
.239	31.07.1978	دل کیا کہتا ہے ریڈیو پر اپنی آواز سن کر	گفتگو	ہری مہتا
.240	03.08.1978	i) اینٹی افسانہ اور نثری نظمیں ii) شاعری iii) یادوں کے جنگل میں	گفتگو افسانہ	پروفیسر ظہور الدین سریندر ساجد، راز مناوری موہن یاور
.241	17.08.1978	i) پیطرس ii) رباعیات iii) آخری فیصلہ	گفتگو افسانہ	وی۔پی۔سوری اختر رضوانی وجے موہن
.242	28.08.1978	دل کیا کہتا ہے آئینے میں اپنی شکل دیکھ کر	گفتگو	ڈی۔ڈی۔کھوسلہ
.243	31.08.1978	i) اقبال کی پیشن گوئیاں ii) چھوٹ ہی گئے نہ منہ سیہ کافر لگی ہوئی	گفتگو افسانہ	جگن ناتھ آزاد کشوری منچندہ
.244	31.08.1978	اسٹوڈیو مشاعرہ	مشاعرہ	ہنس راج شاداں، راز مناوری، نثار دہلوی، آنند ورماسوز، شبیر مرزا، عرش صہبائی وغیرہ
.245	07.09.1978	i) ادب میں نئی حیثیت ii) غزلیں iii) آل انڈیا مشاعرہ iv) ریت کی دیوار	گفتگو مشاعرہ افسانہ	فاروق مفطر رہبر جدید زابیدہ زیدی آنندلہر

246.	21.09.1978	i) غزلیں ii) اودھ پنچ iii) بھوک	 گفتگو افسانہ	آنند حیت لطف دیناناتھ، چاند نرائن سکینہ، مجیب صدیقی شام طالب
247.	05.10.1978	i) میرا محبوب شاعر امیر مینائی ii) شاعری iii) سورج	گفتگو افسانہ	پریم سنگھ صہائی کمار پاشی پرویز اختر
248.	19.10.1978	i) اردو ادب میں دیہی زندگی ii) قطعات غزل iii) ہرنام کور	گفتگو افسانہ	عبدالماجد ستیندر سنگھ فانی کشمیر لال ذاکر
249.	02.11.1978	i) بچوں کی شاعری ادب ایک جائزہ ii) غزل iii) کنسر	گفتگو افسانہ	منظر اعظمی منور لال دل عبدالحق قاسم
250.	13.11.1978	ہمیں تو اس ادا نے مار ڈالا، بیاہ شادیوں میں ٹیوسٹ اور بینڈ باجا	گفتگو	جتند شرما
251.	16.11.1978	i) سیفٹی میچز ii) شاعری iii) نمک حرام	خاکہ افسانہ	وید بھوشن گپتا مہندر رانا ایس۔این۔ڈوگرہ
252.	30.11.1978	i) شوکت تھانوی ii) آل انڈیا مشاعرہ iii) الاؤ	گفتگو مشاعرہ افسانہ	وی۔پی۔سوری زہرہ سنگھ پشکر ناتھ

.253	07.12.1978	i) غالب اور نرگسیت	گفتگو	یوسف
		ii) شاعری		محمد یاسین
		iii) بھوک	افسانہ	محمد امین بیگ
.254	18.12.1978	ہمیں تو اس ادا نے مار ڈالا نقلی آبرو اور پوف	گفتگو	کنہیا لال کپور
.255	12.12.1978	i) مناظرِ فطرت اور اقبال	گفتگو	جگن ناتھ آزاد
		ii) شاعری		کے۔ڈی۔میانی
		iii) ہندو پاک مشاعرہ	مشاعرہ	صاحب قفلباش
		iv) پیراڈائیز	افسانہ	زاکی انور
.256	01.01.1979	اسٹوڈیو مشاعرہ	مشاعرہ	رہبر جدید، محمد یاسین، پرتپال سنگھ بیتاب، ظہور الدین، عرش صہبائی، رسا جاودانی وغیرہ
.257	04.01.1979	i) فیض کی شاعری ایک جائزہ	گفتگو	اجیب کمار بخشی
		ii) قطعات		سریندر ساجد
		iii) صدا سہاگن	افسانہ	ستیش بترا
.258	18.01.1979	i) میزبان	انشائیہ	منظر اعظمی، محمد ایمان ازاردہ
		ii) غزل		منور لال دل
		iii) ماچی	افسانہ	او۔پی۔شرما سارتھی
.259	22.01.1979	توبہ میری شوپنگ اور بیوی کے ساتھ	گفتگو	ڈی۔ڈی۔کھوسلہ
.260	15.02.1979	i) میں ہوں اپنی شکست کی آواز	گفتگو	میکش کاشمیری
		ii) غزل		
		iii) سپنوں کا شہر		محمد یاسین
			افسانہ	موہن یاور

261.	01.03.1979	i) نیاز فتح پوری ii) شاعری iii) زخموں کا سفر	گفتگو افسانہ	وی۔پی۔سوری بیتاب جے پوری، درشن، کمار حسرت آنندلہر
262.	05.03.1979	کس زمانے کی بات کرتے ہو۔ مہمانوں کی ناز برداریاں	گفتگو	آر۔کے شرما
263.	14.03.1979	اسٹوڈیو مشاعرہ	مشاعرہ	بلراج موہن شفق، راز مناوری، انند سروپ وغیرہ
264.	24.03.1979	i) اقبال اور بھارت ii) نظم iii) منسپلٹی کی گاڑی	گفتگو افسانہ	جگن ناتھ آزاد علی سردار جعفری اقبال نازش
265.	05.04.1979	i) حامدی کاشمیری کے ساتھ انٹرویو ii) شاعری iii) چوراہا	انٹرویو افسانہ	قیصر قلندر انندور ماسوز موہن یاور
266.	07.04.1979	آل انڈیا مشاعرہ	مشاعرہ	پرتپال سنگھ بیتاب، پرتھوی راج کپور، ظہور الدین، منظر اعظمی، حکیم منظور وغیرہ
267.	19.04.1979	i) شگفی کے خطوط ایک جائزہ ii) شاعری iii) کہانی کا المیہ	گفتگو افسانہ	بی۔ڈی۔مل شرما حسرت نوشیروی، منگورام وفا کشوری منچندہ
268.	30.04.1979	آل انڈیا مشاعرہ	مشاعرہ	پرتھوی راج کپور، موہسن زیدی، کمار پاشی، کرشن موہن، اقبال فہم وغیرہ

.269	03.05.1979	i) اقبال اور جمہوریت ii) شاعری iii) برگِ تمنا	گفتگو افسانہ	جگن ناتھ آزاد رہبر جدید شام طالب
.270	17.05.1979	i) علی عباس حسینی کے افسانے ii) شاعری iii) منظر پس منظر	گفتگو افسانہ	تحمینہ اختر منور لال دل، پورن سنگھ ہنر موہن یاور
.271	31.05.1979	رسؔا جاودانی: خراج تحسین	گفتگو	ظہور الدین، سلطان محمد خان، منور لال دل، عرش صہبائی وغیرہ
.272	07.06.1979	i) قمر جالندھری کے ساتھ انٹرویو ii) شاعری	انٹرویو	ایچ ایل کھوسلہ رشی ٹپیالوی، امر چند قیس
.273	21.06.1979	i) آزادی کے بعد ii) غزل iii) مشلِ فکر	مکالمے	پروفیسر آل احمد سرور، گوپی چند نارنگ جگن ناتھ آزاد بقا اللہ خان
.274	25.06.1979	کیا خوب رہے اگر شوہر کھانا پکائے	گفتگو	خاجستہ عطا ور بیگم
.275	05.07.1979	i) اردو ڈراما آج کس موڑ پر ii) شاعری iii) پتنگ	گفتگو افسانہ	جتند شرما محمد یاسین محمد اقبال نازش
.276	19.07.1979	i) بھیگے آنچل بھیگی محر ii) شاعری iii) غالب کا جمالیاتی ذوق	گفتگو گفتگو	میکش کاشمیری نظیر احمد نظیر وی۔ پی۔ سوری

277.	20.07.1979	مشاعرہ		راز مناوری، نثار دہلوی، بلراج کمار سوز، شبیر مرزا، دینا ناتھ رفیق، حکیم منظور، عرش صہبائی وغیرہ
278.	21.07.1979	قمر جالندھری کے ساتھ انٹرویو	انٹرویو	ایچ۔سی۔کوہلی
279.	30.07.1979	منشی پریم چند اور دیہات کا تصور	گفتگو	منظر اعظمی
280.	02.08.1979	i) منشی پریم چند اور ان کے فن کی عظمت	گفتگو	یوسف
		ii) شاعری		محمد خان سوری خالد، سلام مچھلی شہری
		iii) دیارہ	افسانہ	آنند لہر
282.	16.08.1979	i) یہ ہماری زبان ہے پیارے	مکالمے	گوپی چند نارنگ
		ii) چاند	افسانہ	کے۔ڈی۔معیانی
283.	30.08.1979	i) فسانہ آزاد کا ایک ورق	مکالمے	میاں آزاد، خوجی
		ii) گیت اور غزل		درشن کمار حسرت
		iii) شیفا	افسانہ	شام طالب
		iv) دو صدیاں	افسانہ	موہن یاور
284.	06.09.1979	i) شاعری		طالب ایمن آبادی
		ii) امر چند قیس کے ساتھ انٹرویو	انٹرویو	او۔پی۔عارف
285.	20.09.1979	i) لے ڈوبا تہائی کلام	گفتگو	نور الزمان صدیقی نور
		ii) شاعری		رہبر جدید
		iii) ٹھنڈی آگ	افسانہ	کشوری منچندہ
286.	24.09.1979	بیوی کے تازیانے	گفتگو	کنہیا لال کپور

.287	04.10.1979	i) اکبرالہٰ آبادی کا ایک جائزہ ii) نظم iii) گہرا داغ	 افسانہ	 کلدیپ گنہار، کرن کاشمیری موہن یاور
.289	18.10.1979	i) بچوں کا ادب ii) غزل iii) کتابوں پر تبصرہ الف) ''روشنی کتنی ہے'' از رشی پٹیالوی ب) ''یہ جھورے یہ لوگ'' از عرش صہبائی	گفتگو تبصرہ	خورشید ہرمہ محمد یاسین اجیت کما بخشی
.290	01.11.1979	i) اردو زبان کا ارتقا ii) شاعری iii) کس کس کا افسانہ لکھیں	گفتگو افسانہ	منظر اعظمی منور لال دل مالک رام آنند
.291	15.11.1979	i) مضحکہ خیز ii) شاعری iii) احساس گناہ	گفتگو افسانہ	ظہور الدین سریندر ساجد، اندر جیت لطف محمد امین بیگ
.292	29.11.1979	i) یہ کرنسی نوٹ ii) شاعری iii) ابھی بہت دور	انشائیہ افسانہ	محمد زماں آزادہ شجا سلطان، اختر رضوانی ٹھاکر پونچھی
.293	06.12.1979	i) اقبال اور اس کا عہد ii) شاعری iii) ازلی رشتہ	گفتگو افسانہ	جگن ناتھ آزاد پرتپال سنگھ بیتاب عرش صہبائی

.294	20.12.1979	i) جدید شاعری میں اشاریت اور ابہام	گفتگو	حکیم منظور
		ii) شاعری		بیتاب جیپوری، زیب گوری
		iii) سلسلہ	افسانہ	آنند لہر
.295	03.01.1980	سال نو	نظم	راجن سرحدی
.296	17.01.1980	i) خاکہ نگاری ایک فن	گفتگو	ضیاالدین عثمانی
		ii) غزلیں		آر۔ کے چندن
		iii) پچھلے برسوں کا شعری منظر	مکالمے	مخمور سیدی، کمار پاشی
.297	22.01.1980	عورتیں باتونی ہوتی ہیں	گفتگو	خاختہ عطا و ربیگم
.298	31.01.1980	i) نئی کتابوں پر تبصرہ الف) ''غبار خیال''از محمد زماں آزردہ ب) ''ناتمام''از حکیم منظور	تبصرہ	منظر اعظمی
		ii) شاعری		حسرت نوشہری
		iii) آل انڈیا مشاعرہ	مشاعرہ	شاجہاں بانو، یاد دہلوی
		iv) میری نئی کہانی	افسانہ	پرویز اختر
.299	07.02.1980	i) عہد ساز کہانی کار کرشن چندر	گفتگو	زبیر رضوی
		ii) شاعری		
		iii) عرفان		پریمی رومانی
			افسانہ	کے۔ڈی۔ معیانی
.300	21.02.1980	i) میری تجزیہ میری زندگانی: انٹرویو۔ جگن ناتھ آزاد	انٹرویو	کے۔کے۔ ڈوگل
		ii) شاعری		تنویر بھید رواہی، قیوم ساگر

.301	25.02.1980	بڑے کام کی چیز ہے خوشامد	گفتگو	نورالزماں صدیقی
.302	05.03.1980	i) خطیبانہ شاعری ایک جائزہ ii) شاعری iii) دستک	گفتگو افسانہ	نورالزماں صدیقی دیناناتھ رفیق کشوری منچندہ
.303	17.03.1980	کس زمانے کی بات کرتے ہو۔ جادوٹوٹے	گفتگو	ڈی۔ڈی۔کھوسلہ
.304	20.03.1980	i) حسرت موہانی ii) غزلیں	گفتگو	وی۔پی۔سوری منورلال دل،زاہدہ زیدی
.305	03.04.1980	i) آغاحشر کاشمیری اوراسٹیج کے تقاضے ii) غزلیں iii) غبارے رنگ برنگے	گفتگو افسانے	جتیندر شرما محمد یاسین پشکرناتھ
.306	17.04.1980	i) جدید غزل کے موضوعات ii) غزلیں iii) خودکشی	گفتگو افسانہ	حکیم منظور عابد مناوری،علی سردار جعفری محمد امین بیگ
.307	21.04.1980	اقبال اور کشمیر	گفتگو	جگن ناتھ آزاد
.308	23.04.1980	اسٹوڈیو مشاعرہ	مشاعرہ	بلراج کمار سوز،نظر خاور، درشن کمار حسرت، برج موہن شفق وغیرہ

.309	01.05.1980	i) نئی کتابوں پر تبصرہ	تبصرہ	اجیت کمار بخشی
		الف) ''چادر'' از کے۔ڈی معیانی		
		ب) ''مہاشاجاتی کی تاریخ'' از ایس این ڈوگرہ		
		ii) غزلیں		اندر جیت لطف
.310	15.05.1980	i) پریم ناتھ پردیسی اوران کافن	گفتگو	ڈاکٹر برج پریمی
		ii) غزلیں		
		iii) زخمی لکیریں		نورالزماں صدیقی
			افسانہ	آنند لہر
.311	29.05.1980	i) میری پہلی تخلیق	گفتگو	طالب ایمن آبادی
		ii) شاعری		خلیل الرحمٰن اعظمی، فضیل جعفری
		iii) ابھی بہت دور جانا ہے	افسانہ	قاضی عبدالحمید
.312	05.06.1980	i) غزلیں		بیتاب جیپوری، بیکل عطسائی
		ii) پیاسی ممتا	افسانہ	قاضی عبدالحمید
.313	19.06.1980	i) مشکل ہوتا ہے آسان زبان میں اظہار خیال	گفتگو	منظر اعظمی
		ii) شاعری		رگھوبیر چندر نادم
		iii) ہندو پاس مشاعرہ	مشاعرہ	شہاب قفل باش
		iv) دھوک کی رات	افسانہ	کے۔ڈی۔معیانی

.314	03.07.1980	i) غزل کے آئینے میں حسرت موہانی ii) شاعری iii) پل	گفتگو افسانہ	وی۔پی۔سوری نظیر احمد نظیر رام لعل
.315	17.07.1980	i) کیف برن ii) شاعری	گفتگو	میکش کاشمیری علی سردار جعفری
.316	28.07.1980	زندگی فایلوں کی آغوش میں	گفتگو	جتندر شرما
.317	31.07.1980	i) منشی پریم چند کی تخلیقات میں دیہات کی تصویر ii) قطعہ	گفتگو	بی۔ڈی۔مل شرما عرش صہبائی
.318	07.08.1980	i) بدیشیوں میں اردو ii) شاعری iii) سانپ	گفتگو افسانہ	جگن ناتھ آزاد رہبر جدید کشوری منچند
.319	18.08.1980	وقت نہیں بھائی اور داماد کی ناز برداری کا	گفتگو	ڈی۔ڈی۔کھوسلہ
.320	21.08.1980	i) اقبال بحیثیت انسان وشاعر ii) آل انڈیا مشاعرہ iii) ڈر	گفتگو مشاعرہ افسانہ	عزیز ولیم شہریار شام طالب
.321	04.09.1980	i) آغا حشر کاشمیری کا اچھوتہ اسلوب بیان ii) شاعری	گفتگو	منظر اعظمی منور لال دل، شباب للیت

.322	18.09.1980	i) اردو کی مزاحیہ شاعری ایک جائزہ	گفتگو	نورالزماں صدیقی
		ii) غزل		حکیم منظور
		iii) زندگی یوں بھی گزرتی ہے	افسانہ	پرویز اختر
.323	29.08.1980	بعض لوگ اپنی تعریف کرتے تھکتے نہیں	گفتگو	آر۔کے۔کھوسلہ
.324	02.10.1980	i) اردو ادب میں گاندھیائے طرز فکر	گفتگو	بی۔ڈی۔مل شرما
		ii) گاندھی جی: خراج تحسین	شاعری	طالب ایمن آبادی
		iii) میرا پسندیدہ افسانہ نگار۔ پشکر ناتھ کے ساتھ انٹرویو	انٹرویو	کے۔کے۔ڈوگل
.325	16.10.1980	i) ہندوستانی کلچر کی نشو نما میں اردو ادب کا حصہ	گفتگو	پروفیسر جگن ناتھ آزاد
		ii) غزلیں		اندرجیت لطف
		iii) جادو	افسانہ	جوگیندر پال
.326	30.10.1980	i) صدائے بازگشت	شاعری	ساحر لدھیانوی
		ii) شاعری کے آئینے میں ساحر لدھیانوی	گفتگو	اجیت کمار بخش
		iii) فانوسِ خیال غزلیں		درشن کمار حسرت
		iv) میرا پسندیدہ افسانہ نگار: انٹرویو اقبال نازش	گفتگو	کے۔کے۔ڈوگل
.327	03.11.1980	ادھار لے کر واپس نہ کرنا	گفتگو	ڈی۔ڈی۔کھوسلہ

328.	05.11.1980	مشاعرہ: اجالا ہے دل میں تیری روشنی ہے	مشاعرہ	برج موہن شفیق، شبیر مرزا، تنویر بھدرواہی، دینا ناتھ رفیق، عرش صہبائی وغیرہ
329.	01.01.1981	i) گلِ نو ii) ذوقؔ کے قصیدے iii) اونچی اڑان	نظم گفتگو افسانہ	منور لال دل خورشید بسمل وجے سوری
330.	12.01.1981	کیا ضروری ہے پرس میں میک اپ کا سامان	گفتگو	ڈی۔ڈی۔کھوسلہ
331.	15.01.1981	i) جدیدیت کی تحریک ii) شاعری iii) صحرا کا مسافر iv) ہندو پاک مشاعرہ	گفتگو افسانہ مشاعرہ	فاروق مفطر راز بلاوری وجے سوری حفیظ جالندھری
332.		جمہوریت میں شفقات کی اعلیٰ قدریں	گفتگو	محمد سید ملک، برج بھردواج، رام لعل رومہ وغیرہ
333.	02.02.1981	ماڈرن لیلیٰ مجنوں	گفتگو	جتیندر شرما
334.	05.02.1981	i) کتابوں کی دنیا ii) شاعری iii) سرخ تالاب	گفتگو افسانہ	ڈاکٹر منظر اعظمی رہبر جدید، واحید اختر محمد اسلم
335.	19.02.1981	i) انتظار ii) شاعری iii) اجنبی	خاکہ افسانہ	محمد زماں ازردہ تنویر بھدرواہی شام طالب

336.	05.03.1981	i) مونولوگ چٹکلے ii) شاعری iii) آل انڈیا مشاعرہ iv) کچھ بھی ناممکن نہیں	گفتگو مشاعرہ افسانہ	بشیر زارا اندرجیت لطف، کرشن موہن شہاب قصل لباش کشوری منچندہ
337.	19.03.1981	i) نیا چہرہ مونولاگ ii) شاعری iii) اپنی اپنی سلیب iv) بھیڑ	گفتگو افسانہ افسانہ	زمیر اشاری سریندر ساجد، بشیر بدر موہن یاور آنند لہر
338.	02.04.1981	i) ٹھاکر پونچھی کے ناول ایک جائزہ ii) شاعری iii) آج کی غزل	گفتگو مکالمے	محمد شریف دانش ملک آر کے چندن بشیر بدر، کمار پاشی، شہریار، جگن ناتھ آزاد
339.	16.04.1981	اسٹوڈیو مشاعرہ	مشاعرہ	انجم رہبر، ہومہ پروین، عش صہبائی وغیرہ
340.	30.04.1981	i) حفیظ شیرازی کا ایک شعر ii) شاعری iii) ایک نظر ادھر بھی	گفتگو خاکہ	ڈاکٹر کاشی ناتھ پنڈتہ ایم۔ایچ۔ظفر، شمیم ساحل محمد زماں ازردہ
341.	04.05.1981	کتنی پیاری ہوتی ہیں آنکھیں اور زبان	گفتگو	ڈی۔ڈی۔کھوسلہ
342.	21.05.1981	i) اردو شاعری میں وجودی عناصر ii) شاعری	مکالمے	سوہن لعل کول، اقبال فہم، غلام نبی حکیم، غلام رسول آنند سروپ انجم، بلراج کمار سوز، تنویر بھدرواہی
343.	25.05.1981	عجیب زمانہ ہے بال کون سنوارے	گفتگو	خاجستہ عطا وربیگم

.344	04.06.1981	i) جدید افسانہ ii) شاعری iii) شیریاں	مکالمے افسانہ	کمار پاشی، مخمور زائدی منور لال دل کے۔ڈی۔معیانی
.345	08.06.1981	کتنی پیاری ہوتی ہے اپنی اپنی جان	گفتگو	اجیت بخشی
.346	18.06.1981	i) میرا حالیہ سفر: پروفیسر جگن ناتھ آزاد ii) شاعری iii) ہندو پاس مشاعری	انٹرویو مشاعرہ	پروفیسر راشید حسن خان بیتاب جیپوری فنا نظام کانپوری
.347	02.07.1981	i) سید احتشام حسین ii) شاعری iii) پھروہی مصیبت iv) ہندو پاک مشاعرہ	گفتگو افسانہ مشاعرہ	وی۔پی۔سوری شجا سلطان کشوری منچندہ مجروح سلطان پوری
.348	20.07.1981	چھوڑیئے اس دھمکی کو میں چلی مائیکے	گفتگو	ڈی۔ڈی۔کھوسلہ
.349	06.08.1981	i) اقبال بھی اقبال سے آغا نہیں ہے ii) شاعری	گفتگو	حمد الدین بانڈے، احمد شمیم، ڈاکٹر شام لال کالرہ اوپی شاکر، شبیر مرزا
.350	20.08.1981	i) صحیح املہ ii) شاعری	گفتگو	رشید حسن خان آنند سروپ انجم، ودیا رتن آسی، حکیم منظور، فضیل جعفری

.351	03.09.1981	i) غالب کی رندی اور بداشمی ii) غزلیں iii) اونچے لوگ	گفتگو افسانہ	یوسف رگھوبیر چندر، ندیم کوتالوی مانک رام آنند
.352	17.09.1981	اسٹوڈیو مشاعرہ	مشاعرہ	حسرت نوشہروی، شام ماحل، خورشید بسمل، دینا ناتھ رفیق، عرش صہبائی وغیرہ
.353	01.10.1981	i) غالب کی زندگی کا اقتصادی پہلو ii) شاعری iii) بھیگے ہوئے لمحے	گفتگو افسانہ	خورشید ہمرہ منور لعل دل، طالب ایمن آبادی محمد اقبال نازش
.354	05.10.1981	عجیب سوق ہے پہلے دن فلم دیکھنا	گفتگو	اجیت بخشی
.355	12.10.1981	بھول ہوئی ٹیلی فون لگوا کر	گفتگو	ڈی۔ڈی۔کھوسلہ
.356	15.10.1981	زیر نظر کتاب الف) ''شکست آرزو'' از کشوری منچندہ ب) ''متوازی سائے'' از آزاد بہادیلپوری	تبصرہ	ڈاکٹر منظر اعظمی
.357	02.11.1981	بھول ہوئی سلسل بن کر	گفتگو	نورالزماں صدیقی نور
.358	05.11.1981	i) عروض کی جانکاری شاعری کے لیے ضروری ii) شاعری iii) لیٹیس اور لکیریں	گفتگو افسانہ	جگن ناتھ آزاد مظفر عراج بندھو شرما

359.	09.11.1981	i) اردو ناول کا ارتقا ایک جائزہ ii) رباعیات iii) آل انڈیا مشاعرہ iv) ہرضمیر کا کرب	گفتگو مشاعرہ افسانہ	ڈاکٹر تحمنہ اختر اختر رضانی فیض الہ آبادی پرویز اختر
360.	13.12.1981	اسٹوڈیو مشاعرہ	مشاعرہ	درشن کمار حسرت، بلراج کما سوز، سریندر ساجد، عرش صہبائی وغیرہ
361.	17.12.1981	شبِ افسانہ	گفتگو	محمد اسلم ،کشوری منچندہ، محمد امین بیگ، کے ڈی معیای، شام طالب
362.	21.12.1981	عجیب شوق ہے جاسوسی ناول پڑھنا	گفتگو	ادلین روہی
363.	07.01.1982	i) داستان ہفت سیاح از غلام غوث تشنہ ایک جائزہ ii) شاعری iii) اردو کا چلن باہر کے ملکوں میں	گفتگو مکالمے	مہندر پروانہ پرتپال سنگھ بیتاب گوپی چند نارنگ
364.	21.01.1982	ریڈیو مشاعرہ	مشاعرہ	آنند سروپ انجم، تنویر بھدرواہی ، اوم پرکاش نقش، عرش صہبائی وغیرہ
365.	04.02.1982	i) مشاعروں میں سامعین کا کردار ii) شاعری iii) خارش	گفتگو افسانہ	ڈاکٹر منظر اعظمی رہبر جدید، منور لعل دال راشید قمر

.366	15.02.1982	کون کہتا ہے غالب کا کلام مہمل ہے	گفتگو	کاشی ناتھ پنڈتہ
.367	18.02.1982	اسٹوڈیو مشاعرہ	مشاعرہ	برج موہن شفیق، شبیر مرزا، بیتاب جیپوری، عرش صہبائی وغیرہ
.368	22.02.1982	ادب اور صحافت کے آئینے میں مولانا ابو اکلا آزاد	گفتگو	وی۔ پی۔ سوری
.369	04.03.1982	i) عہد ساز کہانی کار کرشن چندر ii) شاعری iii) پیر بخش	گفتگو افسانہ	زبیر رضوی عبدالقیوم، رومیش امید خالصہ مالک رام آنند
.372	22.03.1982	پہلے پہل جب لڑکی کا ٹکٹ خریدہ	گفتگو	جتندر شرما
.371	01.04.1982	اسٹوڈیو مشاعرہ	مشاعرہ	نوراندوری، ڈاکٹر بشیر بدر، مظہر امام، عرش صہبائی وغیرہ
.372	15.04.1982	i) منٹو فلر وفن کے چند پہلو ii) شاعری iii) زندگی iv) آل انڈیا مشاعرہ	گفتگو انشائیہ مشاعرہ	ڈاکٹر برج پریمی پریمی رومانی محمد زماں ازردہ ارمان صاحب

جموں خطے میں ریڈیو کشمیر جموں کے حوالے سے جو ریڈیو ڈرامے، ڈراما نگاروں نے پیش کیے انھیں ڈراما نگاروں کی روایت کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ریڈیو ڈرامے نہ ہی کسی کتاب میں شائع ہوئے ہیں اور نہ ہی ریڈیو ڈراما نگاروں نے انھیں کسی کتابی صورت میں پیش کیا ہے۔ اس حوالے سے پروفیسر ظہورالدین نے اپنی کتاب میں لکھا ہے:

"The Srcipts of these plays have also been destroyed and

they are nither available withthe authors not with the Radio Kashmir Authorities".

Development of Urdu Languages and Literature in Jammu Region, 1985, P.152.

ریڈیو کشمیر جموں کے حوالے سے جو ریڈیو ڈرامے نشر کیے گئے ہیں ان کی فہرست مندرجہ ذیل ہے:

نمبر	تاریخ نشریات	موضوع	ریڈیو ڈراما نگار
.1	15.09.1969 24.05.1973	ماضی کی پرچھائیاں	کپور سنگھ گمنام
.2	15.10.1968 01.07.1969	یہودی کی لڑکی	آغا حشر کاشمیری
.3	13.01.1970 03.05.1970	رات کی بہاروں میں	یاقوت سید
.4	15.02.1970 14.02.1971 31.12.1972	امراؤ بیگم	ایم۔ایم۔شرما
.5	27.04.1971 19.06.1974	موت کا پیغام	لکشمی نارائین
.6		شعنتہ	پشکر ناتھ
.7	19.04.1970	تصویریں	نور شاہ
.8	14.12.1969 30.05.1972	ہملیٹ	جے۔سی۔بترہ

.9	01.08.1971 17.04.1973 27.09.1977	آخری دروازہ	پشکر ناتھ
.10	23.02.1971 19.11.1973	تمیں منٹ	پشکر ناتھ
.11	21.11.1971 31.03.1974	آخری دن کی تلاش	نورشاہ
.12	18.10.1972	پت جھڑ	پشکر ناتھ
.13	02.11.1971	محبت اور آدمی	او۔پی شرما
.14	21.05.1972 12.12 1972	آدھی رات کا بادل	پشکر ناتھ
.15	18.06.1972 15.05.1973 04.12.1974	جہانگیر کی موت	زیڈ۔سیمی
.16	09.07.1972	آخری منزل	پشکر ناتھ
.17	08.10.1972	تال پاتال	پشکر ناتھ
.18	26.11.1972 28.08.1973 03.04.1974 05.10.1976	ہوا کا آنچل	ٹھاکر پونچھی
.19	07.01.1973	آشیانہ	نورشاہ

.20	11.03.1973 01.01.1974	آنگن کی چڑیا	پشکرناتھ
.21	10.03.1973	چھتیں	سی۔ پروانہ
.22	29.04.1973 06.11.1973 12.03.1975	سنگتراس	وجے سوری
.23	06.05.1973 13.11.1973 03.05.1977	یہ من بڑا چنچل ہے	ٹھاکر پونچھی
.24	22.07.1973 19.02.1974	دو آتشا	وجے سومن
.25	14.10.1973 12.02.1975	تصویر اور سایہ	اشوک پٹواری
.26	28.10.1973	جھانکیاں	سی۔ پروانہ
.27	27.01.1974 14.08.1974 02.01.1975	تمنا کے قدم	ٹھاکر پونچھی
.28	10.02.1974 08.01.1975 05.11.1975	آدمی نہیں سنتا	ہری مہتا
.29	24.02.1974 28.09.1974	اجنبی رہنے دو	پشکرناتھ

.30	26.05.1974	کالے من کی چھایا	پشکر ناتھ
.31	14.07.1974	اور انسان مر گیا	راجندر پٹواری
.32	18.07.1974	دودھا لکے	پشکر ناتھ
.33	25.08.1974	کلپنا	او۔پی۔شرما
.34	17.11.1974 06.06.1978	سلگتی چاندنی	ڈاکٹر اشوک پٹواری
.35	10.11.1974 11.01.1977	پت جھڑ کے آنچل	پشکر ناتھ
.36	19.01.1975	ادھورے خاکے	راجندر پٹواری
.37	02.02.1975 09.07.1975	دل کے دریچے	ٹھاکر پونچھی
.38	17.03.1975 12.11.1975	آدھے چاند کا آخری سفر	پشکر ناتھ
.39	30.03.1975	انصاف کے دائرے	اشوک پٹواری
.40	02.02.1975 18.09.1981	بہروپ	پشکر ناتھ
.41	01.06.1975	تن کی اگنی میں کی ہلچل	پشکر ناتھ
.42	29.06.1975	وہ بھی ایسی ہی رات تھی	رام درشن کپور
.43	27.07.1975	تاج محل جو ٹوٹ گیا	وجے سوری
.44	03.08.1975 21.12.1975	ناؤ اور ندی	مہیش شرما

.45	31.08.1975 16.01.1977 07.03.1977	اوسکار وائلڈز ڈراما	جتندر شرما
.46	28.09.1975	لمحہ لمحہ زندگی	پشکر ناتھ
.47	19.10.1975 10.03.1975	دریا سے بچھڑیں لہریں	مہیش شرما
.48	26.10.1975	آپ لوگ	کے۔کے۔کپور
.49	14.12.1975 09.06.1976	نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا	پشکر ناتھ
.50	04.01.1976 02.06.1976	سحر ہونے تک	راجندر پٹواری
.51	18.01.1976	جہاں دھرتی ملے آکاش سے	سکھ دیو سنگھ
.52	01.02.1976 27.06.1976	خواب خواب نہ رہا	کے۔کے۔کپور
.53	07.03.1976 30.06.1976	نئی راہ کا مسافر	پشکر ناتھ
.54	25.04.1976 17.10.1976	کہاں ہے منزل	سکھ دیو سنگھ
.55	02.05.1976	ٹوٹنے پر	وجے سوری
.56	23.05.1976 04.08.1976 14.06.1981	نہ بول اتر یہ کاگا	پشکر ناتھ

.57	30.05.1976 02.11.1976	میری منزل	کے۔کے۔کپور
.58	04.01.1976	چھوٹے ہاتھ لمبے ہاتھ	نرسنگھ دیو جموال
.59	25.07.1976 03.02.1977	منزل بھلا رہی ہے	راجندر پٹواری
.60	01.08.1976 12.04.1977 10.05.19777	جینے کی تمنا	کے۔کے۔کپور
.61	17.10.1976 14.06.1977	چہرے	سکھ دیو سنگھ
.62	12.09.1976	سانجھ ڈھلے	پشکر ناتھ
.63	24.10.1976	متوا گھر آجا	پشکر ناتھ
.64	13.03.1977 18.12.1977	ایک موتی انمول سی	شبنم قیوم
.65	23.01.1977	آدھے چاند کی ادھوری کہانی	کے۔کے۔کپور
.66	03.04.1977 02.08.1977	سگائی	مہیش شرما
.67	13.04.1977	تھیٹر کمپنی	محمود احمد
.68	13.04.1977	حکم کرو میرے آقا	راج کمار داغ
.69	15.05.1977 01.11.1977	راستے نامور	سکھ دیو سنگھ
.70	29.05.1977	زندگی کی تلاش میں	کے۔کے۔کپور

.71	19.06.1977 17.07.1977	آخری منزل پہلا پڑاؤ	پشکر ناتھ
.72	03.07.1977 04.10.1977 07.03.1978	لوٹتے قدم	مہیش شرما
.73	16.08.1977 10.01.1978	وادیاں اور ویرانے پہلی قسط	پشکر ناتھ
.74	21.08.1977 17.01.1978	وادیاں اور ویرانے دوسری قسط	پشکر ناتھ
.75	23.08.1977 24.01.1978	وادیاں اور ویرانے تیسری قسط	پشکر ناتھ
.76	11.09.1977	گنہگار	سکھ دیو سنگھ
.77	23.10.1977 21.03.1978	تاریک مکان، روشن دریچے	پشکر ناتھ
.78	25.12.1977 26.03.1978	قہقہہ، عقل اور مزاج	محمود احمد
.79	01.01.1978 30.05.1978	امانت	سکھ دیو سنگھ
.80	05.02.1978 09.05.1978	آخری منزل	پشکر ناتھ
.81	26.02.1978	کہانی کا کلائمکس	کے۔ کے۔ کپور

.82	02.04.1978 04.07.1978	کوئی داستان ہوں	پشکر ناتھ
.83	23.04.1978 03.03.1981	پرورتن	سکھ دیو سنگھ
.84	28.05.1978 19.09.1978	ہنسا ہنس	مہیش شرما
.85	25.06.1978	ایک قطرہ حسرت	کے۔کے۔کپور
.86	13.08.1978	اندھے رشتے	پشکر ناتھ
.87	10.09.1978	ایک جنم ایک تصویر	سکھ دیو سنگھ
.88	08.10.1978	خاموشی کا سفر	او۔پی۔شرماسارتھی
.89	22.10.1978 02.01.1978	دلِ ناداں	وجے سوری
.90	31.10.1978	چھتیں	سی۔پروانہ
.91	12.11.1978	بوند بوند ترسے	پشکر ناتھ
.92	09.05.1979 08.09.1980	برستے بادل	سکھ دیو سنگھ
.93	07.01.1979 23.12.1979	مغل	آر۔کے۔ابرول
.94	28.01.1979 17.07.1979 15.05.1981	لکشمن ریکھا	رینا جتندر

.95	04.02.1979 02.01.1981	ایک تھا کتا	ہری مہتا
.96	25.02.1979	پرچھائیاں	سکھ دیو سنگھ
.97	04.03.1979	کون سا سپنا دیکھوں	پشکر ناتھ
.98	25.03.1979	اندھی اور بہری چٹان	کے۔کے۔کپور
.99	31.03.1979 21.08.1979	احساس کی ڈوری	پشکر ناتھ
.100	22.04.1979	کیا بھالی نہ ایک	محمود احمد
.101	29.04.1979	دلال	آر۔کے۔ابرول
.102	03.006.1979	سپنوں کی دنیا	پشکر ناتھ
.103	22.07.1979	اپنے اپنے دائیرے	او۔پی۔شرما
.104	29.07.1979	جلتے چراغ	سکھ دیو سنگھ
.105	05.08.1979	ذراسی بھول	ہری مہتا
.106	26.08.1979	تین فٹ اونچا آسمان	پشکر ناتھ
.107	03.09.1979	بکھرا بکھرا ناٹک	کے۔کے۔کپور
.108	08.10.1979 05.02.1980	بجھتے چراغ	سکھ دیو سنگھ
.109	07.01.1980 20.05.1980	اندھے رات کی چاند	پشکر ناتھ
.110	03.05.1980 18.01.1981	یہ جیون ہے	جتندر شرما
.111	01.06.1980	پریت نہ کریو کوئی	کے۔کے۔کپور

.112	02.06.1980 21.10.1980	اُس پار کا سچ	پشکر ناتھ
.113	29.06.1980 19.12.1980 22.01.1982	زہر کا احساس	راجندر پٹواری
.114	06.07.1980	ایک کہانی ایک نشانی	سکھ دیو سنگھ
.115	03.08.1980 09.01.1981	چرچہ گلی گلی	بی۔ڈی مل شرما
.116	07.09.1980	اُس کا سچ	پشکر ناتھ
.117	12.10.1980	ایک گالب میلا سا	کے۔کے۔کپور
.118	16.12.1980 01.05.1981	تیرے گردش کے مارے	مہیش شرما
.119	20.01.1981	تورا من درپن کھلائے	کے۔کے۔کپور
.120	27.01.1981	گھر	وریندر پٹواری
.121	10.03.1981 16.10.1981	من کے تین حاضر پہلی قسط	پشکر ناتھ
.122	17.03.1981 23.10.1981	من کے تین حاضر دوسری قسط	پشکر ناتھ
.123	24.03.1981 30.10.1981	من کے تین حاضر تیسری قسط	پشکر ناتھ
.124	07.04.1981 26.08.1981	اُس دن	وجے سوری

.125	12.05.1981	جہاں گلاب کھلتے ہیں	پشکر ناتھ
.126	02.06.1981 15.01.1982	اُس کا درد	مہیش شرما
.127	09.06.1981 05.03.1982	خاموشی کی آواز	کے۔کے۔کپور
.128	07.07.1981 18.12.1981	آؤاب لوٹ چلیں	وجے سوری
.129	04.08.1981	پہلی بارش	پشکر ناتھ
.130	01.09.1981 19.02.1982	پتھر کے آدمی	ایس۔کے۔رامپول
.131	06.10.1981	پالتو گدھ	ساجود سلطانی
.132	13.10.1981	گرتی دیوار	سکھ دیو سنگھ
.133	22.11.1981 10.01.1982	مجھے روکو	پشکر ناتھ
.134	01.12.1981	کون نہیں ہے چور	ہری مہتا
.135	29.12.1981 23.04.1982	سارے رنگ تمہارے	پشکر ناتھ
.136	04.01.1982 13.04.1982	چندر اور سورج	کے۔کے۔کپور
.317	24.01.1982 14.03.1982	تمہاری طرح	سی۔پروانہ
.138	09.02.1982	بوند بوند زہر	پشکر ناتھ

.139	28.03.1982	وقت کی پکار	محمود احمد
.140	28.03.1982	ڈھیلے پیچ	سکھ دیو سنگھ
.141	16.04.1982	ہڑتال	وجے سوری

*****

حوالہ جات

1: رسالہ ’’اعلیٰ تعلیم‘‘، جنوری۔ مارچ 2018، ص4

2: تنقیدی فکر وفن از مشتاق احمد وانی‘‘ ص123

3: مقالہ ’’محمد الدین فوق اور ان کی علمی وادبی خدمات‘‘، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1987، ص621

4: حکایت کشمیر ’’راجہ ماتر گپت اور ایک فونی سالار پرورسین‘‘ افسانہ، ص30

5: حکایت کشمیر، افسانہ ’’ہر دل عزیز سلطان زین العابدین‘‘، ص33

6: رسالہ ’’اعلیٰ تعلیم‘‘، جنوری۔ مارچ 2018، ص13

7Development of Urdu Language and Literature in Jammu Region", p371.By prof. zahoor Ud Din

8: کشمیر میں اردو از عبدلقادر سروری، جلد، سوم۔ ص۔ 133

9: ضلع ڈوڈہ کی ادبی شناخت، از ولی محمد اسیر کشتواڑی، ص، 184۔

10: ’’اعتراف‘‘ از پریمی رومانی، ص46

11: ’’طلسم خیال‘‘ از کرشن چندر، ص51

12: کرشن چندر کے دس بہترین افسانے‘‘ از شہزاد منظر، ص87

13: ’’شہاب نامہ‘‘ از قدر اللہ شہاب، ص121

14: ایضاً، ص19

15: یضاً، ص1139

16:Development of Urdu Language and Literature in Jammu Region" prof, Zahur Ud

Din, p377.

17:Development of Urdu Language and Literature in JammuRegion",prof, Zahur Ud Din, p431.

18:''کشمیر میں اردو'' ازعبدالقادرسروری،ص230

19:''افسانوی مجموعہ زندگی کی دوڑ''از ٹھاکر پونچھی،ص۔3

20:جموں کشمیر کے اردو مصنفین''از جان محمد آزاد۔ص،436

21:کشمیر میں اردو'' ازعبدالقادرسروری(جلد۳)ص۔231

22:بحوالہ:رسالہ''شیرازہ'' شمارہ 1978

23:Development of Urdu Language and Literature in Jammu Region, prof, Zahur Ud Din,p441.

24:بحوالہ؛کشمیر میں اردو'' ازعبدالقادرسروری(جلد۳)ص۔179

25:ایضاً،ص۔179

26:''افسانوی مجموعہ''سیاہ تاج محل''،ازموہن یاور،ص145

27:ایضاً،ص151

28؛کشمیر میں اردو'' ازعبدالقادرسروری(جلد۳)ص۔181.

29:مجموعہ''توی جہلم''ازموہن یاور،ص۔3

30:جموں کشمیر کے اردو مصنفین''از جان محمد آزاد۔ص،452

31:''جموں کشمیر کے اردوافسانہ نگار''ازنورشاہ۔ص،53

32:جموں کشمیر کے اردو مصنفین''از جان محمد آزاد۔ص،453

33:''جموں کشمیر کے اردوافسانہ نگار''ازنورشاہ۔ص،54

34:Development of Urudu Language and Literature in Jammu Region,prof, Zahur Ud Din، p368

35:''تلون کا کرب''از کشوری منچندہ،آخری صفحہ

36:Development of Urdu Language and Literature in Jammu Region",prof, Zahur Ud Din، p383.

37:افسانہ''رمتا جوگی''کشمیر میں اردو''ازعبدالقادر سروری (جلد ۳) ص۔211.

38:''جموں وکشمیر کے اردو مصنفین''از جان محمد آزاد،'482

39:''تنقیدی فکر وفن''ازمشتاق احمد وانی،ص124

40:Development of Urdu Language and Literature in Jammu Region"prof, Zahur Ud Din, p368

41:"Development of Urdu Lanugage and Literature in Jammu Region",prof, Zahur Ud Din، p401

42:''افسانہ پردہ نشین''رسالہ''ہمارا ادب''شمارہ1959،

43:''جموں وکشمیر کے منتخب اردو افسانے''(پریم ناتھ پردیسی سے ترنم ریاض تک) ازسلیم سالک،جلداول،ص198

44:مجموعہ''عشق کا چاند اندھیرا''پشکر ناتھ،ص7

45:ایضاً ،ص13

46:ایضاً،ص58

47:ایضاً،ص59

48:کشمیر میں اردو''ازعبدالقادر سروری (جلد ۳) ص۔189.

49:افسانوی مجموعہ:''کانچ کی دنیا''ازپشکر ناتھ،ص13

50:ایضاً،ص156

51:ایضاً،ص158

52:پریمی رومانی (مرتبہ) برج پریمی،ایک مطالعہ،ص108

53:''ذوقِ نظر''از برج پریمی،ص145

54:حرفِ جستجو،از پرج پریمی،ص11

55:''برج پریمی۔ایک انسان،ایک ادیب،از پروفیسر ظہورالدین،ص58

56:پیش لفظ،افسانوی مجموعہ ''سپنوں کی شام''از برج پریمی،ص8

57:مباحث،از برج پریمی،ص7

58:کشمیر میں اردو،از عبدالقادر سروری،ص197

59:مجموعہ ''سپنوں کی شام''از برج پریمی،ص43

60:ایضاً،ص54

61ایضاً،ص56

62:پریمی رومانی مرتبہ ''برج پریمی شخصیت اور فن''،ص13

63:''برج پریمی کی ادبی خدمات''از ڈاکٹر چمن لعل بھگت،ص34

64:''زمین پیاسی ہے''از لیش سروج،ص7

65:''جموں وکشمیر کے اردو مصنفین''از جان محمد آزاد،ص468

66:کشمیر میں اردو،از عبدالقادر سروری،ص205

67:ماہنامہ ''سنگم جموں'' شمارہ جنوری1964ء،ص59

68:افسانوی مجموعہ ''نثار میں تری گلیوں کے''از مدن موہن شرما،ص،67

69: کشمیر میں اردو''، از عبدالقادر سروری، ص208

70: افسانوی مجموعہ ''پونم کا چاند'' از خیراتی لال، ص76

71؛ ضلع ڈوڈہ کی ادبی شناخت، از ولی محمد اسیر کشتواڑی، ص،560

72؛ ایضاً، ص564،

73: ''جلوۂ صد رنگ'' از برج پریمی، ص۔19-218

74 بحوالہ: جموں کشمیر کے اردو مصنفین'' از جان محمد آزاد۔ ص،479

75 بحوالہ: ''جموں وکشمیر کے منتخب اردو افسانے'' (پریم ناتھ پردیسی سے ترنم ریاض تک) جلد اول، از سلیم سالک ص117

76: ایضاً، ص121

77: ''جموں کشمیر کے اردو افسانہ نگار'' از نور شاہ۔ ص،82

78: اخبار ''کشمیر عظمیٰ ''2، فروری2019۔

79؛ ضلع ڈوڈہ کی ادبی شناخت، از ولی محمد اسیر کشتواڑی، ص859۔

80: ایضاً، ص862۔

81: اخبار ''کشمیر عظمیٰ ''2، فروری2019۔

82؛ ضلع ڈوڈہ کی ادبی شناخت، از ولی محمد اسیر کشتواڑی، ص859۔

83؛ ایضاً، ص848

84؛ ایضاً، ص848

85؛ ایضاً، ص۔677

86: مجموعہ ''انحراف'' از آنند لہر، ص8۔

87: ایضاً، ص37

88: ''افسانوی مجموعہ ''بٹوارہ'' از آنند لہر، ص5

89: ایضاً، ص15

90: ایضاً، ص16

91: ایضاً، ص17-18

92: ایضاً، ص22

93: ایضاً، ص23

94: ایضاً، ص25

95: ایضاً، ص24

96: ایضاً، ص88

97: ایضاً، ص91

98: ایضاً، ص97

99: ''ایضاً، ص76

100: مجموعہ ''سرشٹا نے بھی یہی لکھا ہے'' از آنند لہر، ص11

101: ایضاً، ص129

102: رسالہ ''ہماری زبان'' ہفتہ وار، نئی دہلی۔ ص19، سن اشاعت، 1 جنوری، 2016۔

103: ، انحراف، از آنند لہر، ص3-4

104: جموں و کشمیر میں اردو افسانہ نمبر، رسالہ ''شیراز''، جموں، ص28

105: ''ضلع ڈوڈہ کی ادبی شناخت'' از ولی محمد اسیر کشتواڑی، ص942

106: ایضاً، ص898

107 بحوالہ: ’’حصار‘‘ از تمنا منشی، ص9

108: افسانوی مجموعہ ’’ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں‘‘ از خالد حسین، ص24

109: ایضاً، ص31

110: ایضاً، ص64

111: ایضاً، ص68

112: ’’تنقیدی فکر و فن‘‘ از مشتاق احمد وانی، ص124

113: مجموعہ ’’اشتہاروں والی حویلی‘‘ از خالد حسین، ص184

114: ایضاً، ص184

115: ایضاً، ص87

116: ایضاً، ص97

117: ایضاً، ص29

118: ’’جموں و کشمیر کے اردو مصنفین‘‘ از جان محمد آزاد، ص476

119: ’’لازوال‘‘ اخبار، مضمون، اوم پرکاش شاکر کا شعری رویہ‘‘ 29/ اکتوبر 2017

120: ’’کشمیر میں اردو‘‘ از عبدالقادر سروری، ص252

121: جموں کشمیر کے اردو مصنفین، از جان محمد آزاد، ص461

122 بحوالہ: ’’تنقیدی فکر و فن‘‘ از مشتاق احمد وانی، ص124

123: مجموعہ ’’ایک بوند زندگی‘‘ بلراج بخشی، ص24

124: ایضاً، ص40

125: ایضاً، ص75

126: ''ایضاً، ص78

127: ایضاً، ص12

128: ایضاً، ص98

129: ''تنقیدی فکر وفن'' از مشتاق احمد وانی، ص124

130: ''ایک بوند زندگی'' از بلراج بخشی، ص15

131: ''مجموعہ ''الاؤ'' از امین بنجارہ، ص۔18

132: ایضاً، ص102

133: ایضاً، ص106

134: ایضاً، ص30

135: ایضاً، ص148

136: ایضاً، ص15

137: ایضاً، ص18

138: ''جموں وکشمیر کے اردو مصنفین'' از جان محمد آزاد، ص483

139: ''تنقیدی فکر وفن'' از مشتاق احمد وانی، ص124

140: مجموعہ ''ہزاروں غم'' از مشتاق احمد وانی، ص20

141: ایضاً، ص26

142: ایضاً، ص47

143: ایضاً، ص53

144: مجموعہ ''میٹھا زہر'' از مشتاق احمد وانی، ص۔10،۔

145:ایضاً،ص178

146:ایضاً،ص101

147:مجموعہ’’اندر کی باتیں‘‘،ازمشتاق احمد وانی،ص196

148:’’قبر میں زندہ آدمی‘‘ازمشتاق احمد وانی،ص159

149:ایضاً،ص135

150:ایضاً،ص11

151:ایضاً،ص115

152:ایضاً،ص100

153:ایضاً،ص97

154:ایضاً،ص123

155:’’اندر کی باتیں‘‘،ازمشتاق احمد وانی،ص136

156:’’قبر میں زندہ آدمی‘‘ازمشتاق احمد وانی،ص30

157:’’خوابوں کے اس پار‘‘اززنفر کھوکھر،ص۔20

158:ایضاً،ص28

159:ایضاً،ص34

160:ایضاً،ص46

161:ایضاً،ص8

162:ایضاً،ص98

163:ایضاً،ص116

164:ایضاً،ص135

165:ایضاً،ص4

166:''تنقیدی فکروفن''از مشتاق احمد وانی،ص124

167:ایضاً،ص124

168:رسالہ''اعلیٰ تعلیم''،ص118

169:''کرشن چندر شخصیت اورفن''از بیگ احساس،ص40

170:''میری یادوں کے چنار''از کرشن چندر،ص11

171:''کرشن چند شخصیت اورفن''از جگدیش چندرودھاوں،ص634

172:جموں کشمیر کے اردو مصنفین''از جان محمد آزاد۔ص،440,

173:''قفس اداس ہے''از ٹھاکر پونچھی۔ص89۔

174:ایضاً،ص177

175:''جموں وکشمیر کے اردو مصنفین''از جان محمد آزاد،ص440

176:''تنقیدی فکروفن''از مشتاق احمد وانی،ص124

177''جموں وکشمیر کے اردو مصنفین''از جان محمد آزاد،ص،441

178:''جموں کشمیر میں اردوادب کی نشو ونما''از برج پریمی،ص،43

179:''رات اورزلف'' ازکرن کاشمیری،ص۔78

180:''جموں وکشمیر کے اردو مصنفین''از جان محمد آزاد،ص475

181''کشمیر میں اردو''جلد3،ازپروفیسر عبدلقادر سرری،ص۔202

182:ایضاً،ص،202

(183.)Development of Urdu Languages and Literature in Jammu Region",prof.Zahur Ud Din, p426-27.

184: ''ایک ناؤ کاغذ کی'' از وجے سوری، ص154-55

185: ''اگلی عید سے پہلے'' از آنند لہر، ص،9

186: ایضاً، ص28-29

187: ایضاً، ص37

188: ''ایضاً، ص85

189: ایضاً، ص26

190: ایضاً، ص43-44

191: ''مجھ سے کہا ہوتا'' از آنند لہر، ص19-20

192: ایضاً، ص23

193: ایضاً، ص25

194: ایضاً، ص102

195: ایضاً، ص12-13

196: ''یہی سچ ہے'' از آنند لہر، ص22

197: ایضاً، ص5-6

198: ایضاً، ص10

199: افسانوی مجموعہ ''انحراف''، از آنند لہر، ص4

200: تنقیدی مباحث وتجزیے، از پروفیسر ظہور الدین، ص106

201: ''کشمیر میں اردو'' حصہ دوم، از عبدالقادر سروری، ص258

202: ''جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما'' ڈاکٹر برج پریمی، ص97

203: رسالہ ''ہمارا ادب''، شخصیات نمبر4، ص،205

204: ''جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما'' از ڈاکٹر برج پریمی، ص100

205: ''ناٹک ساگر''، از محمد عمر نور الہٰی، ص1

206: ایضاً، ص8

207: ایضاً، ص14

208: ایضاً، ص314

209: ''رنگمان'' از وجے سمن سوسن، ص87

210: ایضاً، ص8

211: ''کشمیر میں اردو''، از عبدالقادر سروری، ص255

212: ایضاً، ص256

213: ایضاً، ص258

214: ص257

215: جموں وکشمیر کے اردو مصنفین، از جان محمد آزاد، ص461

216: ''تنقیدی مباحث وتجزیے'' از پروفیسر ظہور الدین، ص148

217: کشمیر میں اردو، از عبدالقادر سروری، ص264

(218)Development of Urdu Language and Literature in Jammu Region, By prof. Zahur Ud Din, p.384

(219)Development of Urdu Languages and Literature in Jammu Region, 1985, By prof. Zahur Ud Din, p270.

(220)Development of Urdu Language and Literature in Jammu Region, By prof. Zahur Ud Din, p271.

(221)Development of Urdu Language and Literature in Jammu Region, By prof. By Zahur Ud Din, p271.

222:''جدید اردو ڈراما''از پروفیسر ظہور الدین،ص،10

223:ایضاً،ص330

224:''حقیقت نگاری اور اردو ڈراما''از پروفیسر ظہور الدین،ص10

225:''تنقیدی مباحث و تجریے''،از پروفیسر ظہور الدین،ص120

226:ایضاً،ص132

227:ایضاً،ص125

باب سوم

غیر افسانوی اصناف میں جموں کا حصہ

(صحافت، سفر نامہ، تحقیق وتنقید، مضمون، انشائیہ، خطوط اور ترجمہ نگاری)

جموں میں اردو صحافت:

ریاست جموں وکشمیر میں اردو صحافت کی ابتداء اس وقت ہوئی جب یہاں اردو زبان وادب کا ابتدائی دور تھا۔ چونکہ ریاست میں اردو زبان وادب کی ابتداء کے کافی عرصہ بعد ریاست کے صحافیوں کو اپنے اخبارات ورسائل کی اجازت ملی۔

ریاست جموں وکشمیر میں اردو زبان وادب کو فروغ دینے میں اخبارات ورسائل کا ایک اہم رول رہا ہے۔ ریاست میں پیدا ہونے والے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے ادیب وقتاً فوقتاً اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دلانے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتے رہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ریاست جموں وکشمیر کا سب سے پہلا چھاپہ خانہ 1858ء میں ''احمدی پریس'' کے نام سے تھا۔ اس پریس کے قائم کے برسوں بعد ''وکرم ولاس پریس'' کے نام سے ایک اور سرکاری پریس قائم کیا گیا۔ اس پریس کی وجہ سے اردو زبان وادب کو فروغ دینے میں بے پناہ سہولت حاصل ہوئی، چوں کہ اس وقت تک اس زمانے میں کوئی بھی اخبار منظر عام پر نہ آسکا تھا۔

ریاست جموں وکشمیر میں اردو صحافت کا آغاز اردو زبان کے ابتدا کے بہت بعد میں ہوا اس کی خاص وجہ یہ رہی کہ دوڑ گرہ حکومت کے دور میں کسی بھی صحافی کو اخبار نکالنے کی اجازت نہیں تھی، چوں کہ ڈوگرہ حکمران نہیں چاہتے تھے کہ ریاست میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے اس بات کا علم اخبارات کے ذریعے عام نہ ہو جائے وہ اپنی کمزوری خود جانتے تھے، کہ صحافی ریاست کے مسائل کو منظر عام پر لانے میں کوشش کر سکتا ہے، اس لیے انھوں نے کسی بھی صحافی کو اخبار نکالنے کی منظوری نہ دی۔ جس کی وجہ سے ریاست کے بہت سارے قلمکار بیرون ریاست میں جاکر اپنے اخبارات ورسائل نکالنے لگے۔ ان تمام اخبارات میں کہیں نہ کہیں ریاست کے مسائل کو بھی پیش کیا جاتا رہا۔ ان اخباروں میں خاص طور پر ''مراسلہ کشمیر'' جو لاہور سے 1872ء میں نکلنا شروع ہوا تھا اس کے علاوہ لاہور سے نکلنے والے اخبارات میں ''اخبار عام'' 1881ء ''خیر خواہ کشمیر'' 1882ء ''ہمدرد ہند'' 1894ء ''رسالہ کشمیر پرکاش'' 1898ء ''پنجۂ فولاد'' 1901ء ''کشمیر گزٹ'' 1901ء ''کشمیر میگزین'' 1901ء ''سفید'' 1914ء ''صبح کشمیر'' 1916ء ''بہار کشمیر'' 1916ء کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ ''کشمیر'' کے عنوان سے ایک اخبار امرتسر پنجاب سے 1924ء میں نکلنا شروع ہوا اور اسی طرح سے ''کشمیر درپن'' جوالہ آبار سے 1989ء میں منظر عام پر آیا تھا۔

ان اخبارات سے پہلے صحافیوں نے ریاست جموں وکشمیر میں اخبارات نکالنے کی بہت کوشش کیں تھیں مگر ساری کی ساری ناکامیاب رہیں۔ ریاست جموں وکشمیر کا پہلا اور باضابطہ اخبار ''بدیابلاس'' کے عنوان سے شائع کیا گیا جسے خود مہاراجہ رنبیر سنگھ نے 1867ء میں جاری کیا تھا۔ یہ اخبار دونوں زبانوں اردو اور ہندی میں شائع ہوتا تھا۔ ''بدیابلاس'' کل آٹھ صفحات پر مشتمل تھا اور یہ ہفت وار اخبار تھا جس میں حکومت کی پالیسیوں کو زیادہ تر پیش کیا جاتا تھا۔ پروفیسر ضیا الدین اپنی کتاب میں اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''صوبہ جموں میں 1867ء میں مہاراجہ رنبیر سنگھ نے اخبار ''بدیابلاس'' جاری کیا۔ دربار کے زیرسایہ پروان چڑھنے والا ہفت روزہ اخبار آٹھ صفحات پر مشتمل ہوا کرتا تھا۔ یہ اخبار ادبی سرگرمیوں اور حکومت کی پالیسیوں سے زیادہ تعلق رکھتا تھا''۔(1)

اس سے پہلے ریاست کے مشہور قلمکار سالگ رام سالک نے اخبارات جاری کرنے کی کوشش کیں تھیں مگر کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ اس کے بعد وہ مجبور ہوکر لاہور چلے گئے جہاں سے انھوں نے اپنا ہفت روزہ ''خیرخواہ کشمیر'' کے نام سے جاری کیا۔ سالگ رام سالک کے بھائی ہرگوپال خستہ بھی اپنے زمانے کے بڑے ادیب تھے۔ انھوں نے قیام لاہور میں ''راوی ریفارمر''، ''خیرخواہ کشمیر''، ''دیس کی پکار'' وغیرہ جیسے کئی پرچوں میں اہم رول ادا کیا تھا ریاست کے صحافیوں میں ان کا بھی ایک اہم نام ہے۔ عبدالقادر سروری صاحب لکھتے ہیں کہ:

''چنانچہ پنڈت ہرگوپال خستہ او رپنڈت سالگرام کے حالات میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جب وہ مہاراجہ رنبیر سنگھ سے ناراض ہوگئے تو لاہور سے اخبار نکال کر ان کی ذات اور ان کے نظم ونسق پر تنقید کرنے لگے''۔(2)

محمد الدین فوق علامہ اقبال کی تحریک سے بے حد متاثر تھے۔ علامہ محمد اقبال کی تحریک سے متاثر ہوکر محمد الدین فوق نے رسالہ ''طریقت'' اور ماہنامہ ''نظام'' جاری کیا، تاکہ تصوف کی خدمت کی جاسکے۔ فوق کی تصانیف کی بات کی جائے تو انھوں نے مختلف کتابیں تحریر کیں تھیں۔ تقریباً 95 سے زائد ان کی تصانیف ہیں۔ مگر ان میں آج کچھ ہی دستیاب ہوسکتی ہیں۔ تاریخ میں ان کی سب سے زیادہ تصانیف ہیں۔ ان میں خاص طور پر تاریخ کشمیر مکمل 3 جلد میں، رہنمائے کشمیر، تاریخ اقوام کشمیر 3 جلد، تاریخ اقوام پونچھ، مشاہیر کشمیر، خواتین کشمیر، کشمیر کی رانیاں، شباب کشمیر، حکایات کشمیر، کشمیری زمیندار، تاریخ بڈشاہی (سلطان زین العابدین کی سوانح اور حالات پر مبنی ہے) روایات اسلام، تاریخ حریت

اسلام، تاریخ سیالکوٹ وسونحات، علامہ عبدالعلیم سیالکوٹی، تذکرہ الصالعین، ماثر لاہور، اخبار نویسوں کی حالات، تذکرہ علماوالمشائغ، لاہور عہد مغلیہ میں، تاریخ کا روشن پہلو وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ان مذکورہ بالا تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد الدین فوق ریاست جموں وکشمیر کی عوام اور خاص طور پر کشمیری عوام کی رہنمائی میں ہر وقت پیش پیش رہے تھے۔ اگر چہ فوق صاحب نے لاہور میں زیادہ وقت گزارا تھا مگر جموں وکشمیر کی عوام کی عکاسی ان کی اکثر تخلیقات چاہے وہ افسانہ، ناول، اخبار ہو یا دوسری کوئی تحریر ہر کسی میں کشمیریوں کی عکاسی ملتی ہے۔

محمد الدین فوق جموں وکشمیر کے مشہور صحافی رہ چکے ہیں۔ انھوں نے بھی اپنے زمانے میں بہت کوشش کی کہ ریاست سے کوئی اخبار جاری کریں مگر ان کی بھی ساری کوشش بے کار ہوگئی۔ حالاں کہ جب محمد الدین فوق نے مہاراجہ پرتاپ سنگھ کو عرضداشت پیش کی تھی۔ اس میں لکھا تھا کہ ریاست سے نکالے جانے والے اخبارات میں کسی بھی طرح کا سیاسی یا ملکی معاملات کا واسطہ نہ ہوگا اور ڈوگرہ حکمران کے خلاف کچھ بھی لکھا نہیں جائے گا مگر اس کے باوجود محمد الدین فوق کی عرضی رد ہوگئی۔ اس حوالے سے برج پریمی صاحب اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''انھوں نے (محمد الدین فوق) علاوہ دوسری باتوں کے اس میں لکھا تھا کہ اس اخبار کو سیاسی اور ملکی معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہوگا اور ان کے بارے میں کبھی کچھ نہیں لکھا جائے گا لیکن مہاراجہ نے اپنے 10/ جون 1907ء کے مراسلہ کے ذریعہ فوق کی یہ درخواست رد کرتے ہوئے احکام صادر کیے تھے کہ موجودہ وقت میں اس اخبار کو کشمیر سے شائع کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی''۔(3)

اس کے بعد محمد الدین فوق مجبوراً لاہور چلے گئے جہاں سے انھوں نے متعدد اخبارات جاری کیے اور اس کے کئی عرصہ بعد جب مہاراجہ ہری سنگھ کے دور میں اجازت ملی تو انھوں نے 1933ء میں اپنا اخبار ''کشمیر جدید'' کے عنوان سے جاری کیا۔ مگر یہ صرف دو سال تک ہی محدود رہا اس کے بعد یہ بند کر دیا گیا۔

وادی کشمیر سے زیادہ جموں میں پرسکون ماحول تھا، ڈوگرہ حکومت کی نمائندگی کرنے والوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس لیے 1912ء کے دوران دو اخبارات ''مہاجن سبھا'' اور ''ڈوگرہ سدھار سبھا'' سرکار کی رضامندی اور ان کی حمایت میں جموں خطے سے شائع ہونے لگے۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دور حکومت میں 1924ء میں پہلی بار ریاست کے مشہور صحافی لالہ ملک راج صراف کو کامیابی حاصل ہوئی اور انھیں ریاست سے پہلی بار اپنا اخبار جاری کرنے کا حکم ملا۔ جس کو انھوں نے ''رنبیر'' کے نام سے شائع کیا۔ یہ اخبار پہلی بار ہفتہ روزہ کی صورت میں شائع کیا گیا تھا۔ اس اخبار کو جاری کرنے کے لیے مہاراجہ رنبیر سنگھ نے یہ شرط رکھی تھی کہ اس اخبار کا مقصد صرف یہ ہوگا کہ ریاست میں عوام کو یہ دکھایا جائے کہ ایک عام شہری کس طرح سے اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہے۔ اس حوالے سے ''رنبیر'' اخبار کا پہلا شمار 24/جون 1924ء کو شائع ہوا۔ اور یہ اخبار 1950ء تک برقرار جاری رہا۔ اس اخبار نے ایک انقلابی رول بھی ادا کیا ہے۔ کیوں کہ اس اخبار میں کبھی کبھی بڑی آسانی سے حکومت پر تنقید کر دی جاتی تھی۔ بقول حبیب کیفوی:

> ''ہفت روزہ رنبیر کی پالیس حکومت نواز تھی البتہ حکومت پر کبھی کبھی بڑی نرمی سے تنقید کر دیا کرتا تھا۔ صحیح معنوں میں یہ ہندو مفاد کا ترجمان تھا۔ صحافت کا معیار بھی کچھ اونچا نہ تھا لیکن جب مسلمان میدان صحافت میں اترے تو انھوں نے صحافت کے معیار کو بلند کرنے کی کوشش کی''۔(4)

''رنبیر'' اخبار کا مقصد یہ بھی تھا کہ ریاست جموں وکشمیر کی عوام اور برطانوی حکومت اور دوسری ریاستوں کے درمیان اچھے تعلقات ہوں۔ جس سے ریاست میں ترقی وترویج کی نئی نئی راہیں ہموار ہوسکیں۔ ''رنبیر'' اخبار کے کئی سال بعد ''پاسبان'' کا نام بھی اہم ہے یہ اخبار معراج الدین کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ یہ ''رنبیر'' اخبار کے مقابلے میں ایک طرح سے مقابل میں تھا چونکہ اس اخبار میں مسلمانوں کے حقوق کو پیش کیا جاتا تھا۔ مگر یہ زیادہ دن تک نہ چل سکا۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے اپنے دور حکومت میں عوام الناس کو کافی حد تک اپنی حمایت میں کر لیا تھا اور عوام میں کافی اچھی طرح سے اپنے تعلقات بنا لیے تھے۔ مگر یہ بھی زیادہ دیر تک عوام کا دل نہ جیت پائے جس سے ریاست بھر میں روز بروز استحصال وتشدد بڑھنے لگا۔ لہٰذا 1931ء میں مڈلٹسن کمیشن کی رپورٹ میں یہ دکھایا گیا تھا کہ ریاست بھر میں عوام کی ایک بڑی بے چینی کی وجہ یہ ہے کہ انھیں اپنی ہی ریاست میں اخبارات شائع کرنے کی اجازت نہیں ہے لہٰذا پریس ایکٹ میں پھر سے ترمیم ہوئی اور 1932ء سے باضابطہ طور پر اخبارات کی اشاعت کی منظوری دے دی گئی اور تقسیم وطن تک ریاست میں اخبارات کی تعداد لگ بھگ 50 تک پہنچ گئی تھی۔

ریاست جموں وکشمیر میں اردو صحافت کے بارے میں پروفیسر عبدالقادر سروری صاحب لکھتے ہیں:

''اخبارات کی اشاعت کے لحاظ سے سے تعداد کی حد تک شاید ہی کوئی اور ریاست جموں و کشمیر کا مقابلہ کر سکتی ہے۔اس صدی کے ربع اول سے جب سے اخبارات کی اشاعت کی اجازت ملی''۔(5)

جموں میں مالک راج صراف نے اپنے اخبار کے ساتھ ساتھ ایک پریس بھی قائم کیا تھا اور اس کے بعد انھوں نے جموں سے ہی 1924ء میں بچوں کی حمایت کے لیے رسالہ ''رتن'' کو منظر عام پر لایا۔ یہ رسالہ اپنی نوعیت کا پہلا رسالہ تھا۔اس دور میں صحافیوں کے حوالے سے جموں میں ملک راج صراف اور کشمیر میں پریم ناتھ بزاز نا کا نام قابل ذکر تھا۔

لالہ ملک راج صراف:

لالہ ملک راج صراف کی پیدائش 8/اپریل 1894ء کو جموں کے علاقہ سانبہ میں ہوئی تھی۔ ابتدائی تعلیم بھی انھوں نے سانبہ سے حاصل کی اور اس کے بعد وہ مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے پرنس آف ویلز کالج جموں گئے اور پھر لا کالج لاہور میں انھوں نے اپنی اعلیٰ تعلیم مکمل کی۔جموں میں صحافت کے حوالے سے لالہ ملک راج صراف کا بڑا نام ہے ۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ جموں کے پہلے صحافی ملک راج صراف کو ہی کہا جاتا ہے۔اسی لیے انہیں جموں وکشمیر کے باوائے آدم بھی کہا گیا ہے۔

ملک راج صراف سے پہلے جموں میں ڈوگرہ حکومت کے دوران بہت سارے قلمکاروں نے اخبارات و رسائل جاری کرنے کی کوشش کیں مگر کوئی بھی کامیاب نہ ہوسکا۔ان میں خاص طور پر منشی محمد الدین فوق، پنڈت ہرگوپال خستہ اور سالگ رام سالک وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔اس دور میں مہاراجہ رنبیر سنگھ نے اپنا ایک اخبار ''بدیا بلاس'' کے عنوان سے جاری کیا جسے ریاست میں صحافت کے حوالے سے اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ یہ اخبار مہاراجہ نے 1882ء میں جاری کیا تھا۔اس کی ایک خاص خوبی یہ تھی کہ یہ اخبار صرف سرکاری کاروبار تک ہی محدود تھا۔عوام الناس کے مسائل کو اس میں بالکل بھی ضبط تحریر میں نہیں لایا نہیں جاتا تھا۔

جموں میں ڈوگرہ حکومت کے دوران سب سے پہلے لالہ ملک راج صراف کو اخبار نکالنے کی اجازت ملی تھی۔اور انھوں نے اپنا پہلا اخبار 1924ء میں ''رنبیر'' کے عنوان سے شائع کیا تھا۔اس بات میں کوئی دورائے نہیں تھی کہ اس اخبار میں شروع شروع میں ڈوگرہ حکومت کے مفادات کی ترجمانی کی جاتی تھی، مگر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ''رنبیر''

اخبار سے ہی ریاست کے لوگوں کی ہمت افزائی ہوئی ''رنبیر'' اخبار کا سب سے پہلا شمارہ 24/جون 1924ء کو جموں سے شائع کیا گیا تھا۔

ملک راج صراف بنیادی طور پر ایک مشہور صحافی تھے مگر اردو ادب کی دیگر اصناف ادب میں بھی انھوں نے طبع آزمائی کی تھی۔ اردو زبان کے علاوہ انہیں انگریزی میں بھی کافی مہارت حاصل تھی۔ صحافت کے میدان میں انہیں زیادہ دلچسپی تھی اس لیے انھوں نے اپنی تعلیم کے فوراً بعد صحافت میں اپنے جوہر دکھائے۔ ڈاکٹر برج پریمی ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''صحافت لالہ صاحب کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی''۔(6)

لالہ ملک راج صراف جموں میں اردو صحافت کے لیے ایک مسیحا بن کے آئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں ریاست کا ''باوائے صحافت جموں وکشمیر'' کہا جاتا ہے۔ اس حوالے سے راما نند ساگر لکھتے ہیں:

''لالہ ملک راج صراف کے قلم کو سچائی بیان کرنے میں نہ ہی لرزہ طاری ہوا اور نہ ہی حق گوئی کی راہ سے انھوں نے انحراف کیا''۔(7)

لالہ ملک راج صراف نے نہ صرف صحافت میں منفرد مقام حاصل کیا بلکہ وہ انسان دوستی، دور اندیشی اور ہمدردانہ طور پر صحافت کے میدان میں نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔ وہ اپنی زندگی کے تقریباً 60 سال سے زیادہ صحافت سے جڑے رہے۔ اس کے ساتھ وہ ''آل انڈیا ورکنگ جرنلسٹ فیڈریشن'' کے اسٹیٹ یونٹ کے صدر بھی رہے تھے۔ اس کے علاوہ وہ کئی اخبارات کے ساتھ بھی وابستہ رہے۔ جن میں دی ہندو، ہندوستان ٹائمس، ٹریبیون، بمبئی کرانیکل وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

لالہ ملک راج صراف ہندوستان وفد کے ممبر بھی رہ چکے ہیں۔ جو ایک بہت بڑے اعزاز کی حیثیت رکھتا ہے۔ صحافت کے ساتھ وابستہ لالہ ملک راج صراف نے کئی ممالک کے دورے بھی کیے جن میں فرانس، سویت یونین، چین، کوریا، ہانگ کانگ، پاکستان وغیرہ شامل ہیں۔

لالہ ملک راج صراف کو اگر صحافی کے طور پر پرکھا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس میدان میں جیسے روزگار کا ذریعہ یا کاروبار یا پھر معاشی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے نہیں آئے تھے۔ بلکہ وہ ایک انقلابی مشن اور عوام کی فلاح و بہبود کے لیے اپنے عوامی جذبے اور ریاست میں اخبار کی شروعات کے لئے آگے آئے تھے۔ اور اس کام میں وہ کافی حد

تک کامیاب بھی رہے۔ جب ہم ان کی خودنوشت ’’Fifty years as a journalist‘‘ کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ریاست جموں وکشمیر میں صحافت کی آزادی کے لیے بے پناہ کوشش کی۔اور کئی مشکلات کا بھی سامنا کرتے رہے۔اسی کے ساتھ ساتھ وہ ریاست جموں وکشمیر کی عوام کے مسائل کو پیش کرنے میں بھی اہم ثابت ہوئے۔ان کا پہلا اخبار ’’رنبیر‘‘ بھی سماجی مسائل کے لیے شروع کیا گیا تھا۔اس اخبار میں جو موضوعات پیش کیے جاتے تھے ان میں خاص طور پر۔

1. جبری مشقت کے نظام کا خاتمہ ہو جو وحشی دور کی یاد دلاتا تھا۔
2. بدعنوانی کا خاتمہ ہو جو متعدد غریب اور عمدہ خاندانوں کو تباہ کر رہا تھا۔
3. ریاست کے لوگوں بالخصوص پہاڑیوں میں دہشت گردی کے ارتکاب کے خاتمے۔
4. دیہاتی مفروضیت کو ختم کرنا وغیرہ اہمیت کے حامل تھے۔

لالہ ملک راج صراف کی اہم کتابوں میں خاص طور پر ’’جموں وکشمیر انسائیکلوپیڈیا، کشمیر ائیر بک، انسانیت ابھی زندہ ہے، میری پاکستان یاترا، اور ہنس راج کی سوانح عمری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔لالہ ملک راج صراف کو بہت سارے انعامات واعزازات سے بھی نوازا جا چکا ہے۔اس کے علاوہ ان کی عوامی خدمات پر انھیں 1976ء میں ’’پدم شری‘‘ اعزاز سے بھی سرفراز کیا گیا۔

صحافت کے حوالے سے ملک راج صراف کا ایک اور اہم کارنامہ ہے کہ انھوں نے بچوں کے لیے رسالہ ’’رتن‘‘ 1934ء میں شروع کیا تھا۔ یہ رسالہ شمالی ہندوستان میں بچوں کا سب سے زیادہ کثیر الاشاعت پرچہ تھا۔’’رنبیر‘‘ اور ’’رتن‘‘ میں نہ صرف ریاست کے قلمکار اپنی تحریروں کو شائع کرتے تھے بلکہ ملکی سطح پر ان اخباروں میں قلمکاروں کی تخلیقات کو شامل کیا جاتا تھا۔اس حوالے سے ڈاکٹر برج پریمی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

> ’’رنبیر‘‘ اور ’’رتن‘‘ میں نہ صرف یہ کہ پورے ملک کے مشاہیر اہل قلم معاونت کرتے تھے بلکہ نئے لکھنے والے بھی شریک اشاعت ہوتے تھے۔رنبیر کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے کشمیر اور جموں میں بہت سے ایسے نثر نگار اور شاعر پیدا کیے جو بعد میں ملکی شہرت کے مالک بن گئے‘‘۔(8)

یہ بات قابل ذکر ہے کہ لالہ ملک راج صراف کی کوششوں سے ہی ریاست کے صحافیوں کی ہمت افزائی ہوئی

تھی۔اور انہی کی بدولت ریاست جموں وکشمیر میں آل جموں وکشمیر جرنلسٹ ایسوسی ایشن کا اجرا بھی ہوا تھا۔لالہ ملک راج صراف کے بارے میں اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ وہ سیاسی تنظیموں کے ساتھ نہیں بلکہ سماجی تنظیموں کے ساتھ ہر وقت پیش پیش رہے تھے۔

''رتن'' اخبار اگر چہ بچوں کی دلچسپ اور ہر دلعزیز کہانیوں کے لیے مخصوص تھا مگر اس میں بہت سارے ایسے مسائل بھی تھے جس کو کہانیوں کے ذریعے اشاروں اور کنایوں میں پیش کیا جاتا تھا۔اس حوالے سے ''رتن'' کے ایڈیٹر نے ایک جگہ لکھا ہے:

> ''ان کہانیوں کے متعلق خاص بات یہ ہے کہ کہانی مختلف ملک سے لی گئی ہے۔ان کہانیوں کے چناؤ میں یہ کوشش بھی کی گئی ہے کہ صرف ایسی کہانیاں لی جائیں جو دلچسپ ہوں،مزہ دار بھی اور ہر دل عزیز بھی''۔(9)

''رنبیر'' اخبار کے بعد جموں میں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل اخبار ''چاند'' ہے۔یہ اخبار جموں کے مشہور صحافی نرسنگھ داس نرگس کی صدارت میں 1937ء میں نکلتا تھا۔اس اخبار کی ایک خوبی یہ تھی کہ یہ ایک آزاد خیال کا اخبار تھا ۔جموں میں صحافت کو فروغ دینے میں اخبار ''چاند'' نے اہم رول ادا کیا ہے۔اس میں عوام الناس کے بارے میں مختلف مسائل کو پیش کیا جاتا تھا۔اس کے علاوہ جموں خطے سے 1924 سے 1960،تک کے آس پاس نکلنے والے اخباروں میں خاص طور پر ''رنبیر''،''امر''،'' سویرا''،''وطن''، ''پاسبان''،''سنگم''، چاند''،''حقیقت''،''سدرشن''،''رفتار''،'' خورشید''،''پربھات''،''المجاہد'' وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔یہ متذکرہ بالا تمام اخبارات عوام الناس کی ترجمانی کرتے تھے اور حکومت کی سچی تصویر کو منظر عام پر لانے کی کوشش کرتے تھے،جس میں حکومت کا عوام پر ظلم وتشدد صاف طور پر دیکھا جاسکتا تھا۔

جموں خطے میں جن صحافیوں نے اس میں اہم رول ادا کیا تھا ان میں نرسنگھ داس نرگس، ہرگوپا خستہ، سالگ رام سالک، دیا کرشن گردش، اللہ رکھا ساغر، موہن یاور، وجے سوری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ان صحافیوں نے نہ صرف صحافت کے میدان میں اہم رول ادا کیا تھا بلکہ اردو ادب کی دیگر اصناف میں بھی اہم کردار نبھایا ہے۔

نرسنگھ داس نرگس:

ان کا اصل نام دیوان نرسنگھ داس نرگسؔ تھا۔والد کا نام دیوان بیلی رام تھا۔نرگس کی پیدائش 10/نومبر 1902ء

میں گونتال گرامہ ضلع ہوشیار پور میں ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم مکتب میں حاصل کی تھی۔ انھوں نے بہت ساری زبانوں کا درس حاصل کیا جس میں ڈوگری، فارسی اور اردو زیادہ اہم تھیں۔

نرسنگھ داس نے عوامی اصلاح اور بیداری کے لیے ''چاند'' اور ''پریم'' کے نام سے مشہور اخباروں اور رسائل کو منظر عام پر لانے کی جرت بخشی تھی۔ انھوں نے اردو فکشن کے لیے اپنے اصلی نام کے بجائے دیگر ناموں سے اپنی تخلیقات کو پیش کیا۔ 1967ء میں ''تاریخ ڈوگرہ دیس'' (جموں و کشمیر) مکمل کر کے اس خواب کو تعبیر کی منزل تک پہنچایا۔ نرگس نے جموں خطے میں اپنی دوسری اور مشہور تصنیف بعنوان ''کشمیر کا اتہاس'' ہے اس کتاب کو ان کے بڑے بھائی اقبال نرگس نے ان کی وفات کے بعد شائع کیا تھا۔ پروفیسر ظہور الدین نرسنگھ داس نرگس کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "Narsingh Dass Nargis was also a historian of repute. As he himself mentions: Firdoursi", "Shahnma", which he read during his educational career, infused in his a desire to write a shahnama of Dogra Kings. The flame of this desire continued burning in him till in 1956, he started the work and completed it in 1967 in the form of Tarikh-e-Jadid Dogra Des. Narsing Dass Nargis also earned fame as a Journalist of great caliber. He wrote undauntedly about the social, political and cultural life of the people in the State, which sometimes caused lot of inconvenience"(10)

جموں کے نامور صحافی اور بلند پایہ ادیب دیا کرشن گردش، چیف ایڈیٹر روز نامہ اخبار ''ہند سماچار'' اپنے ایک مضمون میں نرگس صاحب کے مزاج کا کچھ یوں ذکر کرتے ہیں:

> ''عروس صحافت کے جذبہ خود سپردگی کو چھپاتی طلب، قد درمیانہ اور سڈول تمکنت آمیز نقوش، نیم گندمی رنگ، بیضوی چہرہ روشن اور چوڑی پیشانی، نگاہ میں عقاب کی تیزی، حکمرانی

کے غرواسی ابھری ہوئی ٹھوڈی، داڑھی مونچھوں پر کرزن کا سایہ، آواز کرخت نہ شرین، لباس
کے معاملے میں اکھنڈ بھارت، نیپالی نمونہ کی ٹوپی لکھنوی اچکن، پنجابی کرتا، مدراسی دھوتی،
گجراتی جاکیٹ اوران تمام میں الجھے الجھے ڈوگرہ انداز''۔(11)

اس متذکرہ بالا اقتباس کی قلمی تصویر سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں ایک طرف نرسنگھ داس کے مزاج اور شخصیت کے خدوخال یا سراپا کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے وہاں دوسری طرف ان کی صلاحیت کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ جس کا ذکر راقم نے پچھلے چند صفحات میں کیا ہے وہ ایک اعلیٰ ظرف اور سنجیدہ قسم کے ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے اور اخلاقی انسان بھی تھے۔ وہ نہ صرف روشن ضمیر، دوراندیش اور ملنسار انسان تھے بلکہ اپنی سنجیدہ زندگی گزارنے والے خوش طبع اور حلیم مزاج بھی تھے۔ ان کی تخلیقات سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے ادبی فن پاروں کی پاکیزگی پر ان کے بلند ذاتی کردار کی چھاپ نمایاں نظر آتی ہے۔ تاریخ ڈوگرہ دیس کو مرتب کرنا ان کا سب سے بڑا اور اہم کارنامہ تھا۔ کیونکہ اس میں انھوں نے ہزاروں سال قبل کے واقعات کو جوڑ کر اس کتاب میں پیش کیا جو کہ بہت مشکل ترین کام تھا، مگر اس کے باوجود نرگس نے اس کتاب کو لکھنے میں کامیابی حاصل کی۔ اس کتاب کی شروعات انھوں نے یکم جنوری 1956ء میں کی اور 15رجنوری 1967ء کو پورے گیارہ سال کے عرصہ میں اس کو مکمل کیا۔ نرسنگھ داس نرگس 17رنومبر 1973ء بروز سنیچر صبح ساڑھے نو بجے اپنی رہائش گاہ چاندنگر جموں میں 62 سال کی عمر میں ہمیشہ کے لیے ابدی نیند سو گئے۔

پنڈت دیا کرشن گردش:

پنڈت دیا کرشن، نام اور تخلص گردش تھا۔ ان کی پیدائش 1902ء کے آس پاس جموں میں ہوئی۔ انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم جموں میں ہی حاصل کی تھی۔ اس کے بعد انھوں نے کئی عرصہ تک ''دھرم ارتھ ٹرسٹ جموں'' میں گزارا تھا۔ ان کو بچپن سے ہی صحافت سے بہت لگاؤ تھا۔ پنڈت دیا کرشن گردش نے کئی عرصہ تک ایڈیٹر کی حیثیت سے ہفتہ وار اخبارات ''ڈوگرہ گزٹ'' اور ''انکشاف'' میں اپنی خدمات انجام دی۔ اس دوران دیا کشن گردش نے اردو صحافت کے حوالے سے بہت سے اہم کارنامے انجام دیے۔ جموں خطے میں انھوں نے تقریباً 1947ء تک صحافت کے میدان میں کام کیا۔ تقسیم وطن کے بعد وہ جموں سے جالندھر منتقل ہو گئے۔ جالندھر آئے تو یہاں سب سے پہلے انھیں ''ہند سماچار'' کا چیف ایڈیٹر بنایا گیا۔ اس کے بعد ان کو ''پردیپ'' کا چیف ایڈیٹر بنایا گیا۔

پنڈت دیا کرشن گردش نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا تھا۔ انھیں صحافت کے ساتھ ساتھ شاعری کرنے کا شوق بھی بچپن سے ہی تھا۔ اس کے بعد انھوں نے کئی غزلیں پنجاب اخبار میں شائع کیں۔ خطہ جموں میں ایک شاعر کی حیثیت سے بھی ان کا شمار کیا جاتا ہے۔ گلزار احمد فدا جموں کے مشہور اخبار ''پریم'' کے ایڈیٹر تھے، انھوں نے اپنے مضامین میں پنڈت دیا کرشن گردش کا ذکر کیا ہے۔ فدا نے اپنے ایک مضمون ''ریاستی فنکار'' کے عنوان سے تحریر کرتے ہوئے دیا کشن گردش کے کارناموں پر بھی ایک سرسری نظر ڈالی تھی۔ اس کا حوالہ دیتے ہوئے پروفیسر ظہور الدین نے اپنی انگریزی میں تحریر کردہ کتاب میں لکھا ہے:

> "He (Gardish) is an outstanding writer, well known critic and good poet of the state. When he ducts his poetry and prose with the ornaments of similes, metaphors and images, it appears as if his thought is reminiscent of Galib's period. His artistry lies in the fact that he projects both the dark and bright aspects of a picture with elegance and clarity. His composes very little poetry but the fact is that whatever he creates it is good and impressive. Since he belongs his writings are impregnated with the problems of life".(12)

جموں میں صحافت کے حوالے سے ان کا ایک منفرد مقام ہے۔

بی۔ڈی۔مل شرما:

1906ء کے آس پاس جموں میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم اور پرورش کے بارے میں مواد نہیں ملتا، مگر کچھ تصانیف میں ان کا سرسری طور پر ذکر ملتا ہے۔ بی ڈی مل شرما جموں صوبہ کے مشہور اخبار ''پریم'' میں ان کا نام سرفہرست تھا۔ انھوں نے اپنے ابتدائی دور کی شروعات چھوٹے چھوٹے مضمون سے کی۔ مگر بعد میں وہ مضمون نگاری میں اتنا مشہور ہوئے کہ جگہ جگہ ان کے چرچے ہونے لگے۔ انھوں نے کئی مضامین، اخبار ''پریم'' میں چھپوائے تھے۔

وہ کئی عرصہ تک محکمہ تعلیم سے وابستہ رہے، پھر اس کے بعد ان کو گونمنٹ کی طرف سے پرنسپل بھی بنایا گیا۔ پروفیسر ظہورالدین نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

"As a writer of Urdu he started writing quite at an early age and contributed a number of literary articles to the Pream Jammu".(13)

موہن یاور:

موہن یاور نے اردو فکشن کے ساتھ ساتھ صحافت میں بھی طبع آزمائی کی تھی۔ انھوں نے 1958ء سے 1968ء تک روزنامہ ''سندیش''، جموں میں چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ اس دوران انھوں نے روزنامہ ''سندیش'' میں اپنے بل بوتے پر اچھے اچھے مضامین شائع کروائے جس کی وجہ سے اس روزنامہ کی حیثیت اور زیادہ بڑھ گئی۔ 1968ء کے بعد انھوں نے خود کا ایک ہفتہ وار اخبار ''رفتار'' کے عنوان سے جاری کیا۔ شروع میں اس کو ہفتہ وار رکھا مگر جیسے جیسے اس کی مقبولیت بڑھتی گئی اس کو روزنامہ میں تبدیل کرلیا گیا۔ 1978ء کے بعد موہن یاور نے اسے ہفت روزہ سے روزنامہ میں منتقل کر دیا۔ موہن یاور کو صحافت کے میدان میں کافی لگاؤ تھا۔ اس لیے جب وہ ''سندیس'' کے چیف ایڈیٹر تھے اسی دوران انھوں نے جموں سے ایک ماہنامہ رسالہ ''سنگم'' کے عنوان سے جاری کیا تھا جس کو وہ دو سال تک وقتاً فوقتاً شائع کرتے رہے۔

نادم کوتالوی:

وہ بیک وقت ایک صحافی، فکشن نگار اور شاعر بھی تھے۔ ان کا اصل نام رگھوبیر چند گپتا اور تخلص نادم کوتالوی تھا۔ ان کی پیدائش 7/اکتوبر 1945ء کو کوٹلی آزاد کشمیر پاکستان میں ہوئی۔ تقسیم ملک کے بعد نادم کوتالوی کا خاندان بھی کوٹلی (آزاد کشمیر) سے جموں منتقل ہوا، اور اس کے بعد جموں کو ہی اپنا وطن بنالیا۔ نادم صاحب کی ابتدائی تعلیم بھی جموں میں ہوئی، انھوں نے کئی عرصہ تک پرینٹر پبلیشر کی حیثیت سے بھی کام کیا اس کے بعد انھیں ہفتہ وار اخبار ''ترجمان شہر'' کا ایڈیٹر بنادیا گیا تھا۔ جہاں انہیں کافی عرصہ تک اس اخبار میں کام کرنے کا موقع فراہم ہوا۔

نادم کوتالوی نے شاعری کے علاوہ فکشن میں بھی طبع آزمائی کی مگر صحافت میں انہیں زیادہ شہرت حاصل ہوئی تھی۔ اس وقت جموں صوبہ میں اردو ادب کو فروغ دینے میں ایک انجمن ''انجمن فروغ اردو'' کے عنوان سے اردو زبان کے

فروغ میں اہم کام ادا کر رہی تھی۔ اس انجمن میں ریاست کے کئی شعراء وادبا شامل تھے۔ نادم صاحب کو بھی اس انجمن میں شامل ہونے کا موقع ملا۔ انہوں نے ابتدا سے اس انجمن میں اپنی محنت اور کوششوں سے صحافت کے میدان میں اچھی خاصی پہچان بنائی تھی۔ اسی وجہ سے انہیں بعد میں ''انجمن فروغ اردو'' کا سیکریٹری منتخب کیا گیا۔ اس حوالے سے نادم صاحب کو کافی عرصے تک اس انجمن میں جڑے رہنے کا موقع ملا۔ نادم کوتالوی کو اردو زبان وادب کے علاوہ پہاڑی زبان پر بھی کافی لگاؤ تھا۔

گلزار احمد فدا:

جموں میں 1947ء سے قبل کے قلمکاروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ جنھوں نے اس صوبہ میں رہ کر اردو زبان و ادب کو فروغ دینے میں نمایاں رول ادا کیا۔ جموں کے مشہور اخبار ''پریم'' میں گلزار احمد فدا بحیثیت ایڈیٹر کافی عرصہ تک انہیں اپنے فرائض انجام دینے کا موقع ملا اور ساتھ ہی ساتھ کئی تنقیدی مضامین لکھنے اور انہیں اپنی زیر نگرانی میں شائع کرنے کا مواقع بھی فراہم ہوا۔ ان مضامین میں انھوں نے زیادہ تر ریاست کے فن کاروں کی تحریروں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی تھی۔ ان مضامین کا موضوع بھی ''ریاستی فنکار'' ہی تھا۔ جو بعد میں اخبار ''پریم'' میں جولائی 1945ء کو منظر عام پر آئے۔ اسی وجہ سے گلزار احمد فدا صاحب کو ریاست کے اکثر قلمکاروں سے ربط رہتا تھا۔ جن کی تخلیقات کو وہ اپنے مضامین کے ذریعے سے وقتاً فوقتاً شائع کرتے رہتے تھے۔ 1947ء کے بعد گلزار صاحب کو صوبہ جموں کی سرزمین راس نہ آئی جس کی وجہ سے تقسیم ملک کے فسادات کے بعد وہ جموں سے سیالکوٹ (پاکستان) چلے گئے اور آخر دم تک وہیں زندگی گزاری۔

سیالکوٹ میں بھی انھوں نے ہفتہ وار اخبار ''جہاد'' نکالنا شروع کیا جس کی پاکستان میں کافی پذیرائی ہوئی۔ اس اخبار میں کبھی کبھی ریاست جموں وکشمیر کے حالات کی منظر کشی بھی کی جاتی تھی۔ چونکہ جموں وکشمیر میں تقسیم ہند سے پہلے کے حالات سے گلزار احمد ندا کافی واقف تھے۔ اسی وجہ سے اس اخبار کے ایک کالم میں کبھی کبھی کشمیر کے لوگوں کی حمایت میں کچھ نہ کچھ ضرور تحریر کیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر گلزار احمد فدا کا ایک اقتباس، جو اخبار جہاد میں تحریر کیا گیا تھا:

> ''فرقان بٹالین نے مجاہدین کشمیر کے شانہ بشانہ ڈوگرہ فوجوں سے جنگ کی اور اسلامیان کشمیر کے اختیار کردہ موقف کو مضبوط بنایا''۔ (14)

ان کی وفات سیالکوٹ میں 20/ جون 1980ء کو ہوئی تھی۔

امین بنجارا:

امین بنجارا کا سب سے خاص اور ادبی میدان افسانہ نگاری کا تھا۔لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے صحافت کے پیشے سے ادبی دنیا میں قدم رکھا تھا۔اس حوالے سے انھیں کئی اخبارات میں کام کرنے کے موقعے فراہم ہوئے جس میں ''الجھنیں''، ''تسکین''، ''اجالا''، ''سندیش''، ''حق''، ''جواہر نگار'' اور ''ہند سماچار'' جیسے اخبارات میں انھوں نے مختلف موضوعات جیسے سیاسی، سماجی، ثقافتی، اقتصادی، مذہبی وادبی وغیرہ پر لکھتے تھے۔اس کے بعد ریاست جموں وکشمیر میں 1984ء میں اردو اور انگریزی کے مشہور اخبار ''Our Kashmir'' کے ایڈیٹر کے عہدے پر بھی فائز رہے۔شروع شروع میں امین بنجارا کو صحافت کے میدان میں خاصی دلچسپی تھی اس لیے وہ اپنی ملازمت کے دوران بھی کئی اخبارات ورسائل کے ساتھ وابستہ رہے۔

عشرت کاشمیری:

عشرت کاشمیری کو صحافت سے بھی کافی دلچسپی تھی۔انہوں نے ہفت روزہ ''چاند'' جموں میں ضلع ڈوڈہ کی اہم شخصیات پر بہت مزاحیہ انداز میں مضامین تحریر کیے تھے۔ ہفت روزہ ''چاند'' میں عرصہ دراز تک عشرت کاشمیری نے مزاحیہ مضامین کا سلسلہ جاری رکھا۔ان کے علاوہ دیگر ادیب بھی اس ہفت روزہ میں حصہ لیتے تھے۔اس اخبار کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس میں مختلف شخصیات کی خوبیوں اور خامیوں کو ہنسی مزاق میں ہی اجاگر کیا کرجاتا تھا۔یہ سلسلہ تقریباً 1962ء تک یوں ہی چلتا رہا اور اس دور میں جموں خطے سے تعلق رکھنے والے بہت سارے شعرا وادبا کی تخلیقات کو مزاحیہ طریقے سے تنقیدی جامعہ پہنایا گیا۔1967ء تک اس اخبار میں تقریباً چالیس شخصیات کے تذکرے منظر عام پر آچکے تھے جو بہت اہم کارنامہ تھا۔اس اخبار میں عشرت کاشمیری نے اپنے مضامین میں ذاتی نام کے بجائے ''ناظم بقلم خود'' کے نام کو استعمال کیا تھا۔اس کے بعد انہوں نے اپنے سارے مزاحیہ مضامین کو اکٹھا کر کے کتابی صورت میں ایک مسودہ برائے طباعت چاند پریس جموں کے حوالے کیا تھا۔کچھ ہی عرصہ کے بعد انہوں نے ان مضامین کی طباعت رد کردی۔

نشاط کشتواڑی اور عشرت کاشمیری دونوں نے ایک دور میں اردو ادب کی خدمات انجام دی ہیں۔عشرت ضلع ڈوڈہ میں اپنے دور کے ایک منجھے ہوئے صحافی تھے۔صحافت سے وہ بہت دلچسپی لیتے تھے۔ان کی صحافتی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے حکام وقت نے انہیں بی ڈی۔او کے عہدے سے اٹھا کر ماہنامہ ''دیہات سدھار'' کی ادارت سپرد کی تھی۔ جہاں

انہوں نے بہت ہی اہم کاموں کو زیر بحث لایا۔عشرت کاشمیری بیک وقت کئی اخبارات کی ادارت سمبھالتے تھے۔ وہ ''قومی آواز'' کے علاوہ ''سندیش''اور''سچ'' وغیرہ جیسے اخبارات کی ادارت کے فرائض انجام دیتے تھے۔

فن صحافت:

پروفیسر ظہورالدین کی اہم کتاب ہے۔ان کی یہ کتاب 2006ء میں دریا گنج دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب تقریباً146 صفحات پر محیط ہے۔اس کے اہم موضوعات میں خاص طور پر چھاپے خانے کی کہانی،خبر بندی،سرخیوں کے تقاضے،اداریے کی ترتیب وتشکیل،کالم نگاری،اخباری فیچر وغیرہ شامل ہیں۔ پروفیسر ظہورالدین نے یہ کتاب جموں یونی ورسٹی صر دشعبہ اردو کے دوران لکھی تھی۔ بقول ظہورالدین:

> ''2001ء میں جب جموں یونی ورسٹی نے شعبہ اردو کے تحت ایم۔اے اردو پروفیشنل کے عنوان سے ایم۔اے اردو کے بعد کے دوسالہ کورس کا آغاز کیا تو سب سے پہلی دقت جو سامنے آئی وہ اس نصابی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کتب کی فرہمی تھی۔''(15)

جموں خطے میں اخبارات کے ساتھ ساتھ بہت سارے رسائل بھی شائع ہوتے تھے ان میں ''پریم'' اور ''فردوس'' کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ ''پریم'' نرسنگھ داس نرگس کی صدارت میں شائع ہوتا تھا اور''فردوس'' قیس شیروانی اور کشمیری لعل ذاکر کی ادارت میں نکلتا تھا۔ان دونوں رسالوں میں ریاست بھر کے قلمکار اپنی تحقیقی وتنقیدی کاوشوں کو وقتاً فوقتاً منظر عام پر لایا کرتے تھے۔اس کے علاوہ اردو کے مشہور افسانہ نگار پریم چند اور ان کی بیوی شیورانی کی کہانیاں بھی اس رسالے''فردوس''میں شائع ہوا کرتی تھیں۔

رسالہ''پریم'' نرسنگھ داس نرگس کی ادارت میں نکلتا تھا جس کی مقبولیت ملک بھر میں تھی ۔اس رسالے سے ریاست کے بہت سارے شاعر اور انشاپرداز اپنی تخلیقی تحریروں کو منظر عام پر لاتے تھے۔جس سے ان کی تحریروں کو حوصلہ افزائی ہوتی تھی ،اور انھوں نے اپنے رسالوں سے اپنا مقام بنایا۔اس کے علاوہ جموں سے نکلنے والے رسالوں میں ''سویرا''اور''رتن'' بھی بہت اہمیت کے حامل ہیں۔''سویرا'' ویدراہی اور وید گپتا کی ادارت میں نکلتا تھا اور''رتن'' ملک راج صراف بچوں کے لیے نکالتے تھے۔ یہ تمام رسالے تقریباً1960 تک جاری رہے۔

رسالہ''گوجر دیس'' کو بھی جموں خطے میں کافی شہرت حاصل ہے۔ یہ رسالہ اقبال عظیم کی ادارت میں جموں سے 1965ء میں نکلنا شروع ہوا تھا۔ یہ ماہ نامہ رسالہ تھا جس میں ریاست کے گوجر طبقے کے ادباء وشعراء کی ادبی خدمات کے

بارے میں معلومات فراہم کی جاتی تھی۔جن میں خاص طور پر سروری کسانہ، ایڈیٹر’’قومی آواز‘‘ جموں، چودھری غلام احمد رضا، چودھری دیوان علی خان، میاں نظام الدین وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

’’استاذ‘‘ رسالہ ایک تعلیمی رسالہ تھا جو کشمیر ٹیچرس ایسوسی ایشن کا ترجمان تھا اور یہ پنڈت دینا ناتھ نادم کی صدارت میں 1956ء میں پہلی بار منظر عام پر آیا تھا۔اس رسالے میں لکھنے والوں میں گنگا دھر بھٹ دیہاتی، جگن ناتھ خیبری، جیالال پنڈتا، برج پریمی، موتی لال کول، غلام احمد ہمدانی، گلشن آرا ہمدانی وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

جموں خطے میں 1947ء کے بعد سے بہت سارے رسالے اور اخبارات منظر عام پر آتے رہے۔جن میں کئی قلمکار مختلف موضوعات پر اپنی تحریریں شائع کرواتے تھے۔جس میں ’’سویرا‘‘ کا نام قابل ذکر ہے۔یہ رسالہ ویدراہی کی صدارت میں نکلتا تھا۔اس طرح سے ’’سنگم‘‘ کے عنوان سے موہن یاور اور ’’نوری چھم‘‘ کے عنوان سے نند گوپال باوا اپنے رسالے شائع کرتے تھے۔

صحافت کے میدان میں موہن یاور نے روز نامہ ’’سندیس‘‘ جموں سے وابستہ رہ کر کافی عرصہ کام کیا۔اس کے علاوہ انہوں نے ادبی ماہنامہ ’’سنگم‘‘ میں بھی بہ حیثیت مدیر اپنی خدمات انجام دی۔’’سنگم‘‘ ماہنامہ ’’سندیش پبلی کیشنز‘‘ کا ہی ایک حصہ تھا اور موہن یاور سے پہلے اس کے مدیر اعلی سید نذیر حسین تھے۔یہ ادبی ماہنامہ جموں میں کافی اہمیت کا حامل تھا، اور اس میں ریاست بھر کے بڑے بڑے قلم کاروں کی تحریریں منظر عام پر آتی تھیں، اور کافی عرصہ تک یہ ادبی ماہنامہ جموں سے شائع ہوتا رہا تھا۔

1960ء کے آس پاس رسالہ ’’توی‘‘ جموں خطے کے گاندھی میموریل کے طلبا و طالبات کی رہنمائی کے لیے منظر عام پر آیا تھا یہ کالج کے رسالوں میں سب سے قدیم رسالہ ہے۔اسی طرح سے ’’آئینہ‘‘ رسالہ گورنمنٹ کالج پونچھ سے جاری ہوتا تھا یہ طلبا کی حوصلہ افزائی کے لیے تھا۔اور ان دونوں رسالوں میں ادیبوں و انشاء پردازوں کی تحریروں کو شائع کیا جاتا تھا۔’’آئینہ‘‘ رسالہ کالج کے اردو کے استاد کنول کشور ربانی کی نگرانی میں جاری ہوتا تھا۔

’’قومی آواز‘‘ جموں خطے کے بہترین اخباروں میں سے ایک تھا۔جس کے ایڈیٹر رگھوبیر سنگھ تھے اس اخبار میں خبروں اور تبصروں کے علاوہ ادبی مضامین اور نظمیں بھی وقتاً فوقتاً شائع ہوا کرتی تھیں۔’’اجالا‘‘ اخبار بھی جموں خطے کے قدیم اخباروں میں سے تھا۔جو لالہ امرناتھ کی ادارت میں ہفت روز کے طور پر شائع ہوتا تھا۔اور 1963ء میں اسے روزنامہ کی اہمیت دی گئی تھی۔لالہ امرناتھ کے بعد اس کی ادارت وجے سوری کو سونپ دی گئی۔اس کے علاوہ جموں خطے

سے نکلنے والے اخباروں میں ''سندیس'' کا بھی اہم رول رہا ہے۔ یہ نذیر احمد مینائی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔

''وکیل'' کے عنوان سے پنڈت شمبھو ناتھ وکیل اپنا اخبار جاری کرتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے اور مشہور افسانہ نگار پنڈت شنگر ناتھ کول نے اس کی صدارت سنبھالی تھی۔

جموں خطے سے ترقی پسند مصنفین کا پرچہ ''ادبیات'' بھی کافی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد جموں سے ''دھنک'' شائع ہوا۔ اس کے علاوہ کلچرل اکیڈمی سے نکلنے والے دو رسالے ''ہمارا ادب'' اور ''شیرازہ'' خاص طور پر اہمیت کے حامل ہیں۔ ان دونوں رسالوں میں ریاست کے بہت سارے قلمکار اپنی تخلیقی تحریروں کو منظر عام پر لاتے رہے۔

''کشمیر ٹرانسپورٹر'' 1963ء میں جموں سے شائع ہوتا تھا اور اس کے مدیر اجیت سنگھ تھے یہ ہفت روزہ ٹرانسپورٹ اور حمل و نقل کے کام میں مصروف لوگوں کے ترجمان کے لیے شائع کیا جاتا تھا۔ جس کا مقصد تھا کہ حمل و نقل کے مسائل کو اخبار کے ذریعے سے حکومت تک پہنچانے میں مدد مل سکے۔ ''محاذ'' کے نام سے بھی ہفتہ روزہ اخبار جموں سے شائع ہوتا تھا جو ہر بھجن سنگھ بالی کی ادارت میں نکلتا تھا۔ اس میں زیادہ تر ادبی خبریں اور ثقافتی امور پر تبصرے شائع ہوتے تھے۔

''رفتار'' کے عنوان سے نکلنے والا ہفت روزہ اخبار موہن یاور کی صدارت میں شائع ہوتا تھا یہ پہلی بار 1965ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں علمی اور ادبی مضامین اور خبروں کے ساتھ ساتھ تبصرے بھی شائع ہوتے تھے۔ اور کچھ مزاحیہ نگاروں کے لیے بھی اس اخبار میں ''قلم قتلے'' کے عنوان سے ایک کالم مقرر رہتا تھا۔

''آواز'' ہفتہ وار اخبار تھا جو اونکار سنگھ آوارہ کی ادارت میں جموں سے شائع ہوتا تھا۔ اسی کے ساتھ 1968ء میں ''گوجر'' ہفتہ وار اخبار چودھری نور الدین کٹاریہ کی ادارت میں نکلتا تھا۔ جس میں گوجر طبقے کے لوگوں کے مسائل کو منظر عام پر لایا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ جموں خطے سے دوسرے اخبارات میں ''عوامی روا'' کو امتیازی اہمیت حاصل ہے۔ اسی طرح سے بے تاب جے پوری کا مشہور اخبار ''فروغ وطن'' اور نند گوپال باوکا ''عوامی لہر'' بھی قابل ذکر ہیں۔ جنھوں نے جموں میں اردو ادب کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اس دور میں جموں سے دیگر اخبارات میں ''پیغام''، ''عوامی عدالت''، ''دیہاتی سماچار''، ''جدوجہد''، ''شیکسن'' اور البیاصن'' قابل ذکر ہیں۔ ان تمام متذکرہ بالا اخبارات میں ریاست جموں وکشمیر کے ادبا و شعرا کی تحریروں کے ساتھ ساتھ ریاست کے مسائل کو بھی منظر عام پر لایا جاتا تھا۔ یہ اخبارات اور رسائل 1965ء تک جموں سے نکلتے رہے۔

اسی طرح سے جموں یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے نکلنے والا مشہور رسالہ ''تسلسل'' کے عنوان سے کافی اہمیت کا حامل ہے جو پروفیسر ظہور الدین کی صدارت میں نکلنا شروع ہوا تھا اور ابھی بھی مسلسل شائع ہوتا رہتا ہے جس میں ریاست کے بہت سارے ادیب اور شاعر، اسکالر وغیرہ کی تخلیقات منظر عام پر آتی رہتی ہیں۔

جموں میں اردو سفر نامہ:

ریاست جموں وکشمیر میں سفر نامہ کی ابتداء تقریباً انیسویں صدی سے ہوتی ہے۔ جب انگریزوں کا دور دورہ تھا اور ان میں سے بہت سارے یورپی سیاح ریاست جموں وکشمیر میں سیر وتفریح کے لئے آتے تھے اور اپنے سفر ناموں میں کشمیر کے حالات کو بیان کرتے تھے۔

جموں خطے کا اولین سفر نامے کے نقوش مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے دور حکومت میں ملتے ہیں، جو نیم سرکاری وفد پر ترکستان کے سفر پر گیا تھا۔ اس وفد کی قیادت جموں خطے کے دور دراز علاقہ کشتواڑ سے تعلق رکھنے والا مہتہ شیر سنگھ تھا جو سب سے پہلے کشمیر سے چل کر کابل، سمرقند، بخارہ جیسے جگہوں سے ہوتے ہوئے تبت اور لداخ سے چل کر کشمیر پہنچا۔ اس حوالے سے پروفیسر ضیاالدین نے اپنی کتاب میں لکھا ہے:

> ''مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے دور حکومت میں ایک نیم سرکاری وفد مرکزی ایشیا یعنی ترکستان کے سفر پر روانہ ہوا''۔(16)

اس متذکرہ بالا سفر میں وفد کو تقریباً ایک سال کا وقت لگا تھا اور اس سفر نامہ کو وفد نے فارسی زبان میں تخلیق کیا تھا۔ اور پھر انھوں نے اپنا یہ سفر نامہ ڈوگرہ حکومت کے سپرد کیا تھا۔ اس کے بعد اس سفر کے بہت ساری زبانوں میں ترجمے کیے گئے۔

ریاست جموں وکشمیر میں اردو سفر نامہ کا باضابطہ آغاز پنڈت سالگ رام سالک سے ہوتا ہے۔ ان کا سفر نامہ ''تحفۂ سالگ'' ہے۔ اس سفر نامے میں انھوں نے دوسرے ممالک کی تاریخ اور جغرافیائی ماحول کا جائزہ پیش کیا ہے۔ برج پریمی نے اپنی کتاب میں اس حوالے سے لکھا ہے:

> ''تحفۂ سالگ'' ایک سفر نامہ ہے جس میں دوسرے ممالک کی تواریخ اور جغرافیہ کا سہارا لے کر وہاں کی ترقی کا حال لکھا گیا ہے۔ اس کتاب میں قصے کی تکنیک کا التزام کیا گیا ہے''۔(17)

جموں خطے میں سفر نامہ کی روایت زیادہ نہیں ملتی اور اس میدان میں بھی ان ادیبوں کے نام ملتے ہیں جنھوں نے ادب کی باقی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔اس حوالے سے جموں خطے کے جو سفر نامے منظر عام پر آئے ہیں ان میں خاص طور پر ملک راج صراف کا سفر نامہ ''میری پاکستان یاترا'' از ملک راج صراف، اس کے علاوہ دیگر سفر ناموں میں ''پشکن کے دیس میں'' از جگن ناتھ آزاد'' کوبس کے دیس میں''، ''نیپال نامہ'' از پرتپال سنگھ بیتاب، ''میری لکھنؤ یاترا'' از پروفیسر شہاب عنایت ملک اس کے علاوہ ان کے دیگر سفر ناموں میں ''مندروں کے شہر سے گوتم بدھ کی سرزمین تک''، ''یاور عباس کے ساتھ پانچ دن''، ''سولن میں چار دن''، ''اسفار شہاب'' (مجموعہ)، ''بازار حسن کے شب وروز'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ان متذکرہ بالا سفر ناموں میں کچھ سفر نامے کتابی شکل میں منظر عام پر آچکے ہیں اور کچھ مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوئے ہیں۔

سفر نامہ ''میری پاکستان یاترا'' ملک راج صراف کا بہترین سفر نامہ ہے۔جو 20/نومبر 1979ء کو شروع کیا۔ یہ سفر نامہ جموں کا اولین سفر نامہ کا درجہ رکھتا ہے۔ملک راج صراف نے قیام پاکستان میں دو ہفتے گزارے تھے اس سفر کے دوران انھوں نے پاکستان کے تین شہروں فیصل آباد، لاہور اور سیالکوٹ کا ذکر کیا ہے۔اس سفر کا مقصد مصنف کا صرف یہ تھا کہ وہ اپنے عزیز دوستوں سے ملاقاتیں کیں اور ڈھر ساری باتیں کیں۔اس مقصد کے ساتھ ساتھ انھوں نے پاکستانی دوستوں کی ہمدردی، وہاں کا رسم ورواج، تہذیب وثقافت وغیرہ تمام چیزوں کی منظر کشی کی ہے۔دراصل تقسیم ملک کے بعد بہت سارے لوگ جو اپنے عزیزوں سے دونوں ملکوں میں ربط کرنا چاہتے تھے مگر سرحد کی مجبوریوں کی وجہ سے وہ مل نہیں پاتے اور بہت سارے ایسے بھی ہیں جو انسانیت کی مثال کو زندہ رکھنے کے لیے سرحد کو پار کر کے اپنے عزیزوں سے ملتے رہتے ہیں۔جیسا کہ ملک راج صراف نے بھی اپنے سفر نامے میں ایک جگہ لکھا ہے:

> ''میں محض اپنی انفرادی حیثیت میں ایک ہندوستانی ہونے کے ناطے اپنے ہمسایہ ملک پاکستان میں انسان کو دیکھنے گیا تھا اور مجھے اطمینان اور خوشی ہے کہ میرا یہ تجربہ ناکام نہیں رہا''۔(18)

اس سفر نامے میں مصنف نے پاکستان کے لوگوں کی محبت، خلوص، گرم جوشی، انسانیت وغیرہ کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔اور اس کے ساتھ ساتھ ملک راج صراف نے پاکستان کی مہمان نوازی، وہاں کے سیاسی سماج اور ثقافتی حالات کی بھی منظر کشی کی ہے۔وہاں کے دیہاتی لوگوں سے مل کر انھیں ایسا محسوس ہوا کہ دونوں ممالک میں غربت اور مظلوم

لوگوں کی کسیر تعداد ہے۔ جس کا کسی سیاست داں کو خیال تک نہیں آتا ہے۔ اس پندرہ روزہ پاکستان کے سفر کے دوران ملک راج صراف کو اپنے جموں کی تہذیب وکلچر، بول چال، ڈوگری زبان وغیرہ یادیں تازہ ہوگئی۔ اس دوران وہ ایسے لوگو ں سے بھی ملے جو تقسیم وطن سے پہلے جموں میں رہتے تھے اور انھوں نے جموں کے رسم ورواج تہذیب کو ابھی بھی اپنے دل میں بسائے رکھا ہے۔ دونوں طرف لوگوں کے دلوں میں محبت ابھی بھی برقرار ہے۔ یہ سب دیکھ کر ملک راج صراف کو بہت مسرت محسوس ہوئی۔ اس سفرنامے کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ملکوں میں انسانیت ابھی بھی زندہ ہے مگر دونوں ملکوں کی سرحدوں کی وجہ سے آئے دن سفر نہیں کر پاتے ہیں۔ ملک راج صراف نے ایک جگہ خود اپنے سفر نامے میں لکھا ہے:

> ''اپنی زندگی میں میں نے کئی بار سفر کیا ہے، یورپ اور ایشیا کے ملکوں کا بھی دورہ کیا ہے لیکن جو حقیقی مسرت مجھے اپنے ہمسایہ ملک پاکستان میں اپنے چند روزہ قیام اور اپنے دوستوں سے مل کر ہوئی وہ مجھے بہت کم جگہوں پر نصیب ہوئی ہے۔ میں اسے اپنی خوش نصیبی پر محمول کرتا ہوں جس خلوص، محبت اور گرمجوشی کے ساتھ میرے دوستوں بالخصوص میرے ہم وطن مسلمان بھائیوں، بہنوں، بلکہ بچوں نے بھی میرے یہاں آنے کا خیر مقدم کیا ہے۔ وہ ناقابل فراموش اور اپنی مثال آپ ہے۔ میں ان کی آنکھوں میں خوشی کے آئینوں سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ ان کے درمیان اپنے آپ کو پا کر انسانیت کی جھلک کو دیکھا ہے۔ دو ہفتوں کے درمیان لمحہ بھر کے لیے بھی میرے دل میں خیال تک نہ آیا کہ میں کسی غیر جگہ میں آیا ہوں بلکہ اکثر ایسا محسوس ہوتا رہا جیسے میں اپنے گھر جموں میں ہی بیٹھا ہوں''۔(19)

اسی طرح ایک اور سفرنامہ ''پاکستان میں دو دن'' کے عنوان سے اوم پرکاش صراف کا بھی قابل ذکر ہے۔ سفر نامہ نگاری کے حوالے جموں کا سب سے اہم اور بڑا نام پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا ہے۔ انھوں نے جموں میں رہ کر جو ادبی کارنامے انجام دیئے ہیں، وہ کسی تعریف کے محتاج نہیں ہے۔ ان کا پہلا سفرنامہ ''جنوبی ہند میں دو ہفتے'' کے عنوان سے ہے۔ دوسرا سفرنامہ ''پشکن کے دیس میں'' اور تیسرا سفرنامہ ''کولمبس کے دیس میں'' اہمیت کے حامل ہیں۔

''پشکن کے دیس میں'' روس کے سفر کی روداد ہے۔ یہ سفرنامہ کتابی شکل میں پہلی بار 1986ء میں منظر عام پر آیا تھا۔ یہ سفرنامہ کل 105 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس سفر کی شروعات انھوں نے 3رستمبر 1978ء میں دہلی سے کی تھی۔

ان کا یہ سفر صرف اکیس دن کا تھا اور، دوران سفر انھوں نے روس کے متعلق بہت ساری اہم معلومات بیان کی ہے۔اس سفر کے دوران جگن ناتھ آزاد نے روس میں ہونے والی ادبی سرگرمیوں کا بھی جائزہ پیش کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''میں نے روس میں جو کچھ دیکھا اس کا ایک مختصر ساذکر آئندہ صفحات میں درج ہے یہاں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ علم وفن کی قدر کا ایک بہت اونچا معیار مجھے اس ملک میں دیکھنے کو ملا۔ بازاروں میں خریداروں کے لمبے لمبے کیو(Q) یہاں آلو، پیاز اور مٹی کے تیل کی دکانوں پر نظر نہ آئے بلکہ کتابوں کی دکانوں پر نظر آئے۔ یہاں وہ بھوک اور پیاس نہیں ہے جو مشرق کے اکثر تعداد میں چھپتے ہی فوراً اپنے عشاق کے ہاتھوں میں پہنچ جاتی ہیں۔مستند اور بلند پایہ مصنفوں کا مرتبہ یہاں صحیح معنوں میں دوسرے ملکوں کے لیے قابل رشک ہے''۔(20)

مندرجہ بالا اقتباس سے اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جگن ناتھ آزاد کو روس کے ادبی ماحول نے بہت متاثر کیا۔ایسے ماحول میں انھیں اپنے ملک کے بڑے ادیبوں جن میں علامہ اقبال اور پریم چند، جوش، فیض، سجاد ظہیر، آل احمد سرور، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، فراق وغیرہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔اقبال کے حوالے سے رقمطراز ہیں:

> ''یہ دیکھ کر مجھے دلی مسرت ہوئی کہ اقبال پر کام کرنے والے روسی طلبہ اور ان کے اساتذہ کس طرح اقبالیات کی گہرائی میں پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ہم بہتر ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کی طرح کلام اقبال سے سرسری نہیں گزر جاتے بلکہ ہر''جہان دیگر'' تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں''۔(21)

اس کے علاوہ اس سفر نامے میں جگن ناتھ آزاد نے روسی قانون، سویت اور ہندوستان کے آپسی تعلقات، وہاں کے فرائض وغیرہ پر اظہار کیا ہے۔''کولمبس کے دیس میں'' بھی جگن ناتھ آزاد کا ایک بہترین سفر نامہ ہے۔ یہ سفر نامہ انھوں نے اس وقت لکھا تھا جب وہ 14 ؍اگست 1981ء کو شکاگو یونیورسٹی کے چانسلر وصی اللہ صاحب کی دعوت پر ایک ادبی کانفرنس میں امریکہ گئے تھے۔اس سفر نامہ میں انھوں نے اپنے دروان سفر سے لے کر امریکہ کی ادبی وعلمی سرگرمیوں وہاں کی یونیورسٹیوں کا جائزہ لیا ہے۔اسی کے ساتھ وہاں گزرے بہترین لمحات، وہاں کا رہن سہن، تہذیب وکلچر، اردو زبان کی صورتحال، امریکہ کے مشہور شہروں اور اہم مقامات وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔

اس سفر نامے کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جگن ناتھ آزاد نے امریکہ کی ان یونیورسٹیوں کے

بارے میں تفصیلی ذکر کیا ہے جہاں علمی وادبی پروگرام کیے جاتے ہیں اور خاص طور پر ایسے اداروں کا ذکر کیا ہے۔ جہاں اردو زبان وادب کو فروغ دیا جارہا ہے۔اس کے علاوہ انھوں نے یہ بھی پیش کیا ہے کہ علامہ اقبال کی شخصیت سے کس قدر امریکی طلبا وطالبات واقفیت رکھتے ہیں۔علامہ اقبال کے نام سے امریکی طلبہ وطالبات نے بہت ساری انجمنیں قائم کی ہیں۔ جہاں اقبال کی شاعرانہ عظمت کے حوالے سے گفتگو کی جاتی ہے۔

جموں خطے کے سفر نامہ نگاروں میں پرتپال سنگھ بیتاب کا بھی ایک اہم نام ہے۔ بنیادی طور پر وہ ایک شاعر ہیں مگر ادب کی دیگر اصناف ادب میں بھی انھوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ان کی پیدائش 26 / جولائی 1949ء میں انبالہ میں ہوئی تھی اور اس کے بعد وہ جموں کے علاقہ پونچھ میں اپنے خاندان کے ساتھ رہنے لگے جہاں ان کا بچپن گزرا۔ ابتدائی تعلیم بھی انھوں نے پرائمری اسکول پونچھ سے کی تھی۔اس کے بعد مزید تعلیم انھوں نے جموں یونیورسٹی سے حاصل کی۔انھوں نے کشمیر ایڈمنسٹریٹو سروس کی حیثیت سے بھی اپنی ملازمت کو انجام دیا، اور آئی۔اے۔ایس کی حیثیت سے بھی اپنا کام بخوبی نبھایا، وہ پنجابی اور اردو دونوں زبانوں میں مہارت رکھتے ہیں۔

سفر نامہ کے حوالے سے ان کے دو اہم سفر نامے منظر عام پر آئے ہیں، جن میں ''نیپال نامہ'' اور ''لاہور نامہ'' خاص طور پر اہمیت کے حامل ہیں۔سفر نامہ ''نیپال نامہ'' کی پہلی قسط'' ہند سماچار کا ادبی میگزین'' میں 12 / جولائی 1999ء کو شائع ہوئی تھی۔اس سفر نامے میں انھوں نے نیپال کے مشہور پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔اور اپنے سفر کی روداد بہت ہی بہترین انداز میں پیش کی ہے۔اس سفر نامے میں انھوں نے نیپالیوں کے دل میں ہندوستانی لوگوں کے لیے محبت اور بھائی چارہ کی اچھی مثالیں بھی پیش کیں ہیں اور نیپال میں ہندی زبان کے بولنے والوں کا جائزہ بھی لیا ہے۔اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

> ''نیپال میں خوشگوار بات یہ بھی ہے کہ ہندی زبان اور ہندوستانی سکہ نیپالی زبان اور نیپالی سکے کے ساتھ ساتھ رواں دواں ہیں۔ ہندوستانی لوگوں کی وہ لوگ دوسرے ملکوں کے سیاحوں کے مقابلے میں زیادہ عزت کرتے ہیں''۔(22)

اس کے علاوہ اس سفر نامہ میں نیپال کے لوگوں کے کام کاج، رہن سہن، تہذیب وکلچر، نیپالی لوگوں کی ایمانداری ، نیپال کی مشہور عمارتوں اور مندروں وغیرہ کے بارے میں خاص طور پر معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ نیپال سے واپسی کے بعد انھوں نے جموں خطے کی مشہور جگہوں کی بہترین عکاسی کی ہے۔ جہاں سے وہ سفر کرتے ہوئے علاقہ پونچھ میں پہنچے

تھے۔

اسی طرح سے پرتپال سنگھ کا دوسرا سفرنامہ ''لاہورنامہ'' بھی قابل ذکر ہے۔ جوانھوں نے فروری 2014ء کو شروع کیا تھا۔اس سفرنامہ میں انھوں نے جس طرح سے پاکستان کے جن پہلوؤں کی عکاسی کی ہےاس سے معلوم ہوتا ہے کہ آنکھوں کے سامنے ایک فلم چل رہی ہو۔ یہ پرتپال سنگھ بیتاب کی خوبی ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں آسان اور عام زبان کا استعمال کرتے ہیں۔جس سے قاری کوان کی تحریریں آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہیں۔

''لاہورنامہ'' میں انھوں نے ذکر کیا ہے کہ انھیں پاکستان سے آرٹس کونسل کے چیرمین جناب عطاالحق قاسمی نے ایک ادبی کانفرنس میں دعوت دی تھی جو 23,24,25 مئی 2014 کوالحمرہ انٹرنیشنل کانفرنس تھی اور پاکستان جانے کے لیے پرتپال سنگھ پہلے سے ہی خواہش مند تھے۔اس کانفرنس کے دوران انھیں بہت سارے ادبی شخصیات سے ملاقات کرنے کا موقع فراہم ہوا۔جس کا ذکرانھوں نے اس سفرنامے میں بخوبی کیا ہے۔

لاہور کی مشہور عمارت الحمرہ جہاں یہ کانفرنس منعقد کی جارہی تھی۔اس کا ذکر کرتے ہوئے پرتپال سنگھ نے لکھا ہے:

> ''الحمرہ کی عمارت میں داخل ہوتے ہی مجھے بھوپال کا بھارت بھون یاد آ گیا جہاں میں نے کئی پروگراموں میں شمولیت اختیار کی ہے۔الحمرہ بے شک بھارت بھون سے الگ قسم کی عمارت ہے مگر ذوق جمال اورفن تعمیر کے معاملے میں بھارت بھون کی یادضرور دلاتی ہے''۔(23)

اس سفر کے دوران پرتپال سنگھ بیتاب کو پاکستان کےلوگوں سے جومسرت حاصل ہوئی وہاں کےلوگوں کی محبت، مہمان نوازی وغیرہ کو بہت ہی بہترین انداز میں انھوں نےقلم بند کیا ہے۔اس سفرنامہ کے مطالعہ کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں رہنے والے پاکستانی لوگوں کے بارے میں جو غلط فہمیاں ہیں اور پاکستان کے شہریوں کے دلوں میں جو ہندوستانی لوگوں کے بارے میں جو غلط خیالات ہیں اس طرح کی تمام غلط فہمیاں اس سفرنامہ کے مطالعہ سے دور ہوجاتی ہیں۔ پرتپال سنگھ بیتاب جموں میں اردو زبان وادب کوفروغ دینے میں آج بھی اہم رول ادا کررہے ہیں۔اور اردو کی خدمات انجام دینے میں ہمہ تن کوشاں رہتے ہیں۔

دور حاضر میں جموں کے سفرنامہ نگاروں میں پروفیسر شہاب عنایت ملک کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ان کے بہت سارے سفرنامے ابھی تک مختلف رسائل وجرائد میں قسط وار شائع ہو چکے ہیں۔ان کے سفرناموں کے حوالے

سے ان کی کتاب ''اسفار شہاب'' منظر عام پر آ چکی ہے۔ اس کے علاوہ ان کی دوسری تصنیف ''عصری ادبی تفکرات'' کے عنوان سے ہے۔ جو 2013ء میں منظر عام پر آئی اس میں بھی موصوف کے بیشتر سفرنامے شامل ہیں۔ شہاب عنایت ملک کے سفرناموں سے ملکی اور غیر ملکی سیاسی، سماجی، علمی و ادبی، تہذیبی و ثقافتی اور جغرافیائی پہلوؤں کی معلومات ہمیں ملتی ہے۔ جس کو موصوف نے بہت ہی عمدہ طریقے سے ضبط تحریر میں لیا ہے۔ ڈاکٹر شہناز قادری صاحب ان کے سفرناموں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''پروفیسر شہاب عنایت ملک اپنے وسیع مطالعے اور گہرے مشاہدے کی بنا پر اپنے سفرناموں میں مختلف مقامات کی مکمل تصویر کشی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پروفیسر موصوف نے دوانِ سفر ان تمام جگہوں کی ہمہ پہلو تاریخی، ثقافتی و جغرافیائی حالات کا پتہ لگا کر قارئین کے لیے معلومات کا ایک بیش بہا سرمایہ سپرد قلم کیا ہے جس کی وجہ سے یہ سفرنامے پر اعتبار سے بیش بہا معلومات کا منبع و سرچشمہ قرار دیے جا سکتے ہیں''۔(24)

''اسفارِ شہاب'' کے مطالعے سے پروفیسر شہاب عنایت ملک کے سفرناموں میں ذاتی تجربات مشاہدات کے ساتھ ساتھ تاثرات اور احساسات اور ماضی کی رنگارنگ تصویریں ہماری آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہیں۔ اور وہ جس ملک کا بھی سفر کرتے ہیں وہاں کی ہر مشہور چیز چاہے وہ تاریخی نوعیت کی ہو یا تہذیبی و ثقافتی نوعیت کی ہو غرض تمام پہلوؤں کا گہرائی سے جائزہ پیش کرتے ہیں۔ ان کے سفرناموں میں انسان دوستی، امن بھائی چارہ، گنگا جمنی تہذیب، انسانی رشتوں کی قدریں وغیرہ بخوبی دیکھی جا سکتی ہیں۔ پروفیسر صغیر افراہم ان کے سفرناموں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ان سفرناموں میں صارفیت کی چمک دمک خودنمائی کے جتن، جمہوریت اور آمیریت کی آمیزش اور کشاکشی ہے۔ لیکن جو پہلو غالب ہے وہ امن و محبت و اخوت کی لہروں میں گنگا جمنی تہذیبی عکس اور ہمالہ کے بلند و بالا وقار و استقلال کا ہے''۔(25)

پروفیسر شہاب عنایت ملک کے سفرنامے اردو کے غیر افسانوی نثر میں کافی اہمیت کے حامل ہیں اور جموں خطے کے حوالے سے پروفیسر شہاب عنایت ملک کے سفرنامے خوشگوار اضافہ ہیں۔

جموں میں تحقیق و تنقید نگاری:

تحقیق عربی زبان کا لفظ حقیق سے ماخوذ ہے جس کا مطلب ثابت کرنا ہے۔ ثبوت فراہم کرنے کے ہیں۔ تحقیق

کے لغوی معنی حقیقت کی تلاش یا کھوج کے ہیں یا تحقیق کا مطلب ہے مسائل کو حل کرنے کے لیے سائنٹیفک طریقے کا استعمال کرنا اور اصل مقصد تک رسائی حاصل کرنا ہے۔

تحقیق کے ابتدائی دور میں جن بڑے محققین کا نام آتا ہے ان میں سر سید احمد خان، شبلی نعمانی، خواجہ الطاف حسین حالی، محمود شیرانی، مولوی عبدالحق، سید سلیمان ندوی وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ ان تمام حضرات نے ابتدائی دور میں تحقیق کو ایک ایسے میدان میں کھڑا کر دیا تھا۔ جس سے آنے والے محققین بڑی آسانی سے اس میدان میں طبع آزمائی کر سکیں، اور آنے والی نسلوں کے لیے ایسا مواد فراہم کر دیا تھا جس سے دیگر محققین کے لیے اردو تحقیق میں آسانی ہو سکے۔ 1947ء کے بعد کے محققین نے اردو تحقیق کو چار چاند لگا دیے۔ اس حوالے سے جن محققین کا نام سر فہرست ہے ان میں مسعود حسن خان، رضوی ادیب، امتیاز علی خان عرشی، قاضی عبدالودود، پروفیسر گیان چند جین، رشید حسن خان، مالک رام، پروفیسر گوپی چند نارنگ، جمیل جالبی، محمود الٰہی، نور الحسن ہاشمی، پروفیسر سیدہ جعفر، محی الدین قادری زور، مولوی محمد شفیع، برج موہن دتا، تریا کیفی، شیخ چاند حسن، شیخ محمد اکرام، نصیر الدین ہاشمی، حامد حسن قادری، وحید قریشی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام ایسے قابل تعریف اور معتبر محقق ہیں جنھوں نے تحقیق کے اصولوں اور طریقہ کار پر غور فرما کر گراں قدر اضافے کئے۔ انہی کی وجہ سے تحقیق کا میدان وسیع ہوتا چلا گیا اور نئے نئے طریقہ کار سے بہت سارے محققین اس میں شامل ہوتے گئے جن میں خاص طور پر نور الحسن نقوی، پروفیسر قمر رئیس، نذیر احمد، مختار الدین احمد، خلیق انجم، عبدالستار دلوی، عابد پشاوری، کالی داس گپتا رضا، محمد الدین فوق، محمد عمر نور الٰہی، تنویر احمد علوی، پروفیسر منظر اعظمی، ڈاکٹر برج پریمی، حامدی کاشمیری، اکبر جیدی، محمد یوسف ٹینگ، عبدالغنی شیخ لداخی، پروفیسر ظہور الدین، شہاب عنایت ملک، مشتاق احمد وانی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان تمام شخصیتوں نے تحقیق میں نہ صرف راہیں ہموار کیں بلکہ اعتبار و معیار سے بھی روشناس کروایا۔

جہاں تک ریاست جموں و کشمیر کا تعلق ہے تو دیگر ریاستوں کی طرح سے یہاں بھی تحقیق کے میدان میں بہت سے اسے محققین ہیں جنھوں نے تحقیق کی روایت کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اس حوالے سے ریاست جموں و کشمیر میں سب سے پہلا نام محمد الدین فوق کا سامنے آتا ہے۔ جن کے بارے میں راقم پچھلے باب میں تفصیلاً ذکر کر چکا ہے۔ یہاں صرف اتنا کہنا ضروری ہے کہ اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ محمد الدین فوق کی تحقیق کا بنیادی دائرہ تاریخ رہا ہے۔ مگر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان کی تحقیق کے حوالے سے بہت سارے تذکرے ایسے بھی ہیں جن کو براہ راست ادبی تحقیق کے دائرے میں رکھا جا سکتا ہے مثال کے طور پر ''یادرفتگاں''، ''تذکرۂ علمائے لاہور''، ''تذکرۂ

شعرائے لاہور'' اور تذکرۂ اخبار نویساں'' قابل ذکر ہیں۔اس کے بعد جموں کشمیر میں تحقیق کے حوالے سے دو بڑے نام محمد عمر اور نور الٰہی کا آتا ہے۔ان دونوں حضرات کو ان کی مشہور کتاب ''ناٹک ساگر'' کی وجہ سے بے پناہ شہرت حاصل ہوئی۔اس کے علاوہ حبیب کیفیوں کی تصنیف ''کشمیر میں اردو'' اور عبدالاحد آزاد کی مشہور کتاب ''کشمیری زبان اور شاعری'' بھی ریاست میں تحقیق کے حوالے سے قابل تعریف ہیں۔

ریاست جموں وکشمیر میں 1947ء کے بعد جن محققین نے اس میدان کو وقار بخشا ان میں ڈاکٹر اکبر حیدری، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، پرفیسر شکیل الرحمٰن، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر محمد حسن، پروفیسر عبدالقادر سروری، منظر اعظمی، شیام لعل کالرا (عابد پیشاوری)، گیان چند جین کے نام اہمیت کے حامل ہیں اس کے علاوہ موجودہ دور میں جموں کشمیر سے تعلق رکھنے والوں میں، محمد زمان آزردہ، پروفیسر ظہور الدین، ڈاکٹر برج پریمی، حامدی کشمیری، محمد یوسف ٹینگ، پروفیسر قدوس جاوید، پروفیسر شبیر احمد نحوی، ڈاکٹر نذیر احمد ملک، ڈاکٹر مجید مضمر، ڈاکٹر فرید پربتی، محمد اسداللہ وانی، شہاب عنایت ملک، مشتاق احمد وانی، ڈاکٹر نصرت چودھری وغیرہ کے نام اہمت کے حامل ہیں۔

تنقید:

ریاست جموں وکشمیر میں تنقید کی عمر بہت کم ہے۔اس حوالے سے ریاست جموں وکشمیر میں جن نقادوں کے نام اہمت کے حامل ہیں ان میں خاص طور پر عبدالاحد آزاد، محمد عمر نور الٰہی، محمد الدین فوق، نندلال کول طالب، پروفیسر شکیل الرحمٰن، حامدی کاشمیری، عزیز احمد قریشی، پروفیسر ابراہیم، پروفیسر حاضی، محمد یوسف ٹینگ، ڈاکٹر برج پریمی، ظہور الدین، مغل سلطان پوری، شاہد بڈگامی، نند یر احمد ملک وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

جموں میں تحقیق وتنقید کے حوالے سے ''بزم سخن'' جموں کو اہمیت حاصل ہے۔مہاراجہ پرتاب سنگھ کے دور حکومت میں ریاست میں دو انجمنیں قائم کی گئیں تھیں۔جموں میں ''بزم سخن'' کے نام سے 1912ء میں اس کا اجرا ہوا اور اس کے بعد دوسری انجمن خوشی محمد ناظر کی نگرانی میں سرینگر میں ''حلقہ مغرح القلوب'' کا قیام عمل میں آیا۔جموں میں ''بزم سخن'' کو زیادہ اہمیت حاصل تھی اور بزم میں ریاست اور دیگر ریاستوں کے شعرا و ادبا اپنی اپنی تخلیقات کو پیش کرتے تھے۔ساتھ ہی ساتھ جو تحریریں پیش کی جاتی ان پر تنقیدی بحث بھی کی جاتی تھی۔اس لیے بزم سخن جموں کو تنقید کے حوالے سے کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔اس حوالے سے پروفیسر ظہور الدین اپنی کتاب میں رقم طراز ہیں:

"It was, therefore , due to these anfluences that the first literary organisation, the Bazm_i_sukhan, jammu, was setup in 1912 at jammu, which proved highly conducive to both the art of criricism and research. The periodic meetings of this organisation in which most enlightened writers of both within and without the state partcipated served as a major training centre where knowledge and aptitude of cirticism and research was fostered among the new writers of the region"(26)

جموں میں اردو تنقید کے ابتدائی نقوش ہمیں محمد الدین فوق کی تحریروں میں مل جاتے ہیں۔انہوں نے کافی عرصہ جموں کے علاقہ پونچھ میں گزارا تھا۔ان کی تخلیقات میں اگر دیکھا جائے تو براہ راست ان کی تحریروں میں تحقیق وتنقید کا کوئی تعلق نہ تھا تاہم کہیں نہ کہیں ان کی تخلیقات میں بلا واسطہ طور پر تنقیدی نقوش مل جاتے ہیں۔محمد الدین فوق کا بنیادی طور پر صحافت، فکشن اور تاریخ سے تعلق رہا تھا۔اس لیے راقم نے ان کا ذکر جموں میں فکشن کے حوالے سے تفصیلاً کیا ہے۔ یہاں ان کے صرف تنقیدی نقوش کی طرف اشارہ کرنا مقصد ہے۔بقول ڈاکٹر برج پریمی:

''ریاست جموں وکشمیر میں اردو تنقید کے ابتدائی نقوش محمد الدین فوق مرحوم کی بعض تحریروں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔فوق کا تنقید کے ساتھ براہ راست کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی یہ ان کا میدان تھا۔انہوں نے تاریخ، شاعری، فکشن اور تحقیق جیسے کئی میدانوں میں چراغ روشن کئے۔یہ صحیح ہے کہ فوق کی تحقیق وتلاش کا اصل دائرہ تاریخ ہے۔''(27)

محمد الدین فوق اگر چہ فکشن اور تاریخ وغیرہ کے میدان میں زیادہ مقبولیت رکھتے ہیں لیکن یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ انہوں نے کئی ایسے تذکرے بھی تالیف کئے جن کا تعلق براہ راست اردو ادب کے ساتھ نمایاں تھا۔اس حوالے

سے ان کی تصانیف میں خاص طور پر ''یادرفتہ گان'' تذکرہ علمائے لاہور، تذکرہ شعروائے لاہور، تذکرہ اخبارنویساں وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔اس کے علاوہ محمد الدین فوق کی کئی تصانیف ہیں جو تحقیقی اور تنقیدی نوعیت کی حامل ہیں۔ان کی کئی تصانیف میں اقتضائے زمانے کے مطابق تنقیدی خیالات کا اظہار قدم قدم پر دیکھا جا سکتا ہے۔یہی خیالات اگر چہ کسی خاص اصول کے تحت قابل ذکر نہیں مگر پھر بھی جس طرح کا اظہار اس زمانے کی تحریروں میں ملتا تھا اسی طرح کا اظہار محمد الدین فوق کے تذکروں اور تصانیف میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ڈاکٹر مشتاق احمد وانی صاحب محمد الدین فوق کے بارے میں اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''جموں و کشمیر میں اردو تحقیق کے اولین نقوش محمد الدین فوق مرحوم کی بعض تحریروں میں ملتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ فوق کی تحقیق کا اصل دائرہ تاریخ ہے مگر ان کے کئی تذکرے ایسے ہیں جن کا تعلق براہ راست ادبی تحقیق کے ساتھ ہے۔ مثلاً ''یادرفتگان''، ''تذکرہ علمائے لاہور''، ''تذکرہ شعرائے لاہور'' اور ''تذکرہ اخبارنویساں'' فوق کی تمام تصانیف تحقیقی نوعیت کی ہیں۔''(28)

جموں خطے میں تحقیق اور تنقید کا آغاز بنیادی طور پر محمد عمر نورالٰہی صاحبان کی تحریروں سے ہوتا ہے۔ان دونوں حضرات نے مل کر اردو ادب میں ایک ایسا کارنامہ پیش کیا تھا جو اپنی مثال آپ ہے۔محمد عمر نورالٰہی کی معرکتہ الآرا تصنیف ''ناٹک ساگر'' نہ صرف ڈرامہ کی تاریخی نوعیت میں اہمیت کی حامل ہے، بلکہ اس تصنیف کو تحقیق و تنقید میں بھی اتنی ہی مقبولیت حاصل ہے۔ان دونوں حضرات نے مشترکہ نام سے برسوں تک مشترکہ کارنامے انجام دئے تھے۔انہوں نے افسانوں اور ڈراموں کے علاوہ دیگر ادب کی اصناف سخن میں بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ راقم الحروف ان دونوں حضرات کا ذکر جموں میں اردو ڈراما کے حوالے سے تفصیل سے کر چکا ہے۔مگر تحقیق اور تنقید کے حوالے سے بھی ان کا ذکر خاص طور پر ان کی تصنیف ''ناٹک ساگر'' کے حوالے سے بے حد ضروری ہے۔ چوں کہ جموں خطے میں تحقیق و تنقید کی تاریخ تب تک مکمل نہیں ہوسکتی ہے جب تک ''ناٹک ساگر'' کا ذکر نہ کیا جائے۔ پروفیسر ظہورالدین نے اپنی ایک کتاب میں محمد عمر اور نورالٰہی کے بارے میں لکھا ہے:

> The first achievment in this field is , ''
> therefore, the "Natak Sagar" of Mohd. Umar

Noor Ilahi, which appeared in 1924 and earned an award of Rs,250/- from the State Government. This is the first critical and reserch advanture in the entire realm of urdu literature which deals, exclusively, with the rise and development of drama in various countries of the world. It makes a critical study of almost all the major playwrights of the world" (29)

''ناٹک ساگر'' محمد عمر نورالٰہی کا قابل قدر کارنامہ ہے۔ یہ تصنیف پہلی بار لاہور سے 1924ء میں منظر عام پر آئی تھی۔ اس کتاب کو نہ صرف جموں خطے میں تحقیقی وتنقیدی اولیت حاصل ہے۔ بلکہ اردو ڈراما نگاری کے فن پر اہم اردو تصنیف کا درجہ حاصل ہے۔ اس میں کوئی شک کی بات نہیں ہے کہ یہ تصنیف اردو ڈرامے کی جامع تاریخ ہے۔ اردو ڈراما نگاری کے حوالے سے اور تھیٹر کی تحریک کا کوئی سنجیدہ قاری، نقاد یا محقق اس کتاب کو نظر انداز نہیں کر سکتا ہے۔ محمد عمر نورالٰہی صاحبان کی یہ تصنیف تقریباً پندرہ ابواب پر مشتمل ہے اور اس میں ہندوستان سے لے کر یونان، چین، جاپان، روس، مشرق اور مغرب وغیرہ غرض کہ تمام ممالک کے ڈراموں کا تفصیلاً احاطہ کرنے کی بہترین کوشش کی گئی ہے۔ اس وجہ سے یہ تصنیف اردو ادب کی تاریخ میں ایک نمایاں کارنامہ ہے۔ اس کتاب کے دیباچہ میں خود نورالٰہی محمد عمر لکھتے ہیں:

''لیکن جب اہل ذوق اس کی طرف توجہ گرامی مبذول کرنا وضع کے خلاف سمجھتے ہوں تو ہماری جسارت شاید قابل عضو ہو۔ واقعات کی صحت کے ہم ذمہ دار ہیں مگر محاسن ادبی کے مدعی نہیں یہ بھی دعویٰ نہیں کہ یہ کتاب جامع اور ڈراما کے جملہ کوائف پر محتوی ہے کس کتاب کی تکمیل کے لیے سرسید کی تحقیق، آزاد کا قلم سرشار کی فطرت طرازی اور انسائیکلو پیڈیا کی کشادہ دامانی درکار ہو۔ وہاں ہمارا قلم کیوں کر دو قدم چل سکتا ہے۔ اس لیے ہم ان اصحاب سے عذر خواہ ہیں۔ جو کسی کتاب کا سرمایہ کمال فقط الفاظ کی نشت تراکیب کی چستی اور محاورے کے چٹخارے کو سمجھتے ہیں۔ کہ ان کی ضیافت طبع کا بہت کم سامان یہاں مہیا ہے۔'' (30)

''ناٹک ساگر'' کا اگر گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصنیف ایک طرح سے عالمی ڈرامے کی مختصر تاریخ ہے اور دونوں مصنفین نے اس تصنیف کو طبع کرنے میں بہت ہی محنت ولگن سے کام لیا ہے اور اس تصنیف کا بنیادی مقصد تحقیق پر مبنی ہے۔لیکن ساتھ ہی ساتھ اس میں تنقیدی منصب سے بھی عہدہ برآ ہونے کی سعی کی گئی ہے۔ان ہی خصوصیت کے پیش نظر اس تصنیف کا مطالعہ کرتے ہوئے علامہ برج موہن دتاتر یہ کیفی نے مقدمہ لکھا ہے۔جس میں ایک جگہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''یہ وہ کتاب ہے جو اردو ادیبوں اور ڈرامہ نویسوں اور اسٹیج یعنی تھیٹر کے ہر قسم کے متعلقین کے لیے روز نامچہ ہدایت کا کام دیگی۔یورپ کے ڈرامہ کی عہد بہ عہد ترقی اس کا عروج ارتقا اوت تنزل،فن تمثیل یعنی ایکٹری،اسٹیج کا لباس اور سنہری وغیرہ ایسے مطالب ہیں جن کا ذکر جا بجا اس کتاب میں آیا ہے اور جن پر مورخانہ تعبیر کے ساتھ ناقدانہ نظر بھی ڈالی گئی ہے۔اس وقت ہندوستان میں آٹھ اسٹیج ہیں۔احاطہ بمبئی میں مراہٹی اور گجراتی اسٹیج۔احاطہ مدراس میں تامل؛،تلنگانی یا اور کناری،بنگال میں بنگالی اسٹیج اور صوبہ متوسط میں ہندی،پنجاب اور صوبہ آگرہ واودھ میں اردو۔منجملہ ان کے اردو اور ہندی ناٹک تمام بر اعظم ہند میں دکھائے اور اور دیکھے جاتے ہیں۔''(31)

مذکورہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کیفی نے ناٹک ساگر کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ان میں بہت ہی قابل ذکر باتیں ہیں۔اصل میں دیکھا جائے تو علامہ کیفی نے پوری حقیقت بیان کر دی ہے کہ مصنفین نے بڑی شدت اور لگن کے ساتھ اپنا مواد اکٹھا کیا ہے۔اگر چہ اس تصنیف میں تنقیدی خیالات بہت مختصر ہیں مگر پھر بھی قابل ذکر ہیں۔یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کو اردو ادب کا تاریخ میں قابل قدر مقبولیت حاصل ہے اور جموں وکشمیر میں اس کتاب کو عملی تنقید کا اولین نمونہ کہا جاتا ہے۔ڈاکٹر مشتاق احمد وانی اپنے ایک مضمون میں محمد عمر نورالٰہی صاحبان کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''محمد عمر نورالٰہی دو ادب نواز دوستوں نے مشترکہ نام سے ''ناٹک ساگر'' جیسی معرکتہ الآرا تصنیف بطور یادگار چھوڑی ہے جو 1924ء میں پہلی بار مرتبہ لاہور سے شائع ہوئی۔مذکورہ کتاب ڈرامہ نگاروں کے فن اور اس کی تاریخ سے تعلق رکھتی ہے اس میں حقائق کی بازیافت

اور واقعات کی صحت پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ مصنفین نے بڑی جگر سوزی کے ساتھ مواد اکٹھا کیا ہے۔''(32)

اسی طرح کا ایک اور قابل ذکر کارنامہ محمد عمر نور الہی کا یہ ہے کہ انہوں نے 1926ء میں مشہور و معروف ڈراما نگار امانت لکھنوی کی ''اندر سبھا'' مرتب کر کے شائع کی تھی۔ اس کتاب کا یہ ایڈیشن لاہور سے شائع ہوا تھا۔ اس ایڈیشن کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ مرتبین نے ڈرامے کو دو ایکٹوں اور کئی مناظر میں تقسیم کر کے ایک نئی صورت میں پیش کیا ہے۔ مصنفین نے اپنے مقدمے اور حواشی سے اس تصنیف میں بہت سی جگہوں پر اضافہ بھی کیا ہے۔ یہ حصہ ان کے کارناموں میں تحقیقی اور تنقیدی شعور کا غماز ہے۔ اگر چہ امانت لکھنوی کی تصنیف ''اندر سبھا'' کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ مگر اس ایڈیشن کو پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ اس کا اپنا منفرد مقام ہے اور ڈرامے کی تاریخ میں اس ایڈیشن کی اتنی اہمیت ہے کہ اسے نظر انداز کرنے سے ڈراما ''اندر سبھا'' کے ساتھ نا انصافی ہوگی کیوں کہ محمد عمر اور نور الہی نے اس ایڈیشن میں بہت سی اہم باتوں کی نشان دہی کی ہے۔

حنیف ہاشمی:

حنیف ہاشمی کا تعلق جموں سے تھا۔ انہوں نے جموں کے ادبی اخبارات و رسائل میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ان کے کئی تنقیدی مضامین جموں سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ خاص طور پر جموں کے ''رنبیر'' اخبار ''پریم'' اور ''رتن'' وغیرہ میں ان کے تنقیدی مضامین منظر عام پر آتے تھے۔ بقول پروفیسر ظہور الدین:

> "He was a well known writer of the region and worked as Liberarian in the Government Ranbir High School Jammu before partition" (33)

حنیف ہاشمی نے جموں کے گورنمنٹ رنبیر ہائی اسکول میں کئی عرصہ تک لائبریرین کی حیثیت سے ملازمت کی تھی اور اسی دوران انہیں مضامین لکھنے کا شوق بھی پیدا ہوا تھا۔ کیوں کہ ریاست میں ابھی کچھ ہی عرصہ ہوا کہ قلم کاروں کو اپنی تخلیقات کو منظر عام پر لانے کا موقع فراہم ہوا تھا۔ اس دور میں جموں کے ادیب خاص طور پر اپنے مضامین کو ''پریم'' اخبار اور ''رنبیر'' اخبار میں شائع کراتے تھے۔ جموں میں اردو ادب کے حوالے سے سب سے اہم اور قابل قدر کارنامہ

بعوان مضمون ’’کالی داس‘‘ کا ہے۔ان کا یہ مضمون تنقیدی حیثیت سے اہمیت رکھتا ہے۔جو قسط وار جموں کے مشہور اخبار ’’پریم‘‘ میں دسمبر 1945ءاور دوسری بار 1946ء میں منظر عام پر آیا تھا۔

تقسیم ملک کے بعد حنیف صاحب کو یہ جگہ راس نہ آئی اور وہ مجبوراً جموں سے پاکستان کے شہر سیالکوٹ میں جا بسے اور آخری دم تک وہیں رہے۔اردو شعر وادب کے ساتھ انہیں کافی لگاؤ تھا۔ان کے کئی تنقیدی مضامین جموں کے رسائل و جرائد میں شائع ہوئے تھے۔اس لیے جب وہ سیالکوٹ پاکستان میں گئے تو وہاں بھی اردو زبان وادب کے ساتھ تا حیات وابسطہ رہے۔حنیف ہاشمی اردو زبان کے ساتھ ساتھ ہندی اور سنسکرت میں بھی مہارت رکھتے تھے ان کا تنقیدی مضمون ’’کالی داسا‘‘ جموں میں کافی اہمیت کا حامل ہے۔حنیف ہاشمی کے بارے میں بہت کم مواد دستیاب ہوتا ہے۔پروفیسر ظہور الدین صاحب ان کے مضمون کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"His article on "Kalidassa" earned considerable fame in the literary circles both in the region and outside of it. (34)

حنیف ہاشمی نے اپنے اس مضمون میں جن باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے، ان کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کیوں کہ ان سے پہلے کالی داس کی ذاتی زندگی کے بارے میں بہت کم معلومات ملتی ہیں۔مصنف نے کالی داس کی بنیادی باتوں کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ہندوستان کے ہر پہاڑی علاقہ میں صرف کیا تھا۔اگر چہ کالی داس کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر اس مضمون میں روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔مگر پھر بھی مصنف نے اپنی محنت سے نمایاں کام کیا ہے۔اس مضمون میں حنیف ہاشمی نے کالی داس کے کارنامے شکنتلا، میگھدوتم وغیرہ پر بھی سرسری طور پر اظہار خیال کیا ہے۔

پنڈت دیا کرشن گردش:

ان کی پیدائش جموں میں 1902ء کے آس پاس ہوئی تھی۔راقم الحروف نے ان کا ذکر فکشن کے حصے میں بھی کیا ہے۔یہاں ان کے صرف تحقیقی اور تنقیدی مضامین کے حوالے سے ذکر کیا جائے گا۔تحقیق وتنقید کے حوالے سے پنڈت دیا کرشن گردش کے کئی تنقیدی مضامین منظر عام پر آئے مگر انہیں سب سے زیادہ مہارت ان کے دو تنقیدی مضامین ’نیا ادب‘‘ اور ’’کالی شلوار‘‘ کی حیثیت سے حاصل ہوئی۔ان دونوں مضامین میں مصنف نے زمانہ قدیم اور دور حاضر

کے کئی سماجی، معاشی اور تہذیبی خوبیوں اور خامیوں میں فرق واضح کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ دور حاضر میں انسان اپنی سماجی، تہذیبی وثقافتی ذمہ داریوں سے دور ہوتا چلا جارہا ہے۔ پنڈت دیا کرشن گردش نے ان دونوں مضامین میں اپنی رائے کا اظہار بھی کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ترقی پسند ادیبوں سے متاثر نہیں تھے۔مصنف کے مطابق ترقی پسندوں نے سماج کو برائیوں کے گڈھے میں ڈال دیا ہے۔ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ترقی پسند ادیبوں نے ادب کو پروپگنڈہ بنادیا ہے۔جس سے اکثر و بیشتر ادیب اپنی سماجی ذمہ داریوں سے کوسوں دور چلے گئے ہیں۔پررفیسر ظہورالدین نے بھی پنڈت دیا کرشن گردش کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "He is , therefore, totally against the progressive writers movement which , according to him is not only encouraging depravity degradation, and lust and destruction but also causing irreparable demage to the healthy values of our literature. Howevers the opinion of Daya Krishan Gardish about the progressive literature is not beleaved and he has just veited out his own grudges aganist it" (35)

پنڈت دیا کرشن گردش نے اپنی ابتدائی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا تھا۔مگر اس میدان میں انہیں زیادہ کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔

بی۔ڈی۔مل شرما:

بی۔ڈی۔مل شرما کی پیدائش جموں میں 1906ء میں ہوئی تھی۔وہ جموں یونیورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے عرصہ دراز تک فرائض انجام دیتے رہے۔انہوں نے کئی تنقیدی مضامین اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔جو وقتاً فوقتاً جموں کے رسائل وجرائد میں شائع ہوئے۔ان کا سب سے بہترین مضمون اردو تحقیق وتنقید کے حوالے سے بعنوان''اودھ پنچ کا ایک ورق'' ہے۔یہ مضمون جموں کے مشہور اخبار''پریم'' میں فروری 1946ء میں منظر عام پر آیا تھا۔بی۔ڈی۔مل شرما کا یہ تنقیدی مضمون نہ صرف خطہ جموں کے ادیبوں کے لیے فائدہ مند ثابت ہوا بلکہ اردو شعر وادب سے تعلق رکھنے والے

تمام قلمکاروں کے لیے اہمیت کا باعث بنا۔اس میں مصنف نے لکھنؤ کے مشہور و معروف ادیب منشی سجاد حسین کے اخبار ''اودھ پنچ'' کی کچھ خصوصیات کو بیان کیا ہے۔منشی سجاد حسین نے یہ اخبار لکھنؤ سے 1877ء میں شائع کیا تھا۔جس کی اہمیت ہر اردو داں جانتا ہے۔انہی خوبیوں کو بنیاد بنا کر بی۔ڈی۔مل شرما نے ایک تنقیدی مضمون شائع کیا تھا۔اس مضمون میں انہوں نے بہت سے اقتباسات شامل کئے ہیں اور ساتھ میں منشی سجاد حسین کے ادبی کارناموں کی نشان دہی بھی مختصراً طور پر کی ہے۔پروفیسر ظہور الدین صاحب اپنی کتاب میں بی۔ڈی۔مل شرما کے اس مضمون کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "This article is mainly based on the "Oudh Punch" of March7, 1877 and therefore , a number of quotations given in support of his contentions have also been drawnfrom the issue of said newspaper"(36)

نشاط کشتواڑی:

نشاط کشتواڑی کا اصل نام غلام رسول متخلص نشاط کشتواڑی تھا۔ان کی ولادت مئی 1909ء میں ہوئی تھی۔نشاط کشتواڑی کا بھی جموں خطے کے شعراء وادبا میں اہم نام ہے۔ان کے آباواجداد آج سے تقریباً دوسو برس قبل اسلام آباد کشمیر سے ہجرت کر کے جموں کے دوردراز پہاڑی علاقہ کشتواڑ میں آباد ہو گئے تھے اور یہی پر سکونت اختیار بھی کی۔

نشاط کشتواڑی کو اردو زبان کے ساتھ ساتھ عربی،فارسی اور کشمیری زبانوں میں بھی دسترس حاصل تھی۔

جناب غلام رسول نشاط کشتواڑی حضرت سیمابؔ اکبرآبادی کے شاگردوں میں سے تھے۔غزل،مرثیہ،نظم، قصیدہ،رباعی اور مثنوی اور قطعہ وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے۔نشاط عروض سے بخوبی واقف ہیں۔جس سے کلام میں پختگی پیدا ہو گئی ہے۔بعض غزلیں یا اشعار بہت ہی اچھے ہیں۔ملک کے اچھے رسائل اور اخباروں میں ان کا کلام چھپتا رہا ہے۔کلام کے دو مجموعے ''نعت سرکار دو عالم'' اور نثر میں ''سگریٹ نوشی'' کے عنوان سے ایک کتابچہ شائع کیا ہے۔ ۔۔نشاط کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس سے کشتواڑ کی ثقافتی اور سیاسی تاریخ ترتیب دی جاسکتی ہے۔ایک اچھے شاعر کے علاوہ نشاط ایک بہترین اور سادہ وضع کے انسان بھی ہیں اور ہر انسان کا دکھ درد بانٹنے کے لیے ہر وقت تیار نظر آتے ہیں۔'اس حوالے سے ان کے کتابچے ''سگریٹ نوشی''،''خطوط احباب'' اور کچھ شائع شدہ مضامین خاص طور پر

اہمیت کے حامل ہیں۔نشاط کشتواڑی کی یہ تصنیف ''سگریٹ نوشی'' تاریخی اور تحقیقی نوعیت کی ہے۔اس میں مصنف نے تمباکو کی تاریخ اوراس کے مصنوعات، تمباکواور سگریٹ میں زہریلے اجزاء اوران کا انسانی جسم میں اور انسان کی صحت پر ہونے والے برے اثرات کی کھوج لگانے کی کوشش کی۔

نشاط کشتواڑی صاحب کا اردو نثر کے حوالے سے سب سے اہم کارنامہ ان کے تحقیقی وتنقیدی مضامین ہیں جو انہوں نے اپنے دور کی مشہور شخصیات پر لکھے تھے۔ان میں سب سے اہم مرحوم رسؔا جاودانی اور مرحوم کامگار کشتواڑی وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ان کے یہ مضامین ریاستی کلچرل اکاڈمی کے رسالے''شیرازہ'' میں بھی شائع ہوئے تھے۔محترمہ نسیمہ بانو جوکہ جموں خطے کی پہلی خاتون تھیں،جنہوں نے اردو زبان وادب میں طبع آزمائی کی تھی،انہوں نے اپنی تصنیف میں نشاط کشتواڑی کے بارے میں لکھاہے کہ:

> ''نشاط صاحب ریاست کے پہلے شاعر ہیں جن کی نعتیں اور مناجات میں نے اسکول میں پڑھی۔ پھر مختلف تقریبات میں ان کی دید نے ان کے تئیں میرے جذبۂ عقیدت کو مزید آسودگی بخشی اوران کی مفکرانہ شخصیت سے متاثر ہوتی چلی گئی۔۔۔۔نشاط صاحب کشتواڑ کی ادبی زندگی پر ہمیشہ چھائے رہے۔اگر چہ یہ سب کچھ ان کی خواہش کے علی الزعم تھا،تحقیق کے دوران اس بات کا شدت سے بار بار احساس ہوتا رہا کہ نشاط صاحب ایسے بزرگ شاعر سے انصاف نہیں کیا گیا۔انہیں ادب میں وہ مقام نہیں دیا گیا جس کے وہ مستحق تھے۔'' (37)

عبدالمجید نظامؔی:

تحقیق اور تنقید کے حوالے سے ان کا قابل ذکر مضمون ''پریم اکتوبر 1945 پر ایک نظر'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا تھا۔اس مضمون میں انہوں نے نہ صرف اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے بلکہ اس دور کے جموں کے ادیبوں کا ذکر بھی کیا ہے۔جو اپنی کاوشوں کو وقتاً فوقتاً اخبار ''پریم'' میں شائع کرتے تھے۔

جموں میں تنقید کے حوالے سے عبدالمجید نظامی کا ایک اور کارنامہ پروفیسر محمود ہاشمی کے افسانے کا تنقیدی جائزہ تھا۔اس مضمون میں مصنف نے نہ صرف افسانہ کی ہئیت واجزاء پر تنقیدی بحث کی ہے بلکہ محمود ہاشمی کی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کو منظر عام پر لانے کی بھی کوشش کی ہے۔اس حوالے سے پروفیسر ظہورالدین صاحب لکھتے ہیں:

"For instance in this former article he writes a critical

estimate of a short story of the same title by Professor Mehmud Hashmi, published in the "Afsana Number" of the literary journam "Saqi" july 1945. In this eassey , though, the writer has severaly criticised both thematic and formative aspects of the short story yet his critism is balanced and rational. Rights from the title of the story to the plot construction, charasterisation and diction the critic has discussed every aspect in detail and pointed out various anherent flow"(38)

گلزار احمد فدا:

جموں خطے میں 1947ء سے قبل کے قلمکاروں میں گلزار احمد فدا ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔گلزار احمد فدا نے اپنے ادبی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا تھا۔جموں خطے کے مشہور اخبار ''پریم'' میں وہ ایڈیٹر کی حیثیت سے اپنی خدمات کو انجام دیتے تھے۔اسی دوران انہیں اردو زبان وادب سے گہرا لگاؤ ہو گیا جس کی وجہ سے وہ کبھی کبھی اپنی تخلیقی کاوشوں کو اخبار ''پریم'' میں شائع کرتے تھے۔انہوں نے کئی تنقیدی مضامین اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔جن کی وجہ سے انہیں جموں میں کافی سراہا گیا۔اس حوالے سے ان کے قابل ذکر مضامین میں خاص طور پر ''دکھیا دیس'' اور ''ریاستی فن کار'' وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ان کا پہلا تنقیدی مضمون ''دکھیا دیس'' نرسنگھ داس نرگس کے ایک افسانوی مجموعے کے حوالے سے تنقیدی جائزہ ہے۔گلزار احمد نے معمولا رام کوٹی (نرسنگھ داس نرگس) کے بیشتر افسانوں کا مطالعہ کیا تھا۔اسی لیے انہوں نے اپنے خیالات کو اس تنقیدی مضمون میں پیش کیا ہے اور ساتھ ہی معمولا رام کوٹی کی خوبیوں اور خامیوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔گلزار احمد فدا کے اس تنقیدی مضمون پر بحث کرتے ہوئے پروفیسر ظہور الدین احمد لکھتے ہیں:

"Former is the critical evaluation of a collection of short stories by Sh, Mamola Ramkoti (Narsingdass Nargis) . Being himself a short story writer and a critic . He makes

> an appreciable study of various short stories of the collection. Since he is also fully conversant with the entire development of fiction in urdu language, therefore, in this article he evaluated the contribution of Sh, Mamola Ramkoti in comparison with various other outstanding fiction writers of the language" (39)

1947ء تک گلزار احمد فدا نے جموں میں اردو شعر وادب کی خدمات میں نمایاں کردار ادا کیا ہے مگر تقسیم وطن کے بعد انہیں مجبوراً جموں کو ترک کرنا پڑا اور وہ سیالکوٹ (پاکستان) میں منتقل ہو گئے۔ اردو ادب سے انہیں اتنا لگاؤ تھا کہ سیالکوٹ میں جا کر بھی اس زبان کی خدمت انجام دیتے رہے۔ سیالکوٹ میں جا کر انہوں نے اپنا ایک اخبار' جہاد' کے عنوان سے جاری کیا تھا۔ جو کہ ایک ادبی اخبار تھا۔ جس میں بہت سارے ادیبوں کی تحریریں منظر عام پر آتی تھیں اور ساتھ ہی ساتھ خود گلزار احمد فدا اپنے مضامین میں ریاست جموں وکشمیر کے حالات کو بھی منظر عام پر لاتے رہتے تھے۔

گلزار احمد دفا کا دوسرا اہم تنقیدی وتحقیقی مضمون ''ریاستی فن کار'' ہے۔ ان کا یہ مضمون اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہے، کہ اس دور میں ریاستی قلمکاروں کا مختصراً ذکر کیا گیا ہے۔ اس مضمون میں جن ادیبوں کا ذکر کیا ہے ان میں خاص طور پر نرسنگھ داس نرگس، ساگر، معراج الدین احمد، محمد عمر نورالٰہی، محمد الدین فوق، عبدالعزیز الٰہی، اے۔ آر۔ مجوبہ، غلام حیدر چستی، پریم ناتھ پردیسی، کشن سمیل پوری، کیف اسرائیلی، محمود ہاشمی، ایم۔ اے عزیز، محمد شبیر، کشمیری لال ذاکر، قیس شیروانی، عشرت کشمیری، دولت رام گپتا، اقبال تمنائی، حمید نظامی، طالب گڈگانی، طالب کشمیری، عمادالدین سوز، حبیب کیفی، ازرعسکری، رسا جاودانی، رانا نظامی، کوثر سہابی، اختر فاروقی ملک عمر دین، عمر ہزین، محمد امین، محمد عشاق، لطیف ہاشمی، عزیز کاش، انور نقوی، جگدیش چندر کنول اور کندن لال کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس مضمون میں مصنف کا یہ مقصد تھا کہ ریاستی قلمکاروں کو منظر عام پر لایا جائے۔ جس میں گلزار احمد فدا بڑی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔

محمد بشیر:

ان کی پیدائش جموں میں ہی ہوئی تھی اور ابتدائی تعلیم بھی جموں سے حاصل کی تھی۔ محمد شبیر کی ابتدائی زندگی کے حالات وواقعات کے بارے میں محققین ومورخین نے بہت کم لکھا ہے۔ ان کے کچھ مضامین کی وجہ سے انہیں ریاست

جموں و کشمیر میں شہرت ملی تھی۔

محمد بشیر نے اگر چہ مضمون نگاری کے علاوہ دیگر اصناف ادب میں طبع آزمائی بہت کم کی تھی لیکن تنقید و تحقیق کے حوالے سے ان کے دو قابل ذکر مضامین منظر عام پر آئے تھے۔ان کے دونوں مضامین دکنی ادب کے بارے میں ہیں۔ پہلا مضمون ''اردو نثر کی تدریجی ترقی'' اور دوسرا مضمون ''غزل کی تدریجی ترقی'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا۔ان دونوں مضامین کو نہ صرف جموں میں اہمیت حاصل ہوئی ہے بلکہ انہیں دیگر ریاستوں میں اردو ادب سے تعلق رکھنے والے ادیبوں نے دلچسپی سے پڑھا۔بقول پروفیسر ظہور الدین:

"Mohd. Bashir too contributed a lot to the growth of reserch and literary criricism in the region. His two articles "Gazal ki Tadriji Tarraqqi" and "Urdu Nasar Ki Tadriji Tarraqqi" were very much appreciated both within and without the region" (40)

محمد بشیر کا پہلا مضمون ''غزل کی تدریجی ترقی'' دکنی دور تک ہے۔اس مضمون میں محمد بشیر نے دکنی دور کے تمام غزل گو شاعروں کے کلام کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے اور تقریباً ہر دور کے تمام شعرا کو منظر عام پر لایا ہے۔مصنف نے اس مضمون میں دکنی دور کے شاعروں کا بھی احاطہ کیا ہے۔اس تنقیدی اور تحقیقی مضمون کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس کا پہلا حصہ جموں کے مشہور اخبار ''پریم'' میں جولائی 1945ء کو منظر عام پر آیا تھا اور اس حصے میں انہوں نے اردو ادب کے شاعروں کے کلام کو 1857ء تک پیش کیا ہے اور اس دور تک جن شعرا کا تعارف پیش کیا گیا ہے ان میں قابل ذکر شعرا قلی قطب شاہ، ولؔی دکنی، مضموؔن، آبرؔو، مظہؔر، حاتؔم، میر تقی میرؔ مرزا سوداؔ، سوز، دردؔ، ناسخؔ۔خواجہ حیدر علی آتش، مرزا غالبؔ، مومن خاں مومؔن، داغؔ، امیرؔ، جلالؔ اور تسلیمؔ شامل ہیں۔اگر چہ یہ مضمون بہت مختصر ہے مگر پھر بھی محمد بشیر نے جس طرح سے اس کو پیش کیا ہے۔اس میں مذکورہ تمام شعرا کی بنیادی خصوصیات کو سامنے لایا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس دور کے دبستان دلی اور دبستان لکھنؤ کی تمام خصوصیات کا بھی ذکر کیا ہے۔

مضمون کا دوسرا حصہ محمد بشیر نے ''پریم'' اخبار سے اگست 1945ء میں شائع کیا تھا۔اس میں مصنف نے 1857ء سے 1945ء تک کے تمام شعرا کے کلام کو مختصراً طور پر بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔اس حصے میں محمد بشیر نے

زیادہ تر اردو ادب کے دو مشہور شعرا مولانا حالؔی اور محمد حسین آزادؔ کے کلام پر زیادہ بحث کی ہے اور ساتھ میں انجمن پنجاب کی بنیادی خصوصیات اور جدید غزل کی چند خوبیوں کو زیر بحث لایا ہے۔ اگر چہ اس مضمون میں مصنف نے تفصیل سے بحث نہیں کی ہے۔ مگر اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اگر مذکورہ بالا شعرا کے کلام کو ایک مضمون میں بحث کی جائے تو یہ ان کے کلام کے ساتھ ناانصافی ہوگی کیوں کہ ان کے کلام کا اگر سرسری طور پر بھی ذکر کیا جائے تو پوری کتاب شاید کم پڑھ جائے۔ لیکن پھر بھی محمد بشیر نے اس مختصر سے مضمون میں اہم معلومات پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے جن جدید شعرا کے کلام کا تعارف پیش کیا ہے۔ ان میں فانی بدایونؔی، اصغر گونڈویؔ، جگر مرادآبادیؔ، اسرار الحق مجازؔ، ساغرؔ، حفیظ جالندھریؔ، مجنون گورکھپوری اور تلوک چند محروم قابل ذکر ہیں۔

اسی طرح محمد بشیر کا دوسرا تحقیقی وتنقیدی مضمون ''اردو نثر کی تدریجی ترقی'' بھی قابل ذکر ہے۔ یہ بھی ان کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ اس مضمون کا آغاز مصنف نے دکن کے ایسے صوفی حضرات سے کیا ہے جن کا رتبہ اردو ادب میں بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔ محمد بشیر نے وجہیؔ کی ''سب رس'' کے متعلق جن باتوں کا اظہار کیا ہے بہت ہی قابل تعریف ہے۔ اس میں انہوں نے ''سب رس'' تصنیف کی اہمیت وافادیت کے تمام پہلوؤں کو سامنے لایا ہے اور وجہیؔ کی اس کتاب کو کن خصوصیات کی بنا پر اہمیت حاصل تھی، ان تمام خصوصیات کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے دیگر مصنفین کی تصانیف کا بھی جائزہ لیا ہے۔ جن میں فضل علی فضلؔی کی تصنیف ''وہ مجلس'' (کربل کتھا)، تحسینؔ کی ''نوطرز مرصع''، سوداؔ کا کلام ''دیوان سوداؔ'' اور انشاؔ کی تصنیف ''دریائے لطافت'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان تمام تصانیف کا مصنف نے مختصراً طور پر صرف تعارف پیش کیا ہے۔

اس کے بعد مضمون میں محمد بشیر نے فورٹ ولیم کالج سے تعلق رکھنے والے ادیبوں اور ان کی تصانیف کا بھی ذکر کیا ہے۔ جن میں خاص طور پر شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر، مولانا اسمعیل، رجب علی بیگ سرورؔ، فقیر محمود گویا، مرزا غالبؔ وغیرہ شامل ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ محمد بشیر نے دلی کالج اور علی گڑھ تحریک کی ادبی خدمات کا بھی مختصراً طور پر جائزہ پیش کیا ہے۔ حالاں کہ اس مضمون میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ محمد بشیر دلی کالج، فورٹ ولیم اور علی گڑھ تحریک کی خوبیوں اور خامیوں کو پیش کرتے مگر پھر بھی انہوں نے بہت ہی مختصر مگر قابل ذکر اور اہم معلومات کو منظر عام پر لایا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اس میں ''انجمن ترقی اردو'' اور ''دارالمصنفین اعظم گڑھ'' کی ادبی خدمات کا بھی مختصراً جائزہ پیش کیا ہے، جو بہت ہی

اہمیت کا حامل ہے۔ مضمون کے آخر میں محمد بشیر نے کچھ اردو کے اہم شخصیات کا جائزہ بھی پیش کیا ہے جن میں لالہ سری رام، احسان مارہروی، رشید احمد صدیقی، سلطان حیدر جوش اور سجاد حیدر یلدرم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کے یہ دونوں مضمون نہ صرف جموں میں اردو تحقیق وتنقید کے حوالے سے نمایاں ہیں۔ بلکہ پورے اردو ادب میں ان دونوں تنقیدی مضامین کی حیثیت قابل قدر ہے۔

اردو نثر کے حوالے سے ان کا ایک بہترین کارنامہ ان کی تصنیف ''کہکشاں'' ہے۔ جو جموں خطے کی تحقیقی وتنقیدی نوعیت کا اہم کارنامہ ہے۔ اس میں مصنف نے اپنے ادبی ذوق کے تحت اپنی سرزمین سے تعلق رکھنے والے ادباء وشعرا کا ایک پر معلومات تذکرہ تحریر کیا ہے۔ ان کا یہ نثری کارنامہ ضلع ڈوڈہ کی اہم تصانیف میں قابل تعریف مقام رکھتا ہے۔ اس تصنیف میں رند بھدرواہی نے بھدرواہ کے اردو، کشمیری اور بھدرواہی زبان کے ارباب فکر کی حالات زندگی اور ادبی خدمات کا بڑے بہترین انداز میں احاطہ کیا گیا ہے۔ ان کا یہ کارنامہ ایک بنیادی اور کلیدی ہے جس میں ضلع ڈوڈہ کے علاقہ بھدرواہ کی پوری تاریخ بیان کی گئی ہے۔ اس تصنیف سے بہت سارے ادبا وشعرا نے فیض اٹھایا ہے۔ اس کتاب کے ذریعے سے ایک مخصوص علاقائی ادب کی سمت ورفتار کی عکاسی بھی کی گئی ہے اور اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس دور میں بھدرواہ میں ادب سے تعلق رکھنے والے ادبا وشعرا کی کیا اہمیت وافادیت رہی ہے۔ اس کتاب میں بیک وقت مصنف نے تین زبانوں اردو، کشمیری اور بھدرواہی میں کی گئی شاعری ونثر نگاری کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

رند بھدرواہی:

''کہکشاں'' کے علاوہ رند بھدرواہی کے دو تحقیقی وتنقیدی مضامین بھی قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے یہ مضامین ''وفا بھدرواہی شخصیت اور فن'' اور ''غلام نبی ڈولوال جانباز'' کے عنوان سے تخلیق کئے تھے۔ یہ دونوں مضمون انہوں نے جموں خطے سے تعلق رکھنے والے بڑے ادیبوں کی ادبی خدمات کے حوالے سے پیش کیے تھے۔

عشرت کاشمیری:

عشرت کاشمیری کا تعلق جموں کے علاقہ کشتواڑ سے تھا وہ ایک مشہور ادیب، شاعر، انشاء پرداز، صحافی اور مورخ تھے۔ عشرت کاشمیری کی ولادت 23 دسمبر 1916ء کو ہوئی تھی۔

عشرت کاشمیری آل انڈیا کانگریس کی ورکنگ کمیٹی اور ریلوے بورڈ کے رکن بھی رہ چکے تھے۔ اسی طرح سے انہوں نے ریڈیو کشمیر جموں، ریاستی کلچرل اکیڈمی اور انجمن فروغ ادب جموں میں بھی کافی عرصہ تک خدمات انجام دیں۔

24اپریل1978ءکوعشرت کاشمیری جموں میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گئے۔عشرت کاشمیری کی یاد میں جموں میں بزم فروغ ادب کی جانب سے ہر سال یوم عشرت منایا جاتا تھا۔عشرت کاشیری کی شہرت کے چرچے نہ صرف ریاست جموں وکشمیر میں تھے بلکہ کئی دیگر ریاستوں میں بھی ان کی قابلیت کوسراہا جاتا تھااور پروفیسر جگن ناتھ آزادصاحب بھی انہیں اچھاادیب مانتے تھے۔

عشرت کاشمیری کی تصنیف ''تاریخ کشتواڑ'' تقریباً ایک سو چالیس صفحوں پر مشتمل ہے۔اس میں انہوں نے بہت سی کتابوں کے حوالے بھی دئے ہیں۔کتاب کے ہر باب میں اہم سے اہم ترین معلومات بیان کی ہیں۔باب اول میں انہوں نے اپنے انکشافات کے ثبوت میں ٹھوس حوالہ جات دئے ہیں۔

ولی محمد اسیر کشتواڑی صاحب اپنی کتاب میں پروفیسر فدامحمد حسین کا حوالہ دیتے ہوئے ان کے الفاظ اس طرح بیان کئے ہیں:

> ''عشرت کشتواڑ کے رہنے والے تھے اور انہیں اس علاقے کے ساتھ انتہائی محبت تھی۔وہ ادیب اور شاعر بھی تھے۔انہیں تمنا تھی کہ کشتواڑ کی تاریخ لکھی جاسکے۔ظاہر ہے کہ مصنف نے یہ تاریخ ٹھوس بنیادوں پر قلم بند کی ہے اور اس پر ان کے دلی جذبات کا گہرا اثر رہا ہے۔کشتواڑ کے ساتھ جو مصنف کولگاؤ پیدا ہو گیا تھا اسی نے انہیں کشتواڑ سے متعلق تحقیق کرنے کی تحریک دی۔یہی وجہ ہے کہ اس نے کچھ ایسے معلومات بہم پہنچائے جو سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔مشہور بدھ عالم ناگیسن کے بارے میں اس کی رائے یہ ہے کہ وہ کشتواڑ کا رہنے والا تھا۔بطور ثبوت وہ کہتا ہے کہ آج بھی کشتواڑ میں ایک ایسا علاقہ ہے جس کا نام ''ناگسون'' یا ''ناگ سین'' ہے اور مذکورہ علاقے کی وجہ تسمیہ مشہور بدھ عالم ناگسین ہے۔''(41)

عشرت کشمیری نے جموں میں اپنی ملازمت کے دوران ایک بزم ''بزم فروغ اردو'' کے نام سے بنائی تھی اور اس بزم میں ان کو ہی صدر کے طور پر منتخب کیا گیا تھا جہاں عشرت نے کافی عرصہ اس کام میں خدمات انجام دی۔عشرت کاشمیری نے اردو ادب کے کئی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی تھی۔ان کے تحقیقی،تنقیدی اور علمی مقالات میں ان کی اردو انشاپردازی کی اعلی صلاحیتوں کو ظاہر کرتے ہیں۔

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ عشرت کاشمیری علاقہ کشتواڑ کے ایک بہت بڑے عالم بزرگ ہیں۔انہوں نے دین و

مذہب اسلامی کے ساتھ ساتھ اردو زبان وادب میں بھی قابل قدر کارنامے انجام دیے ہیں۔عشرت کاشمیری کی وفات 24 اپریل 1973ء میں جموں میں ہوئی۔

پروفیسر اودے چند ٹھاکر:

خطہ جموں کے علاقے بھدرواہ کی سرزمین سے تعلق رکھنے والے اردو کے ادیب اودے ٹھاکر کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ پروفیسر اودے چند ٹھاکر کا اصلی وطن کوٹلی (بھدرواہ) تھا۔ان کی ابتدائی تعلیم بھی بھدرواہ سے ہی ہوتی تھی۔

اردو ادب میں ٹھاکر اودے چند کا مشہور کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے بہ حیثیت مورخ بھدرواہ کی قدیم تاریخ کا مطالعہ کر کے اور اس تاریخ کو کھوجنے اور مرتب کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ چنانچہ جب وہ بھدرواہ کالج میں بہ حیثیت لیکچرار تھے تو اس دور میں بھدرواہ کالج کے مشہور میگزین ''شاہین'' میں ٹھاکر اودے چند کے اکثر تنقیدی و تحقیقی مضامین شائع ہوتے رہتے تھے۔ان مضامین سے تاریخ بھدرواہ کی بہت سی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔اس وجہ سے ''تاریخ بھدرواہ'' کے اولین نقوش کے نمونے ہمیں پروفیسر اودے چند ٹھاکر کے ان تنقیدی اور تحقیقی مضامین میں ملتے ہیں۔ جو محققین کے لیے بہت ہی مفید ثابت ہوئے۔ اودے چند ٹھاکر کی سرپرستی میں بھدرواہ کی سیاسی تاریخ کے ساتھ ساتھ وہاں کی جغرافیائی، لسانی اور ثقافتی مواد بھی منظر عام پر لایا گیا تھا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ٹھاکر اودے چند کے مواد کے ساتھ ساتھ بھدرواہ کی تاریخ کو اگر لکھا جائے تو ان کا یہ مواد بہت ہی اہمیت اور قابلیت سے بھرا ہے۔جس کی وجہ سے ٹھاکر اودے چند کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔

ٹھاکر اودے چند کا انتقال 1985ء کے آس پاس بھدرواہ میں ہی ہوا تھا۔ولی محمد اسیر کشتواڑی صاحب نے اپنی کتاب میں پروفیسر اودے چند کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> '' 1971ء میں جب مجھے ان کی کلاس میں بیٹھنے کا موقع نصیب ہوا تو انہوں نے غلطی سے حاضری رجسٹر میں میرا نام ولی محمد کے بجائے علی محمد درج کیا تھا میرے اعتراض پر اپنا ردعمل ظاہر کرتے ہوئے یہ شعر کس دیا۔
>
> یہ مسائل تصوف، یہ تیرا بیان غالب
> تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

۔۔۔ان کے جیسا باریک نظر اور نکتہ رس پروفیسر بھدرواہ کالج کو دوبارہ نصیب نہ ہوا۔لیکن اس حقیقت سے کسی کو اعتراض نہیں ہوسکتا کہ ٹھاکر صاحب کی جملہ خوبیاں کسی ایک فرد میں مشکل سے نظر آئیں گی۔'' (42)

ٹھاکر اودے چند صاحب بھدرواہی زبان کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ بھدرواہ کالج کی میگزین ''شاہین'' میں چھپنے والے ان کے مضامین نہ صرف قابل قدر ہیں۔

فدآ کشتواڑی:

جموں خطے سے تعلق رکھنے والے ادیبوں میں فدآ کشتواڑی کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ان کا اصل نام عبدالرشید فدا کشتواڑی تھا۔انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اردو ادب کی خدمات میں صرف کیا ہے۔انہیں اردو اور کشمیری دونوں زبانوں میں مہارت حاصل تھی۔شاعری کے ساتھ ساتھ انہوں نے کئی نثری کارنامے بھی انجام دیے ہیں۔نثر میں ان سے زیادہ تر تواریخی اور ادبی نوعیت کے تنقیدی و تحقیقی مضامین ہیں۔فدآ کشتواڑی کی ولادت 28 اپریم 1936ء کو جموں خطے کے علاقے کشتواڑ میں ہوئی تھی۔

فدآ کشتواڑی کے ضلع ڈوڈہ کی کئی ادبی شخصیات پر اپنے تحقیقی وتنقیدی مضامین قلم بند کئے ہیں۔ان کا ایک مضمون بزم ادب ضلع ڈوڈہ کی شاہکار تصنیف انور فریدیہ میں ''انور فریدیہ میری نظر میں'' کے عنوان سے بہت ہی قابل تعریف مضمون ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس مضمون میں فدآ کشتواڑی نے ولی محمد اسیر کشتواڑی کے مضمون ''ضلع ڈوڈہ کی ادبی سرگرمیاں'' پر بھی تبصرہ کیا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

''انور فریدیہ میں شامل منظومات ضلع ڈوڈہ کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا ایک سرسری جائزہ ہے۔ بدقسمتی سے مرتبین نے اس کتاب کا نام انور فریدیہ رکھا ہے۔ جو کتاب میں مواد اور مندرجات مقصد اور افادیت سے میل نہیں کھاتا ہے جو کہ بالکل غیر موزوں اور نامناسب ہے۔ کیوں کہ حضرت شاہ محمد فریدالدین بغدادی ضلع ڈوڈہ میں اسلام لے کر آئے تھے نہ کہ شعر وشاعری کی محفلیں سجانے۔ ولی محمد اسیر کشتواڑی نے ضلع ڈوڈہ کا تواریخی اور جغرافیائی سروے کیا ہے اور کافی دماغ سوزی اور محنت کی ہے۔اگر یوں کہا جائے کہ دریا کو کوزے میں بند کرنے کی سعی کی ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔اس میں وہ کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں یہ کام قاری

کا ہے کہ وہ اعلی اور ادنی میں تمیز کرے۔ جہاں تک میری رائے کا تقاضا ہے مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ ولی محمد اسیر ایک اچھے انشا پرداز اور ادیب ہیں وہ ایک تحقیقی ذہن رکھتے ہیں۔ میں ایسے لوگوں کو بہت پسند کرتا ہوں۔۔۔۔۔اس کے علاوہ جدید اور قدیم ادب کے بارے میں بھی خاموش نظر آتے ہیں۔حالاں کہ کشتواڑ نے ماضی اور حال میں بڑے بڑے ادیب،شاعر،علما اور فضلا پیدا کیے ہیں۔''(43)

اس کے علاوہ فدآ کشتواڑی کا ایک اور تنقیدی و تحقیقی مضمون اہمیت کا حامل ہے جو'' کامگار مرحوم_ کچھ یادیں'' کے عنوان سے لکھا تھا۔اس مضمون میں انہوں نے کامگار کشتواڑی کی ادبی زندگی کے متعلق اہم معلومات فراہم کی ہے۔ فدآ کشتواڑی نے جہاں کامگار کشتواڑی کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی ہے وہی انہوں نے مذہبی اور سیاسی زندگی کے متعلق بھی خاص باتوں کا ذکر کیا ہے۔اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کامگار صاحب کو بچپن ہی سے علم دین سیکھنے اور وعظ و تبلیغ کا شوق تھا۔اس لیے وہ علم کی پیاس بجھانے کے لیے دور دور تک جاتے تھے۔ جہاں کہیں کسی عالم دین اور صاحب علم کا پتہ چلتا تو وہ دوڑے دوڑے وہاں فوراً پہنچ جاتے۔''(44)

فدا کشتواڑی نے بہت سی ایسی شخصیات کی تخلیقات کو تنقیدی جامع پہنایا ہے جس سے ادیبوں کی خوبیوں اور خامیوں کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔

سرتاج بھدرواہی:

ان کا اصل نام محمد اقبال سرتاج تھا۔ان کی پیدائش 28،فروری 1938، میں بھدروہ میں ہوئی تھی۔انہوں نے بہت سارے تحقیقی و تنقیدی مضامین شائع کیے ہیں۔ جو کافی اہمیت کے حامل ہیں۔سرتاج بھدرواہی نے جموں کے مشہور شعراء وادبا پر تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھے تھے۔ان شخصیات میں خاص طور پر ڈاکٹر مشتاق احمد بھدرواہی، رسا جاودانی، غلام نبی گونی، وفا بھدرواہی، ناشاد بھدرواہی،تنویر بھدرواہی اور دیوانہ بھدرواہی کے نام قابل ذکر ہیں۔ان مذکورہ بالا شخصیات کے کلام کا سرتاج بھدرواہی نے خوب مطالعہ کیا تھا اور اس کے بعد ان پر مضامین قلم بند کئے تھے۔

سرتاج بھدرواہی نے حضرت شاہ محمد فرید الدین بغدادی اور ان کے صاحب زادوں کے حوالے سے ایک بہت ہی عمدہ کتاب مرتب کی تھی۔اس کتاب کے بارے میں بہت سارے جموں خطے سے تعلق رکھنے والے مورخین و محققین

نے کیا ہے۔مگر راقم کو اس کتاب تک رسائی حاصل نہ ہو پائی۔البتہ اتنا ضرور ہے کہ اس کتاب کے بارے میں بہت سے تصانیف میں ذکر مل جاتا ہے۔اس میں ایک تصنیف ولی محمد اسیر کشتواڑی کی بھی ہے۔

سرتاج بھدرواہی کی تصنیف ''بغداد سے کشتواڑ تک'' کے عنوان ہے۔اس کتاب کا ایک مسودہ ولی محمد اسیر کشتواڑی کے پاس ہے اورانہوں نے اپنی کتاب میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''سرتاج صاحب نے حضرت شاہ محمد فریدالدین بغدادی اوران کے صاحب زادوں سے متعلق ایک اچھی کتاب مرتب کی ہے جس کا مسودہ میری نظر سے گزرا۔اس غیر مطبوعہ کتاب میں موصوف نے تاریخ کشتواڑ کے اہم واقعات نقل کرنے کے بعد شاہ صاحبان کے حالات زندگی اور کشف وکرامات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔اس کتاب کا نام انہوں نے''مبلغ اعظم''بغداد سے کشتواڑ تک رکھا ہے۔''(45)

سرتاج بھدرواہی کے چند مضامین اور کتابچوں کے علاوہ اردو ادب میں ان کی تحریروں کا کہیں ذکر نہیں ملتا ہے۔

غلام حیدر چشتی:

صوبہ جموں کے اردو زبان ادب میں خاص طور پر تحقیق وتنقید کے میدان میں غلام حیدر چشتی کا بھی ایک اہم نام ہے۔اگر چہ ان کی تاریخ پیدائش اور ابتدائی زندگی کے بارے میں معلومات دستیاب نہ ہوسکی ہے مگر اردو ادب میں ان کا نام کافی اہمیت کا حامل ہے۔مگر اردو نثر کے حوالے سے ان کا سب سے اہم کارنامہ ان کی کتاب''اصلاح ادب'' کے عنوان سے ہے جو تحقیقی وتنقیدی مضامین پر مبنی ہے۔

غلام حیدر چشتی نے جموں میں''بزم سخن'' میں کافی عرصہ اپنی خدمات انجام دی تھی۔اس کے بعد انہوں نے ''بزم ادب جموں'' میں بھی کام کیا تھا۔پروفیسر ظہورالدین نے ان کے بارے میں اپنی کتاب میں ایک جگہ ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "Gulam Hyder Chishti was famous Urdu writer of the region before partition and wrote both poetry and prose. His articles in criticism were particularly, appreciated in the literary circle. In his esays he laid much stress on the

proper use of words and their various other gramatical aspects.He was elected as secretary of Bazm-i-sukan, later Bazm-i-urdu jammu, for a number of times between1924-47"(46)

غلام حیدر چشتی کی مشہور تصنیف ''اصلاح ادب'' 1939ء میں منظر عام پر آئی تھی۔اس میں اردو زبان و ادب کے اصلاحی ادب پر بحث کی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اردو گرائمر پر بھی انھوں نے بحث کی ہے۔

برج پریمی:

حرف جستجو: برج پریمی کی یہ تصنیف مضامین کے حوالے سے ہے، اس میں تقریباً بار مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ برج پریمی کی یہ تصنیف ان کے مضامین کا اولین مجموعہ ہے۔ یہ کتاب ریاستی کلچرل اکادمی کی جانب سے 1982ء میں منظر عام پر آئی تھی۔ اس کا پیش لفظ پروفیسر شکیل الرحمٰن نے لکھا تھا جس کے مطالعے سے ڈاکٹر برج پریمی کی تنقیدی اور تحقیقی صلاحیتوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یوپی اردو اکادمی کی جانب سے اس تصنیف پر برج پریمی 1982ء میں گراں قدر اعزاز سے بھی نوازا گیا تھا۔

جلوۂ صد رنگ: ''جلوۂ صد رنگ'' کشمیر کی تاریخ کلچر اور تہذیب وغیرہ کے موضوعات کی عکاسی کرتی ہے۔اس میں کل تیرہ مضامین شامل ہیں۔ یہ کتاب 1985ء میں پہلی بار کلچرل اکادمی ریاست جموں وکشمیر کے مالی تعاون سے منظر عام پر آئی۔ برج پریمی کشمیر کے تہذیب وثقافت سے بخوبی واقف تھے انھوں نے جس طرح سے اپنے وطن کشمیر کی منظر کشی کی ہے وہ واقعی قابل تعریف ہے۔خود ایک جگہ کشمیر کی ملی جلی تہذیب اور قومی یکجہتی کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہندو مہاراجاؤں کے وقت میں گونجتی ہوئی شنکھ کی سریلی آوازیں، بودھ کلچر کا ''بدھ گن چھم سرنامے'' اسلام کی توحیدی صدائیں ، افغانوں اور مغلوں کی جمالیاتی حسن سکھوں اور ڈوگروں کی دلاوری۔ یہ سب اب بھی یہاں کے پتھروں دروں اور دیواروں ، باغوں او ریپڑوں کی جھومتی ہوئی ڈالوں اور کومل دھرتی کے پپوٹوں میں مسکرارہا ہے۔وقت کے بے رحم ہاتھوں نے اگرچہ ان نقوش کی پھیکا کر دیا ہے لیکن یہ نقش لازوال ہیں اوراب بھی وقت کے

پیکراں وجود کو چیرتے ہوئے صدیوں پرانی یادیں زندہ کرتے ہیں‘‘۔(47)

اس کے علاوہ بھی ان کی اس کتاب میں کئی مضامین ایسے ہیں جن میں وادیٔ کشمیر کی ہر شئے کی بھرپور عکاسی دیکھنے کو ملتی ہے۔ بقول محمد یوسف ٹینگ:

’’برج پریمی نے اس کتاب میں کشمیر کی تواریخ وتمدن کے وسیع گوشوں کو کھلی ہوئی نگاہوں سے دیکھا ہے‘‘۔(47)

’’سعادت حسن منٹو: حیات اور کارنامے‘‘ یہ تصنیف برج پریمی کا تحقیقی مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی ہے جو انھوں نے ممتاز افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کی حیات اور ان کے کارناموں پر لکھا ہے۔اس کتاب پر کشمیر یونیورسٹی کی جانب سے برج پریمی کو 1976ء میں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی تھی۔اس کتاب کو برصغیر ہندوپاک کے ادبی حلقوں میں بے حد سراہا گیا تھا۔

’’ذوق نظر‘‘ برج پریمی کی یہ کتاب گیارہ مضامین پر مشتمل ہے۔1987ء میں یہ کتاب ریاستی کلچرل اکادمی کی مالی معاونت سے منظر عام پر آئی۔اس کتاب کے بارے میں خود برج پریمی رقمطراز ہیں:

’’ذوق نظر‘‘ میرے مضامین کا نیا مجموعہ ہے اس مجموعے میں میرے گیارہ مضامین شامل ہیں۔جو تنقید وتحقیق، ادب، فلم اور فن کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ مجھے پیشہ ور ناقد اور محقق ہونے کا دعویٰ نہیں۔البتہ فن، ادب، ثقافت اور آرٹ کے مختلف شعبوں سے گہری دلچسپی ہے۔ان کے بارے میں غور وفکر کرتا رہتا ہوں اور اپنا ردِعمل اپنی تحریروں میں پیش کرتا ہوں۔ یہ مضامین میرے سوچ وفکر اور میرے ذہنی رویوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس مجموعے میں شامل بیشتر مضامین ملک کے مختلف معروف رسائل وجرائد میں شائع ہو چکے ہیں اور ان کی پذیرائی بھی ہوئی ہے‘‘۔(48)

برج پریمی کی ادبی خدمات کا اگر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے زیادہ تر پریم ناتھ پردیسی، منٹو اور کشمیر جیسے موضوعات پر زیادہ دلچسپی لی ہے۔مجموعہ ’’ذوق نظر‘‘ میں انھوں نے ذاتی لمس کے ساتھ ساتھ اردو ادب کی دو بڑی شخصیات کے خاکے بھی پیش کیے ہیں۔ برج پریمی کی تحریریں اتنی دلکش اور پراثر ہیں کہ کتاب پڑھتے ہوئے ایسا لگتا ہے جیسے پروفیسر عبدالقادر سروری اور طالب کاشمیری کی شخصیتیں ہماری نظروں کے سامنے چل پھر رہی ہوں۔اتنی متضاد

المصفات شخصیات پر لکھنا اوران کے بیرون اور اندرون کی سیر کرانا بڑی پیچیدگی کا عمل تھا جسے برج پریمی نے بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔ یہ شخصی خاکے ہمیں ایک بستی کی روحانی بالیدگی سے متعارف کراتے ہیں۔ جو اجڑی ہوئی ہونے کے باوجود آباد رہے۔

اس مجموعے کے بعض مضامین کافی مختصر اور تشنہ ہیں اس بات کا اعتراف خود انہیں بھی ہوا ہوگا۔ اس کتاب کے تقریباً مضامین مختلف اوقات پر ریڈیو کے لیے قلم بند کیے گئے تھے۔ جس کے لیے یہ بالکل کھرے اترتے تھے لیکن کتابی صورت میں شائع ہونے سے قبل اگر ان مضامین میں ترمیم واضافہ کیا ہوتا تو اس کتاب کی شان اور بڑھ جاتی بہر حال کتاب میں شامل مضامین مختلف رسائل وجرائد سے منظر عام پر آچکے تھے اس کے بعد ان کو کتابی شکل دی گئی۔ ''ہمارا ادب'' کے جموں وکشمیر نمبر میں برج پریمی کا ایک اہم تحقیقی مضمون '' آثار قدیمہ'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ جس کی بے حد پذیرائی ہوئی تھی۔

چند تحریریں۔ برج پریمی کی یہ تصنیف 254 صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں تقریباً 23 مضامین شامل ہیں ۔جس میں خاص طور پر تحقیق، تنقید، تجزیے، ترجمے، مختصر سفرنامے، انشایئے، فلم سے متعلق مضامین، دیومالا پر استوار کہانیاں اور تراجم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس مجموعے پر شیرازہ میں تبصرے کرتے ہوئے منظور احمد بابا رقمطراز ہیں:

> ''اس مجموعے میں اردو ادب کے ہلکے اور گہرے رنگوں کی آمیزش سے ایک خوبصورت قوس قزح بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان تحریروں میں مصنف کے مختلف اور بدلے ہوئے Style ملتے ہیں یہ بدلے ہوئے رنگ وروپ کی شخصیت کے مظہر ہیں۔ جس کی وجہ سے چند تحریریں مصنف کی جلوۂ تمثال ذات ہوگئی ہے''۔(49)

اس لحاظ سے یہ ایک مجموعہ اپنے اندر کئی موضوعات پر مشتمل ہے ان مضامین کو برج پریمی کے فرزند پریمی رومانی نے 1988ء میں کشمیر سے شائع کیا۔ اس کتاب کے ابتدائی مضامین تحقیقی وتنقیدی نویت کے حامل ہیں۔ مزید مضامین سعادت حسن منٹو سے متعلق ہیں۔ ان مضامین سے مصنف کی وسعت نظری اور تنقیدی وتحقیقی صلاحیتوں کا بھر پور اندازہ ہوتا ہے ساتھ ہی ساتھ اسلوب کی سناخت بھی ہوجاتی ہے۔ یہ اسلوب براہ راست محسوس کرنے والا اسلوب ہے جس کی بے ساختگی اور شگفتگی قاری کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہ سادا، سلیس، غیر پیچیدہ اور معلوماتی انداز سیدھا پڑھنے والے کے دل میں اتر جاتا ہے۔ ''سفرنامہ گوا'' میں نثر کی شگفتگی اور برجستگی ایک نیا ترنم لے کر آتی ہے۔ اس نثر میں تعمیری حسن

کے علاوہ علمیت اور شعریت کا امتزاج بھی ہے۔ایسی لطیف نثر صرف برج پریمی کا حصہ ہی ہوسکتی ہے۔

کشمیر کے مضامین: برج پریمی کی کتاب 1989ء میں ریاست جموں وکشمیر کلچرل اکیڈمی کی جانب سے منظر عام پر آئی۔کشمیر کے مضامین برج پریمی کی کشمیریات کے موضوعات پر ایک قابل قدر تصنیف ہے۔اس میں انھوں نے کشمیر کی ثقافت، تاریخ، ادب کے ساتھ ساتھ ان شخصیات کا بھی احاطہ کیا ہے جنہوں نے کشمیریات سے متعلق لکھ کر کشمیر کا نام ساری دنیا میں روشن کیا۔ان شخصیات میں گوبند کول، پریم ناتھ پردیسی، پریم ناتھ درد، لل دید، مہجور اور پروفیسر سروری کے نام قابل ذکر ہیں۔ برج پریمی نے ان شخصیات کا جائزہ لے کر ان کے ادبی کارناموں کو اجاگر کیا ہے۔اس طرح سے انھوں نے کشمیر کے حقیقی فرد ہونے کا ثبوت بھی فراہم کیا ہے۔

1990ء میں برج پریمی کی اچانک وفات کی وجہ سے ان کے بہت سے مسودے بکھری ہوئی شکل میں تھے لیکن ان کے بیٹے پریمی رومانی نے ان تمام مسودات ومخطوطات کو ترتیب دے کر شائع کیا۔اس طرح سے نہ صرف انھوں نے اپنے والد کی قیمتی تحریروں کو محفوظ رکھا بلکہ اردو زبان وادب کی محفلوں میں بھی خوب نام کمایا۔

پریمی رومانی نے اپنے والد صاحب کی تحریروں کو اکٹھا کر کے نہ صرف منظر پر لانے کی کوشش کی بلکہ ان تصانیف میں ترمیم واضافہ کر کے وقتاً فوقتاً شائع کرتے رہے۔ پریمی رومانی نے برج پریمی کی جن تصانیف کو شائع کیا ان میں صدمیر، جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشوونما، منٹو کتھا، سپنوں کی شام اور مباحث وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

''صدمیر'' برج پریمی کی یہ کتاب صدمیر پر لکھا ہوا موتی لال ساقی کا تبصرہ تھا جس کو بعد میں برج پریمی نے ترجمہ کیا تھا۔ یہ کتاب ساہتیہ اکادمی کے ذریعہ منظر عام پر آئی چونکہ ساہتیہ اکادمی برسوں سے ہندوستان کی مختلف زبانوں میں محققین سے ہندوستانی ادب کے معمار سیریز کے تحت مونوگراف لکھوا کر شائع کرتی آرہی ہے ساتھ ساتھ اکادمی کی جانب سے ترجمہ کا کام بھی بخوبی انجام دیا جارہا ہے۔اسی وجہ سے کشمیری زبان کے ایک مشہور اور صوفی شاعر صدمیر پر موتی لال ساقی کا کشمیری زبان میں لکھا ہوا ایک مونوگراف تھا۔اس کتاب کو اکادمی نے برج پریمی سے اردو میں ترجمہ کروایا تھا جو ان کے انتقال کے تقریباً دو سال بعد یعنی 1992ء میں منظر عام پر آیا۔

''جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشوونما''۔ برج پریمی کی ایک قابل قدر تصنیف ہے۔اس میں شامل مضامین کی نوعیت تحقیقی وتنقیدی ہے۔جموں وکشمیر میں افسانہ، ناول، ڈراما، صحافت، تنقید، ترقی پسند تحریک، ریاستی کلچرل اکادمی کی ادبی خدمات، ریاست کے تمدنی ادارے وغیرہ جیسے موضوعات پر برج پریمی نے سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔اس کے علاوہ

جموں وکشمیر میں اردو ادب کے بعض نمائندہ فن کاروں کی شخصیت اوران کی ادبی خدمات پر بھی برج پریمی نے تبصرے کیے ہیں۔یہ کتاب 1992ء میں کشمیر سے شائع ہوئی تھی۔اس کتاب کا پیش لفظ موتی لال ساقی جو ریاست کے بڑے لکھنے والوں میں شامل ہوتے ہیں نے لکھا ہے اور برج پریمی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

''پریمی نے ریاست میں اردو کی نشو ونما کے سلسلے میں اچھا کام کیا ہے اور مستقبل کے محققین کے لیے تحقیق کی بنیادوں کو استوار کیا ہے کتاب کا وہ حصہ خاص طور پر قابل ذکر ہے جس میں ریاست کے نمائندہ اردو فنکاروں پر قلم اٹھایا گیا ہے۔کتاب کے اس حصے میں توسیع کی مزید گنجائش ہے اور کچھ نمائندہ لوگوں کا اس میں ذکر نہیں ہوا ہے جن میں مولانا محمد سید مسعودی، شمیم احمد شمیم، شہ زور کاشمیری، دینا ناتھ مست، عبدالصمد وانی، میر عبدالعزیز، چراغ حسن حسرت کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔پریمی کتاب کو ایک مبسوط مربوط اور تاریخی دستاویز بنانے کے درپے تھے مگر حالات کی دوش اور موت کے ظالم ہاتھوں نے اسے ایسا کرنے سے باز رکھا۔پھر بھی ہمارے سامنے جو کچھ بھی ہے وہ ہر لحاظ سے قابل قدر ہے اور قابل غور بھی''۔(50)

اس کتاب میں برج پریمی نے ریاست کی نمائندہ شخصیات کا تفصیلاً ذکر کیا ہے مگر اس دور میں چند ایسی شخصیات بھی تھیں جن کا تفصیلاً ذکر اس کتاب میں ہونا ضروری تھا جن کا ذکر پیش لفظ میں موتی لال ساقی نے بھی مذکورہ بالا اقتباس میں کیا ہے۔

منٹو کتھا: یہ کتاب 1994ء میں شائع ہوئی تھی۔ برج پریمی نے منٹو کی شخصیت اور ان کے فن کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔اس کتاب کو سنجیدہ ادبی حلقوں نے کافی سراہا اور اس کو منٹو پر ایک لازوال تصنیف قرار دیا گیا تھا۔بقول پروفیسر قمر رئیس:

''منٹو کتھا منٹو شناسی کے میدان میں ان کے دوسرے اہم کارنامے کا درجہ رکھتی ہے''۔

(51)

بر پریمی کی یہ کتاب ان کے مشہور تصانیف میں سے ایک ہے اس میں انھوں نے منٹو کی شخصیت اور ان کے خاندان کی پوشیدہ پہلوں کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔

جموں میں اردو تحقیق وتنقید 1947ء کے بعد

جہاں ایک طرف سے ریاست جموں وکشمیر میں محققین و نقادوں کا ذکر اہمیت کے حامل ہے۔ وہیں دوسری طرف خطہ جموں میں بھی بہت سارے ایسے نام پیدا ہوئے جنھوں نے اردو تحقیق وتنقید کی روایت کو آگے بڑھانے میں بھر پور آزمائش کیں۔ راقم الحروف نے پچھلے صفحات میں 1947ء تک کے تحقیق وتنقید کو پیش کیا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد جموں خطے میں جن نقادوں ومحققین نے اہم رول ادا کیا ہے ان میں ڈاکٹر برج پریمی، پروفیسر ظہور الدین، پشکر ناتھ، ہر بھگوان شاد، موہن یاور، نند کمار باؤا، منشور بانہالی، اسد فریدی، مشتاق فریدی، رند بھدرواہی، مشتاق پوگلی، ریاض احمد نجار، مرغوب بانہالی، بشیر بھدرواہی، مشتاق کشتواڑی، شہاب عنایت ملک، محمد اسد اللہ وانی، غلام مصطفےٰ عشرت، شام لعل کالرا، گیان چند جین، منظر اعظمی، جنگ ناتھ آزاد، پریمی رومانی، مشتاق احمد وانی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مشتاق فریدی:

ان کا اصل نام شیخ غلام علی تھا مگر اردو دنیا میں انھیں مشتاق فریدی کے نام سے اہمیت حاصل ہوئی۔ مشتاق فریدی 22/فروری 1941ء کو جموں خطہ کے ضلع ڈوڈہ میں پیدا ہوئے۔

تحقیق وتنقید کے حوالے سے مشتاق فریدی صاحب کے بہت سارے تحقیقی وتنقیدی مضامین مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ اگر چہ انھوں نے بہت کم لکھا ہے مگر جو بھی لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں اپنی تخلیقی کاوشوں میں بہت ہی محنت سے کام لیا ہے۔ ان کی پہلی تحقیقی تصنیف ''انور فریدیہ'' رند بھدرواہی کی کتاب اس میں ان کا مضمون شامل ہے۔ اس مضمون کو بعد میں ضلع ڈوڈہ کی ایک ضخیم کتاب ''انور فریدیہ'' میں شامل کر کے شائع کیا گیا تھا۔ مصنف کا یہ مضمون ضلع ڈوڈہ کی ثقافتی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ ان کا یہ مضمون کافی طویل ہے جسے انھوں نے 66 صفحات پر مشتمل کیا ہے۔ ان کا لکھا ہوا یہ مفصل مقالہ ضلع ڈوڈہ کی صحافت کے ابتدا وارتقاء پر کافی اہم مواد فراہم کرتا ہے۔ اس مقالے سے بہت سارے ادیبوں نے استفادہ کیا ہے۔

اسی طرح سے ''ہمارے تعلیمی وسائل ومسائل'' بھی ایک اچھا مقالہ ہے اس طویل مقالے سے نہ صرف ضلع ڈوڈہ کی تعلیمی ماحول کی معلومات فراہم ہوتی ہے بلکہ اس مقالے میں انھوں نے عالمی نظام تعلیم کی خامیوں اور خوبیوں پر روشنی ڈالی ہے۔

اس کے علاوہ ضلع ڈوڈہ کی ایک اور مشہور کتاب ''پس افق'' میں شامل مشتاق فریدی کا ایک مقالہ ''جانباز کی

مزاحیہ شاعری'' کے عنوان سے ہے۔اسی طرح سے''ڈوڈہ ماضی اور حال کے تناظر میں'' بھی مشتاق فریدی کا اہم مضمون ہے۔اس میں انھوں ضلع ڈوڈہ کی تاریخی پہلو کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔اس کے علاوہ مصنف نے کچھ شخصی مضامین بھی لکھے تھے جن میں ان کا ایک خاص مضمون''مظہر امام جیسے شعروادب سے نفرت تھی'' قابل ذکر ہے۔ان کا یہ مضمون ماہنامہ''لمحہ فکریہ نئی دہلی'' سے منظر عام پر آیا تھا۔

اسی طرح سے انھوں نے اپنے مضمون''مظہر امام جیسے شعرادب سے نفرت تھی'' میں بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> ''مظہر امام کی دلآویز شخصیت،خوشبوؤں میں ڈوبا ہوالب ولہجہ شعر پڑھنے کا منفرد انداز ان کو سراپا غزل بنادیتا ہے۔ان کی تہہ دار شخصیت میں بلا کی کشش ہے۔بحثیت بلند قامت شاعرواد یب ان کا اندز خرام کسی ساحرہ سے کم نہیں''۔(52)

اس کے بعد مشتاق فریدی کے دو اور اہم مضمون جن میں''دل دیاں گلیاں''ضلع ڈوڈہ کے مشہور افسانہ نگار خالد حسین کی افسانہ نگاری پر لکھا ہے۔ اور دوسرا مضمون تصوف اور اہل تصوف سے متعلق بہترین مضمون ہے۔

پروفیسر ظہورالدین:

پروفیسر ظہورالدین نے جہاں علمی وادبی دنیا میں ایک الگ پہچان بنائی ہے۔انہوں نے انتظامی امور میں بھی کئی کارنامے انجام دیے ہیں۔جموں یونی ورسٹی کے حوالے سے پروفیسر ظہورالدین کا نام بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔انہوں نے متعدد عہدوں پر اپنے کارنامے انجام دیئے ہیں۔جن میں وہ جموں یونی ورسٹی کے رجسٹرار، کنٹرولر اور دوبار صدر شعبہ بھی رہ چکے ہیں۔اس کے علاوہ وہ اپنی صدارت کے دوران میں کئی قومی اور بین الاقوامی سیمنار، ورکشاپ، کانفرنس اور کئی اہم ادبی انجمنیں بھی کرا چکے ہیں۔انہوں نے اپنی ایم۔اے کی تعلیم کے دوران سے ہی چند ایسے مضامین تحریر کیے تھے جو جموں خطے کی تحقیقی اور تنقیدی نوعیت میں اہم ہیں۔اس کے بعد انہوں نے اپنی تحقیقی تخلیقات کی وجہ سے کافی مہارت حاصل کی۔جموں کے ترقی پسندی ادیبوں میں بھی ایک خاص مقام حاصل کر چکے ہیں۔ان کے ہم عصر ادیبوں میں جن کا تعلق ترقی پسندوں سے رہا ہے۔ان میں خاص طور پر موہن یاور، ٹھاکر پونچھی، رام کمار ابرول، کشوری منچندہ،

یش سروج، کرن کاشمیری، اوپی شرما، آنند لہر وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ پروفیسر ظہور الدین ضلع ادھم پور کی ایک تحصیل رام نگر کے کوہستانی علاقہ میں پیدا ہوئے تھے۔لیکن ملازمت کے سلسلے میں جموں آئے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ پروفیسر ظہور الدین نے نہ صرف ترقی پسند اردو افسانہ کی عظمت کا خیال رکھا بلکہ جدیدیت کے روشن اور مثبت پہلوؤں کا بھی خیر مقدم کیا۔

ان کی تنقیدی اور تحقیقی تحریروں میں ''تفکرات'' (تنقیدی مضامین)، ''محروم کی شاعری'' (تلوک چند محروم پر مقالہ)، ''بیسویں صدی کے اردو ادب پر انگریزی کے ادبی رجحانات'' (پی۔ایچ۔ڈی کا مقالہ)، ''حقیقت نگاری اور اردو ڈراما'' (تحقیق وتنقید) ''Development of Urdu Language and Literature an Jammu Region''، (ڈی لٹ کا مقالہ)، ''تعلیل وتاویل'' (تنقیدی مضامین)، ''ارمغان آزاد'' (تنقید)، ''تنقیدی مباحث وتجزیے''، (تحقیقی وتنقیدی مضامین)۔ وغیرہ اہم کارنامے ہیں۔

پروفیسر ظہور الدین صوبہ جموں کے بیسویں صدی کے ادیبوں میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ دراصل اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ بیسویں صدی کے شروع ہونے سے پہلے ہی ملک بھر میں سیاسی، سماجی، اقتصادی، معاشی اور ادبی تحریکوں نے جنم لیا۔ اس سے متاثر ہو کر انھوں نے اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ ''بیسویں صدی کے اردو ادب پر انگرزیزی کے ادبی رجحانات'' پروفیسر گیان چند جین کی نگرانی میں مکمل کیا۔ ان کا یہ مقالہ 1972ء میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔ ریاستی کلچرل اکیڈمی کی جانب سے یہ مقالہ 1978ء میں منظر عام پر آیا۔ اس مقالے میں انہوں نے بیسویں صدی کے آغاز سے ساتویں دھائی تک عالمی سطح پر جو بھی ادبی رجحانات سامنے آئے تھے اور ان میں خاص طور پر جن رجحانات کی وجہ سے اردو ادب متاثر ہوا ان تمام رجحانات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سے ان کی محققانہ صلاحیتوں کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ اس مقالے کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پروفیسر ظہور الدین نے اپنے اس مقالے کو کامیاب بنانے کے لیے بہت محنت اور لگن سے کام لیا ہے۔ جس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ انہوں نے اپنے اس مقالے میں ایسے نکات واصول بیان کئے ہیں جو موجودہ دور کے طلبہ کے بس کی بات نہیں ہے۔ انہوں نے ادب کی غرض وغایت، اشاریت، تاثریت وغیرہ جیسے موضوعات کو تنقیدی نظریات کے ساتھ زیر بحث لایا ہے اور ہر موضوع میں اہم مواد فراہم کیا ہے۔ ایک جگہ پر رومانیت کی تعریف کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہوں:

''لفظ ''رامانٹک'' سب سے پہلے سترھویں صدی عیسوی کے نصف میں اس ادب کے لیے استعمال کیا گیا جو فرضی موضوعات کا حامل تھا کچھ وقت کے بعد اس مفہوم میں تبدیلی رونما ہوئی اور اب اسے قدرتی مناظر کے بیان کے لیے استعمال کیا جانے لگا اور ایک سو سال تک یہ لفظ اسی مفہوم کی ترجمانی کے لیے رہا۔ رفتہ رفتہ یہ مفہوم بھی بدلا اور بالآخر اسے جذبے اور وجدان کی تجدید کے لیے مخصوص کیا گیا۔''(53)

مذکورہ بالا مقالے میں مصنف نے صرف متقدمین کی باتوں پر اتفاق ہی نہیں کیا بلکہ اس میں بہت سارے ترامیم و اضافے بھی کئے ہیں جو ان کی علمی بصیرت اور ثقافتی مطالعے میں ایک اہم اضافہ بن جاتا ہے۔ پروفیسر ظہور الدین نے اردو ادب میں متعدد کتابیں شائع کرنے کے علاوہ مختلف سمیناروں اور رسائل و جرائد کے لیے کئی تنقیدی و تحقیقی مضامین بھی تخلیق کئے۔ جو ریاست اور بیرون ریاست کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ ان کی تنقیدی اور تحقیقی تخلیقات کا جائزہ لینے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے شعر و ادب کی ماہیت اور قدیم ادبی تصورات و نظریات کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہوا تھا اور ایک ادیب کو مختلف تصانیف کے مطالعے سے ہی اس کی قلم میں زور پیدا ہوسکتا ہے، یہ خوبی ظہور الدین صاحب میں صاف طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ جس کا اندازہ ان کی تخلیقات سے لگایا جاسکتا ہے۔ اس حوالے سے ان کی بہترین تصانیف میں سے ایک ''جدید ادبی تنقیدی نظریات'' اہمیت کی حامل ہے۔ ان کی یہ کتاب 2005ء میں منظر عام پر آئی تھی۔ ظہور الدین صاحب ترقی پسندی سے کافی متاثر تھے۔ اس حوالے سے انہوں نے ایک جگہ لکھا ہے:

''یہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی باشعور ادیب ادب کو سماج اور ماحول سے جدا کرنے کی جسارت نہیں کرسکتا اور نہ سماج و ماحول سے جدا کر کے اس کی صحیح قدر و قیمت متعین کی جاسکتی ہے۔ ترقی پسندوں سے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پیدا کی گئی ہیں جن کے ازالے کے لیے کی گئی کوششوں میں سے چند کا اعادہ یہاں بے جا نہ ہوگا۔ کچھ لوگ ترقی پسندی کو محض بھوک اور پیاس سے وابستہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں حالاں کہ ایسا سوچنا ترقی پسندی کی صریحاً توہین ہے۔ بھوک اور پیاس ان کے لاتعداد مضامین میں ایک مضمون ہے۔ لیکن یہی ترقی پسندی نہیں۔''(54)

پروفیسر ظہورالدین کی یہ کتاب ان کی برسوں کی محنت کا نتیجہ ہے۔جس میں انہوں نے مغربی ممالک کے نئے ادبی رجحانات سے مستند حوالوں کی مدد سے اردو کے قارئین کو متعارف کرانے کی بھرپور سعی کی ہے۔ان کی یہ کتاب چودہ ابواب پر مشتمل ہے اوراس میں تصنیف کا ہر باب ایک منفرد اہمیت رکھتا ہے۔ایک جگہ پر وہ نئی تنقید سے متعارف کرواتے ہوئے لکھتے ہیں:

''نئی تنقید دراصل ادب کو سمجھنے سمجھانے اوراسے پرکھنے کا ایک نیا انداز ہے۔یہ بنیادی طور پر اس مکتبہ فکر کی نمائندگی کرتی ہے جو ادب کی قدر و قیمت متعین کرنے سے پہلے اس کی تفہیم پر زور دیتا ہے۔یوں سمجھ لینا چاہیے کہ یہ تفہیم ادب کو زیادہ سے زیادہ موثر و جاگزیں بنانے اوراسے ادب کی قدر شناسی کے وسیلے کے طور پر برتنے پر زور دیتی ہے۔یہ نقاد یا قاری سے یہ تقاضا کرتی ہے کہ وہ اپنی چشم بصیرت پر کسی طرح کا کوئی چشمہ چڑھائے بغیر ادب کو اس کے اپنے رنگ میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرے اوراس سے کوئی ایسا تقاضا نہ کرے جس سے اس کا کوئی تعلق واسطہ نہ ہو۔نئی تنقید کی اصطلاح سب سے پہلے امریکی نقاد جیول اسپنگارن نے 1910ء میں کولمبیا یونیورسٹی میں دیے اپنے خطبے میں ان تنقیدی افکار کے لئے استعمال کی جو 40-1930ء کے دہے کے دوران سامنے آئے تھے۔''(55)

'کہانی کا ارتقا'' بھی پروفیسر ظہورالدین کی اہم کتاب ہے۔یہ کتاب سال 1999ء میں منظر عام پر آئی۔اس کتاب میں مصنف نے اردو ادب کی مختلف اصناف سخن کا تاریخی جائزہ پیش کیا ہے۔اس کتاب کے ابتدا سے آخر تک ظہورالدین نے اردو ادب سے متعلق بہت سی اہم معلومات فراہم کی ہے۔اس کتاب میں مصنف نے کہانی کے ارتقا کے طویل سفر میں کہانی نثر و نظم دونوں روپ میں گفتگو کی ہے۔انہیں اردو ادب کی اصناف سخن میں جہاں بھی کہانی مشکل نظر آتی اسے تفصیل سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔مثال کو طور پر انہوں نے منظوم داستانوں کے ساتھ ساتھ رزمیہ نظموں ،منظوم سفرناموں، خودنوشتوں اور منظوم افسانوں وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے۔اس کے علاوہ انہوں نے مرثیوں، ڈراموں، بیانیہ نظموں اور منظوم مخطوطات کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے۔اس کتاب کی سب سے اہم خوبی یہ ہے کہ پروفیسر ظہورالدین نے اس کتاب میں اس بات کا خیال رکھا ہے کہ ہر موضوع کے بارے میں انہوں نے مستند ماخذ کی مدد سے مفید معلومات فراہم کرنے کی بڑی حد تک کوشش کی ہے۔''اپنی بات میں'' پروفیسر ظہورالدین لکھتے ہیں کہ:

''کہانی کا ارتقا اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔اس کا مقصد جہاں ایک طرف کہانی کے ارتقا کی عالمی تاریخ مرتب کرنا ہے وہاں ارتقا کے اس سفر کے دوران کہانی کا یہ سفر کس قدر طویل ہے اس کا اندازہ آپ کو اس پہلی کڑی کے مطالعے سے ہی ہو جائے گا۔''(56)

اس کے علاوہ ایک جگہ انہوں نے کہانی کے ارتقا کے بارے میں لکھا ہے:

''کہانی کے ارتقا کے ابتدائی دور میں اس نے جو رنگ و روپ اختیار کیا وہ وہی تھا جو ان حالات میں ممکن تھا۔جوں جوں انسان ذہنی اعتبار سے بالیدہ ہوتا گیا۔کہانی بھی نئے رنگ و روپ اختیار کرتی چلی گئی۔جب تک انسان شعور کی کچھ اور منزلیں طے نہ کر گیا کہانی ناپختہ رہی۔جیسے جیسے وہ یہ منزلیں طے کرتا گیا کہانی میں پختگی پیدا ہوتی چلی گئی۔''(57)

پروفیسر ظہور الدین نے اس تصنیف میں زیادہ تر فکشن کے حوالے سے بحث کی ہے۔جس میں انہوں نے خاص طور پر کہانی، افسانہ اور ناول کو زیر بحث لایا ہے۔ان تمام اصناف سخن کے بارے میں بڑی باریک بینی سے ہر ایک پہلو کو واضح طور پر تفصیل سے پیش کرنے کی سعی کی ہے۔انہوں نے اس کتاب میں ساگا ناول کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''اس کا مفہوم کہاوت یا قول ہے۔قرون وسطا میں اس اصطلاح کو آئیس لینڈ (Ice Land) اور اسکنڈے نیویا (Scandinaia) کی ان نثری کہانیوں کے لیے استعمال کیا گیا جو کسی مشہور ہیرو، بڑے خاندان، بہادر راجاؤں یا جنگجو اشخاص کے کارناموں کو پیش کرنے کے لیے تخلیق کیا گیا۔''(58)

اسی طرح سے انہوں نے چھٹے باب میں ''پکارسک ناول'' کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''پکارسک ناول (آوارہ گرد۔بدمعاش) ایسے بدمعاش کی زندگی کو موضوع بناتا ہے۔جو بیک وقت بہت سے آقاؤں کی خدمت انجام لاتا ہے۔اپنے تجربات کی روشنی میں وہ اس سماج کو طنز و تشفیع کا نشانہ بناتا ہے جس میں وہ خود اپنشا ہے۔''(60)

اس کے علاوہ انہوں نے اس کتاب میں ناول اور افسانہ کے بارے میں بھی ان کی تاریخی نوعیت اور فنی اور تکنیکی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ایک جگہ وہ ناول کے بارے میں لکھتے ہیں:

''انیسویں صدی میں ناول نے جتنی ترقی یورپ میں کی اتنی اسے کسی دوسرے براعظم میں ممکن نہ ہوسکی۔شاید اسی لیے دوسری اصناف کی طرح ناول کے بہترین فن پارے بھی ہمیں اسی خطے کے ادیبوں سے حاصل ہوئے۔لیکن یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ناول کو وقتاً فو قتاً دوسرے خطوں سے بھی اچھے ادیب نصیب ہوتے رہے۔''(61)

ان مذکورہ بالا اقتباسات سے اس اقتباس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پروفیسر ظہورالدین ادیب، ادب، ادبی اصناد اور ادبی نظریات وتصورات سے جڑے اپنے تنقیدی تصورات کا اظہار بڑے اچھے انداز بیان میں کرتے ہیں تا کہ ان کی تنقید ادبی تنقید رہے۔اس لیے ان کی تنقید فلسفہ اور علمیت کا اظہار نہیں پاتی۔اس کے علاوہ ان کے اندر خوبی یہ ہے کہ وہ زبان وبیان کے لحاظ سے قدیم وجدید تصورات ونظریات اصول اور معلومات سے اگر چہ بہت استفادہ کرتے ہیں مگر اپنی زبان وادب اور ثقافت کے مطابق وہ اپنے تنقیدی شعور کا حصہ بنا لینے کے بعد جو ان کے نظریات منظر عام پر آتے ہیں وہ ہماری تہذیبی اور اخلاقی میدان سے جڑے ہوتے ہیں۔انہوں نے اپنے تہذیبی اور اخلاقی نظریات کو جس طرح سے اپنی تخلیق میں پیش کیا ہے بہت ہی قابل ذکر ہیں۔پروفیسر ظہورالدین کی تنقیدی تحریروں میں ادب، دیب اور قاری کی تشکیل جدید کے وسیع امکانات دکھائی دیتے ہیں۔تنقیدی نظریات کے حوالے سے ان کی کتاب ''تنقیدی مباحث وتجزیے'' بہت ہی اہمیت کا درجہ رکھتی ہے۔ان کی یہ کتاب عام 272 صفحات پر مشتمل 2007ء میں منظر عام پر آئی تھی۔اس کتاب میں کل چودہ مضامین شامل کیے گئے ہیں۔

ان مضامین کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بہت ہی معیاری قسم کے مضامین ہیں اور ہر مضمون اپنے اندر ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔پروفیسر ظہورالدین نے ان مضامین میں بے پناہ علمیت پر مبنی صرف اور محض اپنی تنقیدی بصیرتوں کا نہ صرف مظاہرہ کیا ہے، بلکہ بہت سی شخصیات ،نظریات اور بیشتر اصولوں کے رد تشکیل یا تشکیل جدید کے حوالے سے انوکھے اور تیکھے مباحث کے دشت امکاں واضح طور پر روشنی ڈالنے کی کوشش بھی کی ہے۔اس کتاب میں مصنف نے اسے طبقات کو بھی پیش کیا ہے۔جن میں افلاطون اور ارسطو کے نظریات سے لے جدید دور کے نظریات تک کو زیر بحث لایا ہے۔جیسے کہ ہیئت پسندی پر انہوں نے تفصیل سے بحث کی ہے اور اس کے علاوہ ساختیات، تانیثیت ، نو مارکسیت ،نو تاریخیت وغیرہ موضوعات پر روشنی ڈالی ہے اور اپنے خیالات ونظریات کو بھی سعوری اور لاشعوری طور پر وضاحت اور دلیلوں کے ساتھ سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔مثال کے طور پر وہ اردو افسانے کے نئے جہات کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اردو افسانے کی عمر سو سال سے زیادہ تو نہیں ہے پر اس مختصر سی مدت کے دوران بھی اس نے ارتقا کی جن بلندیوں کو چھوا ہے اسے دیکھتے ہوئے اردو کے قاری کا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔ زندگی کا وہ کون سا یہ ہے جو اس کے آئینے میں اپنا عکس پیش کرتا نظر نہیں آتا۔ انسانی تجربے کا وہ کون سا رنگ ہے جو اس کی قوس قزح میں جھلملا تا دکھائی نہیں دیتا۔ فکر واحساس کی وہ کون سے ادا ہے جو اس کے آبگینوں میں ارتعاش پیدا کر کے حیات وکائینات کے اسرار ورموز کی گھتیاں سلجھانے کے راگ نہیں چھیڑتی۔'' (62)

پروفیسر ظہور الدین کو اردو ادب کے ساتھ ساتھ انسانی نفسیات کا بھی گہرائی سے مطالعہ کرنا آتا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ انسان کو شاہین سے مشابہ کرتے ہی ذہن میں جو وقار و مرتبے کا تصور نظر آتی ہے۔ وہ انسانی ذہن کے ارتقا کی منزلوں کی طرف پرواز کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ مثال کے لیے اقتباس:

''شاہین، پرواز، آسمان یہ تینوں استعارے بلندی کی علامت بن کر انسان کے مرتبے کو بدرجہا بڑھا دیتے ہیں۔ اس طرح ان الفاظ کو جس بحر میں پرویا گیا ہے۔ وہ خود اتنی رواں اور مترنم ہے کہ قاری کے ذہن ودل پر جادو سا طاری ہوتا محسوس ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے شعر کہا نہیں گیا ڈھلا ڈھلا یا شاعر پر اترا ہے۔ انسان کی عظمت اس کی مسلسل جستجو اور نئے جہانوں کی تسخیر میں مضمر ہے۔ وہ لکیر کا فقیر نہیں ہو سکتا۔ اسے روایات ورسوم میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ وہ شیر مردوں کی طرح جیتا ہے۔ صوفی وملا کے غلاموں کی زندگی نہیں گزارتا۔'' (63)

مذکورہ بالا اقتباسات سے پروفیسر ظہور الدین کے متوازن اور بصیرت مندانہ تنقیدی نظریے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے مختلف لسانی اور ادبی تصورات، نظریات اور اصطلاحات سے متعلق اردو میں جاری بحث و مباحثہ کے حوالے سے انہوں نے بہت سارے اپنے نتائج اخذ کئے ہیں۔ جن سے ان کی ادبی اور تنقیدی بصیرت سامنے آتی ہے۔

پروفیسر ظہورلدین تنقید کے میدان میں اپنی ایک الگ پہچان بنائے ہوئے ہیں۔ ان کی تنقید میں کہیں پر احتشام حسین تو کہیں پر وزیر آغاز اور کہیں کہیں تو محمد حسن کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ حالاں کہ بنیادی طور پر دیکھا جائے تو پروفیسر ظہور الدین نظریاتی اعتبار سے ان سب نقاروں سے الگ اپنی ایک منفرد پہچان بنائے ہوئے ہیں۔ جس کا مقصد

خالص اوراعلی ادب کی تشکیل اوراس کے ساتھ ساتھ ادب کے حوالے سے پوری کائینات کی تکمیل ہے۔اس حوالے سے ان کی تنقیدی نظریات میں سے ایک مثال یہاں پیش کی جاتی ہے۔جس میں وہ لکھتے ہیں:

''ادب سے تعلق رکھنے والا شاید ہی کوئی طالب ایسا ہو جس نے اس سوال پر غور نہ کیا ہو کہ متن ،غیر متن یا فن پارہ کسے کہتے ہیں؟۔اس کے اغراض ومقاصد کیا ہوتے ہیں اور لسانی زندگی سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ وغیرہ وغیرہ اوران سوالات کو اپنے اندر میں حل کرنے کی بھی کوشش نہ کی ہو۔یہی وجہ ہے کہ ہمارے قدیم اہل فلاسفہ سے لے کر ہمارے دور کے اکثر نقادان ادب تک سب نے کسی نہ کسی شکل میں ان سوالات کے جواب فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔اس کے باوجود جب بھی ہم سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ کون کون سے معروضی عناصر ہیں جن کی موجودگی کسی متن کو غیر متن یا فن پارہ بناتی ہے۔''(64)

اس کے علاوہ پروفیسر ظہورالدین صاحب کی ایک اور ضخیم کتاب Development of urdu language and literature in jammu region کے عنوان سے ہے۔یہ کتاب جموں خطے میں اردو زبان و ادب کے اعتبار سے بہت ہی اہمیت کی حامل ہے۔یہ کتاب 1985ء میں منظر عام پر آئی تھی۔اس کتاب کا استفادہ کئے بغیر نہ صرف خطہ جموں بلکہ وادی کشمیر کے آر پار بھی اردو زبان کی لسانی،سماجی اور ثقافتی جڑوں کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا ہے۔ان کی یہ کتاب 490 صفحات اور نو سے زائد ابواب پر مشتمل ہے۔مصنف نے یہ کتاب انگریزی زبان میں ترجمہ کی ہے اور جموں خطے کے منتخب شعرا وادبا کی ادبی خدمات پر مختصراً روشنی ڈالی ہے۔حالاں کہ بہت سارے ادیبوں کا ذکر اس کتاب میں نہیں کیا گیا ہے۔جن کی ادبی خدمات ریاست جموں وکشمیر میں اہمیت کے حامل ہیں۔مگر اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جموں خطے میں بہت سے شعرا وادبا نے اردو زبان وادب میں اپنی خدمات کو انجام دیا ہے۔اس کتاب میں ان تمام شخصیتوں کا ذکر کرنا ناممکن تھا مگر پھر بھی انہوں نے جس محنت اور لگن سے مختلف انگریزی،اردو،کشمیری ،ڈوگری وغیرہ تصانیف سے مواد اکٹھا کر کے اس تصنیف کو پائے تکمیل تک پہنچایا قابل تعریف ہے۔اس تصنیف پر بحث کرتے ہوئے جان محمد آزاد صاحب اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

''جموں خطے میں اردو زبان وادب کا ارتقا آپ کی ایک اور مستحن علمی کوشش ہے۔یہاں آپ نے ایک بالغ نظر نقاد کا فریضہ انجام دیتے ہوئے مختلف شعبوں کا گہری نظر سے جائزہ لیا

ہے۔۔۔۔اس تصنیف کی خاص بات وہ انگریزی ترجمے ہیں جو جموں کے مقتدر شعرا
حضرات کے انتخاب کلام سے معطر ہیں۔''(65)

تعلیل و تاویل:

''تعلیل اور تاویل'' بھی ظہورالدین کی ایک اہم تنقیدی اور تحقیقی تصنیف ہے۔ یہ کتاب 1991ء میں شائع ہوئی۔ مصنف نے اس کتاب کو چار حصوں اور بیس ابواب پر تحریر کیا ہے۔اس کتاب کا ہر باب ایک الگ مقام رکھتا ہے۔ یہ کتاب بہت ہی ضخیم ہے جس کو مصنف نے 371 صفحات امیں مکمل کیا ہے۔

تفکرات:

''تفکرات'' بھی ظہورالدین کی ایک تنقیدی مضامین پر مبنی اچھی کتاب ہے۔ یہ کتاب 1976ء میں منظر عام پر آئی تھی۔ یہ کتاب پندرہ مضامین اور 167 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصے میں مصنف کے وہ مضامین ہیں جو ملک کے مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوئے اور دوسرے حصے میں مصنف کی ریڈیائی تقاریر پیش کئے گئے ہیں۔

محروم کی شاعری:

پروفیسر ظہورالدین صاحب کی اہم تصانیف میں سے ایک ہے۔ان کی یہ تصنیف 1976ء میں منظر عام پر آئی تھی۔ مصنف نے یہ کتاب اردو کے مشہور ومعروف ادیب پروفیسر جگن ناتھ آزاد کے والد محترم تلوک چند محروم کی ادبی خدمات کو پیش کیا ہے۔ یہ بہت ہی معیاری کتاب ہے۔اس میں مصنف نے کچھ ایسی معلومات فراہم کی گئی ہے جس سے تلوک چند محروم کی ادبی خدمات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے جو صرف 132 صفحات پر مشتمل ہے مگر تنقید اور تحقیق کے اعتبار سے یہ بہت اہمیت کا درجہ رکھتی ہے۔اس میں مصنف نے زیادہ تر تلوک چند کی شاعری کو ہی زیر بحث لایا ہے۔ پروفیسر ظہورالدین تلوک چند محروم کی شاعری کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''محروم کا کلام معنوی اور لفظی خوبیوں کا مرقع ہے۔ دل سے بات نکلتی ہے اور کڑے کمان کے تیر کی طرح دل میں جا کر پیوست ہو جاتی ہے۔اس کے اشعار میں اصلیت بھی ہے اور سادگی بھی، بلندی بھی ہے اور گہرائی بھی، تڑپ بھی ہے اور کائنات کا وسیع مطالعہ ومشاہدہ

بھی، اختصار بھی ہے اور زور بھی، مناسبت الفاظ بھی ہے اور جدت بھی۔''

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنی ملازمت کے دوران اردو زبان وادب کے فروغ میں جموں میں بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ انہیں کئی انعامات سے بھی نوازہ جا چکا ہے۔ انہیں یوپی اردو اکیڈمی کی جانب سے انعامات سے بھی نوازا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف سرکاری اور غیر سرکاری انجمنوں میں بھی وہ ایک فعال رکن کی حیثیت سے کام کر چکے ہیں۔ مثلاً جموں یونی ورسٹی کونسل کے سیکریٹری، سکریٹری آف جموں یونی ورسٹی سنڈیکیٹ، یونی ورسٹی آف جموں فنانس کمیٹی، کنویز بورڈ آف اسٹڈیز ان اردو لینگویجز، سکریٹری آف یونی ورسٹی پبلیکیشن بورڈ، بہ حیثیت چیف ایڈیٹر ان یونی ورسٹی نیوز بلیٹن، سیکٹری انجمن ترقی اردو ہند جموں شاخ ممبر سب کمیٹی جے اینڈ کے اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز اور چیرمین مسلم ایجوکیشن سوسائٹی جموں وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ ریڈیو اور ٹی وی کے پروگراموں میں بھی اکثر شرکت کرتے تھے۔ انہیں حکومت ہند کے محکمہ اطلاعات ونشریات کی جانب سے 1975ء میں سب سے بہترین کہانی کار کے انعام سے بھی نوازا جا چکا ہے۔ اس کے علاوہ انہیں ہندوستان کے متعدد اکادمیوں اور دوسرے تہذیبی وسماجی اداروں کی جانب سے بھی قومی اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔ پروفیسر ظہور الدین جموں خطے کے اہم ادیبوں اور قلم کاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ وہ بیک وقت ایک بلند پایہ محقق، نقاد، مفکر، شاعر اور فکشن نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔

منشور بانہالی:

ان کا اصلی نام عبدالغنی تھا لیکن ادبی دنیا میں وہ منشور بانہالی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کی پیدائش 4/جنوری 1948ء کو قصبہ بانہال کے ایک دور دراز گاؤں بنکوٹ میں ہوئی۔

منشور بانہالی اردو زبان کے ساتھ ساتھ کشمیری زبان میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ وہ بنیادی طور پر شاعر تھے مگر انھوں نے بہت سارے نثری کارنامے بھی تخلیق کیے ہیں۔ ان کے متعدد تحقیقی وتنقیدی مضامین شائع ہو چکے ہیں جن میں خاص طور پر ''جموں کے میلے اور تہوار''، ''ضلع ڈوڈہ کی ادبی افق''، ''عندلیب شعلہ نواب جانباز کشتواڑی''، ''بانہال تہذیب وکلچر کے آئینے میں''، '' کائشر ادب پیر یانشر ال پیاری''، ''صحرا اور شمع --- وفا بھدرواہی''، ''جموں آب وہوا اور فطری مناظر''، ''صوبہ جموں میں صحافت نگاری۔ ایک تعارف'' وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ تمام متذکرہ بالا تحقیقی و تنقیدی مضامین شیرازہ، پش افق، ضلع ڈوڈہ کی ادبی ثقافتی تاریخ وغیرہ میں چھپ چکے ہیں۔

منشور بانہالی صاحب اپنی نثری کاوشوں میں اگر چہ بہت کم لکھتے ہیں مگر ان کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ بہت کم

الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مواد فراہم کردیتے ہیں اور موضوع سے متعلق مکمل معلومات فراہم کرنے میں اچھی سے اچھی کوشش کرتے ہیں۔

وہ جب بھی تحقیقی وتنقیدی مضمون تخلیق کرتے ہیں تو ان کی نظر ہمیشہ موضوع کے تمام پہلوؤں پر جمی رہتی ہے۔وہ اردو زبان کے ساتھ ساتھ فارسی، انگریزی اور کشمیری میں مہارت رکھتے ہیں۔ان کے مضامین پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقالات کو موثر بنانے میں بہت ہی محنت اور لگن سے کام کرتے ہیں۔وہ اردو اور فارسی زبان کے بہترین اور مناسب الفاظ کا انتخاب کرکے اپنی اردو تحریروں کو بہترین بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔وہ اردو زبان میں آسان اور عام فہم زبان کا استعمال کرتے ہیں جس سے ان کی نثری کاوشوں کو قارئین بہت ہی لطف اندوز ہوتے ہیں۔اس حوالے سے ولی محمد اسیر کشتواڑی یوں رقمطراز ہیں:

> ’’ان کی نثر قاری کے ذہن پر دباؤ ڈالنے کے بجائے روح وقلب کو ایک عجیب سرور سے ہمکنار کرتی ہے‘‘۔(66)

منشور بانہالی خطہ جموں کے ایک اچھے شاعر اور ادیب میں شمار کیے جاتے ہیں۔انھوں نے کئی مشہور کتابوں کے تبصرے اور دیباچے لکھے تھے جن میں جانباز کشتواڑی کی ’’پھولوں سنگر‘‘ خواجہ غلام قادر بہرواڑی کی ’’رانگی ریہہ‘‘ اور شہباز راجوروی کی ایوارڈ یافتہ تصنیف ’’برأنتی‘‘ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اس کے علاوہ منشور بانہالی عرصہ دراز تک بانہال کے مشہور کشمیری رسالہ ’’گولاب‘‘ میں بھی کام کرتے رہے تھے۔

منشور بانہالی ریاست جموں وکشمیر میں اکثر ریڈیو پروگراموں میں شرکت کرتے رہتے تھے۔اور کئی ادبی سمینار اور مشاعروں میں بھی ان کی شرکت رہتی تھی۔مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ منشور بانہالی، بانہال کے ایک بڑے شاعر ہیں اور شاعری کے ساتھ انھوں نے نثری تحریروں کو بھی وسیع کیا تھا۔

رند بھدرواہی:

شیخ طالب حسین رند بھدرواہی خطہ جموں کے ضلع ڈوڈہ کے علاقہ بھدرواہ گاؤں درنگہ میں 16/اپریل 1947ء کو پیدا ہوئے۔ڈوڈہ میں ہی انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔رند بھدرواہی ایک اچھے شاعر، ادیب اور انشاء پرداز ہیں۔انھوں نے سرزمین بھدروا کے شعروادب کے فنی خدوخال کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔اپنے تاثرات کو انھوں نے اپنی مشہور تصنیف ’’کہکشاں‘‘ میں محفوظ کیا ہے۔یہ تصنیف نہ صرف رند بھدرواہی کے ادبی

کارناموں پر مبنی ہے بلکہ اس کتاب میں مختلف شعراء اور ادباء کے ادبی کارنامے پیش کئے گے ہیں۔ ان کی تصنیف کے بارے میں ڈاکٹر شرف الدین ساحل رقمطراز ہیں:

> ''ان کا انداز تحریر دلکش، باربط اور پرتاثیر ہے۔ انھوں نے ہر مرحلے کو سلامت روی کے ساتھ طے کیا ہے۔ وہ شعرا کے حالات اور ان کی خصوصیات شعری پر روشنی ڈالتے وقت افراط و تفریط کا شکار نہیں ہوئے ہیں بلکہ ہر ایک کا دیانتداری سے محاسبہ کیا ہے''۔(67)

رند بھدرواہی کی مشہور تصنیف ''کہکشاں'' جموں خطے میں اردو زبان و ادب کے حوالے سے ایک بلند مقام رکھتی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے اقبال بزم ادب بھدرواہ سے وابستہ تقریباً ہر بڑے شاعر، ادیب اور فنکار کی ادبی خدمات کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ مصنف کی دو اور اہم تصانیف ''انور فریدیہ'' اور ''پس افق'' قابل ذکر ہیں۔ مگر رند بھدرواہی کو سب سے زیادہ شہرت ان کی تصنیف ''کہکشاں'' سے حاصل ہوئی۔ یہ کتاب جنوری 1992ء میں پہلی ڈوڈہ سے منظر عام پر آئی تھی۔ اس کتاب میں مصنف نے اردو اور کشمیری زبان سے تعلق رکھنے والے ضلع ڈوڈہ کے اہم قلم کاروں کی ادبی خدمات کو پیش کیا ہے۔ جیسا کہ انھوں نے خود بھی اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے:

> ''زیر نظر تحریر میں بھدرواہی کے اردو اور کشمیری لکھنے والے شعراء کا ذکر ہو رہا ہے۔ اور کوشش کی گئی ہے اس میں ان کے مختصر مگر جامع تعارف کے ساتھ ساتھ نمونۂ کلام بھی پیش کیا جائے۔ یہ کام اقبال بزم ادب بھدرواہ کے زیر سرپرستی عمل میں لایا گیا ہے اور اقبال بزم ادب بھدرواہ کے تقریباً سب ارکان نے اس کام میں مجھے اپنے بھرپور تعاون سے نوازہ ہے''۔(68)

''کہکشاں'' کے ابتدائی صفحہ میں مصنف نے اقبال بزم ادب بھدرواہ کے صفحہ اول میں شمار ہونے والے موسیقاروں، گلوکاروں اور نثر نگاروں کا ذکر کیا ہے۔ اس کتاب کے ابتدائی حصہ میں مصنف نے تقریباً پچیس شخصیات کا تذکرہ کیا ہے جو بہت اہم مواد فراہم کرنے میں مفید ہے۔

رند بھدرواہی کے بہت سارے تحقیقی و تنقیدی مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں ان کے دو اہم مضمون ''وفا بھدرواہی شخصیت اور فن'' جو کہ ''پس افق'' میں شامل ہے اور اسی طرح سے ان کا دوسرا قابل ذکر مضمون ''غلام نبی

ڈالول جانباز'' جو تصنیف ''ضلع ڈوڈہ کی ادبی وثقافتی تاریخ ''میں شامل ہیں۔ ان دونوں مضامین کی وجہ سے رند بھدرواہی کو کافی بلند مقام حاصل ہوا تھا۔

محمد اسد اللہ فریدی (محمد اسد اللہ وانی):

پروفیسر محمد اسد اللہ وانی جموں کے ضلع ڈوڈہ کی ایک اعظیم شخصیت ہیں۔ان کی پیدائش 18/جولائی 1951ء کو ضلع ڈوڈہ کے دور دراز دیہات کے علاقہ مرمت میں ہوئی تھی۔اسد فریدی (محمد اسد اللہ وانی) اپنی طالب علمی کے زمانے سے ہی مضامین لکھتے رہے تھے اور جہاں کہیں بھی ادبی تقریر منعقد ہوتی وہ ضرور حصہ لیتے تھے۔ان کے اکثر تحقیقی وتنقیدی مضامین ''شاہین'' میں شائع ہوتے تھے۔ریاست جموں وکشمیر کلچرل اکیڈمی سے وابستہ انھیں اپنے بہت سارے تحقیقی وتنقیدی مضامین لکھنے کا موقع ملا جس کی وجہ سے بعد دیگر مختلف موضوعات پر مضامین شائع ہونے لگے۔اس حوالے سے ان کے تحقیقی وتنقیدی مضامین میں خاص طور پر ''جموں وکشمیر میں اردو زبان کے ابتدائی آثار''،''جموں وکشمیر اردو افسانہ نگاری''،''بدھ مت اور ریشیات''،''حضرت شیخ العالم اور کشتواڑ''،''گوجری زبان اور بھدرواہی پر اس کا اثر'' ،''ضلع ڈوڈہ کے میلے اور تہوار''، ''لل دید کی انسان دوستی''،''گوجری زبان اور محققین''،''رسا جاودانی کی اردو شاعری''،''کلچرل اکادمی کی پچاس سالہ اردو شاعری''،''جموں کی خانقاہیں اور گرجے''،''ضلع ڈوڈہ کے شاعروں نے کیا دیا''،''بھدرواہی زبان کا ارتقاء''، ''ضلع ڈوڈہ کا تہذیبی وثقافتی جائزہ''،''رسا کا شعری سفر''،''شیخ العام کی شاعری میں کشتواڑی لب ولہجہ''،''خوابوں کا سفر''،''جموں وکشمیر میں اردو افسانہ''،''گوجری زبان کا ارتقاء''،''سری نگر کی زبانیں''،''ضلع ڈوڈہ کی بولیاں''،''لداخ''،''اروند گھوش کا جدید ہندوستان کی تعمیر میں حصہ'' وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں ۔مصنف کے یہ تمام متذکورہ بالا مضامین ریاست کے مختلف رسائل و جراء میں شائع ہوئے تھے جن میں ''آج کل ''ہمارا ادب''،''شیرازہ''(اردو) ''گجر اور گوجری ''،''پاسبان چنڈی گڑھ''،''ریشیات''،''مہانامہ دبستان سری نگر''،''کشمیر یونیورسٹی سلور جوبلی نمبر'' وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

محمد اسد اللہ وانی کی ایک اہم کتاب ''شیخ العالم ایک مطالعہ'' کے عنوان سے 1993ء میں منظر عام پر آئی تھی۔ اس کتاب کی وجہ سے محمد اسد اللہ وانی صاحب کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔دراصل یہ کتاب کشمیر کے صوفی شیخ العالم شیخ نورالدین ولی جو کشمیر کے صوفیوں میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں جنھیں کشمیر کے لوگ پیار اور عقیدت کے سبب نندہ ریشی کے نام سے بھی جانتے ہیں، کے کارناموں پر مبنی ہے۔موصوف نے اس تصنیف میں شیخ العالم کی شخصیت، مذہبی، سماجی

،سیاسی وغیرہ کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔

حضرت شیخ العالم صاحب کے اجداد کا تعلق ضلع ڈوڈہ کے خطہ کشتواڑ سے بھی تھا اس لیے محمد اسد اللہ وانی صاحب نے شیخ العالم کے اجداد کے بارے میں تخلیق کیا ہے اور وہ خود کو بہت ہی خوش قسمت سمجھتے ہیں کہ جس سرزمین سے شیخ العالم کے خاندان کا تعلق رہا ہے اسی سرزمین میں رہتے ہوئے پروفیسر اسد اللہ وانی کو ان کے بارے میں تخلیق کرنے کا موقع فراہم ہوا۔اس حوالے سے انہوں نے لکھا ہے اقتباس ملاحظہ ہو:

''حضرت شیخ العالم کا تعلق ضلع ڈوڈہ کے خطہ کشتواڑ سے تھا۔اس اعتبار سے میں یہ اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ میں ان کی زندگی اور فن سے متعلق اپنے ان چند مضامین کا مجموعہ ''شیخ العالم۔ایک مطالعہ'' پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ یہ یوں بھی میری ایک ذمہ داری تھی جس سے سبکدوش ہوتے ہوئے مجھے آج کافی مسرت محسوس ہو رہی ہے''۔

اس تصنیف میں محمد اسد اللہ وانی نے سلسلہ ریشیت اور اس کے پس منظر کے ہر پہلو پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس حوالے سے محمد اسد اللہ وانی نے ایک جگہ لکھا ہے:

''حضرت شیخ کا کوئی نیا مذہب نہیں تھا بلکہ وہ اسلام کی حدود کے اندر ہی اپنی تحریک چلا رہے تھے وہ اسلام کے تمام اصول نماز، روزہ وغیرہ کے پابند تھے قرآن میں جن لوگوں کو اولیاء اللہ کہا گیا ہے ان میں ان کا شمار بھی ہوتا ہے''۔(69)

اسد اللہ وانی صاحب کی تصنیف ''شیخ العالم ایک مطالعہ' میں تین مضامین شیخ العالم کے خلفاء قریبی خدام اور دیگر خلفاء اور زنانہ خلفا وغیرہ کے بارے میں تخلیق کیے ہیں۔اس سے ان بزرگ ہستیوں کے بارے میں بہت ہی اہم معلومات ثابت ہوتی ہے۔جن کے ہاتھوں کشمیر کے لوگوں کو دین اور اسلام کو سمجھنے اور ان اصولوں پر چلنے کی مدد ملی۔اس کتاب میں جہاں مصنف نے ان خوبیوں کی وجہ سے داد حاصل کی ہے وہیں کچھ خامیاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں مگر باوجود ایک آدھ خامیوں کے یہ کتاب بہت ہی موثر ثابت ہوتی ہے۔

محمد اسد اللہ وانی کو بنیادی طور پر ایک محقق کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔وہ اپنے دور میں ضلع ڈوڈہ کے اہم تخلیق کاروں میں ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ان کے تمام مقالات اور مضامین مواد اور ترتیب کے حوالے سے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ولی محمد اسیر کشتواڑی صاحب اپنی تصنیف میں محمد اسد اللہ وانی صاحب کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''ریاست کے معیاری رسائل اور جرائد میں جس طرح وانی صاحب چھپ رہے ہیں وہ ان کے اعلیٰ ادبی معیار کا ٹھوس ثبوت ہے۔انھوں نے اپنے مقالات کو تحریر کرنے کے لیے محنت شاقہ سے کام لیا ہے اور بیشتر موضوعات پر بنیادی اطلاعات فراہم کی ہیں۔وہ اردو زبان و ادب کے تقاضوں کو اچھی طرح سمجھ رہے ہیں اور جچے تلے الفاظ میں اپنا مدعا و مقصد بیان کرتے ہیں''۔(70)

''شیخ العالم ایک مطالعہ'' کے علاوہ مصنف کی دو ترتیب کردہ تصانیف میں ''ریشی نامہ'' اور ''شیرازہ ہمارا ادب شمارنمبر'' 1978ء بھی قابل ذکر ہے۔''ریشی نامہ'' مصنف حضرت شیخ العالم، شیخ نورالدین کے متعلق لکھی گئی تصنیف ہے ۔جس میں مصنف نے شیخ العالم کے بارے میں بنیادی سرچشموں پر روشنی ڈالی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ اس کتاب میں حضرت شیخ نورالدین کی کشمیر تاریخ اور اس دور کا کشمیر اور شیخ نورالدین کے کارناموں کو پیش کیا ہے۔اس کتاب میں کشمیر کی تہذیب و تواریخ کے گوشوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔اس میں شیخ العالم نورالدین کے کشمیری کلام پر زیادہ بحث کی گئی ہے۔یہ تصنیف کل 324 صفحات پر مشتمل ہے جس کو محمد اسد اللہ وانی سے مرتب کیا تھا اور بعد ازاں 1982ء میں جموں و کشمیر کے اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویز سے منظر عام پر آئی ۔اس کتاب میں مصنف نے کل 98 موضوعات پر بحث کی ہے۔جن میں خاص طور پر کشمیر کے رشی ناموں پر زیادہ روشنی ڈالی ہے۔محمد یوسف ٹینگ اس کتاب کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''علمدار کشمیر کی پیدائش کی چھٹی صدی تقریبات نے کشمیر کی عوامی اور تمدنی تواریخ کے اس روشن مینار کے حالات ان کے کلام اور ان کے کام کے متعلق کچھ اس قدر جوش اور جستجو کی لہر پیدا کر دی کہ ان کی ذات بابرکات کے ساتھ کشمیر کی تہذیب و تواریخ کے کچھ گوشوں پر بھی نئی روشنی کی چھوٹ پڑی..........ریشی نامہ کی اشاعت اور اس کے اردو مقدمے کے اہتمام کا مقصد حضرت شیخ کے متعلق اصل سرچشموں کا عرفان عام کرنا ہے''۔(71)

حضرت شیخ العالم، شیخ نورالدین نورانی کی ذات کو کشمیر کی تاریخ میں بہت ہی اعلیٰ مقام حاصل ہے۔وادئ کشمیر سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی ایسا شخص نہ ہوگا جو ان کی شخصیت سے واقف نہ ہوگا۔انھیں مسلمانوں میں نندہ ریشی کے نام سے جانا جاتا تھا۔اسی طرح سے وادئ کشمیر میں رہنے والے تمام غیر مسلم انھیں سہزانند کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ان

کے بارے میں بہت سارے قلمکاروں نے اپنے اپنے ریشی نامے لکھے تھے اور اس کتاب میں ان تمام ریشی ناموں کو تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ جس میں حضرت شیخ العالم کے حوالے سے مختلف رائیں پیش کی گئیں ہیں۔

محمد اسد اللہ وانی نے ریاستی کلچرل اکیڈمی میں رہ کر اپنے بہت سارے تحقیقی وتنقیدی مضامین کو شائع کیا تھا اور ''ہمارا ادب''، ''شیرازہ'' انتخاب نمبر 79-1978 نمبر کو بھی مرتب کیا تھا اور ان کے ساتھ اس کام کو تعاون دینے میں محمد احمد اندرابی کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ ''شیرازہ نمبر'' میں ریاست جموں وکشمیر کے بہت سارے قلم کاروں کے مضامین اہمیت کے حامل ہیں۔ان میں ایک مضمون محمد اسد اللہ وانی کا ''جموں وکشمیر میں اردو افسانے کے نئے افق'' کے عنوان سے بہت ہی اہم مواد فراہم کرتا ہے۔ اس میں انھوں نے ریاست جموں وکشمیر کے مشہور افسانہ نگاروں کے بارے میں روشنی ڈالی ہے۔

اس طرح کے کئی تحقیقی مضامین انھوں نے تخلیق کیے تھے، جو مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہے۔ انھیں بنیادی طور پر ایک نثر نگاری کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ ان کے نثری کارنامے دروحاضر میں بھی وقتاً فووقتاً مختلف رسائل وجرائد میں ریاست اور بیرون ریاست شائع ہورہے ہیں۔ جان محمد آزاد نے اپنی کتاب میں محمد اسد اللہ وانی کے بارے میں لکھا ہے:

> ''آپ کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین ممتاز اردو رسائل میں پابندی سے شائع ہوتے رہے ہیں اور ناقدین کے حلقوں میں آپ کی آواز نہایت توجہ سے سنی جاتی ہے''۔(72)

اردو نثر کے علاوہ اسد اللہ وانی نے شاعری میں بھی طبع آزمائی کی تھی۔ اس لیے انھوں نے اپنا تخلیق ''اسد'' تخلیق کیا تھا۔ اقبال بزم ادب بھدرواہ میں انھیں ایک اچھے شاعر کے طور پر جانا جاتا ہے۔ وہ اس بزم کے اہم اراکین میں شامل تھے۔ انھوں نے اقبال اور جگن ناتھ کی شخصیت پر ایک اچھا تحقیقی کام کیا ہے۔ اس حوالے سے ان کی ایک مشہور کتاب جو پروفیسر جنگ ناتھ آزاد کی حیات اور ادبی خدمات پر ''اقبالیات آزاد'' کے عنوان سے منظر عام پر آئی ہے۔ اس کے علاوہ شیرازہ کے گولڈن جوبلی نمبر میں بھی محمد اسد اللہ وانی کا ایک اہم مضمون ''اقبالیات میں ریاستی ادیبوں کا حصہ'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون نہایت ہی اہم معلومات فراہم کرتا ہے۔ اقبال شناسی کے حوالے سے یہ ایک بہترین مضمون ہے۔ اسی طرح سے انھوں نے پروفیسر منظر اعظمی وغیرہ کی طرح کئی اہم شخصیتوں کی ادبی خدمات پر مضامین تخلیق کیے ہیں۔

''اقبالیات آزاد'' محمد اسد اللہ وانی صاحب کا پی ایچ ڈی کا مقالہ تھا۔جس کو انھوں نے بہت ہی محنت اور لگن سے انجام دیا ہے۔ یہ مقالہ کتابی صورت میں 1997ء میں محروم میموریل لٹریری کی جانب سے منظر عام پر آیا۔ یہ کتاب کل دوسو چار (204) صفحات پر مشتمل ایک مستند مقالہ ہے۔مصنف نے اس مقالے کو سات ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ یہ تحقیقی مقالہ نہ صرف جموں وکشمیر کے حوالے سے اہم مقالہ ہے بلکہ اردو ادب میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔مصنف نے اس مقالے میں جگن ناتھ آزاد کے ادبی پہلوؤں کو بڑی ہنر مندی اور غیر جانبداری سے پیش کیا ہے۔محمد اسد اللہ وانی جگن ناتھ آزاد کو اپنے طالب علمی کے زمانے سے ہی جانتے تھے۔ایک جگہ وہ جگن ناتھ آزاد کی شخصیت سے متاثر ہو کر لکھتے ہیں:

> ''پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو میں ایسے طالب علمی کے زمانے سے جانتا ہوں۔ میں ان دنوں پرائمری درجے کا طالب علم تھا..........آزاد صاحب گو میرے باقاعدہ استاد نہیں رہے مگر جس طرح سے ان کی محفلوں اور محبتوں سے میں نے فیض پایا اور ان کے علمی سرچشموں سے اپنی تشنگی دور کی اس سے قبل اس کا مشر مشیر بھی مجھے نہیں ملا تھا، اٹھتے بیٹھتے عام گفتگو کرتے ہوئے زبان وقواعد کی باریکیوں سے جس طرح انھوں نے مجھے آگاہ کیا وہ انھی کا خاصہ ہے''۔(73)

محمد اسد اللہ وانی کے تحقیقی وتنقیدی کارنامے ریاست بھر کے ادیبوں اور قلم کاروں کے لیے اہم مواد ثابت کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ انھیں جموں خطے میں صفِ اول کے نثر نگاروں میں شامل کیا جاتا ہے۔

ریاض احمد نجار:

ریاض احمد نجار کا تعلق جموں خطے کی سرزمین کشتواڑ سے تھا۔انھیں ایک شاعر، ادیب اور محقق اور نقاد کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔1947ء کے بعد کے نقادوں اور محققین میں ان کا بھی ایک اہم نام ہے۔ریاض احمد نجار صاحب اپنی پی ایچ ڈی کے مقالے کے آخری مراحل سے گزر رہے تھے تو اچانک وہ ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئے۔

ریاض احمد نجاؔر بنیادی طور پر ایک شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔مگر ان کے نثری کارنامے بھی قابل تعریف ہیں۔تحقیق وتنقید کے حوالے سے اگر چہ انھوں نے بہت کم تخلیق کیا ہے۔مگر اس کے باوجود بھی ان کی شخصیت بلند درجہ رکھی ہے۔انھوں نے اپنے ایم فل کے مقالے میں ''رسا جاودانی۔حیات اور فن'' کے موضوع پر اپنا مقالہ لکھا ہے

۔رسا جاودانی ریاست جموں وکشمیر کے صفحہ اول کے شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

ریاض احمد نجار نے پروفیسر مجید مضمر کی نگرانی میں اپنے اس مقالے کو بڑی ہنر مندی اور غیر جانبداری سے انجام دیا ہے۔ان کا یہ مقالہ کافی طویل ہے جو 1989ء میں مکمل ہوا تھا۔مصنف نے رسا جاودانی کے اردو اور کشمیری کلام پر روشنی ڈالی ہے جو ایک ضخیم کتاب کی صورت میں منظر عام پر آئی تھی۔اس مقالے کے پیش گفتار میں ریاض احمد نجار صاحب لکھتے ہیں:

''یہ ایک خوش آئندہ امر ہے کہ رسا جاودانی اور اس قبیل کے دوسرے شعراء اور ادباء کو گوشۂ گمنامی سے باہر نکالنے اور ان کے نافۂ فن کی خوشبو پھیلانے کا کام کشمیر یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے شروع کیا اور ایم فل کے لیے ریاستی شاعروں اور ادیبوں پر ایک منصوبہ کے تحت تحقیق پر زور دیا ہے۔اس کا سہرا صدر شعبہ پروفیسر حامدی کاشمیری کے سر ہے۔چنانچہ رسا جاودانی پر تحقیق کا فریضہ مجھے تفویض کیا گیا''۔(74)

ریاض احمد نجار کی تحقیقی وتنقیدی کاوشوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے کام کو انجام دینے میں ایک الگ راہ نکالتے ہیں۔انھوں نے اپنے مقالے میں بہت ہی عمدہ کام کیا ہے۔اس مقالے میں رسا جاودانی پر نقد وتبصرہ کرتے ہوئے جس طریقے سے اور جن الفاظ سے رسا جاودانی کی عظمت کو واضح کیا ہے اس کو تمام قلمکار ہر دور میں قدر کی نگار سے دیکھیں گے۔

ریاض احمد نجار کے مقالے میں یہ بات بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ انھوں نے مقالے میں ریاست جموں و کشمیر سے تعلق رکھنے والے ادیبوں وشاعروں کے ساتھ کیے گئے غیر مساوی سلوک کو پیش کیا ہے جو لسانی اور علاقائی بنیادوں پر نظر انداز کیے گئے تھے۔جس میں خاص طور پر کلچرل اکیڈمی اور ریاست کے دیگر کئی ادارد و کے لیے گہری چوٹ دیکھی جاسکتی ہے۔ریاض احمد نجار نے اردو زبان وادب کے اس میدان میں ایک شاعر کی حیثیت سے اہم رول ادا کیا ہے۔اسی لیے انھیں ایک اچھے شاعر کی نگار سے دیکھا جاتا ہے اور اس کے بعد انھیں نثر نگار کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔انھیں ادبی ماحول میں رہ کر بھی اپنے آپ کو ادیب وشاعر کی حیثیت سے بلند مقام حاصل نہ ہوسکا۔ولی محمد اسیر کشتواڑی صاحب اپنی تصنیف میں ریاض احمد نجار کی ادبی خدمات کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''ریاض احمد نجار ایک گل نوشگفتہ سے کم نہ تھے جس کی خوشبوں سے شعر وادب کی محفلیں ابھی

معطر ہی ہو رہی تھیں کہ وہ لقمۂ اجل بن گئے انھیں ایک ادیب اور شاعر کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کرنے کا پورا موقعہ نصیب نہ ہوسکا ورنہ اپنی زندگی ہی میں دور دور تک مشہور ہوجاتے''۔(75)

پروفیسر شہاب عنایت ملک:

عصر حاضر کے جموں سے تعلق رکھنے والے قلمکاروں میں شہاب عنایت ملک کا ایک اہم نام ہے۔ان کا اصل نام شہاب عنایت اللہ ملک ہے ان کی پیدائش 10/مارچ 1965ء کو جموں خطے کے دور دراز ضلع ڈوڈہ کے علاقہ بھدرواہ کے مشہور گاؤں گاٹھا میں ہوئی تھی۔ان کا تعلق ریاست جموں وکشمیر کے مشہور شاعر رسا جاودانی سے تھا۔جو شہاب عنایت ملک کے نانا جی تھے اور ان کی ہی صحبت میں ان کی پرورش ہوئی۔

شہاب عنایت ملک کی ابتدائی تعلیم بھدرواہ سے ہوئی تھی اور یہی سے گونمنٹ ڈگری کالج بھدرواہ سے انھوں نے 1984ء میں بی اے کی تعلیم حاصل کی تھی۔شہاب عنایت ملک کو اردو زبان وادب سے بچپن سے ہی لگاؤ تھا۔انھوں نے بی اے کے بعد 1988ء میں جموں یونیورسٹی سے ایم اے اردو کی ڈگری فرسٹ پوزیشن میں حاصل کی اور یونیورسٹی نے انھیں اس قابلیت پر گولڈ میڈل سے بھی نوازا۔اس کے بعد اسی شعبہ سے انھوں نے 1990ء میں ڈاکٹر منظر اعظمی کی نگرانی میں قراۃ العین حیدر کے ناول ''گردش رنگ چمن'' کا تنقیدی جائزہ پر اپنے ایم۔فل کا مقالہ مکمل کیا۔بعدازاں منظر اعظمی صاحب کی ہی نگرانی میں انھوں نے 1993ء میں بعنوان ''قراۃ العین حیدر بحیثیت افسانہ نگار'' اپنے پی۔ایچ۔ڈی کے مقالے کو بہت ہی ہنرمندی اور غیر جانب داری سے انجام دیا۔اس کے بعد موصوف نے کچھ عرصہ تک کشتواڑ کالج میں جز وقتی لیکچرر کی حیثیت سے کام کیا مگر جلد ہی انھیں جموں یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں سرکاری ملازمت حاصل ہوگئی۔31/جولائی 2009ء کو وہ جموں یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے صدر مقرر ہوئے تھے،تاحال وہ اسی یونیورسٹی میں اپنی ملازمت کو انجام دے رہے ہیں۔اس دوران انھوں نے اردو ادب کی دنیا میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ان کی کئی ادبی تحریریں مختلف رسائل وجرائد میں منظر عام پر آچکی ہے۔

شہاب عنایت ملک نے کئی ادبی سمینار اور ورکشاپ کروائے ہیں۔ان میں سب سے زیادہ شہرت انھیں تین روزہ سمینار بعنوان ''ادب میں تحقیق اور مخطوطات کی اہمیت'' کی وجہ سے حاصل ہوئی تھی۔شہاب عنایت ملک کو بنیادی طور پر نثر نگاری کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔دور حاضر میں جموں خطے سے تعلق رکھنے والے نثر نگاروں میں ان کا اہم نام

ہے۔جموں کے معاصر قلمکاروں میں تعلق رکھنے والے ڈاکٹر لیاقت علی نے اپنی کتاب میں پروفیسر شہاب عنایت ملک کے بارے میں لکھا ہے:

> ''کشمیر کے معاصر محققین وناقدین میں پروفیسر شہاب عنایت ملک کا نام بھی آتا ہے۔شہاب عنایت ملک نے شعبہ اردو جموں یونیورسٹی کی صدارت کے دوران متعدد سمینار کروائے۔ان سمیناروں میں ریاست جموں وکشمیر کے علاوہ دلی لکھنؤ اور الہ آباد اور بین الاقوامی سطح کے دانشوروں نے بھی تحقیقی وتنقیدی مقالے پیش کیے۔جنھیں بعد میں کتابی صورت میں بھی شائع کیا گیا۔شہاب عنایت ملک کی کئی تحقیقی وتنقیدی کتابیں شائع ہوچکی ہیں''۔(76)

ان کی اب تک جو نثری تصانیف منظر عام پر آئی ہیں ان میں ''مدغوب شناسی''،''نئی جانیرے''،''قرۃ الدین حیدر بحثیت افسانہ نگار''،''گردش رنگ چمن کا تنقیدی جائزہ''،''اردو کا سیکولر کردار''،''جموں وکشمیر میں اردو صحافت۔ ماضی،مستقبل''،''ارمغان شہاب نئے امکانات''،''مضامین شہاب''،''وفا بھدرواہی۔فن اور شخصیت''،''وادئ چناب کے چند اہم اردو شعراء''،''ورق ورق آئینہ''،''بھدرواہ کے نمائندہ شعراء''،''جموں وکشمیر میں اردو زبان۔ماضی،حال، مستقبل''،''نئے تنقیدی جائزے''،''چاندنی بیگم:ایک جائزہ''،''عصری ادبی تفکرات''وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

پروفیسر شہاب عنایت ملک کی تخلیقی کاوشوں پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اب تک سترہ (17) سے زائد کتابیں شائع کی ہیں۔اس کے علاوہ انھوں نے مختلف موضوعات پر تحقیقی مضامین لکھے ہیں اور بہت سارے ادبی شخصیات پر تنقیدی مضامین تخلیق کیے ہیں۔

شہاب عنایت ملک کی تصانیف میں ایک بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ ان کی اکثر تصانیف میں قدرت اللہ شہاب کی ادبی خدمات پر تحقیقی وتنقیدی مضامین شامل ہیں۔قدرت اللہ شہاب برصغیر کی ایک عظیم شان کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنی زندگی کے کچھ حسین پل جموں خطے میں بھی گزارے تھے۔اس حوالے سے راقم الحروف نے ان کے بارے میں تفصیل سے پچھلے صفحات میں ذکر کیا ہے۔قدرت اللہ شہاب کی تخلیقات پر لکھے گئے شہاب عنایت ملک کے مضامین قابل تعریف اور جامع ہیں۔جن میں ''قدرت اللہ شہاب کی افسانہ نگاری'' قدرت اللہ شہاب کا شاہکار ناولٹ ''یا خدا''،''شہاب نامہ میں جموں کی جھلکیاں''اور چندروتی''وغیرہ جیسے قابل ذکر مضامین ہیں۔جن میں شہاب عنایت ملک نے نہ صرف قدرت اللہ شہاب کی ادبی وفنی کاوشوں کو منظر عام پر لایا ہے بلکہ ان کی شخصیت کے پس منظر میں

جا کر پنہاں پہلوؤں کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی۔ان تمام مضامین کو جاوید احمد مغل نے ترتیب دے کر کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔

پروفیسر شہاب عنایت ملک قدرت اللہ شہاب سے بہت متاثر تھے۔انھوں نے اپنی سوانحی عمری ''یادوں کے لمس''میں ایک جگہ پر لکھا ہے:

''میں قدرت اللہ شہاب کا ناولٹ ''یا خدا'' پڑھ کر ان کا شیدائی بن گیا۔آج میری شخصیت میں بے باکی کا عنصر ہے وہ قدرت اللہ شہاب کی تحریروں کی وجہ سے ہے''۔(77)

''اردو کے سیکولر کردار'' پروفیسر شہاب عنایت ملک کی بہترین کتابوں میں سے ایک ہے۔یہ دوروزہ قومی سمینار کے موقع پر پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ ہے۔جس کو مصنف نے کل انیس مقالہ نگار کے مقالات پر مشتمل کیا ہے۔384 صفحات پر مشتمل یہ تصنیف 2008ء میں جموں یونیورسٹی کی جانب سے منظر عام پر آئی تھی۔اس کتاب میں ریاست اور بیرون کے قلمکاروں نے مختلف موضوع پر اپنے مقالے شامل کیے ہیں۔پروفیسر شہاب عنایت ملک کا اس میں ایک اہم مضمون ''اردو دلوں کو جوڑنے والی زبان'' کے عنوان سے ہے۔اور اس کے ساتھ میں ہی انھوں نے دوروزہ قومی سمینار کی ایک رپورٹ بھی پیش کی ہے۔اردو زبان کے حوالے سے وہ اپنے اس مضمون میں لکھتے ہیں:

''اردو زبان محبت، بھائی چارے اور امن کی زبان ہے جس نے پورے ہندوستان کو ایک لڑی میں پروئے رکھا ہے۔یہ زبان ہے جس کی آبیاری ہر مذہب سے تعلق رکھنے والے ادیبوں نے اپنے خون جگر سے کی ہے۔یہ زبان ہندوستان کی اپنی زبان ہے جسے کسی ایک مذہب یا فرقے سے جوڑنا اس کے سیکولر کردار کو مجروح کرنے کے مترادف ہوگا۔اس زبان کے شاعروں اور ادیبوں نے تحریک آزادی میں وہ کارنامے انجام دیے ہیں جو سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں''۔(78)

اس کتاب میں تمام قلمکاروں نے اپنے مضامین اردو زبان کے حوالے سے پیش کیے ہیں۔اس ادبی سمینار میں ریاست کے کئی ادیب، دانشور، مفکر، صحافی وغیرہ شامل تھے۔جنھوں نے سمینار کو انجام تک پہنچایا تھا۔صدارتی خطہ میں پدم شری پروفیسر امیتابھ مٹو (وائس چانسلر، جموں یونیورسٹی) نے بھی اردو زبان کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کیا جس میں انھوں نے کہا:

''سب سے پہلے میں اس سیمینار کے منتظمین (Organisers) کو مبارکباد پیش کرنا چاہتا ہوں کہ تناؤ کے اس وقت میں اور غلط فہمیوں کے اس دور میں ہمیں اپنی پرانی قدروں کی طرف توجہ دینے کی بھی ضرورت ہے۔ ہم بھول گئے ہیں کہ اردو زبان کی تاریخ ہمیشہ سیکولر رہی ہے اور اردو زبان کا کسی ایک مذہب کے ساتھ تعلق نہیں رہا''۔(79)

''ورق ورق آئینہ'' بھی شہاب عنایت ملک کی ایک اچھی کتاب ہے۔ یہ کتاب انھوں نے دیپک بُدکی فن اور شخصیت پر لکھی ہے۔ شہاب عنایت ملک کے ساتھ اس کتاب کو ترتیب وتالیف دینے میں ڈاکٹر فرید پربتی اور ڈاکٹر انور ظہیر انصاری کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ مصنف کی یہ تصنیف 366 صفحات پر مشتمل ہے۔ ''ورق ورق آئینہ'' میں شہاب عنایت ملک نے دیپک بُدکی کی شخصیت پر جن قلمکاروں کے بہترین مضامین تھے ان تمام مضامین کو اکٹھا کر کے اس کتاب میں پیش کیا ہے۔ دیپک بُدکی کی شخصیت خاص طور پر تنقیدی و تحقیقی مضامین اور مکتوبات کو شامل کیا گیا ہے۔ شہاب عنایت ملک کا لکھا ہوا اس کتاب میں ایک مضمون ''زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی۔ ایک جائزہ'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں انھوں نے دیپک بُدکی کے افسانوی مجموعے زیبرا کراسنگ کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دیپک بُدکی کشمیر کے ایک اہم افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے کئی موضوعات پر افسانے اور کہانیاں لکھی ہیں جن میں زیادہ تر کشمیر کے مسائل نظر آتے ہیں۔ مگر اس کے علاوہ بھی انھوں نے بہت ساری ایسی کتابیں اور افسانہ تخلیق کیے ہیں جن میں مختلف موضوعات دیکھے جا سکتے ہیں۔ شہاب عنایت ملک دیپک بُدکی کی افسانہ نگاری کے بارے میں میں لکھتے ہیں :

''ان کے افسانوں کے مطالعے سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ بُدکی نہ صرف افسانہ نگار ہے بلکہ سماج کا بہترین نباض بھی ہے۔ موصوف کا یہ مجموعہ (زیبرا کراسنگ پر کھڑا آدمی) نہایت ہی رنگین خوب صورت ٹائٹل اور حد بندی سے آراستہ وپیراستہ ہے۔ طباعت اور کاغذ عمدہ ہے۔ کمپوزنگ کی اغلاط سے بھی پاک ہے۔ میں دیپک بُدکی کو ریاست جموں وکشمیر کے افسانوی ادب میں گراں قدر اضافے کے لیے تہنیت دیتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ مستقبل میں وہ ہمیں اس سے بھی بہتر تخلیقات سے نوازتے رہیں گے''۔(80)

''ورق ورق آئینہ'' کتاب ایک ایسی کتاب ہے جس کے مطالعے سے دیپک بُدکی کی ہر ادبی پہلو کو دیکھا اور جانا

جاسکتا ہے۔اس تصنیف میں جن مقالہ نگاروں نے دیپک بُد کی شخصیت پر قلم اٹھایا ہے قابل تعریف ہے۔جس سے دیپک بُد کی شخصیت وادبی خدمات کو سمجھا جاسکتا ہے۔اور خود دیپک بُد کی نے بھی اس کتاب کو مکمل کرانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔2010ء میں پروفیسر شہاب عنایت ملک نے جموں یونیورسٹی سے نکلنے والا مشہور ششماہی رسالہ ''تسلسل'' کو مرتب کیا تھا۔پروفیسر شہاب عنایت ملک کی کاوشوں کا یہ ایک اہم کام تھا کہ انھوں نے دوروزہ جشن فیض احمد فیض کے عنوان سے سمینار کروایا تھا جس کا اہتمام شعراء اردو جموں یونیورسٹی نے عالمی فیض صدی تقریبات کے سلسلے میں کیا تھا اور اس جشن میں ملک کے بہت سارے قلمکاروں نے اپنے اپنے مقالات کو پیش کیا تھا۔ان تمام مقالہ نگاروں نے فیض احمد فیض کی شخصیت اور شاعری کو موضوع بنایا تھا۔جس کو بعد میں شہاب عنایت ملک نے ترتیب دے کر ششماہی رسالہ ''تسلسل'' میں شائع کیا۔

''جموں وکشمیر میں اردو زبان۔ماضی،حال و مستقبل'' پروفیسر شہاب عنایت ملک کا تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ان کی یہ کتاب 240 صفحات اور کل 18 مضامیں پر مشتمل ہے۔جو 2010ء میں جموں یونیورسٹی کی جانب سے شائع ہوئی تھی۔اردو زبان کے حوالے سے اس کتاب میں جن مشہور ادیبوں کے مضامین شامل ہیں ان میں خاص طور پر پروفیسر مجید بیدار، پروفیسر نذیر احمد ملک، پروفیسر محمد اسداللہ وانی،ڈاکٹر محمد اقبال،اسیر کشتواڑی،ڈاکٹر مشتاق احمد وانی، بلراج بخشی، دیپک بُد کی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔پروفیسر شہاب عنایت ملک جموں خطے میں اردو زبان وادب کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کرتے آئے ہیں۔ریاست جموں وکشمیر میں اردو زبان کے آغاز کی کہانی بہت ہی پر لطف ہے جس کی وجہ سے نہ صرف ریاست جموں وکشمیر کی سماجی،سیاسی،ثقافتی،اقتصادی تاریخ ہمارے سامنے آتی ہے بلکہ ذہنی ،شعوری اور فکری وحدت کے موثر ذریعے کی شکل وصورت بھی ابھر کر سامنے آجاتی ہے جس سے ریاست کا ہر وہ فرد جو زبان وادب سے دلچسپی رکھتا ہے اس کے لیے ان سب چیزوں کا مطالعہ بے حد ضروری ہو جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ریاست کے بہت سارے قلمکاروں نے جموں خطے میں اردو زبان کے حوالے سے مختلف رائے پیش کی ہیں۔پروفیسر شہاب عنایت ملک اردو زبان کے حوالے سے یوں رقمطراز ہیں:

> ''جہاں تک ریاست جموں وکشمیر میں اردو زبان کا تعلق ہے تو اسے بجا طور پر ریاست کی دو ترسیلیت کی موثر اور دیرپا ایجاد شدہ زبان ہونے کا شرف اسی طرح حاصل ہے جس طرح مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کو اردو زبان کے فروغ کا شرف حاصل ہے۔یہی وجہ ہے کہ اردو زبان ریاست جموں وکشمیر میں مواصلاتی نظام کے استحکام کے شانہ بہ شانہ آگے بڑھی

اور اپنی سرعت روی سے وہ مقام و مرتبہ حاصل کیا کہ ہم اس زبان کو فخر سے ہندوستان کی واحد ریاست کی سرکاری زبان ہونے کے اعزاز سے یاد کرتے ہیں''۔(81)

''مضامین شہاب'' بھی پروفیسر شہاب عنایت ملک کی ایک تصنیف ہے جس میں مصنف نے مختلف موضوعات پر تحقیقی وتنقیدی مضامین کو شامل کیا ہے۔اس تصنیف میں بیشتر ایسے مضامین ہیں۔ان مضمون نگاروں کا تعلق صوبہ جموں سے ہے۔جن مضمون نگاروں نے اپنے مضامین کو اس کتاب میں شامل کیا ہے ان میں بہت ساری جگہوں پر تشنگی دکھائی دیتی تھی جس کو پروفیسر شہاب عنایت ملک نے ان ادیبوں کی سوانحی حیات کے ساتھ ساتھ ان کی ادبی کاوشوں کا بہترین طریقے سے جائزہ لیا ہے۔

پروفیسر شہاب عنایت ملک نے صوبہ جموں میں اردو زبان سے تعلق رکھنے والے بڑے ادیبوں وافسانہ نگاروں کے پوشیدہ پہلوؤں کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔جس طرح سے اردو ادب سے تعلق رکھنے والے بڑے افسانہ نگار کرشن چندر کے بارے میں یہ بات بہت ہی عام تھی کہ وہ پونچھ کے رہنے والے تھے مگر شہاب عنایت ملک نے اپنی تحقیق میں یہ بات ثابت کر دکھایا کہ کرشن چندر پونچھ میں پیدا نہیں ہوئے تھے اس حوالے سے ان کا مضمون بعنوان ''وادی پونچھ وکرشن چندر'' قابل ذکر ہے اس میں مصنف نے اس غلط فہمی کو دور کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کرشن چندر بھرت پور میں پیدا ہوئے تھے اور مینڈر کے ایک اسکول میں وہ اس وقت پانچویں جماعت میں داخل کر دیئے گے تھے جب ان کے والد اپنی ڈاکٹری کے سلسلے میں اپنے فرائض انجام دینے پونچھ میں آئے تھے۔

اسی طرح سے پروفیسر شہاب عنایت ملک نے غلام رسول کامگار جو جموں خطے کے ابتدائی دور کے شاعر تھے ان کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے تھے مگر پروفیسر شہاب عنایت ملک نے اس کام کو پورا کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ انھوں نے غلام رسول کامگار کی بہت ساری ایسی تحریروں کو منظر عام پر لایا جو غیر مطبوعہ تھیں۔ان غیر مطبوعہ تخلیقات کو مصنف نے مطالعہ کر غلام رسول کامگار کی شخصیت اور ان کے کلام کو اپنی کتاب میں منظر عام پر لانے کی کوشش کی۔اس کے علاوہ بھی پروفیسر شہاب عنایت ملک نے بہت ساری شخصیت کے پوشیدہ پہلوؤں کو سامنے لایا ہے جن میں ترنم ریاض اور اسیر کشتواڑی کے فن کو بھی پرکھنے کی کوشش کی ہے۔

''عصری ادبی تفکرات'' بھی پروفیسر شہاب عنایت ملک کی بہترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ان کی یہ تصنیف 2013ء میں منظر عام پر آئی۔اس کتاب میں مصنف نے مختلف موضوعات پر مضامین ومقالات،تاثرات،سفرنامے

وغیرہ پر قلم اٹھایا ہے۔اس کتاب کے اکثر مضامین کتاب کے منظر عام پر آنے سے پہلے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے تھے۔اس کتاب میں ایک خاص بات جو اردو کے مشہور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کے حوالے سے پیش کی گئی ہے ۔منٹو کے ایک خط کو پروفیسر شہات عنایت ملک نے مدِ نظر رکھ کر جو تحقیقی مضمون تخلیق کیا ہے اس سے منٹو کی شخصیت کے حوالے سے نئے نئے پوشیدہ پہلو دیکھے جاسکتے ہیں۔اس کے علاوہ اس کتاب میں ہندو پاک کی سیاسی تاریخ و ثقافت کے اہم پہلوؤں کی بھی جانکاری ملتی ہے۔پروفیسر شہاب عنایت ملک کی ایک اور بہترین تصنیف بعنوان ''قدرت اللہ شہات ۔شخصیت اور فن'' قابل ذکر ہے۔یہ کتاب شہابت عنایت ملک کی اٹھارہویں کتاب ہے جو 160 صفحات پر مشتمل ہے جو 2015ء میں منظر عام پر آئی تھی۔جیسا کہ پچھلے چند صفحات میں راقم نے یہ تحریر کیا ہے کہ قدر اللہ شہاب کی شخصیت سے پروفیسر شہاب عنایت ملک بے حد متاثر تھے اس لیے ان کے لئے یہ بے حد ضروری تھا کہ وہ قدرت اللہ شہات کے پوشیدہ پہلوؤں کو منظر عام پر لائیں اور اس کتاب سے انھوں نے یہ کام بھی پورا کر دکھایا۔یہ کتاب نہ صرف ریسرچ اسکالروں کے لیے اہم ہے بلکہ اردو ادب کے حوالے سے پورے برصغیر میں یہ کتاب اہم مواد فراہم کرتی ہے۔قدرت اللہ شہاب جموں و کشمیر کے پہلے آئی سی ایس تھے اور انھوں نے کافی عرصہ جموں میں گزارا تھا اس دوران انھوں نے اردو زبان کو فروغ دینے میں جتنے بھی اہم کارنامے انجام دیے تھے وہ سب مصنف نے اپنی اس کتاب میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔اس کتاب میں مصنف نے قدرت اللہ شہاب کی نثری کاوشوں مثلاً ان کے مشہور افسانے ''یا خدا''، ''ماضی''، ''چندروتی'' وغیرہ پر شہاب عنایت ملک نے گہرائی سے جائزہ لیا ہے۔

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ پروفیسر شہاب عنایت ملک ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں جنھوں نے اپنی پوری زندگی اردو زبان و ادب کو فروغ دینے میں صرف کی اور دور حاضر میں بھی وہ اس زبان کے لیے نمایاں کام کر رہے ہیں۔وہ نہ صرف جموں یونیورسٹی کے طلبا و اسکالروں میں اہم رول ادا کرتے ہیں بلکہ جمو یونیورسٹی کے انتظامیہ میں بھی وہ ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔

پروفیسر شہاب عنایت ملک کو مختلف کارناموں کی بنیاد پر بہت سارے انعامات و اعزازات سے نوازا جاچکا ہے۔1988ء میں انھیں جموں یونیورسٹی کی جانب سے اردو ایم اے میں پہلی پوزیشن پر طلائی تمغہ حاصل ہوا۔اس کے بعد 1997ء میں انھیں انجمن ترقی اردو ہند کی جانب سے سالانہ اعزاز حاصل ہوا۔1998ء میں جموں و کشمیر اردو فارمز کا اعزاز ملا۔1997ء میں محبّ اردو اعزاز ملا۔اسی طرح سے 2011ء میں بھگت سنگھ کی برسی پر بھی انھیں اعزاز دیا گیا وغیرہ وغیرہ۔

ڈاکٹر نسیمہ بانو:

جموں خطے سے تعلق رکھنے والی خاتون قلمکاروں میں ڈاکٹر نسیمہ بانو ایک اہم نام ہے۔اور انھیں ضلع ڈوڈہ کی پہلی ادیبہ ہونے کا بھی شرف حاصل ہے۔وہ بنیادی طور پر ایک محقق ہیں۔ان کی دو تصانیف اب تک منظر عام پر آچکی ہیں۔جن میں ''روح نشاط'' اور ''کلام مجنوں'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔اول الذکر کتاب میں مصنفہ نے جموں یونیورسٹی کی جانب سے اپنے ایم۔فل کا مقالہ تخلیق کیا ہے اور آخر الذکر میں انھوں نے ''کلام مجنوں'' ظہور الدین کی نگرانی میں اپنی پی۔ایچ۔ڈی کے لیے موضوع مخصوص کیا تھا۔ والی محمد اسیر کشتواڑ صاب نے اپنی کتاب میں لکھا ہے:

> ''ان کی دونوں کتابیں بڑی خوبصورت اور قابل مطالعہ ہیں ویسے تو آج کل اردو میں پی۔ایچ۔ڈی کرنے کے لیے عام طور پر طلبا کسی قسم کی بڑی دقت محسوس نہیں کرتے لیکن نسیمہ جی کے موضوعات کافی محنت طلب تھے۔جس خوبصورت ڈھنگ سے انھوں نے اپنے تحقیقی کام کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے وہ ان کی قابلیت ومحنت کا ٹھوس ثبوت ہے''۔(82)

''نشاط روح'' مصنفہ کی ایک اچھی کتاب ہے۔یہ کتاب کل 120 صفحات پر مستمل ہے جو 1993ء میں منظر عام پر آئی تھی۔اس کتاب میں مصنفہ نے بہت ہی اہم مواد اکٹھا کیا ہے۔جس سے نشاط کشتواڑی کی ادبی زندگی اور ان کی شخصیت کے اہم پہلوؤں کی طرف نشاندہی ملتی ہے۔اس کتاب کے حوالے سے پروفیسر ظہور الدین فرماتے ہیں:

> ''روح نشاط'' چونکہ نسیمہ بانو کی پہلی باقاعدہ اور مسلسل تحریر ہے اس لیے اس میں فرد گزاشتیں تو ہیں ہی ان کے ساتھ ایسا مواد بھی خاصا موجود ہے جو کسی سنجیدہ طالب علم کی فکر کے لیے مہمیز کا کام انجام لاسکتا ہے۔موصوفہ نے نہ صرف نشاط کی حیات کے اہم پہلوؤں کو اجاگر کر کے ہمارے سامنے ایک معصوم انسان کی تصویر ابھاری ہے بلکہ اس کی ادبی خدمات سے بھی کما حصہ انصاف کرنے کی کوشش کی ہے''۔(83)

ڈاکٹر نسیمہ بانو کا دوسرا تحقیقی کارنامہ ان کا دوسرا مقالہ ہے جو انھوں نے ''کلام مجنوں'' کے عنوان سے تخلیق کیا تھا۔ان کی یہ کتاب (72) صفحات پر مشتمل ہے جو 1993ء میں منظر عام پر آئی۔اس کتاب میں مصنفہ نے مجنوں گورکھپوری کی حیات اور کارناموں سے متعلق روشنی ڈالی ہے۔اس تصنیف میں خاص طور پر مجنوں گورکھپوری کے کلام کا کچھ حصہ اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے حیات وخدمات کے متعلق دو مضامین کو زیر بحث لایا ہے۔اس بات میں کوئی

شق نہیں کہ مجنوں گورکھپوری کی ادبی خدمات پر یہ ایک اچھا مقالہ ہے، جس سے ان کی شاعری، ڈراما نگاری، افسانہ نگاری اوران کی حالات زندگی پر مواد حاصل ہوسکتا ہے۔اس لیے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ مجنوں گورکھپوری کی شخصیت پر جتنی بھی تصانیف منظر عام پر آئی ہیں ان میں ''کلام مجنوں'' بھی ایک اہم کتاب ہے۔

بہر حال ڈاکٹر نسیمہ بانو خطہ جموں کی ایک اچھی اور ہنر مند مصنفہ ہیں اگر چہ ابھی تک انھوں نے بہت کم لکھا ہے مگر جتنا بھی لکھا ہے۔اس سے ان کی شہرت قابل تعریف ثابت ہوتی ہے۔انھوں نے ایک تو ریاست جموں وکشمیر کے ایک سر براہ شاعر وادیب کا متعارف کروایا ہے اور دوسرا انھوں نے ''کلام مجنوں'' جیسی کتاب لکھ کر اہم کارنامہ انجام دیا۔

پریمی رومانی:

جموں خطے میں 1947ء کے بعد محققین ونقادوں میں ایک اہم نام پریمی رومانی کا ہے۔ان کی پیدائش 1953ء میں رنگ ٹینگ (سرینگر) میں ہوئی تھی۔ان کا اصل نام سبھاش چندر الیہ ہے مگر ادبی دنیا میں وہ پریمی رومانی کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ان کا تعلق کشمیری پنڈت کے گھرانے سے ہے۔ان کے والد صاحب برج پریمی ریاست جموں و کشمیر کے مشہور افسانہ نگار، محقق، نقاد وغیرہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔اسی طرح سے پریمی رومانی کا شمار بھی جموں خطے کے دور حاضر کے مشہور محققین، نقادوں میں کیا جاتا ہے۔ان کی بہت ساری تصانیف ابھی تک منظر عام پر آچکی ہیں اور متعدد تحقیقی وتنقیدی مضامین مختلف موضوعات پر ریاست اور ریاست کے باہر کئی رسائل وجرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے شاعری میں بھی طبع آزمائی کی ہے مگر بنیادی طور پر انھیں ایک نثر نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔پریمی رومانی کی تحریر کردہ تصانیف میں ''جدید اردو شاعری۔ چند مطالعے''،''اوراق''، ''ردعمل''، ''تاثرات''،''میزان''، ''پیش رفت''، ''اقبال اور جدید اردو شاعری''،''مظہر امام حیات اورفن''،''تحریر وتقریر''،''اعتراف اور توازن'' وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔اس کے علاوہ انھوں نے اپنے والد جناب ڈاکٹر برج پریمی کی کچھ کتابوں کو مرتب کیا ہے۔جن میں خاص طور پر ''چند تحریریں، ذوق نظر اور مباحث وغیرہ قابل ذکر ہیں۔''جدید اردو شاعری: چند مطالعے'' مصنف کی جدید شاعروں کے انفرادی مطالعوں سے متعلق یہ کتاب اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے بہت ہی محنت اور لگن سے اس کام کو انجام دیا ہے۔ان کی یہ کتاب 1980ء میں پہلی بار منظر عام پر آئی تھی ۔اس میں پریمی رومانی نے اردو کے مشہور شاعروں کے کلام کا جائزہ لیا ہے۔اس کتاب میں انھوں نے کل دس شعراء کے کلام پر روشنی ڈالی ہے جن میں خاص طور پر خلیل الرحمٰن اعظمی، بلراج کومل، مخمور سعیدی، شہر یار، حامدی کاشمیری وغیرہ

قابل ذکر ہیں۔

''جدید اردو شاعری۔ چند مطالعے'' کے آغاز میں مصنف نے اپنا ایک مضمون ''اردو شاعری کی نئی جہتیں'' کے عنوان سے قلم بند کیا ہے۔اس کتاب میں مصنف نے نئی شاعری کے متعلق جو غلط فہمیاں ابھر کر سامنے آئی تھیں ان کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ جدید شاعری یا نئی شاعری پر اس طرح کی کوئی بھی کتاب دیکھنے کو نہیں ملتی ہے۔ جس میں نئی شاعری کی قاری تک رسائی ہو سکے۔ اسی کمی کو پریمی رومانی نے محسوس کیا۔ اس کے بعد انھوں نے مختلف شعراء کے شاعری کو گہرائی سے مطالعہ کر کے کتابی شکل میں منظر عام پر لایا۔ مظہر امام اس کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''جدید اردو شاعری۔ چند مطالعے'' بلاشبہ ایک ایسی کتاب ہے جو آج کی شاعری کے خط وخال کو اجاگر کرتی ہے۔نئی شاعری کے تعلق سے جو غلط فہمیاں راہ پا گئی ہیں ان کو دور کرنے میں بھی یہ کتاب بالواسطہ مدد دیتی ہے۔ پریمی رومانی نے مفتی کا نہیں، ادب کے سنجیدہ طالب علم ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے''۔(84)

پریمی رومانی چونکہ خود بھی اچھے جدید دور کے شاعر ہیں۔ وہ اپنے ہمعصر شاعروں سے بخوبی واقف ہیں اس لیے انھوں نے یہ قدم اٹھایا اور اس کارنامے کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ پریمی رومانی جدید شاعری کے اچھے پارکھ ہیں۔ اس کتاب سے پریمی رومانی کے اسلوب کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اپنے نقطہ نظر میں بہت ہی عزم سے کام کیا ہے ۔اس کتاب کے دیباچے میں ڈاکٹر عالم خوندی میری نے لکھا ہے:

> ''پریمی رومانی نئی اردو شاعری کے مزاج آشنا ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ وہ عصری ادب اور نئے ادب کے فرق وامتیاز سے واقف ہیں''۔(85)

''ردِعمل'' پریمی رومانی کی بہترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ یہ کتاب کل 178 صفحات پر مشتمل مختلف شاعروں کی تحریروں پر تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو 1994ء میں منظر عام پر آئی تھی۔

اس کتاب میں مصنف نے چند نمائندہ شاعروں کے معروضی مطالعے پر روشنی ڈالی ہے۔ پریمی رومانی کو اس بات کی کمی محسوس ہو رہی تھی کہ جدید شعراء پر ان کی شخصیت اور فن پر ایسی کوئی کتاب تخلیق کی جائے جسے جدید شعراء کے نئے تجربوں نئی علامتوں اور نئی جہتوں پر تفصیل سے گفتگو کی جا سکے۔ اگر چہ ''ردِعمل'' کے اس تحقیقی وتنقیدی مجموعے میں تمام جدید شعراء کا احاطہ نہ ہو سکا ہے مگر جن شعراء کی شاعری پر پریمی رومانی نے قلم اٹھایا ہے قابل تعریف ہے۔ اس

حوالے سے انھوں نے خود لکھا ہے:

''اگر چہ یہ مجموعہ تمام تر جدید شعراء کا احاطہ نہیں کرتا۔تاہم میں نے اس کتاب میں ان شعراء کو موضوع بحث بنایا۔ جو میری دانشت میں نئی شاعری کے معماروں میں سے ہیں۔میرے ذہن میں چند اور نام بھی ہیں جن پر مضامین لکھ کر آئندہ دوسرے مجموعے میں شامل کروں گا ''۔(86)

نئی شاعری کے حوالے سے جس غیر جانبداری سے پریمی رومانی نے نمائندہ شاعروں کی شاعری پر روشنی ڈالی ہے۔اس سے بہت سارے شعراء کی نئی نئی جہتیں سامنے آجاتی ہیں۔اختر الایمان پریمی رومانی کا محبوب شاعر بھی ہے۔ اختر الایمان کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے:

''اختر الایمان ایک ذہین اور منفرد انداز کے فن کار ہیں۔انھوں نے ہمیشہ غیر روایتی انداز نظر اختیار کیا ہے۔ان کے یہاں موضوع اور ہیئت کے جتنے بھی تجربے ملتے ہیں وہ روایتی انداز سے مختلف ہیں۔قطع نظر اس حقیقت کے وہ ترقی پسند تحریک کے دوران ابھرے۔انھوں نے سکہ بند تصورات اور موضوعات سے اجتناب کیا۔یہی وجہ ہے کہ وہ اس زبردست ادبی تحریک سے دور رہے''۔(87)

اس طرح کے کئی بیانات انھوں نے جدید شعراء کی شاعری کے حوالے سے اپنی اس کتاب ''ردِعمل'' میں پیش کیے ہیں۔اس کتاب کو ادبی حلقوں میں کافی شہرت حاصل ہوئی۔انھوں نے جہاں بیرون ریاست سے تعلق رکھنے والے بڑے شاعروں کے کلام پر انصاف کیا وہیں اپنی ریاست کے جدید شعراء سے تعلق رکھنے والے شاعروں کی کاوشوں پر بھی غیر جانبداری سے اظہار خیال کیا۔حامد کاشمیری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''حامدی کاشمیری کی شاعری میں قدیم اور جدید کا امتزاج ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ان کی آواز جانی پہچانی لگتی ہے اس آواز کے جادو، تاثیر، جذبے کی شدت اور اس کے پس پشت چھپے ہوئے تخلیقی ذہن کی کارفرمائی سے ان کی شاعرانہ اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے''۔(88)

پریمی رومانی کی تنقیدی کتاب ''اوراق'' کے عنوان سے پہلی بار 1981ء میں منظر عام پر آئی تھی۔اس تحقیقی و تنقیدی مجموعے میں یہ بات قابل غور ہے کہ اس کتاب میں حیرت انگیز تنوع ملتا ہے۔اس میں پریمی رومانی نے جن

شاعروں کا ذکر کیا ہے ان میں جوش ملیح آبادی، اختر الایمان، طالب کاشمیری، بلراج کومل، وزیر آغا، راج نرائن راز، خلیل الرحمٰن، شہر یار وغیرہ کا ذکر خاص طور پر اہمیت کے حامل ہے۔ اس کتاب کی وجہ سے اردو ادب کے مشہور دانشوروں نے پریمی رومانی کی ہمت افزائی کی تھی۔ پروفیسر مسعود حسین خان اس کتاب کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''پریمی رومانی کا قدم خوب سے خوب تر کی جانب اٹھ رہا ہے اگر وہ اسی طرح ترقی کرتے رہے اور اپنے مخصوص میدان تنقید یعنی جدید اردو شاعری سے باہر نہ بھٹکے تو یقیناً کچھ عرصہ بعد اردو ادب میں ان کی آواز غور سے سنی جائے گی''۔(89)

پریمی رومانی کی کتاب ''پیش رفت'' ایک اہم کتاب ہے۔ اس میں بھی مصنف نے اپنی تحقیقی وتنقیدی مضامین کو پیش کیا ہے۔ یہ کتاب کل 200 صفحات پر مشتمل ہے جو 2000ء میں شائع ہوئی تھی۔ پریمی رومانی کی اس کتاب میں کل بیس (20) مضامین شامل ہیں جو انھوں نے مختلف موضوعات پر لکھے تھے۔ اس تصنیف کے بارے میں یوں کہا جائے کہ پریمی رومانی نے اس میں دریا کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی ہے تو غلط نہ ہوگا۔

اقبال کے فکر وفن کے حوالے سے صفحوں کے صفحے بھر جاتے ہیں اور علامہ اقبال کے بارے میں جتنا زیادہ لکھا جائے اتنا ہی کم ہے مگر مصنف نے اس میں بہت کم الفاظ میں اقبال کی فکری وفنی پہلوؤں کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ پریمی رومانی نے بھی علامہ اقبال سے متاثر ہونے والے بڑے بڑے ادیبوں اور دانشوروں کے بارے میں رائے پیش کی ہیں۔ جن میں سہاب اکبرآبادی، امین جزویں، جگر مرادآبادی، حفیظ جالندھری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مثال کے طور پر پریمی رومانی نے ایک جگہ لکھا ہے:

> ''اقبال سے متاثر ہونے والے فنکاروں میں سیماب اکبرآبادی کا نام سرفہرست ہے۔ سیماب نے اقبال کے فلسفیانہ تفکرات میں سے خودی، عشق، عقل، حیات وکائنات، حسین، انسان، خدا وغیرہ کو لیا اور ان پر اپنا اظہار خیال کیا۔ یہ صحیح ہے کہ سیماب فلسفیانہ تفکر کے اعتبار سے اقبال سے بہت پیچھے ہیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ ان کو وہ لب ولہجہ حاصل نہ ہوسکا جو صرف اقبال کا ہے۔لیکن ان کے یہاں ان موضوعات کو برتنے کی اچھی کوششیں نظر آتی ہیں''۔(90)

پریمی رومانی نے اس کتاب میں جہاں ایک طرف اقبال، ٹیگور، جگن ناتھ آزاد اور مظہر امام جیسی شخصیتوں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے تو وہی دوسری طرف انھوں نے ریاست جموں وکشمیر سے تعلق رکھنے والے مشہور شاعروں و ادیبوں کے بارے میں بھی اپنے خیالات کو پیش کیا ہے۔جن میں پریم ناتھ پریمی، دینا ناتھ کاشمیری، رسا جاودانی، میر غلام رسو نازکی، موتی لال ساقی، مرغوب بانہالی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اس کے علاوہ انھوں نے اس کتاب میں ''اردو داستان اور ہندوستانی داستانیں'' گیت ہماری تہذیب کے آئینہ'' پر بھی روشنی ڈالی ہے اور بہت ساری نئی باتوں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ جمہوری فکر اور ٹیگور کی شاعری کے ذریعے سے ان کے خیالات کو قارئین تک پہنچانے کی کوشش ہے۔داستانوں کے بارے میں پریمی رومانی ایک جگہ پر لکھتے ہیں:

> ''اردو داستانوں کی تاریخ 19 ویں صدی کے نصف آخر سے شروع ہوتی ہے اور داستان نویسی کی پہلی عمدہ مثال عطا حسین تحسین کی ''نوطرز مرقع'' میں ملتی ہے۔اس کے بعد فورٹ ولیم کالج کے زیر اہتمام بہت سی داستانیں لکھی گئیں''۔(91)

''تاثرات'' بھی پریمی رومانی کی ایک اچھی کتاب ہے۔اس کتاب میں اردو ادب سے تعلق رکھنے والے ادیبوں وشاعروں کی شاعری اور نثر نگاری کو موضوع بنایا ہے۔پریمی رومانی نے جہاں ایک طرف اردو فکشن کے بڑے افسانہ نگاروں پریم چند اور کرشن چندر جیسے مقبول ومعروف فکشن نگاروں کی تحریروں پر قلم اٹھا اس کے علاوہ انھوں نے شاعری کے حوالے سے سیماب اکبر آبادی، قتیل شفائی، حفیظ جالندھری وغیرہ جیسے مشہور شاعروں کے کلام پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔سیماب کی شاعری کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''سیماب سامراج کے سفاک رویہ سے دل برداشتہ تھے اور فرنگی شاطروں کی فریب کاریوں سے آشنا تھے۔ان کا دل بھی آزادی وطن کے لیے بے چین تھا۔اتنا ہی نہیں وہ اہل وطن کو بھی آزادی کی جدو جہد کے لیے آمادہ پیکار دیکھنا چاہتے ہیں''۔(92)

''میزان'' کے عنوان سے تحریر کی ہوئی پریمی رومانی کی اچھی تصنیف ہے۔جو 2006ء میں منظر عام پر آئی تھی۔ 156 صفحات پر مشتمل ہے جس میں پریمی رومانی نے پانچ ابواب کو شامل کیا ہے۔پریمی رومانی کی اس کتاب کے بارے میں مختصراً یوں کہا جائے کہ اس میں انھوں نے تقریباً چھتیس (36) کتابوں پر تبصرے کیے ہیں ان تبصروں سے معلوم ہوتا ہے کہ پریمی رومانی نے ان تمام تصانیف کو گہرائی سے مطالعہ کر کے جائزہ پیش کیا ہے۔اس کتاب کا باغور مطالعہ

کر کے پتہ چلتا ہے کہ پریمی رومانی کا تنقیدی شعور بہت گہرا ہے جس کی وجہ سے ان کی اس تصنیف میں استقادی عنصر نمایاں طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔اس کتاب کے شائع ہونے سے پہلے پریمی رومانی کے یہ تمام تحقیقی وتنقیدی مضامین ہندوستان اور پاکستان کے مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہے تھے۔جن کی وجہ سے مصنف کو کافی سراہا گیا ہے۔ جیسا کے اس کتاب کے بارے میں خود مصنف نے لکھا ہے:

''یہ تبصرے اور جائزے وقتاً فوقتاً ہندوپاک کے متعدد رسائل وجرائد میں شائع ہو چکے ہیں اور پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا جاچکے ہیں۔ان میں بعض تبصرے مختلف علمی وادبی انجمنوں کے زیر اہتمام منعقد کیے گئے سیمناروں میں پیش کیے گئے جن کی نہ صرف باذوق قارئین نے داد دی بلکہ اردو کے بعض عالموں اور دانشوروں نے بھی اپنے ذرین خیالات سے نوازا جن سے میں نے راہ اور روشنی پائی''۔(93)

پریمی رومانی نے اقبال کی جن تصانیف پر تبصرہ کیا ہے قابل تعریف ہے۔انھوں نے اقبالیات کے متعلق چار تصانیف کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے جن میں ''اقبال اور مشاہیر کشمیر''،''سیاح اقبال''،''اقبالیات آزاد ایک جائزہ''اور مفتاح اقبال'' قابل ذکر ہیں۔انہوں نے علامہ اقبال کے فکر وفن کے کئی پوشیدہ پہلوؤں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔اقبالیات پر لکھے ہوئے اس باب کے مطالعے سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے پریمی رومانی نے اقبال کے افکار کا بہت ہی گہرائی سے مشاہدہ کیا تھا۔ایک جگہ پر وہ اقبال کے موضوع پر لکھتے ہیں:

''اقبالیات کے موضوع پر نہ صرف اردو میں بلکہ دنیا کی مختلف زبانوں میں ادب تخلیق ہو چکا ہے اور بے شمار ایسی تصانیف منظر عام پر آچکی ہے جن میں اقبال کے فکر وفن کا احاطہ کیا گیا ہے ....کلیم اختر کی تصنیف اقبال اور مشاہیر کشمیر اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اقبال اور کشمیر کے حوالے سے پروفیسر جگن ناتھ آزاد اور ڈاکٹر صابر آفاقی کی تصانیف کو صرف نظر نہیں کیا جاسکتا ان تصانیف میں اقبال اور مشاہیر کشمیر کے بارے میں بہت ساری معلومات فراہم ہوتی ہیں۔لیکن کلیم اختر کی تصنیف اس موضوع پر تفصیلی جائزہ پیش کرتی ہے۔اس تصنیف میں نہ صرف بزرگان دین کے تئیں والہانہ عقیدت کا اظہار انھوں نے کیا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ علامہ اقبال اپنے کلام و پیام میں ان بزرگان دین

کے تئیں کس طرح سے عقیدت کا اظہار کرتے ہیں بلکہ انھوں نے بعض اہم مشاہیر کشمیر کا جائزہ بھی بڑے دلنشین انداز میں پیش کیا ہے''۔(94)

''میزان'' میں پریمی رومانی نے جن قلمکاروں کے مضامین شامل کیے ہیں ان کا شمار جموں کشمیر کے اہم ادبا و شعراء میں ہوتا ہے۔اس تصنیف میں شامل مضامین ملک کے مختلف رسائل و جرائد میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ پریمی رومانی کی تحقیقی وتنقیدی کاوشوں کو بڑے بڑے محققین نے حوصلہ افزائی کی ہے۔ پروفیسر مسعور حسین خان پریمی رومانی کی تحقیقی وتنقیدی تحریروں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

''پریمی رومانی نے تنقید کرتے وقت نہات عزم اور احتیاط سے کام لیا ہے۔ کیوں کہ ان کا ذوقِ شعری بھی نفیس ہے۔اس لیے کمال فن کی اچھی پرکھ بھی کی ہے۔ جہاں فن کی کسوٹی پر کسی نظم یا شاعر کو پورا نہیں پایا، وہاں بے باکی سے انگلی بھی دھری ہے''۔(95)

پریمی رومانی کی تحریروں سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ وہ جب بھی کسی کتاب، مصنف، یا موضوع پر بات کرتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے اپنی رائے نہیں دی ہے بلکہ ایسا لگتا ہے کہ وہ قاری کی خیالات کا اظہار کرتے ہیں اس عمدگی سے وہ کسی موضوع پر تبصرہ کرتے ہیں۔ یہی انداز ان کی تحقیقی وتنقیدی کاوشوں کو بلند درجہ پر لے جاتا ہے۔انھوں نے جس طرح سے اپنی کتاب ''میزان'' میں پروفیسر ظہورالدین، کے افسانوی مجموعہ ''تلافی'' دیپک بُدکی کے افسانوی مجموعے ''ادھورے چہرے'' مشتاق احمد وانی کے افسانوی مجموعہ ''ہزاروں غم'' اور اسی طرح سے زنفر کھوکھر کے مجموعے ''کانچ کی سلاخ'' پر تبصرہ کیے ہیں اس سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ پریمی رومانی کا تحقیقی وتنقیدی ردِعمل کس قدر اہم ہے۔ مثلاً وہ زنفر کھوکھر کے افسانوں پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

''زنفر کھوکھر کا اسلوب صاف ستھرا اور نکھرا ہوا ہے۔اس میں کوئی پیچ وخم نہیں بلکہ وہ براہ راست اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کی قائل ہیں۔ان کی زبان میں فارسیت کا غلبہ نہیں انھوں نے آسان اور خوشحال الفاظ اور تراکیب کا سہارا لے کر اپنے افسانوں میں رنگ آمیزی کی ہے''۔(96)

''اعتراف'' بھی پریمی رومانی کی ایک اچھی کتاب ہے۔اس کتاب میں انھوں نے مختلف موضوعات پر اپنی تحقیقی وتنقیدی مضامین کو پیش کیا ہے۔ان کی یہ کتاب 146 صفحات پر مشتمل پہلی بار 2008ء میں شائع ہوئی تھی۔اس

کتاب کے لیے پریمی رومانی کو ریاستی کلچرل اکیڈمی کی جانب سے مالی امداد بھی فراہم ہوئی تھی جیسا کہ انھوں نے خود بھی اس کے بارے میں کتاب کے ابتداء میں ذکر کیا ہے۔

اس کتاب میں انھوں نے اردو ادب کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور ساتھ ہی ساتھ انھوں نے اس کتاب میں بعض ملکی اور غیر ملکی، تاریخ نویسوں کی خدمات کا جائزہ پیش کیا ہے جنھوں نے جموں وکشمیر کی تہذیب و ثقافت کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا تھا۔ کرشن چندر، مظہر امام، جگر مرادآبادی جیسی شخصیت پر جس طرح پریمی رومانی نے اس کتاب میں بحث کی ہے بہت ہی قابل تعریف ہے۔ کرشن چندر کے بارے میں ایک جگہ یوں رقمطراز ہیں۔

''کرشن چندر اور کشمیر کا تعلق نہایت ہی گہرا ہے۔ ان کے افسانوں میں کشمیر کے دلفریب مناظر اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ امنڈ آتے ہیں۔ انھوں نے کشمیر کی تہذیب وتمدن اور کلچرل کو اپنی تخلیقات میں بڑے انوکھے انداز میں پیش کیا ہے''۔(97)

یہ بات قابل ذکر ہے کہ کرشن چندر کے بارے میں جتنی معلومات اس مضمون میں فراہم کی ہے بہت ہی عمدہ ہے۔ کرشن نے اپنے افسانوں میں نہ صرف کشمیر کی تہذیب کو پیش کیا ہے بلکہ اپنے بچپن کی جموں خطے کے علاقہ پونچھ میں گزاری ہوئی زندگی کو انھوں نے بہترین منظر کشی کی ہے۔ کرشن چندر کے بارے میں راقم نے اردو فکشن کے بارے میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

کشمیر اور اقبالیات ان کے پسندیدہ موضوعات تھے اس لیے مصنف کی ہر کتاب میں کشمیر کا ذکر ضرور مل جاتا ہے اور اس لیے بھی کیوں کہ وہ اپنے وطن کشمیر سے بے حد محبت کرتے ہیں ایک جگہ پر وہ لکھتے ہیں:

''میرا ایک اور پسندیدہ موضوع اقبالیات ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ اقبال کو کشمیر سے بے پناہ عقیدت تھی۔ اسی لیے میں اس موضوع کو بھی کشمیریات کا حصہ سمجھتا ہوں''۔(98)

''فکر ونظر'' بھی پریمی رومانی کی تحقیقی وتنقیدی مقالات کا مجموعہ ہے۔ جس میں انھوں نے بہت سارے ادبا و شعراء کی ادبی خدمات پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ ان کی یہ کتاب 211 صفحات پر مشتمل 2012 میں جموں سے منظر عام پر آئی تھی۔ اس میں مصنف نے مستند شاعروں وادیبوں کے بارے میں (12) مضامین اور (6) تبصرہ کو شامل کیا ہے۔ اس کتاب کا اگر گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ پریمی رومانی کی نظر تحقیق وتنقید میں کافی وسیع تھی۔ اس

تصنیف میں انھوں نے اردو ادب کی مختلف جہات کا احاطہ کیا ہے۔فیض احمد فیض کی شاعری کے حوالے سے اس میں ایک اچھا مضمون قلم بند کیا ہے۔اس میں فیض احمد فیض کے شخصی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری کی مختلف جہات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔فیض کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''فیض انسان دوست شاعر تھے۔انھیں انسان عزیز تھا۔وہ قتل و غارت، مار دھاڑ اور فساد و انتشار سے نفرت کرتے تھے۔ان کے دل میں عشق کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ان کا مطالعہ وسیع اور مشاہدہ غضب کا تھا''۔(99)

اس کتاب کے اکثر مقالات اس کتاب کے منظر عام پر آنے سے پہلے مصنف نے جموں یونیورسٹی کے مختلف سمیناروں میں پیش کیے تھے اور بعض مقالات ہندوپاک کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے تھے۔جیسا کہ انھوں نے خود اس کتاب کے شروع میں ''اپنی بات'' میں کہا ہے۔

اس کے علاوہ سعادت حسن منٹو پر بھی ان کا بہترین مقالا ہے۔اس کے ساتھ اس کتاب میں مصنف نے بہت سارے تبصرے پیش کیے ہیں جو ملک کے متعدد ادبا و شعراء کی تصانیف سے متعلق ہیں اور کچھ نئے قلم کاروں کی تخلیقات پر بھی پریمی رومانی نے تبصرے کیے ہیں۔بہر حال ادبی نوعیت سے ان کی یہ ایک بہترین تصانیف میں سے ایک ہے۔

پریمی رومانی چونکہ سرزمین کشمیر کے باشندے ہیں۔اس لیے ان کی تحریروں میں کشمیر کی محبت جگہ جگہ دیکھی جاسکتی ہے۔انھوں نے اپنے مضامین میں بھی زیادہ تر اقبالیات کے موضوع پر اقبال کو کشمیر کے حوالے سے پیش کیا ہے۔اور اسی طرح سے مظہر امام بھی تقریباً چودہ برس کشمیر میں دور درشن سے وابستہ تھے ان کی ادبی خدمات کو بھی پریمی رومانی نے کشمیر کے حوالے سے پیش کیا ہے۔''مظہر امام حیات اور فن'' کے عنوان سے لکھی گئی پریمی رومانی کی کتاب اہم مقام رکھتی ہے۔جس میں انھوں نے مظہر امام کی تمام ادبی کاوشوں کے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

اسی موضوع پر پریمی رومانی نے جموں یونیورسٹی سے اپنی پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔اس کے بعد ان کا یہ مقالہ کتابی صورت میں 2006ء میں منظر عام پر آیا ہے۔اردو ادب میں اس مقالے کو بہت سراہا گیا۔ان کا یہ مقالہ چھ ابواب پر مشتمل ہے۔

پریمی نے اپنے والد صاحب ڈاکٹر برج پریمی کی جن تصانیف کو مرتب کیا تھا ان میں ''مباحث''،''ذوق نظر''، 'چند تحریریں'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔پریمی رومانی مختلف ادبی سمیناروں اور مشاعروں میں شرکت کرتے رہتے ہیں اور

آج کل وہ اپنے ایک رسالے ''عالمی مراث'' کے سلسلے کو آگے بڑھا رہے ہیں یہ ایک سہ ماہی رسالہ ہے جو پریمی رومانی کی صدارت میں پونہ سے نکلتا ہے۔ اس میں ملک کے بہت سارے قلمکار وقتاً فوقتاً اپنے مضامین پیش کرتے رہتے ہیں۔

پریمی رومانی کی تخلیقات پر مختصراً کہا جائے تو وہ زبان و بیان کے معاملے میں بہت سادہ اور صاف زبان کا استعمال کرتے ہیں چاہے وہ ان کی شاعری ہو یا نثر ہو ہر لحاظ سے وہ قاری کو دلچسپی کا خیال رکھتے ہیں۔ بہر حال پریمی رومانی جموں خطے میں اردو زبان وادب کو فروغ دینے والے اہم قلمکاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

نصرت چودھری:

پروفیسر نصرت چودھری ریاست جموں کشمیر اردو زبان وادب کے حوالے سے ایک بہترین افسانہ نگار، شاعرہ اور محقق ونقاد ہیں۔ ان کی حیات اور افسانہ نگاری کے حوالے سے راقم نے اردو فکشن کے باب میں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ یہاں ان کی تحقیقی وتنقیدی تحریروں پر روشنی ڈالی جائے گی۔ پروفیسر نصرت چودھری کی پیدائش 14/ مارچ 1955ء کو خطہ جموں کے دور دراز علاقہ پونچھ میں ہوئی تھی۔ جموں وکشمیر میں اردو تنقید وتحقیق کے عصر حاضر میں نصرت چودھری کا بھی ایک اہم نام ہے۔ نصرت چودھری نے 1981ء میں کشمیر یونیورسٹی سے ایم اے اردو میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی تھی۔ اس کے بعد انھوں نے اسی یونیورسٹی سے 1983ء میں اپنے ایم فل کا مقالہ لکھا تھا اور پھر انھوں نے جموں یونیورسٹی کا رخ کیا جہاں سے انھوں نے ''فیض احمد فیض کی شخصیت اور شاعری'' کے موضوع پر اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ بڑی محبت اور غیر جانبداری سے مکمل کیا۔

اگر چہ انھوں نے اردو زبان وادب میں شاعری، افسانہ نگاری سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ مگر اس کے بعد انھوں نے تحقیق وتنقید کی طرف رُخ موڑ دیا اور لگ بھگ 1985ء کے بعد سے اردو تحقیق وتنقید میں ان کے اکثر کارنامے دیکھے جاسکتے ہیں۔ بلکہ یوں کہا جائے کہ 1985ء کے بعد سے انھوں نے اپنی ساری توجہ تحقیق وتنقید میں مرکوز کی۔ اردو تحقیق وتنقید کے حوالے سے ان کی تصانیف میں خاص طور پر ''فیض احمد فیض کی شاعری: ایک مطالعہ''، ''فیض احمد فیض: روایت اور انفرادیت''، ''اردو تنقید میں فیض شناسی''، ''فیض احمد فیض اور جدید شعری ذہن''، ''اردو کے چند اہم افسانوں کا تجزیاتی جائزہ''، ''صوبہ جموں میں اردو افسانے کا منظر نامہ'' وغیرہ قابل ذکر ہے۔

ان متذکرہ بالا تصانیف سے آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ نہ صرف چودھری فیض احمد کی شخصیت سے بہت متاثر

تھیں۔فیض کے شناسیوں میں ایک نام نصرت چودھری کا بھی اہم ہے۔ان کی کتاب ''فیض احمد فیض کی شاعری: ایک مطالعہ'' بہت ہی مستند کتاب ہے۔ان کی یہ کتاب کل 222 صفحات پر مشتمل ہے جو 1984ء میں منظر عام پر آئی تھی۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ فیض احمد فیض کی شاعری کے حوالے سے متعدد کتابیں اب تک منظر عام پر آ چکی ہے اور فیض کے موضوع پر ملک بھر میں فیض صدی کے حوالے سے بے شمار سمینار، مشاعرے، ادبی محفلیں منعقد کی جاتی رہی ہیں۔لیکن فیض کے شخصیت پر نصرت چودھری کی یہ کتاب بہت سارے اہم پہلوؤں کو روشناس کراتی ہے۔جس میں مصنفہ نے فیض کی شخصیت، ان کے ضمیر، روایات کی پاسداری اور ان کے کلام کی تفصیلی معلومات فراہم کی ہے۔اس کتاب کو اردو ادب میں بہت اہمیت حاصل ہوئی اور بہت سارے قلمکاروں نے اس کتاب سے استفادہ بھی کیا ہے۔ نصرف چودھری نے نہ صرف فیض احمد فیض کو پڑھا تھا بلکہ ان سے ملاقاتیں بھی کی تھیں۔اس میں فیض احمد سے نصرف چودھری نے بہت سارے سوالات پوچھے تھے۔جس میں نصرف چودھری نے فیض کے ہمعصر شعراء، فیض کی شاعری، زبان و بیان کی روایت، فیض احمد فیض کے دور کا بڑا شاعر، ہیئتی تجربے، فیض کے پسندیدہ شعراء، فیض کی شاعری کے پوشیدہ پہلو، فیض کی پنجابی شاعری، ترقی پسند تحریک اور غیر ترقی پسند تحریک کے شعراء میں بنیادی فرق، نئی شاعری کے بارے میں فیض کے خیالات وغیرہ فیض احمد فیض سے پوچھے گئے سوالات کو مصنفہ نے اس مقالے میں پیش کیا ہے۔ ایک جگہ پر وہ فیض احمد فیض سے روبرو ہوتے کہتی ہیں:

> ''نصرت: ترقی پسند تحریک اور غیر ترقی پسند تحریک کے شعراء میں آپ کے نزدیک بنیادی فرق کیا ہے؟
>
> فیض: ترقی پسند تحریک کے شاعر اور دوسروں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ وہ اپنے معاشرہ کو معاشرہ کی تاریخ کو اور معاشرہ کے مستقبل کو ایک خاص زاویہ سے دیکھتے ہیں۔دوسرے یا تو سرے سے دیکھتے ہی نہیں اور اگر دیکھتے ہیں تو اس کو دوسرے زاویہ سے دیکھتے ہیں لیکن یہ نہیں ہے کہ ترقی پسند شعراء کو عاشقانہ شعر لکھنے کی ممانعت ہے یا ان پر قید لگا دی گئی ہے کہ وہ فلاں مضمون پر نہیں لکھ سکتے۔فرق صرف یہ ہے کہ ترقی پسند شاعر کوشش کرتا ہے کہ آج کی دنیا کی جو بھی حقیقت ہے اس کو دیانت داری سے پیش کریں۔اس میں ہر طرح کے تجربے کی آزادی ہے۔اس میں ذاتی عاشقی بھی شامل ہے''۔(100)

اسی طرح سے ایک اور اہم سوال نصرف چودھری نے ان کی شاعری کے حوالے سے ان کی پسندیدہ نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوب نہ مانگ'' کے حوالے سے کیا تھا۔ اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ''نصرت: آپ نے مجھے سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ جیسی نظمیں لکھ کر عاشقی کو شاعری سے نکال نہیں دیا کیا؟
>
> فیض: (ہلکی سی ہنسی) نہیں ہم نے بالکل نہیں نکالا یہ کہنا بھی تو ایک طرح سے عشق کا اعتراف ہے۔ بات صرف اہمیت کی آجاتی ہے کب کس وقت کون سے مسائل اہم ہیں اور کون سے غیر اہم مگر شامل تو سبھی ہوتے ہیں''۔(101)

نصرت چودھری نے ''فیض احمد فیض پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کشمیر یونیورسٹی سے حاصل کی تھی اور ان کا محبوب شاعر بھی فیض احمد فیض ہی تھے۔ ''فیض کی شاعری: ایک مطالعہ'' میں مصنفہ نے فیض کی نہ صرف دلبستگی کی دلیلیں پیش کیں ہیں بلکہ ایک اچھی نقاد بن کر سامنے آئی ہیں۔ اس کتاب کے حوالے سے جگن ناتھ آزاد صاحب نے لکھا ہے:

> ''اس انٹرویو میں نصرت نے فیض کو جس طرح کریدا ہے وہ ان کے لیے ہر اعتبار سے قابل تعریف ہیں کیونکہ ان کی اس کاوشوں کی بدولت فیض نے بعض اپنے موضوعات پر تفصیل سے کہا جن کے متعلق انھوں نے ابھی تک تفصیل سے نہیں کہا تھا۔ مثلاً زبان کے حوالے سے روایت کا تعین یا فیض کی پنجابی شاعری وغیرہ''۔(102)

''فیض احمد فیض روایت اور انفرادیت'' کے عنوان سے بھی نصرت چودھری کی ایک اچھی کتاب ہے۔ یہ کتاب 342 صفحات پر مشتمل ہے جو 1995ء میں شائع ہوئی تھی۔ مصنفہ نے اس کتاب کو کل پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ جس میں انھوں نے فیض کی حیات سے لے کر ان کی تمام ادبی کاوشوں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور فیض کی شعری انفرادیت کا راز منظر عام پر لانے کے لے مصنفہ نے ان کی روایت کے شعور کا بہترین انداز میں تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ مصنفہ نے اس کتاب میں فیض احمد فیض کی شاعری میں روایت کے عوامل اثرات اور روایت کے جدید مفاہیم کی تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس کام کو انجام دینے میں نصرت چودھری پوری طرح سے کامیاب ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جس طرح سے انھوں نے فیض احمد فیض کی روایت، انفرادیت اور بغاوت کی اصطلاحوں پر جدید تنقیدی شعور کو زیر بحث لایا ہے اس کام کے لیے مصنفہ کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ایک جگہ پر وہ فیض احمد فیض کی

رومانی شاعری کے بارے میں لکھتی ہیں:

''فیض کا رومانی طرزِ فکر آج کے ذہن کے لیے کوئی معنویت نہیں رکھتا۔ رومانی فن کار زندگی کی حقیقتوں سے گریز کر کے خیال و جواب کی دنیا آباد کرتا ہے۔ اور اس میں اپنی ذات کا تحفظ کرنا چاہتا ہے لیکن آج کے فن کار کی شخصیت خارجی حالات کے دباؤ سے شکست و ریخت کی شکار ہے............فیض کی شاعری میں ہمیں آفاقیت کے درخشاں نقوش نظر آتے ہیں۔ یہ ان کی شاعری کے وہ عناصر ہیں جو ہمیں عصری شاعری میں بھی نظر آتے ہیں''۔(103)

نصرت چودھری نے اس کتاب میں فیض احمد فیض کی شاعری کے فنی لوازمات کو بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔ زبان و بیان کے میدان میں نصرت چودھری ایک الگ انداز اپناتی ہیں ان کی نظر موضوع کی گرفت میں بھی رہتی ہے اور قاری کی دلچسپی کا بھی وہ خیال رکھتی ہیں۔ فیض کی انفرادیت، شخصیت اور شاعری کے جن موضوعات پر انھوں نے روشنی ڈالی ہے اس سے فیض کی ادبی خدمات ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ نریندر ناتھ سوز نے نصرت چودھری کی کتاب ''فیض احمد فیض: روایت اور انفرادیت'' کا جائزہ لیتے ہوئے اظہار خیال کیا ہے۔

''اس کتاب میں فیض کی شاعری کا مطالعہ ایک نئے تنقیدی نقطہ نظر سے کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یعنی ان کی شاعری کا مطالعہ روایت اور انفرادیت کے عمل اور ردِ عمل اور اس کے باہمی توافق کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ اور ساتھ ہی فیض کی شخصیت اور ان کی تخلیقات کو بھی مرکوز توجہ بنایا گیا ہے''۔(104)

''فیض افسانہ'' نصرت چودھری کی تحقیقی و تنقیدی کاوشوں کا مجموعہ ہے۔ جس میں مصنفہ نے بہت سارے افسانہ نگاروں کے افسانوں پر تحقیقی و تنقیدی حوالے سے روشنی ڈالی ہے۔ یہ کتاب کل تیرہ (13) افسانوں کے تحقیقی و تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے جو 2002ء میں منظر عام پر آئی۔ نصرت چودھری نے اپنی اس کتاب میں ریاست اور بیرون ریاست کے منتخب افسانہ نگاروں کے افسانوں پر تجزیے کیے ہیں۔

''فیض افسانہ'' کے عنوان سے مصنفہ نے اس کتاب میں اردو افسانے کی روایت پر روشنی ڈالی ہے۔ کلاسیکی افسانے سے لے کر جدید دور کے افسانے تک افسانہ نگاروں کی افسانہ نگاری کا تجزیہ کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ روایت اور جدیدیت کے اہم پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

نصرت چودھری نے افسانوں کے انتخاب کے ساتھ افسانے کے ارتقائی عمل کو زیر بحث لایا ہے۔ پریم چند کے افسانے ’’کفن‘‘ کے بارے میں مصنفہ لکھتی ہیں:

’’جس سماج میں رات دن کام کرنے والوں کی حالت ان کی حالت سے کچھ بہت اچھی نہ تھی اور کسانوں کے مقابلے میں وہ لوگ جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے کہیں زیادہ فارغ البال تھے وہاں اس قسم کی ذہنیت کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ ہم تو کہیں گے گھیسو کسانوں کے مقابلے میں زیادہ باریک بین تھا۔اور کسانوں کی تہی دماغ جمیعت میں شامل ہونے کے بدلے شاطروں کی فتنہ پردانہ جماعت میں شامل ہوگیا تھا‘‘۔(105)

پروفیسر ظہور الدین کا افسانہ ’’بیگ والا‘‘ جدید دور میں ایک علامتی افسانہ ہے اس کا تجزیہ کرتے ہوئے نصرت چودھری نے لکھا ہے:

’اس افسانے میں افسانہ نگار نے نئی نسل کے بچوں کی برتاؤ ان کے والدین کے لیے ایک شرمناک ہے کہ کس طرح سے نئی نسل کے بچے اپنے ماں باپ کو اپنے حالات میں اکیلا چھوڑ دیتے ہیں۔ یہی سب اس افسانہ میں بھی دیکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ان علامتوں میں افسانہ نگار نے اہم نکتوں کو ابھارا ہے۔ ویسے تو بہتے ہوئے پانی کی طرح اپنی راہ تلاش کرنا نہ صرف انسانی فطرت ہے بلکہ ضرورت بھی۔مگر بوڑھے ماں باپ جو خود زندگی کے بیشتر گرم وسرد سہہ کر جہاندیدہ ہو جاتے ہیں............اپنی زندگی کے بیگ میں انھوں نے جو کچھ سنبھال کے رکھا ہے وہی دراصل حاصل زندگی ہے‘‘۔(106)

نصرت چودھری کی تحقیقی وتنقیدی تحریروں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی موضوع پر جب قلم اٹھاتی ہیں تو سب سے پہلے وہ موضوع کی گہرائی میں اس کی تہہ تک جا کر چھان بین کر کے مقالہ کو انجام دیتی ہیں۔ وہ کسی سنی سنائی بات پر غور نہیں کرتی ہیں بلکہ خود مطالعہ کرتی ہیں۔جس کی مثال فیض احمد فیض کی شخصیت اور شاعری ہے۔ جس پر مصنفہ نے فیض کی شاعری کے ہر پہلو کو باریک بینی سے جانچنے کی کوشش کی ہے۔اور جہاں انھیں فیض کے حوالے سے کوئی تکرار پیدا ہوتا ہے تو وہ خود فیض صاحب سے انٹرویو لے کر اس بات کو حل کرنے کی کوشش کرتی۔

اگر چہ فیض احمد فیض کی شاعری اور شخصیت کے حوالے سے کئی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں لیکن جب بھی فیض احمد کی شخصیت کے حوالے سے بات کی جائے گی نصرت چودھری کی تحقیقی وتنقیدی کاوشوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔نصرت چودھری کی ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ کسی بختہ کار دانشور کی طرح سے سب سے پہلے اپنے تحقیقی منصوبے کا مقصد قائم کرنے کی کوشش کرتی ہیں ۔اس کے بعد اس موضوع کی معنویت کو پرکھنے کے لیے موضوع کے متعلق سوالات قائم کرتی ہیں۔ بہرحال مصنفہ نے جس محبت اور لگن سے فیض کی شخصیت اوشاعری پر تصانیف تخلیق کئی ہیں قابل تعریف ہیں۔وہ نثر نگاری کے علاوہ ایک اچھی شاعرہ بھی تھیں اس حوالے سے ان کا مشہورہ شعری مجموعہ ''ہتھیلی کا چاند'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔

پروفیسر ضیاالدین:

جموں خطے میں اردو تحقیق وتنقید کو فروغ دینے میں پروفیسر ضیا الدین کا بھی ایک اہم نام ہے۔ اگر چہ انھوں نے اس میدان میں بہت کم لکھا ہے مگر انھوں نے بہت ہی معیاری موضوعات پر لکھنے کی کوشش کی ہے۔ان کے اب تک (22) سے زیادہ تحقیقی وتنقیدی مقالات منظر عام پر آ چکے ہیں۔جموں میں اردو تحقیق وتنقید کے حوالے سے ان کی اب تک 4 کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔جن میں خاص طور پر ''خواجہ احمد عباس''، ''اسالیب نثر ایک نظر''، ''گوپال متل۔شخص اور شاعری'' اور ''اطراف تنقید'' قابل ذکر ہیں۔

پروفیسر ضیاالدین کی مشہور کتاب ان کی تحقیقی وتنقیدی مقالات کا مجموعہ ''اطراف تنقید'' کے عنوان سے ہے۔یہ کتاب کل 319 صفحات اور 26 مضامین پر مشتمل ہے جس میں مصنف نے بہت سارے تنقیدی تجزیئے، تاثرات اور انٹرویو کو شامل کیا ہے۔ یہ کتاب 2006ء میں منظر عام پر آئی تھی۔اس کے بعد ادبی حلقوں میں اس کتاب کی بہت پذیرائی ہوئی۔اس کتاب میں پروفیسر ضیاالدین نے غالب کی شاعری پر جس طرح سے مضامین قلم بند کیے ہیں۔ بہت ہی قابل تعریف ہیں چوں کہ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ غالب کی تنقید کے لیے غالب کے تفہیم کی بے حد ضرورت رہتی ہے۔ یہ کام دیکھنے میں جتنا آسان ہے اتنا ہی مشکل کن بھی ہے۔جس پر ہر کوئی کامیاب نہیں ہو پاتا ہے۔اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ تفہیم غالب کے لیے سب سے خاص بات ان کی اردو اور فارسی شاعری کے اشاراتی اسلوب،ان کی زبان و بیان اور غالب کے جدت پسند اختراعی ذہن کو سمجھنے کی سخت ضرورت ہوتی ہے، جو ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔

پروفیسر ضیاالدین نے بھی غالب کے پوشیدہ پہلوں کو سمجھنے اور انھیں منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ وہ غالب کی ایذا پسندی کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''غالب کی ایذا پسندی محض لذت کوشی کے لیے نہیں بلکہ ذات اور کائنات دونوں کی اصلاح اس کی تعمیر کے لیے وہ جب بھی خود پر تازیانے برساتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں سو اس احساس کے تحت کے اس سے طہارت نفس او رطہارت وجود کی منزلوں کو عبور کرنے میں آسانی ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ اس ماحول کو بھی پاک وصاف کرنے کے خواہاں رہتے ہیں۔ جس میں وہ سانس لینے کے لیے مجبور ہیں''۔(107)

خواجہ احمد عباس اردو ادب میں ایک بڑا نام ہے وہ ایک ترقی پسند فکشن نگار، فلم ساز، ڈراما نگار تھے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ وہ کسی تعریف کے محتاج نہیں۔ ان کی افسانہ نگاری کے حوالے سے بہت سارے مصنفین و محققین نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ لیکن پروفیسر ضیاالدین نے اردو افسانہ کی شعریت کو مدنظر رکھتے ہوئے جس طرح سے خواجہ احمد عباس کی افسانہ نگاری کا مطالعہ کر کے ان کے نظریے کے عمل دخل کا تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے قابل تعریف ہے۔ اس میں ضیاالدین نے جدیدیت کے حامیوں کے نقطے سے بغاوت کر کے اپنے نظریے کو پیش کیا ہے کہ ادب میں مقصدیت یا نظریات کی بنا پر ادب کی جمالیاتی حیثیت مجروح ہوتی ہوئی دیکھائی دیتی ہے۔ پروفیسر ضیاالدین کے مطالعے کے مطابق خواجہ احمد عباس کے افسانوں سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کے سامنے مقصد کی صداقت شدت کے ساتھ برقرار رہتی ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ احمد عباس کے افسانوی میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ وہ اپنی بات کو قاری تک بہت ہی انتہائی واضح اور دو ٹوک الفاظ میں پہنچانے کا کام کرتے ہیں۔ جس سے قاری کو افسانے پڑھنے میں بہت لطف ملتا ہے۔ پروفیسر ضیاالدین نے جس طریقے سے خواجہ احمد عباس کی افسانہ نگاری کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے خواجہ احمد عباس کے افسانوں کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا، ایک جگہ پر وہ ان کا افسانہ ''ابابیل'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''خواجہ احمد عباس نے اس کی ظالمانہ فطرت کا مکمل احاطہ کیا ہے۔ انسان جانور، بوڑھے، بچے کے ساتھ اس کا برتاؤ کیسا ہے۔ سب کچھ پتا چل جاتا ہے۔ بچوں کا ہوش سنبھالتے ہیں گھر سے بھاگ جانا اولاد کے تئیں اس کے ظالمانہ رویے کو بھر پور انداز سے ظاہر کر دیتا ہے۔

.... وحدت تاثر وحدت تحریک اختصار او رربطہ وتناسب کی جیسی دل کش مثال اس افسانے میں ملتی ہے احمد عباس کے کسی اور افسانے میں شاید ہی ملے۔ حیرت ہوتی ہے کہ جس افسانہ نگار کی اٹھان اتنی عظیم ہو، وہ منٹو، بیدی، کرشن چندر یا عصمت چغتائی جیسے ہم عصروں سے کیسے پیچھے رہ گیا''۔(108)

پروفیسر ضیاالدین نے خواجہ احمد عباس کی افسانہ نگاری کا جائزہ لیتے ہوئے جن نظریات کو پیش کیا ہے۔اس میں زیادہ کچھ نیا دیکھنے کو نہیں ملتا ہے۔انھوں نے بھی زیادہ تر اسی طرح کے خیالات کو زیر بحث لایا ہے جیسے دوسرے قلمکاروں نے خواجہ احمد عباس کی افسانہ نگاری کے حوالے سے اپنے خیالات کے اظہار کیے ہیں۔ڈاکٹر لیاقت چودھری اپنی کتاب میں پروفیسر ضیاالدین کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''پروفیسر ضیاالدین کی تحریروں کا بہ باغور جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ضیاالدین ریاست جموں وکشمیر کے ایک ایسے بالغ نظر اور پختہ ذہن نقاد اور محقق ہیں جن کا شمار برصغیر کے نمائندہ نوجوان ناقدین میں کیا جانا چاہیے''۔(109)

''اسالیب نثر پر ایک نظر'' بھی پروفیسر ضیاالدین کے تحقیقی تنقیدی مضامین کا ایک اچھا مجموعہ ہے۔جس میں انھوں نے مختلف موضوعات پر اردو ادب سے تعلق رکھنے والے منتخب نثر نگاروں کے مقالات کو شامل کیا ہے۔ یہ کتاب 1989ء میں منظر عام پر آئی تھی۔اس تصنیف میں اردو نثر کے حوالے سے کل بارہ (12) نثر نگاروں کے مقالات کو شامل کیا گیا ہے۔

پروفیسر ضیاالدین نے جن متذکرہ بالا نثر نگاروں کے مضامین کو پیش کیا ہے اس سے اردو نثر کے فنی لوازمات کی بہترین طریقے سے معلومات فراہم ہوتی ہے۔ بلکہ کچھ مضامین ایسے بھی ہیں جن سے نظم اور نثر دونوں اصناف کے فن پر گفتگو کی گئی ہے۔مثلاً ''اسلوب کیا ہے'' نثار احمد فاروقی کا ایک ایسا مضمون ہے۔جس میں انھوں نے نظم اونثر میں اسلوب کی کیا اہمیت ہے کو بتانے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے انگریزی ،اردو ، فارسی ،عربی زبانوں کے اسلوب کی اہمیت اور اس کے استعمال کی وضاحت کی ہے اور بہت ساری غلط فہمیوں کی بھی نشاندہی کی ہے۔مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ:

''سب سے پہلے انگریزی لفظ (Style) کو لیجیے۔ یہ ایک یونانی لفظ (STYLUS) سے نکلا ہے جو ہاتھی دانت،لکڑی یا کسی دھات سے بنا ہوا ایک نوکیلا اوزار ہوتا تھا جس سے موم

کی تختیوں پر حروف والفاظ یا نقوش کندہ کیے جاتے تھے۔ کچھ لوگ اس کی اصل (Stylus) بتاتے ہیں مگر یہ غلط ہے''۔(110)

''اسلوب کیا ہے'' اس مضمون میں مصنف نے اردو زبان کے حوالے سے اس کی اہمیت کو پرکھنے کی کوشش کی ہے۔اس موضوع پر اگرچہ انگریزی زبان میں بے شمار لکھا گیا ہے۔مگر اردو ادب میں بہت سارے ادیبوں نے اس کی اہمیت کو بعد میں پرکھا اور اس کی قدر کو سمجھا۔اردو زبان میں ناقدین نے اس پہلو کو نہ صرف اچھے طرح پرتنے کی کوشش کی بلکہ نئی نئی رائیں نکال کر آنے والی نثر نگاروں کے لیے چراغ روشن کر دیے۔اس مقالے میں پروفیسر ضیاالدین نے انہی موضوعات کو زیر بحث لایا ہے۔

اس تصنیف میں مصنف نے جن مقالہ نگاروں کے مضامین کی نظریاتی تنقید کے بارے میں بیان کیا ہے وہ اردو ادب میں بلند مقام رکھتے ہیں۔زیر نظر کتاب میں ان حضرات نے زیادہ تر نثر اور نظم کے اسلوب کو ہی زیر بحث لایا ہے۔ مگر اس کے علاوہ کچھ مقالا نگاروں کے مضامین عملی تنقید کے دائرے میں آتے ہیں جن میں مسعود حسین خان کا مضمون ''قصہ میر افروز و دلبر'' ڈاکٹر سہیل بخاری کا مضمون ''سب رس کی زبان'' ڈاکٹر سلیم اختر کا مضمون ''باغ و بہار اور لطف زبان'' اور ایسی طرح سے ڈاکٹر سید عبداللہ کا مضمون ''مرزا غالب کی اردو نثر'' وغیرہ عملی تنقید کے حوالے سے اہمیت کے حامل ہیں۔مسعود حسین خان اردو تحقیق وتنقید کے حوالے سے کسی تعریف کے محتاج نہیں ہے۔انھوں نے جتنے بھی ادبی کارنامے کیے ہیں وہ سب اردو ادب میں اضافہ کرتے ہیں اور اردوداں کے لیے اہم معلومات فراہم کرتے ہیں۔اس مضمون میں بھی انھوں نے عیسوی خاں کی داستان ''قصہ مہر افروز و دلبر'' کا جس طرح سے جائزہ پیش کیا ہے اس سے بہت ساری معلومات مل جاتی ہے۔حالانکہ اتنے کم مقالے میں مصنف کے لیے بہت ہی دشوار کام تھا کہ وہ ''قصہ مہر افروز و دلبر'' کے تمام فنی لوازمات کو منظر عام پر لاسکیں مگر پھر بھی بہت کم الفاظ میں مسعود حسین خان نے بہت سارے پہلوؤں کو منظر عام پر لایا ہے اور اس مضمون میں انھوں نے زیادہ تر اسلوب پر زور دیا ہے۔مثلاً ایک جگہ پر وہ لکھتے ہیں:

> ''اس میں شک نہیں کہ خالص اسلوب کے نظر سے عیسوی خاں کی عبارت نکھ سکھ سے درست نہیں۔شمالی ہند میں فارسی کے مقابلے میں جس زبان کو دربار نے ٹھکرا دیا تھا اور محمد شاہ کے عہد تک لائق اتمنانہ سمجھا گیا۔ظاہر ہے اس میں ادبی تخلیق کرنا کسی قدر دشوار طلب ہوگا۔ مصنف کے سامنے اردو نثر کا کوئی نمونہ موجود نہیں تھا اور اردو شاعری کے رچے ہوئے

اسلوب کے داغ بیل پڑی تھی............ چنانچہ انھیں روایات سے وہ اپنے ادبی اسلوب کے تانے بانے مرتب کرتا ہے''۔(111)

''اسالیب نثر پر ایک نظر'' میں ان تمام گراں قدر مقالہ نگاروں کے مضامین میں اسلوب نثر کے متعلق مستند اور معنی خیز اشارات ملتے ہیں۔ جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلوبیات کے موضوع پر روشنی ڈالنے کے لیے نئے نئے راستے دکھائی دیتے ہیں۔ ان مضامین کے مطالعہ سے یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اردو زبان وادب سے تعلق رکھنے والا ہر قلمکار اس کتاب سے اہم معلومات حاصل کرسکتا ہے اور اسلوب کا رشتہ اسلوبیات کے مفہوم کے ساتھ جوڑنے اور اسے سمجھنے میں مدد کرسکتا ہے۔ جیسا کہ اس کتاب کے پیش لفظ میں خود پروفیسر ضیاالدین اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

''زیرنظر کتاب تنقید کے اسی پہلو کو اجاگر کرنے کے لیے مرتب کی گئی ہے اور اس میں بعض ایسے مضامین شامل کیے ہیں جو صرف اس موضوع کو سمجھنے کے لیے ہی ضروری نہیں بلکہ اس موضوع پر لکھنے والوں کے لیے رہنمائی کا کام بھی دے سکتے ہیں''۔(112)

متذکرہ بالا اقتباس میں یہ بات قابل تعریف ہے کہ یہ کتاب اردو زبان وادب سے تعلق رکھنے والے ادبا وشعراء کے لیے نہ صرف موضوع کو سمجھنے کے لیے اہم ہے بلکہ موضوع پر لکھنے کے لیے بھی قابل باعث بن جاتی ہے۔

''گوپال متل۔ شخص اور شاعر'' بھی پروفیسر ضیاالدین کا ایک اچھا تحقیقی کارنامہ ہے۔ یہ ایک مختصر مقالہ ہے جو صرف 94 صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب پہلی بار 2005ء میں منظر عام پر آئی تھی۔ یہ کتاب پانچ ابواب پر منقسم ہے جس میں پہلے باب میں گوپال متل کی حالات زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں متل کی قومی شاعری، تیسری باب میں گوپا متل بطور غزل گو شاعر پیش کیے گئے ہیں۔ چوتھے باب میں گوپال متل بطور نظم گو شاعر اور پانچویں اور آخری باب میں گوپال متل کا غیر مطبوعہ کلام شامل کیا ہے۔

گوپال متل ایک اچھے مدیر، صحافی، شاعر اور نثر نگار گزرے ہیں۔ ان کی نثر نگاری اپنا ایک منفرد اسلوب اپناتی ہے جب ان کی نثر کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انھیں نثری اصناف کے فنی لوازمات سے گہری واقفیت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ ان کی شاعری کے حوالے سے ایک خاص خوبی یہ ہے کہ وہ خود فراموشی کے عالم میں شعر کہتے ہیں۔ گوپال متل کی ادبی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے پروفیسر ضیاالدین یوں رقمطراز ہیں:

> ''گوپال متل کے بارے میں جب میں نے لکھنے کے بارے میں سوچا اوراس حوالے سے کچھ پڑھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ نظم ونثر پر یکساں عبور رکھنے والے گوپال متل کا شعری اور نثری سرمایہ اتنا ہے کہ دونوں حوالوں سے ان پر الگ الگ کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔گوپال متل کا جوآج ادبی مقام ہے اس کی کئی وجوہات ہیں۔ایک تو یہ کہ متل اردو کے نامور شاعر ہیں ۔دوسرے یہ کہ ان کی نثر نگاری کی بلند ادبی حیثیت ملک بھر میں تسلیم کی جاچکی ہے۔تیسرا یہ کہ انھوں نے صحافت میں صرف نام ہی پیدا نہیں کیا بلکہ اردو صحافت کو ایک ذمہ دارانہ اور باوقار مقام سے آشنا کیا ہے''۔(113)

پروفیسر ضیا الدین کے تحقیقی وتنقیدی تحریروں سے یہ بات معلوم ہوجاتی ہے کہ وہ جب کبھی کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو سب سے پہلے اس موضوع کی گہرائی میں جا کر ہر پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں پھر اس پر لکھنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔اور موضوع کے تمام پہلوؤں کو ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔وہ بہت کم الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔مگر ان کم الفاظ میں بھی وہ بہت ساری معلومات فراہم کردیتے ہیں ،مثال کے طور پر''گوپال متل شخص وشاعر'' کے عنوان سے صرف 94 صفحات پر لکھا ہے۔ان کم صفحات پر بھی انھوں نے گوپال متل کی تمام ادبی خدمات پر تفصیلاً جائزہ پیش کیا ہے یہی ان کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

مشتاق احمد وانی:

اکیسویں صدی کے جموں صوبہ کے تحقیق وتنقید نگاروں میں مشتاق احمد وانی کا ذکر کسی تعریف کا محتاج نہیں۔ مشتاق احمد وانی صاحب گزشتہ تین دہائیوں سے اردو زبان وادب کے مختلف شعبوں میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے آرہے ہیں۔وہ بیک وقت ایک اچھے افسانہ نگار اور نقاد، محقق وغیرہ ہیں۔ان کی فکشن نگاری کے حوالے سے راقم الحروف نے اردو فکشن کے باب میں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔یہاں صرف ان کی تحقیقی وتنقیدی کاوشوں پر روشنی ڈالی جائے گی۔مشتاق احمد وانی کی پیش نظر کتابوں میں ''تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران''،''اردو ادب میں تانیثیت''،''اعتبار ومعیار''،''آئینہ درآئینہ''،''شعور بصیرت''،''افہام وتفہیم زبان وادب''،''خوشبوؤں میں بسی یادیں''،''زبان وبیان''،''تنقیدی فکروفن''،''کہکشانِ خیال''وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مشتاق احمد وانی نے بنیادی طور پر 2000ء کے بعد سے تحقیقی وتنقیدی میدان میں طبع آزمائی کرنا شروع کی تھی

مگر اس سے پہلے بھی ان کے چند تحقیقی وتنقیدی مضامین ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔انھوں نے ''تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران'' کے عنوان سے جموں یونیورسٹی کی جانب سے انھیں اس مقالے پر پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری دی گئی تھی۔اوراس کے بعد مشتاق احمد وانی کا تحقیقی وتنقیدی سفر شروع ہوا۔اس موضوع کی انفرادیت اورتربیت اورپیش کش کی بنیاد پر یہ مقالہ یونیورسٹیوں میں تخلیق کیے جانے والے مقالوں میں بہت ہی اہم اور بلند مقام رکھتا ہے۔یہ مقالہ اردو فکشن کے حوالے سے پورے برصغیر میں اردو کے قلمکاروں کے لیے اہم موادفراہم کرتا ہے۔پروفیسر شمیم حنفی نے مشتاق احمد وانی کے اس مقالے کے بارے میں لکھا ہے:

> ''ان کا (مشتاق احمد وانی) کا مقالہ عام تحقیقی مقالات کے برعکس اپنی سطح اور معنویت کے اعتبار سے یقیناً اہمیت کا حامل ہے اوراس سے اردو فکشن کے ایک اہم پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔وانی صاحب کا طریقہ کار علمی ہے اوراس میں وہ متانت ملتی ہے جو سنجیدہ مطالعے کے بغیر ہاتھ نہیں۔مجھے یقین ہے کہ ان کی یہ کتاب شوق سے پڑھی جائے گی اور فکشن سے شغف رکھنے والے اس کی قدر کریں گے''۔(114)

مشتاق احمد وانی کی اس کتاب ''تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران'' کے وسیلے سے اردو ناول سے نہ صرف عہد بہ عہد بدلتی ہوئی صورتوں کو سمجھنے میں مددفراہم ہوتی ہے بلکہ تقسیم وطن کے بعد زندگی کے رزم نامے میں ناول کے کرداروں کے ردِعمل کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

مشتاق احمد وانی کے اس موضوع کا مقصد صرف اردو ناول میں تہذیبی بحران نہیں تھا بلکہ تہذیب کے حوالے سے انھوں نے تاریخی نقوش کو بھی زیر بحث لایا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے سیاسی ، سماجی ، اخلاقی و اقتصادی و معاشرتی زندگی کے پہلوؤں کی بھی نشاندہی کی ہے۔مصنف نے اس مقالے میں جس طرح سے گزشتہ پچاس سالوں کے ناولوں کی تاریخ پیش کش پر روشنی ڈالی ہے۔اس سے ان کی فکری وفنی لوازمات کی قدریں بھی بخوبی دیکھی جاسکتی ہیں۔

اردو ناول میں تہذیبی بحران کے حوالے سے مشتاق احمد وانی نے خاص طور پر ہندوستان اور پاکستان میں پیش ہونے والے تہذیبی بحران کی عکاسی پہلی بار کی ہے۔حالانکہ اس لیے پہلے بھی پریم چند کے دور سے لے کر مشرف عالم ذوقی کے دور تک کسی نہ کسی ذریعے سے اردو ناول نگاروں کے ناولوں میں تہذیبی ومعاشی ومعاشرتی تبدیلیوں کو دیکھا

جاسکتا ہے مگر تقسیم کے بعد مشتاق احمد وانی کا یہ پہلا موضوع ہے جس میں باضابطہ و باقاعدہ طور پر ناول کے تہذیبی بحران کی عکاسی ملتی ہے۔اس کتاب میں مشتاق احمد وانی نے سائنسی انقلاب، صنعتی انقلاب، انقلاب فرانس، انقلاب روس کے عالمی سطح پر رونما ہونے والے اثرات کو بھی پیش کیا ہے۔اور ساتھ ہی ساتھ مغربی فلسفیوں میں فرائڈ، کارول مارکس وغیرہ جیسے شخصیات کے نظریات کا بھی جائزہ لیا ہے۔

اس مقالے کے ابتداء میں مصنف نے اردو کے ابتدائی ناول یعنی فسانۂ آزاد اور امراؤ جان وغیرہ میں تہذیبی بحران کی عکاسی کرتے ہوئے مختصراً بحث کی ہے اور اس کے بعد وہ جدید دور کے ناولوں کی تہذیبی بحران پر روشنی ڈالتے ہوئے تقسیم کے بعد کے ناولوں پر تحقیقی وتنقیدی جائزہ تفصیل سے پیش کرتے ہیں۔

''اردو ادب میں تانیثیت'' مشتاق احمد وانی کی مشہور تصانیف میں سے ایک ہے۔انھوں نے اس کتاب کو 780 صفحات اور سات ابواب پر مشتمل کیا ہے۔یہ تصنیف مارچ 2013ء میں منظر عام پر آئی تھی۔تانیثیت کے موضوع پر اس نوعیت کی یہ پہلی اور جامع کتاب ہے۔جس میں مشتاق احمد وانی نے ثانیثیت کے سماجی وثقافتی، علمی وادبی پہلوؤں کا تفصیلاً جائزہ پیش کیا ہے۔پہلا باب میں مصنف نے ثانیثیت کی مکمل طور پر وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔اور اس بات پر زور دیا ہے کہ تانیثیت نہ صرف عورتوں کے حقوق اور مرد اور عورت کی برابری کے حق میں بات کرتی ہے بلکہ رشتوں میں پائداری اپنی خودی اور عرفانِ ذات کے ذات کا اظہار خیال، پیار محبت، اور جنسیت وغیرہ جیسے موضوعات سے متعلق بات کرتی ہے۔اسے ہی مصنف نے اس باب میں عورت سے متعلق اور تانیثیت کے ابتدائی نظریات اور مذہب اور قانون کے طور طریقوں کو زیر بحث لایا ہے۔اور چونکہ مغربی ممالک میں خاص طور پر امریکہ، برطانیہ، جرمنی، فرانس وغیرہ جیسے بڑے ملکوں میں عورتوں پر ہونے والے ظلم وستم اور استحصال اور عورتوں کے حقوق پر آواز بلند کی گئی تھی۔اس کے بعد آہستہ آہستہ یہ رجحان تمام ممالک میں پھیلتا چلا گیا اور ہر جگہ عورتوں کے حقوق کی بحالی کی باتیں ہونے لگتی۔اسی طرح سے پھر ہندوستان جیسے بڑے ملک میں عورتوں کے حقوق اور موجودہ صورت حال میں مصنف نے اسے بہت سارے مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔مثلاً مشتاق احمد وانی صاحب بھارتی سماج میں عورت کے مقام کے حوالے سے ایک جگہ پر لکھتے ہیں:

''عہد قدیم میں دنیا کے تقریباً سبھی ملکوں میں عورت کی جو بھیانک تصویر دیکھنے کو ملتی ہے وہی ہندوستان کی تاریخ میں بھی سامنے آتی ہے۔یہاں بھی ''عورت'' سماجی حیثیت سے لے کر

انفرادی شخصیت تک مردوں کی سر پرستی اور محکومیت کے زیر سایہ نہ صرف پستی رہی بلکہ اس کے وقار اور شخصیت کو مسخ کرنے میں مردانہ سماج کو بھی کسر اٹھائے نہیں رکھی تھی۔ مرد کو سماجی، معاشی، تعلیمی اور سیاسی زندگی میں ایک اہم مقام حاصل تھا جب کہ عورت کو محروم رکھا گیا تھا۔ البتہ تاریخ ہند کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مختلف ادوار میں ایک عہد ایسا بھی رہا ہے جس میں عورت کو بہتر سماجی حیثیت حاصل رہی ہے اور وہ تھا ویدک عہد''۔(115)

اس متذکرہ بالا اقتباس میں ایک حقیقت ہے کہ ہمارے سماج میں عورت کے حقوق، اس کی تعلیم وتربیت وغیرہ بہت بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں مگر اس پر جب عمل کرنے کی بات آتی ہے تو اس موضوع پر پوری طرح سے عمل نہیں کیا جاتا ہے۔ اس حیثیت سے ہم آج بھی یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے سماج میں آج بھی عورت کو وہ حیثیت حاصل نہیں ہو پائی ہے جس کی وہ حقدار ہے۔ بہر حال مشتاق احمد وانی نے اس موضوع میں بہت سارے مسائل کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔

دوسرے باب میں مشتاق احمد وانی نے تانیثیت اور ادب کے متعلق بات کی ہے۔ اس میں انھوں نے مختلف ممالک سے تعلق رکھنے والی قلم کار خواتین کی تخلیقات پر روشنی ڈالی ہے، اور اس میں انھوں نے بتانے کی کوشش کی ہے کہ مرد اساس معاشرے کے خلاف اظہار خیال کیا ہے۔ اس باب میں مصنف نے خواتین قلم کاروں کے حقوق کی تحریک میں پدری سماج کی کمزوریوں پر تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔

تیسرے باب میں مشتاق احمد وانی نے آزادی سے پہلے اردو شاعری میں تانیثیت کے حوالے سے مختصراً بحث کی ہے۔ اس باب میں انھوں نے خواتین شعراء کو پیش کیا ہے جن کے کلام میں خاص طور پر نسائی جذبات کو دیکھا جا سکتا ہے۔ چوتھے باب میں انھوں نے مختلف خواتین شعراء کی شاعری کو پیش کیا ہے جس میں زیادہ تر غزلیں ہیں۔ ان تمام خواتین کی شاعری کو مصنف نے ثانیثیت کے حوالے سے منظر عام پر لایا ہے اور ان کے نام کے ساتھ ساتھ ان کی سوانحی حیات کا بھی جائزہ لیا ہے۔ اسی طرح سے پانچویں باب میں اردو ناولوں میں تانیثیت کے حوالے سے بحث کی ہے۔ اس باب میں بھی انھوں نے اردو کے مشہور ناول نگاروں کی تحریروں میں تانیثیت کے عناصر کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اردو کے بڑے ناول نگاروں کے ناولوں کا بھی جائزہ لیا ہے۔ جس میں تانیثی موضوع پر لکھا گیا ہے۔

چھٹے باب میں مصنف نے اردو افسانے میں تانیثیت کے حوالے سے روشنی ڈالی ہے، جس میں انھوں نے ترقی پسند تحریک اور اس کے منشور کو ملحوظ رکھا ہے اور اردو افسانے میں تانیثیت کے ابتدا سے لے کر ارتقاء تک کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اس باب میں اردو کی اہم خواتین افسانہ نگاروں کے تانیثیت فکر و شعور اور باغیانہ لب و لہجے کو دلیلوں کے ساتھ بیان کیا ہے جس سے واضح طور پر خواتین افسانہ نگاروں کی تحریروں سے تانیثیت کی تحریک کی نشاندہی ملتی ہے۔ ساتویں باب میں مصنف نے حاصل مطالعہ کو پیش کیا ہے جس میں مشتاق احمد وانی نے اپنے خیالات کا بھی اظہار کیا ہے کہ عورت کو کس طرح سے پرسکون زندگی بسر کرنی ہوگی اور کن چیزوں کو نظر انداز کرنا ہے اور کن چیزوں کو اسے اپنانا ہے ان تمام خیالات کا ذکر مشتاق احمد وانی نے اس باب میں کیا ہے۔

دراصل مشتاق احمد وانی کی اس کتاب کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انھوں نے تانیثیت کے معنی و مفہوم وضاحت زیادہ تر مغربی مفکروں کے نظریات کے حوالے سے کی ہے۔ اردو ادب میں ایسے بہت سارے خواتین و حضرات ہیں۔ جنھوں نے تانیثیت کے اس موضوع پر لکھا ہے۔ جس میں ڈپٹی نذیر احمد، مرزا محمد ہادی رسوا، پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، عتیق اللہ، نظام صدیقی، ابوالکلام قاسمی، قدوس جاوید وغیرہ قلمکاروں کا جائزہ لیا ہے اور اسی کے ساتھ خواتین قلمکاروں میں خاص طور پر ساجدہ زیدی، ادا جعفری، پروین شاکر، شفیق فاطمہ شعری، عذرا پروین، ریحانہ عاطف، صادقہ نواب سحر، نصرت آرا چودھری، شبنم عشائی، شہناز نبی، ترنم ریاض، فہمیدہ ریاض، کشور ناہیدہ وغیرہ ہیں۔ ان تمام خواتین و حضرات کی تحریروں کو یکجا کر کے تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔

مشتاق احمد وانی نے اس کتاب میں اردو ادب کی ابتدائی دور و جدید دور کی خواتین شعراء و فکشن نگار کی شاعری و نثری کارناموں میں بہت ہی گہرائی سے مطالعہ کر کے ان میں تانیثیت کے عناصر کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ اس تصنیف میں ایک طرف انھوں نے خواتین کی تحریروں کی طرف زیادہ توجہ دی ہے جن میں ترنم ریاض، صادقہ نواب سحر، ذکیہ مشہدی، لالی چودھری قابل ذکر ہیں وہی دوسری طرح انھوں نے مرد حضرات کی تحریر جن میں تانیثیت کے عناصر کو دیکھا جاسکتا ہے جن میں پیغام آفاقی، مشرف عالم ذوقی، غضنفر کے ناولوں میں بہت کم توجہ دی ہے۔ حالاں کہ دیکھا جائے تو دور حاضر میں آفاقی کے ناول ''مکان''، غضنفر کے ناول ''کینچلی'' اور مشرف عالم ذوقی کے ناول ''لے سانس بھی آہستہ'' وغیرہ تانیثیت کے حوالے سے بہت ہی قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ اردو کے ابتدائی ناول نگاروں جن میں خاص طور پر نذیر احمد، رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی وغیرہ کے ناولوں میں زیادتوجہ دی ہے۔

''اعتبار و معیار'' مشتاق احمد وانی کے تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔اس مجموعے میں مصنف نے کل تیرہ تحقیقی وتنقیدی مضامین کو مختلف موضوعات پر مشتمل کیا ہے۔یہ کتاب جنوری 2011ء میں شایع ہوئی تھی۔

''اعتبار و معیار'' کے پہلے مضمون میں مشتاق احمد وانی نے سب سے پہلے سیکولرازم کی اصطلاح کے معنی و مفہوم کی بہترین انداز میں وضاحت کی ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ سیکولرازم فکر وضمیر کی آزادانہ رائے پیش کرنے کی بات کرتا ہے۔جس سے پیدائشی حق کو عبارت سامنے آتی ہے۔مشتاق احمد وانی نے اس اصطلاح کو بہترین انداز میں اور آسان اور عام فہم زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔انھوں نے ہندوستان جیسے بڑے ملک کی مثال قائم کی ہے جہاں پر سیکولرازم کی روایت صدیوں سے چلتی آرہی ہے۔ناول نگاری میں مشتاق احمد وانی نے منتخب اردو ناولوں میں سیکولرازم کو ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے۔اس حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

> ''جہاں تک اردو ناولوں میں سیکولرازم اور قومی یکجہتی کے عناصر کا تعلق ہے تو ناول کی تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو ناول نگاروں نے تقریباً شروع سے ایک سیکولر اور قومی یکجہتی کی فضا قائم کرنے کی سعی کی ہے''۔(116)

''اعتبار و معیار'' کے دوسرے مقالے میں مشتاق احمد وانی نے ''اکیسویں صدی میں اردو افسانہ'' کو پیش کیا ہے۔اس میں انھوں نے پریم چند سے لے کر بیدیؔ تک کی اردو افسانے کی روایت کو زیر بحث لایا ہے اور اسی طرح سے جدیدیت میں کن موضوعات پر افسانہ نگار افسانے تخلیق کر رہے ہیں،اس پر بھی انھوں نے روشنی ڈالی ہے۔جس میں وہ کہتے ہیں کہ جدیدیت کے رجحان نے افسانے سے افسانہ پن چھین لیا تھا جس کی وجہ سے افسانہ صرف افسانہ نہ رہا بلکہ محض شعبدہ بازی اور اسلوبیات کی کھیل بن کر رہ گیا۔

''اردو فکشن میں تانیثیت'' کے عنوان سے بھی ان کی قابل ذکر مقالہ ہے۔جس میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ ''تانیثیت'' مابعد جدید ادبی منظرنامے کی ایک اہم اور نمایاں اصطلاح بن چکی ہے۔مگر اس اصطلاح کو سمجھنے کے لیے ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔چونکہ تانیثیت ایک ایسا موضوع ہے جو اپنے اندر مختلف موضوعات،مسائل،حقوق اور رویوں کو سموئے بیٹھا ہے۔

''جموں وکشمیر میں اردو شاعرات'' مشتاق احمد وانی کا ایک ایسا موضوع ہے جس پر بہت کم لوگوں نے قلم اٹھایا ہے۔مگر مشتاق وانی نے اس کام کو بڑی محنت اور لگن سے کامیاب کیا ہے۔انھوں نے اس مقالے میں ریاست جموں و

کشمیر سے تعلق رکھنے والی مشہور قلم کار خواتین کے کلام میں نسائیت کے عناصر کو سامنے لانے کی بھر پور کوشش کی ہے۔

اسی طرح سے مصنف کی اس کتاب میں کئی دلچسپ موضوع ہیں۔جن پر مشتاق وانی نے گہرائی سے مطالعہ کر کے قلم اٹھایا ہے۔علامہ اقبال کے حوالے سے بھی ایک اچھا مضمون ہے۔جس میں انھوں نے علامہ اقبال کی مغربی طرز حیات سے بیزاری کے حوالے سے یعنی اقبال کو مغربی فکر،مغربی تہذیب اور سیاست کو پیش کیا ہیاور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ مغربی مفکرین کے خیالات سے کس طرح سے علامہ اقبال بیزار ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں۔مغربی مفکروں نے دور جدید میں بہت سارے بت تراشے تھے جن میں ''قومیت'' ایک سب سے بڑا بت ہے جس سے صاف طور پر اقبال مخالفت کرتے ہیں۔اور اپنا بیان دیتے ہیں کہ مغربی مفکروں کے نظریات سے انسانیت کو سب سے بڑا خطرہ ہے اس طرح کے کئی مقالات کو مصنف نے اپنی اس کتاب میں پیش کیا ہے جس سے اس تصنیف کا معیار قابل بلند ہو جاتا ہے۔پروفیسر قدوس جاوید،مشتاق احمد وانی کی اس تصنیف کے بارے میں فرماتے ہیں:

> ''اعتبار ومعیار'' تنقیدی مضامین کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے مصنف مشتاق احمد وانی ایک با مطالعہ،صاحب بصیرت اور غیر جانبدار نقاد ہیں اور اگر وہ اسی طرح لکھتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب ان کا شمار اردو کے ممتاز نئے ناقدین میں ہوگا''۔(117)

اس کے علاوہ مشتاق احمد وانی نے اس کتاب میں سرن سنگھ،محمد شاہد پٹھان،محمد بشیر ماپر کوٹلوی،پروفیسر شہاب عنایت ملک وغیرہ کے تحقیقی وتنقیدی شعور کا بھی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔''آئینہ در آئینہ'' مشتاق احمد وانی کا ایک اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں انھوں نے ایک درجن سے بھی زیادہ تنقیدی مضامین کو شامل کیا ہے۔اس کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ مصنف نے نہ صرف اس میں ادب کا کھلے انداز میں مطالعہ کیا ہے بلکہ اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ انھیں ادبی اظہار کی ہر صورت سے خاطر خواہ لگن ودلچسپی تھی جس کی مثال ان کی یہ کتاب ہے۔اس میں مصنف نے فکشن اور شاعری دونوں اصنافِ ادب کے موضوعات کو زیر بحث لایا ہے۔

''تنقیدی فکر وفن'' بھی مشتاق احمد وانی کا ایک قابل تعریف تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔اس میں انھوں نے کل تیرہ مضامین پیش کیے ہیں۔یہ تصنیف 2021ء میں منظر عام پر آئی تھی۔اس کتاب میں مشتاق احمد وانی نے جہاں ایک طرف اپنے دور کے ہمعصروں کی تحریروں کا جائزہ لیا ہے۔وہیں دوسری طرف انھوں نے اردو ادب سے تعلق رکھنے

والے شاعروں وادیبوں کی تحریروں کوبھی زیر بحث لایا ہے۔مشتاق احمد وانی کے تحقیقی وتنقیدی کاوشوں کا مطالعہ کرنے سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ انھیں تحقیق وتنقید کے میدان میں کافی مہارت حاصل ہے۔وہ آج بھی اردو ادب کو فروغ دینے میں ایک نمایاں رول ادا کررہے ہیں۔

امین بنجارا:

ان کا ذکر افسانہ نگاروں میں کیا گیا، انہوں نے بہت ساری کتابیں بھی مرتب کیں تھیں جس میں ''ندر آزاد''1998ء،''اسلام و پیام''2002ءاور''روداد اقبال''2005ءقابل ذکر ہیں۔

''ندر آزاد'' کتاب تقریباً257 صفحات پر مشتمل ہے۔اور پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی تحقیقی کارناموں پر مبنی ہے۔اس کتاب میں جگن ناتھ آزاد کے تحقیقی کارناموں پر مختلف محققین کے تقریباً18 مضامین شامل ہیں۔''اسلام و پیام'' کتاب بھی ایک اچھی کتاب ہے۔اس میں جگن ناتھ آزاد کے نام جو مشاہیر کے خطوط تھے ان تمام کا ذکر اس کتاب میں کیا گیا ہے۔اور اسی طرح سے امین بنجارا کا ایک مرتبہ اور تصنیف ''روداد اقبال'' ہے یہ کتاب تقریباً257 صفحات پر مشتمل ہے اور جگن ناتھ آزاد کی تحقیقی کاوشوں پر یہ بھی ایک قابل ذکر کتاب ہے۔امین بنجارا کو خطہ جموں کے حوالے سے ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔

مضمون،انشایہ،خطوط اور ترجمہ نگاری:

جموں میں متذکرہ بالا اصناف ادب کے حوالے سے جن قلمکاروں کا ذکر ملتا ہے ان میں خاص طور پر، کامگار کشتواڑی،ایم۔اے۔عزیز،حنیف ہاشمی،دیا کشن گردش،عبدالمجید نظامی،گلزار احمد فدا،برج پریمی،پروفیسر ظہور الدین،محمد اسد اللہ وانی،مشتاق احمد وانی،شہاب عنایت ملک،پریمی رومانی،پروفیسر ضیاء الدین،چمن لعل بھگت،ڈاکٹر ریاض احمد وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

شاد فرید آبادی کا ایک بہت ہی مشہور و معروف تنقیدی و تحقیقی مضمون ''ضلع ڈوڈہ اور اردو زبان و ادب'' کے عنوان سے منظر عام پر آیا تھا۔اس مضمون میں ضلع ڈوڈہ کی بہت سے اہم کارناموں کے بارے میں اردو زبان کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہے اور خاص طور پر ضلع ڈوڈہ میں اردو زبان کے ادبی کارناموں میں یہ مضمون قابل تعریف ہے۔نشاط کشتواڑی صاحب اس مضمون کے بارے میں ''ضلع ڈوڈہ کی ادبی وثقافتی تاریخ''میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے شاد فرید آبادی کے بارے میں لکھتے ہیں::

''فاضل مضمون نگار نے تاریخی روشنی اور حوالہ جات سے ضلع ہذا میں اردو زبان و ادب کی ترویج کا ایک مکمل اور مبسوط نقشہ پیش کیا ہے۔ جس میں حقائق شواہد اور دلائل کے چراغ جا بجا فروزاں نظر آ رہے ہیں۔ شاد صاحب نے اپنے مضمون میں واقعات و شواہد سے ثابت کیا ہے ءکہ اردو زبان اس ضلع کے عوام الناس میں اتنی ہر دلعزیز بن گئی ہے کہ یہاں کے عوام کی زبان کے سلسلے میں اردو زبان کے مادری زبان ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس ضلع کے عوام میں اردو زبان زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہو چکی ہے۔ گویا اردو زبان یہاں عوام کا اوڑھنا بچھونا بن گئی ہے۔''(118)

شاد فرید آبادی نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز مضمون سے کیا تھا۔ ان کا سب سے پہلا مضمون ہندوستان کے مشہور رسالہ ''شاہین'' میں 1962ء میں شائع ہوا تھا۔ شاد فرید آبادی کو صحافت سے بھی خاص لگاؤ تھا اور رسالہ ''شاہین'' کے مدیر کی حیثیت سے وہ کافی عرصے تک کام کرتے رہے۔ ان کا پہلا شمارا نومبر 1984ء میں شائع ہوا تھا۔ اس رسالے کے صفحہ اول سے ہی اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ شاد فرید آبادی کے زور قلم سے ہی اس رسالے کو وسعت ملی ہے۔ یہ رسالہ 48 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں 42 صفحات پر مشتمل شاد صاحب کا ایک تفصیلی مضمون ہے۔ جو انہوں نے حضرت شاہ فرید الدین بغدادی کے بارے میں لکھا ہے۔

ان کے کئی افسانے، مضامین اور انشائیے وغیرہ ملک کے بیشتر رسائل و جرائد میں شائع ہوئے جس میں خاص طور پر تعلیم دہلی، ادیب علی گڑھ، دوام، نیا دور، آج کل، نوائے قوم، اذان، نیا ولولہ، چناب وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

''رسالہ اذان'' میں شاد فرید آبادی کے زیادہ تر مذہبی نوعیت کے مضامین شوئع ہوتے تھے اور ان کے علاوہ ''اذان'' میں ان کا ایک تاریخی مضمون ''تاریخ کے جھروکوں'' کے عنوان سے ایک سلسلہ وار مضمون تھا جو کئی قسطوں میں چھپتا رہا تھا۔ اس مضمون میں مصنف نے تاریخی واقعات کو ایک افسانوی انداز میں پیش کیا ہے۔ ''اذان'' میں مختلف عنوانات اور مختلف موضوعات پر شائع ہونے والے شاد فرید آبادی کے مضامین اور انشائیے جن میں ''اردو زبان کی المناک داستان''، ''اسلام کا مستقبل'' ''خیال صاحب کی خیال آرائیاں وغیرہ خاص طور پر اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاد صاحب کو اردو زبان و ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ چناں چہ اس حوالے سے ان کے

مضمون ''خیال صاحب کی خیال آرائیاں'' سے مثال کے طور پر ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''اردو دو متحرک اور جاندار تہذیبوں کے ملاپ کی تعبیر ہے۔اس پودے کی نشوونما کے لیے ہر ایک نے بغیر کسی تعصب وتفریق کے اپنے خون جگر سے آبیاری کی ہے۔مسلمانوں یا بقول خیال صاحب (جو اکثر خیالوں میں بہک جاتے ہیں) پاکستان کی زبان نہیں۔یہ ہندوستان میں بسنے والے سب فرقوں اور جماعتوں کی نمائندہ زبان ہے۔'' (118)

ریاست جموں وکشمیر سے نکلنے والا ہفتہ وار ''نیا ولولہ'' میں بھی شاد فرید آبادی کی بہت ساری تحریریں شائع ہوئی تھیں جن میں ''ماں''، ''اجالے کے سپاہی''، ''ہم سے ملیے'' ''ان سے ملیے'' اور زخمی روح'' وغیرہ بہت اہمیت کے حامل ہیں۔''زخمی روح'' اور ''ہم سے ملیے''، ''ان سے ملیے'' شاد فرید آبادی کے مشہور طنز ومزاح سے پر انشائیے ہیں۔ ''اجالے کے سپاہی'' اور ''امام حسین کی شہادت'' میں شاد فرید آبادی نے تاریخ اسلام کے چند واقعات کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ ''ویکلی چناب جموں'' میں بھی شاد فرید آبادی کے کئی تنقیدی وتحقیقی مضامین اور انشائیے منظر عام پر آئے تھے۔جس میں ''امتحان کا موسم''، ''شکستہ آواز''، ''زندہ باد مردہ باد''، ''میں ایک طالب علم ہوں'' اور ''میری بستی میرے لوگ'' وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ان کے انشائیے ''میری بستی میرے لوگ'' سے ایک اقتباس:

''لوگ کیچڑ پر چل کر سکیٹنگ کا لطف اٹھاتے ہیں۔اندھیرے میں راستے کے نشیب وفراز دیکھ کر انسان زندگی کے نشیب وفراز کر بھول جاتا ہے۔ضلعی صدر مقام کا اندازہ چند سرکاری عمارتوں سے ہوتا ہے۔اس کے علاوہ ترقی کا دور دور تک نام واشان نہیں ملتا۔ برسوں سے سڑکوں پر بڑے بڑے بورڈ آویزاں نظر آتے ہیں۔آزادی کے بعد چند کلومیٹر سڑک بنانے کا مرحلہ طے ہوا ہے مگر آج تک ہر سڑک کاڑیوں کی شکل دیکھنے کے لیے ترس رہی ہیں۔''(119)

اسی طرح ''رہنمائے تعلیم دہلی'' میں شاد فرید آبادی کے بہت سارے مضامین شائع ہوئے تھے۔جن میں خاص طور پر ''وہ آزادی ہماریاں''، ''شاخ بریدہ''، ''نصاب میں تحریری کام کی اہمیت'' وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔''وہ آزادی ہماریاں'' میں مصنف نے مزاحیہ انداز اپنایا ہے اور جمہوریت اور جمہوری نظام کا جائزہ پیش کیا ہے۔انہوں نے اپنے انشائیوں میں سیاسی استحصال، اسمگلنگ، لوٹ مار، ذخیرہ اندوزی کی صفت، کام کاج نہ کرنے کی آزادی، مونچھیں رکھنے

کی آزادی، تعلیمی اداروں میں نیا ماحول، کھوپڑیاں رکھنے کی آزادی وغیرہ جیسے حقائق کی نشان دہی کی ہے۔ان انشائیوں میں سب سے زیادہ اہمیت مزاحیہ انداز بیان کی ہے۔

1964ء میں شاد فرید آبادی کی نگرانی میں اسلامیہ فریدیہ اسکول ڈوڈہ نے ''روشنی کا سفر'' کے عنوان سے ایک میگزین کا انعقاد کیا۔اس میگزین کا پہلا شمارہ نومبر 1984ء میں شائع ہوا تھا۔اس کے پہلے شمارے میں شاد فرید آبادی کا ایک مضمون تقریباً ستئیس صفحات پر مشتمل تھا جو ایک مذہبی و دینی نوعیت کا تھا۔رسالہ ''روشنی کا سفر'' کا مقصد تھا کہ اس سے کسی ذریعے سے خوابیدہ ذہنوں کو بیدار کیا جائے اور نوجوان نسل میں شعور وآگہی کی لہر دوڑ پڑے اور ان کے اندر خود شناسی کا جذبہ پیدا ہو سکے۔

شاد فرید آبادی صاحب فریدیہ بزم ادب ڈوڈہ کے اشاعتی بورڈ کے اہم رکن بھی رہ چکے ہیں۔شاد صاحب اپنی سرزمین سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیات پر بھی مقالات لکھے تھے۔جن میں خاص طور پر ''وفا بھدرواہی۔حیات اور شاعری'' اور ''ڈولوال جانباز فن اور شخصیت'' وغیرہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔اس کے علاوہ ''محبوب کبریا'' اور ''معلم انسانیت'' کے عنوان سے لکھی ہوئی شاد فرید آبادی کی دو اہم تصانیف بھی قابل ذکر ہیں۔یہ دونوں تصانیف ریاست جموں وکشمیر میں عمدہ مقام حاصل کر چکی ہیں۔یہ دونوں کتابیں مذہبی نوعیت کی ہیں۔اول الذکران کی تصنیف ''محبوب کبریا'' جنوری 1992ء میں شائع ہوئی تھی۔ان کی یہ کتابن تقریباً144 صفحات پر مشتمل ہے۔اس کتاب میں مصنف نے اسلام کی حقائیت اور اسلام مخالف قوتوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

اسی طرح شاد فرید آبادی صاحب کی دوسری تصنیف ''معلم انسانیت'' 1994ء میں منظر عام پر آئی تھی۔یہ کتاب ان کی پہلی تصنیف ''محبوب کبریا'' سے کافی ضخیم ہے۔یہ کتاب مذہبی نوعیت سے متعلق ہے۔جس میں انہوں نے اسلام کی تاریخ کو پیش کیا ہے۔اس کتاب کے بارے میں ولی محمد اسیر کشواڑی اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اس کتاب کو لکھنے میں انہوں نے تاریخ اسلام اور سیرت پاک پر لکھی گئی شہرہ آفاقن کتابوں سے بھرپور استفادہ لیا ہے۔کافی محنت اور تحقیق سے کام لیا گیا ہے۔جو کمی مصنف کو اپنی پہلی کتاب میں نظر آئی تھیں اس کو دور کرنے کا طرز سیرت نگاری بالکل انوکھا ہے۔وہ اپنی روایتی انداز کے بجائے جدت نگارش کے قائل ہیں۔انہوں نے مختصراً مگر جامعہ الفاظ میں تاریخ

اسلام کا ایک خوب صورت تاثر دیا ہے۔جس میں پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیؐ کے بلند مقام، قرآن واحادیث کی روشنی میں تصور اسلام، ترویج وترقی، اسلام اور حق وباطل کی معرکہ آرائی وغیرہ کی نشان دہی ہوئی ہے۔‘‘(120)

شاد فرید آبادی کی یہ تصنیف تقریباً 477 صفحات پر مشتمل ہے۔جس کو انہوں نے بہت ہی محنت اور لگن سے تخلیق کیا ہے۔

قیصر کشتواڑی:

قیصر کشتواڑی جموں کے خطوط اور مضمون نگاروں میں اہم مقام رکھتے ہیں۔انہوں نے سیاست میں بھی کافی حصہ لیا تھا انہیں ریاست کے بڑے بڑے ادیبوں کے خط آتے تھے مگر ان کا جواب وہ کبھی کبھی دیتے تھے۔اکثر پریشانی کی حالت میں مبتلا رہتے تھے۔ان کے خطوط کی تحریروں سے ان کی گفتگو اور انداز بیان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔انہوں نے اپنے ایک خط کے جواب میں ولی محمد امیر کشتواڑی کو لکھا تھا۔مثال کے طور پر ان کے خط کا اقتباس:

’’دراصل غم جاناں وغم دوراں نے اس قدر جکڑ رکھا ہے کہ یادداشت بس کہیں کھو گئی ہے۔آپ کا خط ملا تو ٹھٹکا سا۔پھر ذہن پر بوجھ پڑ گیا کہ کب کیا لکھوں؟ آپ کے سوالات سے کیا جواب دوں؟ پھر یاد آیا کہ کہیں کچھ لکھا پڑا ہے۔اب اس لکھے پڑھے کو کب اور کہاں ڈھونڈوں۔کہیں اس سعی میں آسانی سے کامیاب ہوا تو لالے پڑ گئے۔۔۔آج سے کوئی چار پانچ سال پہلے جموں سے آئے ڈاکٹر ظہوالدین صاحب نے طلب کیا تھا۔تب بھی اسی مستانہ ولاپرواہ مزاج نے ان کے حوالے یہ لکھا کرنے نہیں دیا تھا تو یہیں پڑا رہا اور آج کام آیا۔۔۔باقی میں اپنے بارے میں کیا لکھوں ایک کھلی کتاب ہوں۔اسے سب نے پڑھا ہے۔آپ نے بھی۔‘‘(121)

قیصر کشواڑی ایک اچھے مضمون نگار اور نقاد کی حیثیت سے بھی جانے جاتے ہیں۔انہوں نے بہت سارے مضامین لکھے تھے جو ریاست کے مختلف اخبارات ورسائل میں شائع ہوتے رہے۔’’حلینت کلچرل فورم کشتواڑ‘‘ کی مشہور تصنیف ’’پس افق‘‘ میں قیصر کشتواڑی کا ایک بہترین مضمون شامل کیا گیا تھا۔ان کا یہ مضمون افسانوی انداز میں لکھا گیا تھا۔اس لیے اس کو افسانہ کے ذمرے میں بھی رکھا جاسکتا ہے۔حالاں کہ یہ افسانہ فنی لحاظ سے پوری طرح افسانہ نہیں

ہے۔مثال کے طور پر س مضمون کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔جس میں قیصر کشتواڑی اپنا اور اپنے عزیزی دوست ڈولوال کا ذکر کیا ہے۔

''ایک دن ڈولوال صاحب کے اپنے ہی ایک شعر نے انہیں جنگلوں سے باہر کھینچا اور کلچرل ڈپاٹمنٹ میں کلچرل آفیسر بنا دیا اور عوام سے دیہات سے اور ایوان سے، اقتدار سے، غریب سے، امیر سے، اعلی آفیسران سے، اہل اقتدار سے بہت قریب ہوگئے۔ یہ دور ڈولوال صاحب کو احساس برتری کے دائرے میں پہنچا گیا۔ وہ بہت دور تک آگے نکل گئے، انہوں نے کشتواڑ کی سرزمین میں اپنے فن کی بنیادیں کھودیں۔ایک ایسے نظر کی تعمیر کروائی جس کی اونچائی ڈوڈہ، بھدرواہ، بانہال سے ہوتی ہوئی کشمیر سے دکھائی دینے لگی۔لیکن ایوانوں نے انہیں بدمست نہیں کیا وہ مفلس بے کس خاندانوں کی تماشائی شادمانی، بے زبانوں کی میزبانی ، بے تکلفوں کی بے تکلف تقاریب کی مہمانی کرتے رہے۔'' (122)

فن ترجمہ نگاری:

فن ترجمہ نگاری بھی ان کی ایک اچھی کتاب ہے۔ جو 2006ء میں نئی دہلی سے منظر عام پر آئی تھی۔ یہ ایک مختصر سی کتاب ہے جو صرف 92 صفحات پر مشتمل ہے مگر اس مختصر سی کتاب میں مصنف نے کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں جن موضوعات کو انہوں نے زیر بحث لایا ہے ان میں ترجمے کے مسائل، فن پارے کے ترجمے کے تقاضے اور فن ترجمہ نگاری شامل ہیں۔اس کتاب کا مقصد بھی شعبہ اردو جموں یونی ورسٹی میں ایم۔اے اردو وغیرہ پروفیشنل کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے تخلیق کیا گیا تھا۔اس کتاب کے بارے میں مصنف نے اپنے الفاظ میں ایک جگہ لکھا ہے:

''ترجمے کی اہمیت سے کس کو انکار ہے لیکن کامیاب ترجمہ کار کس طرح پیدا کیے جائیں یہ اس دور کا سب سے بڑا سوال ہے۔اب وہ زمانہ نہیں رہا جب زبان کے ہر طالب علم یا استاد کو ہر فن مولا سمجھ لیا تھا اور یہ یقین عام تھا کہ جو شخص ایک بار ایم۔اے کر لیتا وہ اس زبان سے متعلق سب کچھ جانتا ہے اور ساری ذمے داریاں نبھا سکتا ہے۔آج زمانہ خصوصی اہلیت (SPECIALIZATION) کا ہے جس کی وجہ سے ترجمے کا کام بھی انہیں کے سپرد کیا جاتا ہے۔ جو اس کی باقاعدہ تربیتی سند حاصل کر کے اس میدان میں اترتے ہیں۔'' (123)

نشاط کشتواڑی:

''خطوط احباب'' نشاط کشتواڑی کی ایک اہم کتاب ہے اور اس کے علاوہ نشاط کشتواڑی کی ایک اور تصنیف ''تصویر خیال'' کے عنوان سے منظر عام پر آئی ہے۔مگر ''خطوط احباب'' ان کی شاہکار تصنیف ہے۔اس میں اس دور کے تمام اردو ادبا وشعرا کا ذکر ملتا ہے۔اس لیے راقم کی نظر میں یہ کتاب ایک تحقیقی وتنقیدی نوعیت کی حامل ہے۔ یہ کتاب 223 صفحات پر مشتمل ہے جس میں نہ صرف شعرا وادبا کا ذکر ملتا ہے بلکہ نشاط کشتواڑی کے عہد کے تمام دانشوروں، صحافیوں، سیاسی وسماجی رہناوں وغیرہ کا ذکر بھی ملتا ہے۔اس کتاب میں مصنف نے کل 141 خطوط کو شامل کیا ہے اور سب سے زیادہ یعنی 34 خطوط مرحوم عشرت کاشمیری کے نام ہیں۔ان کے علاوہ جن احباب کے نام نشاط صاحب نے خطوط شائع کئے تھے ان میں تنہا انصاری، خیرات محمد ابن رسا، انشا انصاری، پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر علی جواز زیدی، مولانا عبدالماجد دریابادی، پروفیسر آل احمد سرور ایڈیٹر روزنامہ ملاپ دہلی، ایڈیٹر روزنامہ انقلاب لاہور، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر نند لال کول، صہبا لکھنوی، لالہ ملک راج صراف، مدیرہ، جمال صابری، پروفیسر ظہور الدین، ڈاکٹر خلیق انجم، بٹ جعفری منڈی پونچھ، رشید احمد صدیقی، پروفیسر دیوان وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

مذکورہ تصنیف میں راقم کی تحقیق کے مطابق نشاط صاحب کے خطوط اور عشرت کاشمیری کے خطوط زیادہ اہمیت کے حامل ہیں، جن سے جموں خطے کے ضلع ڈوڈہ کی ادبی تاریخ کے اہم گوشے ترتیب دیے جاسکتے ہیں اور ضلع ڈوڈہ کی چند اہم تاریخی واقعات کو منظر عام پر لانے والے نشاط کشتواڑی صاحب پہلے شخص ہیں۔انہیں خطوط احباب کا مجموعہ چھاپنے کی تحریک جن تصانیف سے ملی تھی۔ان میں خاص طور پر ''خطوط غالبؔ''، منشی پریم چند کے خطوط، مولانا دریابادی کے ''خطوط مشاہیر''، مولوی لطیف احمد کے مجموعہ ''مکتوبات مشاہیر''، پروفیسر مبشر علی صدیقی کے مجموعہ ''معاصرین کے خطوط'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔جس کا ذکر خود مصنف نے اپنے مجموعہ ''خطوط احباب'' کے ''حرف آغاز'' میں کیا تھا۔شاعری کے حوالے سے نشاط کشتواڑی کی ایک اور تصنیف قابل ذکر ہے جو انہوں نے ''کاشر مناجات نعتیہ مرثیہ'' کے عنوان سے شائع کی تھی۔ یہ کتاب 55 صفحات پر مشتمل ہے جس میں نشاط کشتواڑی کے چودہ نعت شریف، دومناجات، تین چار مرثیے، دواہم نظمیں اور غم سیارہ کی نو چھوٹی چھوٹی صورتوں میں کشمیری زبان کے منظوم ترجمے وغیرہ کو بھی شامل کیا گیا ہے۔

حوالہ جات

1:''اطراف تنقید''،از پروفیسر ضیا الدین،ص128

2:''کشمیر میں اردو'' حصہ سوم،از عبدالقادر سروری ص349

3:''جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشوونما'' از برج پریمی،ص57

4:''کشمیر میں اردو'' از حبیب کیفوی،ص131

5:''کشمیر میں اردو'' حصہ سوم،از عبدالقادر سروری،ص348

6:''جموں وکشمیر میں اردو کی نشونما'' از برج پریمی،ص175

7:''Fifty years as journalist'' از ملک راج صراف،ص222

8:''جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشونما'' از برج پریمی،ص175

9:رسالہ ''رتن''،مارچ 1946،ص4

(10)Development of Urdu Language and Literature in the Jammu Region,By prof. Zahur Ud Din، p.396.

11:اخبار ''چاند'' 1944ء کی ملاقات،ص11

(12)Development of Urdu Language and Literature in Jammu Region,By prof. Zahur Ud Din p360.

(13)Development of Urdu Language and Literature in Jammu Region",By prof. Zahur Ud Din p340.

14:اخبار جہاد،سیالکوٹ،16/جون 1950

15:فن صحافت، از پروفیسر ظہور الدین،ص،5

16:''اطراف تنقید'' از ڈاکٹر ضیا الدین،ص116

17:''جلوۂ صد رنگ''از برج پریمی،ص192

18:''انسانیت ابھی زندہ ہے''،از ملک راج صراف،ص3

19:ایضاً،ص69

20:''پشکن کے دیس میں''،از پروفیسر جگن ناتھ آزاد،ص8

21:ایضاً،ص42

22:''نیپال نامہ''از پرتپال سنگھ بیتاب،ہندسماچار کا ادبی میگزین،مرتب پریم کمار نظر،جلندھر،1999

23:''لاہور نامہ''(غیر مطبوعہ)از پرتپال سنگھ بیتاب،ص4

24:''اردو کے چند مشاہیر''از ڈاکٹر شہناز قادری،ص27

25:''اسفارِ شہاب''از شہاب عنایت ملک،ص

(26)Development of Urdu Language and Literature in Jammu Region"By prof. Zahur Ud Din, p302.

27:''جموں کشمیر میں اردو کی نشو نما''از ڈاکٹر برج پریمی،ص،72

28:رسالہ''شیرازہ''شمارا نمبر4،ص،96

(29)Development of Urdu Language and Literature in Jammu Region"By prof. Zahur Ud Din, p302.

30:''ناٹک ساگر''از محمد عمر نور الہی،ص،2

31:ایضاً،ص،9

32:رسالہ''شیرازہ''''جموں وکشمیر میں اردو نثر نمبر''،شمارہ نمبر4،ص،96

(33)Development of Urdu Language and Literature in Jammu Region",By prof.Zahur Ud Din, p362.

(34)Development of Urdu Language and Literature in Jammu Region",,By prof.Zahur Ud Din, p304.

(35)Development of Urdu Language and Literature in Jammu Region",,By prof.Zahur Ud Din, p305.

(36)Development of Urdu Language and Literature in Jammu Region",,By prof.Zahur Ud Din, p304.

37:''روح نشاط''از نشاط کشتواڑی..........

(38)Development of Urdu Language and Literature in Jammu Region",,By prof.Zahur Ud Din, p305.

(39)Development of Urdu Language and Literature in Jammu Region",,By prof.Zahur Ud Din, p306.

(40)Development of Urdu Language and Literature in Jammu Region",,By prof.Zahur Ud Din, p307.

41:''ضلع ڈوڈہ کی ادبی شناخت''،از ولی محمد اسیر کشتواڑی،ص،206۔

42:ایضاً،ص،430

43:''انور فریدیہ''از انور فریدآبادی۔ص،77

44:''ضلع ڈوڈہ کی ادبی شناخت''،از ولی محمد اسیر کشتواڑی،ص،477

45:ایضاً،ص،869۔

(46)Development of Urdu Language and Literature in JammuRegion",,By prof.Zahur Ud Din, p352.

47:''جلوۂ صدرنگ''،از ڈاکٹر برج پریمی،ص12

48:''ذوق نظر' از ڈاکٹر برج پریمی، ص

49: شیرازہ، مئی 1989، ص88

50:''جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو ونما' از ڈاکٹر برج پریمی، ص13

51:''منٹو کتھا'' از ڈاکٹر برج پریمی، ص9

52: ضلع ڈوڈہ کی ادبی شناخت، از ولی محمد اسیر کشتواڑی، ص619

53:''دریا بہ دریا جو بہ جو'' از پروفیسر ظہور الدین۔ ص، 304

54:''جدید ادبی تنقیدی نظریات'' از پروفیسر ظہور الدین ص، 116۔

55: ایضاً، ص، 259

56:''کہانی کا ارتقا'' از پروفیسر ظہور الدین، ص، ا۔

57: ایضاً، ص، 25

58: ایضاً، ص149

60: ایضاً، ص175۔

61: ایضاً، ص124۔

62:''تنقیدی مباحث وتجزیے'' از پروفیسر ظہور الدین، ص، 44

63: ایضاً، ص، 12

64: ایضاً، ص، 22

65:''جموں وکشمیر کے اردو مصنفین'' از جان محمد آزاد، ص480۔

66: ضلع ڈوڈہ کی ادبی شناخت، از ولی محمد اسیر کشتواڑی، ص624

67: ایضاً، ص674

68: ایضاً،ص675

69: شیخ العالم ایک مطالعہ،ازمحمد اسداللہ وانی،ص52

70: ''ضلع ڈوڈہ کی ادبی شناخت،از ولی محمد اسیر کشتواڑی،ص748

71: ملا بہاؤالدین ریشی نامہ،ازمحمد اسداللہ وانی،ص5

72: ''جموں و کشمیر کے اردو مصنفین ،از جان محمد آزاد،ص486

73: ''اقبالیات آزاد''ازمحمد اسداللہ خان وانی،نئی دہلی،ص162

74: ''ضلع ڈوڈہ کی ادبی شناخت''،از ولی محمد اسیر کشتواڑی،ص886

75: ایضاً،ص890

76: جموں و کشمیر میں اردو ادب(2000 تا2013)''از ڈاکٹر لیاقت علی،ص

77: ایضاً،ص171

78: ''اردو کا سیکولر کردار''از پروفیسر شہاب عنایت ملک،ص381

79: ایضاً،ص32

80: ''ورق ورق آئینہ''از پروفیسر شہاب عنایت ملک،ص161

81: ''جموں و کشمیر میں اردو زبان(ماضی،حال،مستقبل)،از پروفیسر شہاب عنایت ملک،ص18

82 بحوالہ: ''ضلع ڈوڈہ کی ادبی شناخت،از ولی محمد اسیر کشتواڑی،ص904

83: ایضاً،ص905

84: ''پریمی رومانی۔فکر وفن''از پروفیسر اسداللہ وانی،ص60

85: ''جموں و کشمیر کے اردو مصنفین''از جان محمد آزاد،ص376

86: ''ردِعمل''از پریمی رومانی،ص8

87: ایضاً،ص11

88: ''اوراق'' از پریمی رومانی،ص45

89: ''ردِعمل''،از پریمی رومانی،ص138

90: ''پیش رفت''،از پریمی رومانی،ص15

91: ایضاً،ص159

92: ''پریمی رومانی،فکروفن (مرتب) اسداللہ وانی،ص39

93 بحوالہ: ''میزان'' از پریمی رومانی،ص9

94: ایضاً،ص12

95: ''پریمی رومانی۔فکروفن'' از پروفیسر اسداللہ وانی،ص43

96: ایضاً،ص48

97: ''اعتراف'' از پریمی رومانی،ص45

98: ایضاً،ص5

99: ''فکرونظر'' از پریمی رومانی،ص40

100: ''فیض کی شاعری: ایک مطالعہ'' از ڈاکٹر نصرت چودھری،ص97

101: ایضاً،ص197

102: ایضاً،ص6

103: ''فیض احمد فیض: روایت اور انفرادیت،از ڈاکٹر نصرت چودھری،ص321

104؛ ایضاً،ص2

105: فیض افسانہ۔انتخاب اور تجزیے،از ڈاکٹر نصرت چودھری،ص15

106: ایضاً، ص304

107: ''اطراف تنقید'' از ڈاکٹر ضیا الدین، ص14

108: ایضاً، ص78-77

109: ''جموں و کشمیر میں اردو ادب (2000 تا 2013)'' از ڈاکٹر لیاقت علی، ص

110: ''اسالیب نثر پر ایک نظر، از ڈاکٹر ضیاء الدین، ص10

111: ایضاً، ص130

112: ایضاً، ص10

113: ''گوپال متل شخص و شاعر'' از ڈاکٹر ضیاء الدین، ص7

114: ''تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران''، از مشتاق احمد وانی، ص13

115: ''اردو ادب میں تانیثیت''، از مشتاق احمد وانی، ص137

116: ''اعتبار و معیار'' از مشتاق احمد وانی، ص15

117: ایضاً، ص26

118: ''ضلع ڈوڈہ کی ادبی شناخت، از ولی محمد اسیر کشتواڑی، ص562

119: ایضاً، ص563

120: ایضاً، ص563

121: ایضاً، ص778

122: ایضاً، ص789

123: ''فن ترجمہ نگاری'' از پروفیسر ظہور الدین، ص5،

باب چہارم

جموں میں اردو کے فروغ میں ادبی اداروں کا حصہ

جموں میں اردو کو فروغ دینے میں بہت سارے اداروں کا بھی اہم رول رہا ہے۔جس میں سب سے زیادہ جموں یونیورسٹی اور کلچرل اکیڈمی کا نام قابل ذکر ہے۔کلچرل اکیڈمی ریاست کے بہت سارے ادباء وشعراء حصہ لیتے آرہے ہیں اور دور حاضر میں بھی ریاست جموں وکشمیر کے مختلف اردوادیب ودانشور اپنی تحریروں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کررہے ہیں۔کلچرل اکیڈمی ان کی تحریروں کو شائع کرنے میں تعاون دے رہی ہے۔اسی طرح سے یونیورسٹی آف جموں میں بھی ریاست اور بیرون ریاست کے بہت سارے ادیب،شاعر،نقاد،محققین وغیرہ شعبہ اردو سے وابستہ اردو زبان کوفروغ دینے میں نمایاں رول ادا کررہے ہیں۔اس کے علاوہ جموں میں دیگر کئی سرکاری اور غیر سرکاری اداروں نے اردوزبان وادب کوفروغ دینے میں نمایاں رول ادا کیا ہے جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

"آل جموں کشمیر ٹیچر ایسوسی ایشن" کے عنوان سے ریاستی اسکول کے اساتذہ کے لیے ایک ادارہ 1942 میں قائم کیا گیا تھا۔اس ادارے کا مقصد اساتذہ کے مطالبات عہدہ داروں کے لیے ایک فورم مہیا کرنا تھا اور ساتھ ہی ساتھ یہ ادارہ اساتذہ کی فلاح و بہبود کے مسائل کو بھی منظر عام پر لانے کا کام کرتا تھا۔اس ادارے میں زیادہ تر اساتذہ ہی کی کانفرنسیں منعقد ہوتی تھی اور ایسوسی ایشن کی طرف سے ایک ترجمان "استاد" کے عنوان سے شائع ہوتا تھا جس میں اساتذہ کے افسانے تحقیقی وتنقیدی مضامین اور شعری تخلیقات کو شائع کیا جاتا تھا۔

"ڈوگری سنستھا" 1943 میں جموں میں قائم کی گئی تھی۔اس میں ڈوگری زبان اور ادب کی ترقی کے مسائل کو ابھارا جاتا تھا یہ ایک غیر سرکاری ادارہ تھا اس ادارے سے تعلق رکھنے والے اراکین ڈوگری زبان کے ادیب تھے مگر اس میں جو ادبی خدمات کا جائزہ لیا جاتا تھا وہ اردو زبان میں ہوتا تھا۔

اکتوبر 1963 میں جموں میں "بزم فروغ اردو" کے عنوان سے انجمن قائم ہوئی تھی اس کا مقصد یہ تھا کہ "اردو زبان وادب کوفروغ دینا اور صحت مند جاندار صالح اور تعمیری ادب کی تخلیق" کی حوصلہ افزائی کرنا تھا۔انجمن کے اراکین میں جموں کے بڑے ادیبوں میں خاص طور پر مکیش کاشمیری،منظر اعظمی،مالک رام انند،دینا ناتھ کپور،چوہدری دینا ناتھ رفیق،راجیش گوہر،ہر بھگوان شاد،یش سروج،نند گوپال باوا،گردھاری لال،آنند تمنا،وریندر جموال،قادر حسین مجروح، تنویر بھدرواہی،ساگر نسیم حسرت،گیان چند شرما،فاروق درانی،اکرم حسین،منشی رام شرما وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل

تھے۔اس بزم کے صدر ڈاکٹر منظر اعظمی تھے اور نورالزماں صدیقی نور اس کے جنرل سیکرٹری تھے۔ان کے علاوہ اس انجمن سے جن ادیبوں نے اپنے مشورے دیے اور انجمن سے وابستگی قائم رکھی اس میں ڈاکٹر گیان چند جین،عشرت کاشمیری،بی۔ڈی۔مل شرما،پشکر ناتھ،مدن موہن شرما وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

بزم کے زیر اہتمام ہفتہ وار ادبی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھی اور ریاست کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے شعراء وادباء اپنی تخلیقات کو پیش کرتے تھے۔اس بزم سے 1965 میں اراکین کی تخلیقات کا ایک مجموعہ بعنوان "منتخب ادب" شائع کیا گیا تھا۔اس مجموعہ میں انجمن کی کارروائیوں کے علاوہ افسانے زیادہ شامل کیے گئے تھے۔جن میں خاص طور پر مالک رامانند کا افسانہ "جانے وہ کیسے لوگ تھے" یش سروج کا "امرت جیسا زہر" نورالزماں صدیقی کا "لت" راجیش گوہر کا "پونم کا چاند" نندگوپال باوا کا" آخری خواہش" کشوری منچندہ کا" سیاہی "وغیرہ قابل ذکر ہیں.

"انجمن ادب" جموں میں 26 فروری 1967 کو قائم کی گئی تھی۔اس انجمن میں اردو زبان کے علاوہ ہندی کے ادب کو بھی فروغ دیا جاتا تھا۔اس انجمن کے زیر اہتمام بہت سارے مشاعرے اور ادبی محفلیں وقتاً فوقتاً کیے جاتے تھے او ر ہفت روزہ جلسے بھی منعقد ہوتے تھے۔اس انجمن کی شاخیں جموں کے علاوہ دوسرے کئی علاقے جیسے پونچھ،کٹھوعہ، ریاسی،اکھنور وغیرہ میں قائم تھی،سریندر ساجد اس انجمن کے صدر تھے اور انجم ادھوم پوری اس کے نائب صدر تھے اور جنرل سیکرٹری مدن موہن عاقل انجام دے رہے تھے۔اس انجمن کے اراکین میں جنہوں نے نمایاں رول ادا کیا ان میں بلراج کمار ساز،کلدیپ صابر،یش کمار سوز وغیرہ تھے۔

جموں کے اداروں میں ایک مفید اور کارگر ادارہ" مکتبہ اردو ادب" جموں بھی اہمیت کا حامل تھا،اس ادارہ کے ناظم رہبر ساجد تھے اور اراکین میں جموں خطے سے تعلق رکھنے والے بہت سارے ادباء وشعرا اس میں شریک ہوتے تھے ۔عرش صہبائی اور عابد پیشاوری اس ادارے کے روح رواں تھے،اس ادارے سے شعراء وادباء کی تخلیقات کا ایک مجموعہ "انجم کدہ" کے عنوان سے شائع کیا گیا تھا۔جس کو عرش صہبائی نے مرتب کر کے 1963 میں شائع کیا تھا۔

اس کے علاوہ ریاستی" کلچرل اکادمی" ایک اہم ادارہ ہے جس کو" اکادمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز " کے نام سے بھی جانا جاتا ہے اس کا انعقاد 1958،میں عمل میں لایا گیا تھا۔اس میں اردو،کشمیری،ڈوگری پنجابی،لداخی،دردی، بلتی،وغیرہ زبانوں کو فروغ دیا جاتا ہے،یہ ایک سرکاری ادارہ ہے،ابتدا میں اس کے سیکرٹری مرزا کمال الدین شدا،علی جواد زیدی،پروفیسر جیالال کول،نیلامبر دیو شرما،علی محمد لون،محمد یوسف ٹینگ غیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

اس اکادمی کی ایک جنرل کونسل بنائی گئی تھی جس کی صدارت ریاستی وزیر اعلیٰ کرتے تھے اکادمی کا اشاعتی پروگرام ہر سال ایک زبان کے لیے تجویز کیا جاتا ہے۔جس سے ہر زبان کو فروغ دیا جا سکے اس ادارے سے سہ ماہی رسالہ "شیرازہ" کے عنوان سے جاری کیا جاتا ہے اور بہت سارے شخصیات نمبر بھی شائع کیے جا چکے ہیں اکادمی کے زیر اہتمام وسیع پیمانے پر کل ہند مشاعرہ منعقد کروائے جاتے ہیں، اس اکادمی کی جانب سے ریاست کے بہت سارے شعراء و ادباء کی تخلیقات کو منظر عام پر لایا جاتا ہے۔اکادمی کی جانب سے انہیں انعامات واعزازات سے بھی نوازا جاتا ہے۔اردو زبان وادب کے ساتھ ساتھ دیگر زبانوں کو فروغ دینے میں یہ ادارہ ایک اہم کارنامہ انجام دے رہا ہے۔

جموں یونیورسٹی میں اردو ادب کی ابتداء 1965ء میں کی گئی تھی۔اس وقت جموں کشمیر یونیورسٹی نے مل کر یہ فیصلہ کیا تھا کہ جموں میں بھی اردو شعبہ قائم کیا جائے تا کہ جموں خطے کے طلبا وطالبات کو کشمیر جانے کی ضرورت محسوس نہ ہو۔ اس وقت پروفیسر گیان چند کا اس شعبہ کو قائم کرنے میں اہم رول رہا۔وہ حیدرآباد یونیورسٹی کے ایک اہم اسکالر رہے تھے اور شعبہ میں وہ صدر کی حیثیت سے ملازمت کر رہے تھے اور اس کے بعد ان کا تبادلہ جموں یونیورسٹی میں بحیثیت صدر کیا گیا تھا۔ان کی یہ کوشش تھی کہ اردو ادب سے تعلق رکھنے والے جتنے بھی طلبا وطالبات ہیں وہ کشمیر یونیورسٹی میں جانے کے بجائے جموں میں ہی تعلیم حاصل کریں۔چنانچہ 1965ء میں جموں میں شعبہ اردو کا آغاز کیا گیا اور 1966ء میں یہ کوشش بے کار ہوگئی اور بہت سارے مسائل کی ضرورت ہونے لگی اور شعبہ اردو پوری طرح سے بھال نہ ہو سکا۔اور بہت سارے طلبا کشمیر میں ہی جانے لگے۔مگر پروفیسر گیان چند جین نے ہنرمندی سے کام لیا اور ایک بار پھر سے جموں یونیورسٹی کو ایک منی فیسٹو پیش کیا جس کی بہت ساری کاپیاں چانسلر، وائس چانسلر اور یونیورسٹی کے کونسل کو پیش کیں۔اور یونیورسٹی نے شعبہ اردو کی منظوری دے دی۔پروفیسر ظہور الدین نے اپنی کتاب میں گیان چند جین کے بارے میں لکھا ہے:

> "Had this decision been carried out the condition of Urdu in the Jammu Region would have further deteriorated. However, Gian Chand Jain, a number of Political, Sicial and Literary Organizations of Jammu protest against this dicision and supported the Idea of converting it into and evening department, the proposal regarding which had

already been made...... this time the earlier decision was revoked and the Department was allowed to run its classess in the evening".(1)

اس کے بعد سے جموں یونیورسٹی میں اردو زبان وادب کا کام کاج زوروشوروں سے شروع ہوااور 1967ء میں پہلا تحقیقی مقالہ بعنوان ''محروم کی شاعری'' پروفیسر گیان چند جین کی نگرانی میں مکمل ہوا۔

اس کے علاوہ جموں یونیورسٹی کے حوالے سے بہت ساری مشہور شخصیت ہیں۔جن کا تعلق بیرون ریاست سے تھا،ان میں خاص طور پر پروفیسر گین چند جین،جگن ناتھ آزاد،منظر اعظمی،شام لال کالرا،ضیاءالدین وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

گیان چند جین:

ان کی پیدائش 19رستمبر 1923ءکو بجنور میں ہوئی تھی۔وہ اردو ادب کے مشہور نقاد،محقق،ادیب وشاعر اور ماہر لسانیات تھے۔انھوں نے نصف صدی سے بھی زیادہ اپنی زندگی کو اردو ادب کو فروغ دینے میں صرف کردی تھی۔انھوں نے اردو زبان کے حوالے سے متعدد کتابیں لکھی ہیں جن کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ان کی تصانیف میں خاص طور پر اردو کی نثری داستانیں،اردو مثنوی شمالی ہند میں،تاریخ ادب اردو،تحقیق کا فن،تفسیر غالب،عام لسانیات ،حقائق،غالب شناس مالک رام،لسانی مطالعے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اکتوبر 1965ء میں پروفیسر گیان چند جین جموں یونیورسٹی میں بحیثیت پروفیسر مقرر ہوئے۔1972ء میں انھیں شعبہ اردو جموں یونیورسٹی کا پہلا صدر بنادیا گیا۔1965ء سے لے کر 1976ءتک پروفیسر گیان چند جین جموں یونیورسٹی میں رہے۔اس دوران انھوں نے بہت ساری کتابیں تخلیق کیں اور شعبہ میں بہت سارے بہترین مقالے بھی مکمل کروائے۔انھوں نے اپنے مضمون ''جموں تا بھوپال'' میں قیامِ جموں کے دوران کیے گئے کارناموں کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔اس مضمون میں انھوں نے شعبہ اردو جموں یونیورسٹی میں دی جانے والی تعلیم اور جموں خطے کے مشہور شاعروں اور ادیبوں کا ذکر کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''جموں میں ہر طرف اردو ہی اردو ہے۔ہندی محض نئی پود تک رسائی پاسکی ہے۔گئورکشا کمیٹی یا مہابیر جنتی کا پوسٹر ہو یا شمشان گھاٹ پر نوٹس ہر جگہ محض اردو ہی اردو ہے۔ابھی یونیورسٹی

میں ایم اے اردو کی جماعتیں شام کو کرانے کے لیے ارباب اقتدار کو کچھ اداروں نے محض ر دکیے، مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی ہے کہ مقامی جن سنگھ نے بھی از خود اردو کی حمایت میں یادداشت پیش کی ۔اردو کے اس عام رواج کے باوجود جموں میں اردو ادب کا مذاق نہیں۔ تحقیق وتنقید سے تو کوئی آشنا ہی نہیں ۔لیکن شاعری کے رسیا سب ہیں۔مشاعرے بڑے مقبول ہیں ....جموں میں اچھے برے شاعر کل پانچ ہیں۔ان میں عرش صہبائی کے سوا کوئی ایسا نہیں جس کا نام اس ریاست سے باہر معروف ہو‘‘۔(2)

گیان چندجین کے حوالے سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ جس طرح سے انھوں نے جموں میں اردو کی صورت حال کا جائزہ لے کر قارئین کو متاثر کیا ہے شاید ہی کوئی دوسرا ہوگا جو اس کام کو اتنی محبت ولگن سے کر پاتا۔قیام جموں میں ان کے بہت سارے تحقیقی وتنقیدی مضامین اور تصانیف منظر عام پر آئی تھیں جو بعد میں مختلف جگہوں سے شائع ہوئیں۔ اور جموں کے قیام کے دوران ہی انھوں نے اپنا ڈی لیٹ کا مقالہ بھی بعنوان ’’اردو مثنوی شمالی ہند میں‘‘ 1969ء میں مکمل کیا تھا۔اس کے علاوہ قیام جموں میں ان کے تحریر کردہ کتابوں میں خاص طور پر ’’تفسیر غالب‘‘ جو انھوں نے 1971ء میں لکھی ’’لسانی مطالعے 1973ء ’’تجزیے‘‘ یہ ان کی تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو 1973ء میں مکمل کیا۔’’رموز غالب‘‘ 1976ء قابل ذکر ہیں۔’’عام لسانیات‘‘ کے عرض میں بھی پروفیسر گیان چندجین نے جموں میں لکھا ہے کہ یہ کتاب 28رمئی 1975ء کو مکمل کی گئی تھی۔

ان متذکرہ بالا کتابچوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر گیان چندجین نے قیام جموں میں نہ صرف جموں خطے میں اردو زبان کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا بلکہ اردو زبان وادب کے حوالے سے اپنی تحریروں کو منظر عام پر لا کر نمایاں رول ادا کیا ہے۔گیان چندجین نے بھوپال سے نکلنے کے بعد ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔وہ چاہتے تھے کہ اردو ادب میں نئے نئے راستے کھوجے جائیں جن سے آنے والی نسلوں میں ہر طرح کا مواد فراہم ہو سکے اور خاص طور پر صوبہ جموں میں اردو زبان کی بہت ساری کتابیں فراہم ہوسکیں۔مگر اس بات کا انھیں بھی احساس تھا کہ وہ اپنے کام کو پوری طرح سے کامیاب نہ کر پائے جس کا اظہار انھوں نے خود اپنی کتاب میں کیا ہے:

’’ترقی اردو بیورو بنا اور میں اس کی لسانیات کمیٹی میں لیا گیا تو مختلف حضرات کو کتابیں لکھنے کی ذمہ داری تقسیم کی گئی۔میں نے عام لسانیات کی کتاب اپنے نام لکھا کہ میں اس پر پہلے ہی

سے کام کر رہا تھا۔ مطالعہ جاری رہا۔ اپنی کم مائگی کا احساس بڑھتا گیا۔ جموں میں لسانیات کی کتابیں نہ تھیں۔ خریدیں لیکن کتاب لکھنے کے لیے جو ذخیرہ چاہیے تھا وہ میسر نہ ہوا۔ اگر میں کہیں ایسے ادارے میں ہوتا جہاں لسانیات کی کتابیں بقدر مابہت موجود ہوتیں تو اس کتاب کا نقشہ بہت بہتر ہوتا۔ بہر حال وقت کے ساتھ ساتھ میرے لسانیاتی علم کا نشو نما ہوتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بھوپال میں لکھے ہوئے سب ابواب از سر نو لکھنا پڑا۔'' (3)

پروفیسر گیان چند جین تحقیق کے ساتھ تنقید سے بھی گہری واقفیت رکھتے تھے۔ ان کی تحریروں میں تنقیدی و تحقیقی مثالیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ تحقیق کبھی تنقید کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی ہے اسی لیے ان دونوں اصناف کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جیسا کہ خود گیان چند جین نے اپنی تصنیف ''تحقیق کا فن'' میں کہا ہے:

''محقق تنقیدی شعور سے بے نیاز ہو جائے تو اہم اور غیر اہم کی شناخت بھلا دیتا ہے''۔(4)

گیان چند جین صاحب کی تنقیدی تحریروں کے حوالے سے دو تصانیف بہت ہی مشہور ہیں جن میں پہلی ''رموز غالب'' اور دوسری ''تفسیر غالب'' ہے۔ یہ دونوں تصانیف تشریحی اور عملی تنقید کے حوالے سے عمدہ مثالیں ہیں۔ اس کے علاوہ ''تجزیے'' بھی پروفیسر گیان چند جین کی تنقیدی مضامین کا اہم مجموعہ ہے۔

''تفسیر غالب'' انھوں نے قیام جموں کے دوران مرزا غالب کے مکمل منسوخ شاعری کی شرح پیش کی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ گیان چند جین فارسی زبان سے کافی واقفیت رکھتے تھے۔ چونکہ مرزا غالب کے حوالے سے انھوں نے ''رموز غالب'' تصنیف لکھی ہے وہ فارسی کا مطالعہ کیے بغیر ممکن نہیں تھی۔ اس کتاب میں غالب کے ابتدائی زمانے کی شاعری کے حوالے سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے غالب کی فنی وفکری کلام کو دو حصوں میں منقسم کیا ہے۔ ایک کو انھوں نے تحقیق کے حوالے سے پیش کیا ہے اور دوسرا تنقید کے حوالے سے زیر بحث لایا ہے۔ اس کتاب میں کل بارہ مضامین ہیں جن میں تین مضامین تنقیدی حوالے سے ہیں اور نو مضامین تحقیق کے حوالے سے پیش کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب کل 344 صفحات پر مشتمل ہے جو 1976ء میں منظر عام پر آئی تھی۔ پروفیسر گیان چند جین نے مرزا غالب کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور ان کا دیوان مرتب کرنے کے لیے بھی انھوں نے بڑی محنت ولگن سے کامیابی حاصل کی ہے۔ جس میں ایک جگہ پر وہ لکھتے ہیں:

میں نے پچھلے سال تقریباً آدھ گھنٹے کے لیے نسخۂ عرشی زادہ کو سرسری طور پر دیکھا تھا۔ اب

1971ء میں مجھے اس کے تفصیلی مطالعہ کا موقع ملا۔ دیدہ زیبی اور حسن ظاہری کے اعتبار سے یہ جلد موقع چغتائی اور شاہکارانیس کے زمرے میں جگہ پائے گی۔لیکن اس کی اہمیت محض اس کے ظاہر کی وجہ سے نہیں اس کے مشمولات کی وجہ سے ہے''۔(5)

پروفیسر گیان چند جین نے اپنی تصانیف میں جو کارنامے کیے ہیں، اردو ادیبوں اور دانشوروں کے لیے بہت ہی فائدہ مند ہیں۔مرزا غالب کو گیان چند جین نے بڑا شاعر ماننے سے بالکل بھی انکار نہیں کیا ہے۔مگر غالب کے حوالے سے انھیں یہ اعتراض ہے کہ غالب کا کوئی ایسا انتخاب نہیں کیا گیا۔جس کی وجہ سے اسے عالمی سطح کے ادب کے مقالے میں شامل کیا جاسکے۔ان کا یہ بھی ماننا ہے کہ اردو ادب میں جتنا کام غالب کی شخصیت پر کیا گیا ہے اتنا شاید ہی کسی شخصیت پر کیا گیا ہوگا مگر پھر بھی غالب کی قدر و قیمت کو بار بار متعین کرنے کی بے حد ضرورت ہے جس سے نئی نئی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔

اسی طرح سے ان کی دوسری کتاب غالب کی شخصیت پر ''تفسیر غالب'' کے عنوان سے ہے۔اس میں انھوں نے مرزا غالب کی تفسیر لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔جس کی شروعات میں ماہر غالبیات مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی خدمت میں انھوں نے تشریح کے چند اشعار بھیج دیے تھے۔جب امتیاز علی عرشی نے ان اشعار کی تشریح کی تو گیان چند جین ان کی تشریح سے پوری طرح سے متفق نہیں ہوئے۔امتیاز علی کے علاوہ بھی انھوں نے غالب کے اشعار کی تشریح کروائی تھی۔ اس کتاب کو لکھنے میں گیان چند جین کو بہت ساری دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا جس کا ذکر انھوں نے خود بھی کیا ہے:

''غالب کا قلم زد کلام اجنبی فارسی محاوروں کی جنت ہے۔فارسی لغات کے بغیر ان اشعار کے حل کی سعی نامشکور رہے گی۔ میں نے قدم قدم پر بہار عجم اور فرہنگ آنند راج کا سہارا لیا ہے''۔(6)

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ گیان چند جین نے جموں میں تقریباً بارہ سال گزارے تھے اور ان بارہ سالوں میں انھوں نے جو کارنامے کیے ہیں، اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد:

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا تعلق اگرچہ باضابطہ طور پر ریاست جموں وکشمیر سے نہ تھا لیکن جموں میں اردو زبان و ادب کو فروغ دینے میں ان کا نمایاں رول رہا ہے۔ان کی پیدائش 5 رستمبر 1918ء کو پاکستان پنجاب کے علاقہ میانوالی

میں ہوئی تھی۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد چونکہ ریاست جموں وکشمیر میں عرصہ دراز تک مقیم رہے اور اپنی بہت ساری تحقیقی وتنقیدی تحریروں کو انھوں نے قیام جموں میں منظر عام پر لایا تھا۔اس لیے جموں کے حوالے سے ان کی ادبی خدمات کا جائزہ لینا بے حد ضروری ہے۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو جموں میں بحیثیت ایک آفیسر، ادیب، پروفیسر کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا تھا انھیں ابتداء سے ہی شعر وشاعری کا شوق تھا چونکہ وہ اپنے والد تلوک چند محروم جو اپنے دور کے ایک بڑے شاعر تھے۔ان کے ساتھ بہت سارے مشاعروں میں جگن ناتھ آزاد کو شرکت کرنے کے مواقع فراہم ہوئے، جہاں سے انھیں شاعری کا شوق پیدا ہوا۔انھیں پہلی بار غالباً 1938-39 میں مشاعرے میں جانے کا موقع ملا اس کے بعد سے وہ شاعری میں کافی مشغول ہو گئے۔

آزادی سے پہلے ہی جگن ناتھ آزاد جموں میں اپنی شخصیت اور اپنی تخلیقی کاوشوں سے قارئین میں اپنا نام کما چکے تھے۔1947ء کے بعد سے وہ پاکستان پنجاب سے منتقل ہو کر جموں وکشمیر میں چلے آتے تھے اور پھر آخر عمر تک یہی کے ہو کر رہ گئے۔انھوں نے اپنی شاعری کے حوالے سے بہت سارے حب الوطنی کے گیت بھی لکھے تھے۔یہ تمام گیت انھوں نے جموں وکشمیر کے وزیر اعظم شیخ محمد عبداللہ کی فرمائش پر لکھے تھے تا کہ ریاست میں اور پورے ملک میں امن و شانتی اور حب الوطنی کا جذبہ قائم رہے۔

1949ء کے بعد جگن ناتھ آزاد نے پہلی بار 1949ء میں کل ہند مشاعرے کشمیر میں شرکت کی تھی۔ان مشاعروں میں جگن ناتھ آزاد سے جن شاعروں سے ملاقات ہوئی تھی ان میں خاص طور پر جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری، ساغر نظامی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔اس کے بعد 1955ء میں کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر، اے۔ فیضی کی دعوت پر اقبال پر تین توسیعی لیکچر دیئے اور بعد میں ''اقبال اور اس کا عہد'' کے عنوان سے 1960ء میں یہ کتابی شکل میں منظر عام پر آئے۔

1968ء میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد کو گورنمنٹ کی جانب سے ڈپٹی پرنسپل انفارمیشن بیورو کی حیثیت سے وادیٔ کشمیر میں جانے کا حکم دیا گیا تھا۔اس کے بعد 1973ء میں انھیں شعبے کا ڈائرکٹر پبلک ریلیشنز بنا دیا گیا اور 1977ء میں وہ اس عہدے سے سبکدوش ہو کر جموں میں آ گئے اور بعد ازاں انھیں جموں یونیورسٹی میں شعبہ اردو کی صدارت سونپ دی گئی جہاں انھوں نے اپنے اسٹاف کو شامل کر بڑی محنت اور لگن سے کام کیا۔1983ء تک وہ اس عہدے پر فائز رہے

۔1984ء میں جموں یونیورسٹی کی جانب سے انھیں ایمریٹس فیلوشپ بھی جاری کی گئی جو انھیں پوری زندگی نصیب ہوتی رہی۔اس دوران انھیں کئی انعامات و اعزازات سے بھی نوازا گیا اور اسی یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹریٹ ان لٹریچر کی اعزازی ڈگری سے بھی نوازا گیا۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے بالخصوص جموں یونیورسٹی کو بلند مقام حاصل کروایا تھا ۔ان کی ہی کوششوں کی وجہ سے بیرون ممالک جیسے روس، امریکہ، کنیڈا، برطانیہ، مصر، یورپ، فرانس وغیرہ میں جموں یونیورسٹی کا نام روشن ہوا۔انھوں نے جموں یونیورسٹی کے صدارت کے دوران بہت سارے ادبی پروگرام کروائے تھے۔ جن کی وجہ سے ملک اور بیرون ممالک کے بہت سارے اردو سے تعلق رکھنے والی عظیم شخصیتیں جموں یونیورسٹی میں شرکت کرتی رہیں۔جن میں خاص طور پر قرۃ العین حیدر، علی سردار جعفری، رشید حسن خان، پروفیسر تھمسن، ڈاکٹر نینا گوری شنیا، وکٹر بالن وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد شاعری اور نثر دونوں میں مہارت رکھتے تھے۔ان کی نثر نگاری میں ایک منفرد مقام ہے۔ ان کی نثری تصانیف میں خاص طور پر ''تلوک چند محروم'' (تالیف) ''اقبال اور اس کا عہد'' یہ ان کی اقبال پر دیے گئے توسیع لیکچر ہیں۔ان کی یہ کتاب پہلی بار 1989ء میں لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ان میں مصنف نے دریا کو کوزے میں بند کرنے کا کام کیا ہے کیونکہ یہ کتاب زیادہ ضخیم نہیں ہے صرف 136 صفحات پر مشتمل ہے۔مگر اس کے باوجود بھی اقبال کے حوالے سے بہت زیادہ معلومات حاصل ہو جاتی ہے۔اور پورے برصغیر میں اس تصنیف کی مقبولیت ہوئی۔اس کتاب میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے جن تین عنوانات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا ان میں ''شعر اقبال کا ہندوستانی پس منظر''، ''اقبال کے کلام کا صوفیانہ لب ولہجہ'' اور ''اقبال اور اس کا عہد'' قابل ذکر ہیں۔ان تینوں تحریروں میں مصنف نے اقبال کے فکر و فن اور اہم پہلوں پر بہت ہی بہترین انداز میں روشنی ڈالی ہے۔جگن ناتھ آزاد کی تحریروں کا جائزہ لیتے ہوئے محمد ایوب واقف اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

> ''اقبال کے تعلق سے جگن ناتھ آزاد کے قلمی وتحریری جہاد کے بعد اب ہم دیکھ بھی رہے ہیں اور محسوس بھی کر رہے ہیں کہ کل تک ہندوستان میں جس اقبال کا نام لینا بھی جرم سمجھا جاتا تھا اور آج کے اقبالیے ماضی میں جس کے حوالوں سے بھی گھبراتے تھے اب وہ زبان وزد خاص وعام ہو گیا ہے''۔(7)

اس کے علاوہ ''میرے گزشتہ روز شب'' یہ تصنیف ان کی خودنوشت سوانحی عمری ہے۔اس کے علاوہ اردو ادب میں ان کی متعدد کتابیں منظر عام پر آچکی ہے۔

جگن ناتھ آزاد کو ماہر اقبالیات کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔اس لیے کہ انھوں نے ''اقبال اوراس کا عہد'' میں اقبال کے جن کارناموں کو منظر عام پر لایا ہے قابل تعریف ہے۔اس موضوع کی وجہ سے جگن ناتھ آزاد کا نام ماہرین اقبال میں شمار کیا جاتا ہے۔دوران کشمیر میں جگن ناتھ آزاد کو بہت ہی پرسکون اور ادبی ماحول راس آیا اور انھوں نے ایک طرف اپنی ملازمت کو بخوبی نبھایا اور دوسری طرف انھوں نے اپنی تحقیقی تنقیدی کاوشوں کو بھی برقرار رکھا۔1975ء میں مصنف نے اپنی ایک نئی کتاب ''اقبال اور مغربی مفکرین'' کے عنوان سے منظر عام پر لائی۔اس تصنیف کی وجہ سے انھوں نے اہل علم کو بہت ہی حیرت میں ڈال دیا اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ اس موضوع پر پہلے باضابطہ طور پر کوئی کتاب منظر عام پر نہیں آئی تھی۔''اقبال اور مغربی مفکرین'' میں جگن ناتھ آزاد نے پوری طرح سے ظاہر کر دیا ہے کہ پوری فکر ونظر کے ان سرچشموں کی طرف توجہ دینے سے زیادہ اقبال نے ایسی باتوں کی طرف توجہ دی ہے،جس سے علم و دانش کے راستے کھل سکیں۔جس میں علامہ اقبال پوری طرح سے کامیاب بھی ہوئے تھے۔''اقبال اور مغربی مفکرین'' جگن ناتھ آزاد کی کتاب نہ صرف ہندوستان بلکہ پاکستان میں بھی کافی شہرت حاصل کر چکی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کے کئی ایڈیشن منظر عام پر آچکے ہیں۔جن میں ایک ایڈیشن پاکستان کی جانب سے بھی منظر عام پر آیا۔اس کے نئے ایڈیشن میں ایک اور مقالہ ''اقبال اور آئین سٹائن'' کے عنوان سے شامل کر دیا گیا ہے،جو کافی دلچسپ اور قابل تعریف ہے۔

جگن ناتھ آزاد کی کتابیں:اجنتا،آنکھیں ترسیاں ہیں،پشکن کے دیس میں،تعمیر فکر،فکر اقبال کے بعض اہم پہلو، نسیم حجاز،نوائے پریشان،کہکشاں،ہندوستان میں اقبالیات قابل ذکر ہیں۔اس کے بعد 1977ء میں سرینگر میں ایک اور کتاب ''اقبال اور کشمیر'' منظر عام پر آئی۔یہ بھی اس موضوع پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب تھی۔اسی دور میں اقبال کی شخصیت پر بہت سارے قلمکاروں کی کتابیں منظر عام پر آئی مگر جس طرح سے جگن ناتھ آزاد نے اقبال کو پیش کیا ہے شاید ہی کوئی دوسرا کر پایا ہے۔''اقبال اور کشمیر'' ان کی مشہور کتابوں میں سے ایک ہے جو تقریباً 212 صفحات اور سترہ مضامین پر مشتمل ہے۔یہ کتاب دوسری بار 1985ء لاہور سے شائع ہوئی تھی۔علامہ اقبال کا تعلق سرزمین کشمیر سے ایک روحانی تھا اور چونکہ اقبال کے اجداد کشمیری الاصل تھے اس لیے بھی انھیں کشمیر سے محبت تھی۔''اقبال اور کشمیر'' جگن ناتھ آزاد نے اپنے عزیز دوست درگا پرساد دھر کی فرمائش پر لکھی تھی جیسا کہ اس کتاب میں انھوں نے خود بھی ذکر کیا ہے:

''میرے مرحوم دوست جناب درگا پرساد دھر نے اقبال سمینار (حیدر آباد) کے دوران انعقاد میں میرے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ وہ اور میں مل کر اقبال اور کشمیر کے عنوان سے ایک کتاب لکھیں۔ میں نے اس تجویز پر لبیک کہی اور اس سلسلے میں دہلی میں ان کے ساتھ تین چار بار ملاقاتوں میں اس موضوع پر خاصی بحث رہی۔لیکن اس سے پہلے کہ ہم دونوں باہمی اشتراک عمل سے اس کام کی ابتداء کرتے درگا پرساد دھر چندروز بیمار رہ کر ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو گئے''۔(8)

جگن ناتھ آزاد کا ''اقبال'' پسندیدہ اور محبوب موضوع تھا اور سر محمد اقبال کی شخصیت کا انھوں نے گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔انھوں نے اقبال کے حوالے سے بہت ساری معلومات فراہم کرائی ہے۔انھوں نے نہ صرف محمد اقبال کے سفر کشمیر کو زیر بحث لایا ہے بلکہ اقبال دوران کشمیر مہاراجاؤں سے بھی ملاقاتیں کرتے تھے اور اقبال کی مہمان نوازی کو بھی جگن ناتھ آزاد نے دکھایا ہے۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مہاراجہ پرتاپ سنگھ سے اقبال کے اچھے مراسم تھے۔غرض کہ جگن ناتھ آزاد نے اقبال کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی دوران کشمیر کی تمام چیزوں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔اقبال بار بار کشمیر میں آنا چاہتے تھے مگر جون 1921ء کے بعد وہ کشمیر میں نہ آسکے اور ان کو بہت ساری خواہش اور امیدیں جنہیں وہ کشمیر میں جا کر پورا کرنا چاہتے تھے، ان کو پورا نہ کر پائے۔اس بات کا ذکر جگن ناتھ آزاد نے بھی اپنی کتاب ''اقبال اور کشمیر'' میں کیا ہے اور خود علامہ اقبال نے بھی 1937ء میں ایک خط کے ذریعے سے سید غلام میراں شاہ کو کہی تھی۔اس حوالے سے پروفیسر جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں:

''اقبال جون 1921ء کے بعد دوبارہ کشمیر نہ آسکے لیکن کشمیر اور ذکر کشمیر ان کے اوراق تصانیف میں آخر تک جگمگاتے رہے۔ایک بار پھر کشمیر آنے کی خواہش اقبال کے دل میں کس شدت سے موجود تھی اس کا بیان میرے لیے لفظوں میں ممکن نہیں''۔(9)

پروفیسر جگن ناتھ آزاد 1970 کے بعد سے مختلف علمی و ادبی کمیٹیوں،اداروں میں شرکت کرتے رہے۔انھیں عالمی سطح پر ایک شاعر، ماہر اقبالیات، ادیب، نقاد، محقق کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔اور تقریباً 150 سے زائد انعامات و اعزازات سے بھی انھیں نوازا جا چکا ہے۔

جگن ناتھ آزاد کی ادبی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے انھیں صرف جموں سے وابستہ رکھنا ایک ناانصافی ہوگی

چونکہ انھوں نے جموں یونیورسٹی میں رہتے ہوئے پوری ریاست میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ اگر چہ جموں وکشمیران کا آبائی وطن نہ تھا مگر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس ریاست سے انھیں والہانہ لگاؤ تھا۔

علامہ اقبال کی شخصیت اورفن پر طرح طرح کی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں برصغیر ہند و پاک میں اہل قلم نے اقبال کے موضوع پر مختلف طرح کی معلومات فراہم کی ہے۔ ان نامور شاعروں، ادیبوں اور ماہرین اقبالیات میں ایک اہم نام جگن ناتھ آزاد کا بھی اہمیت کا حامل ہے۔ ان متذکرہ بالا تصانیف کے علاوہ مصنف نے جو اقبال کے موضوع پر کتابیں تحریر کیں ہیں ان میں اقبال کی کہانی، اقبال کی زندگی اور شخصیت، بچوں کا اقبال، مرقع اقبال، فکر اقبال کے بعض اہم پہلو، محمد اقبال ایک ادبی سوانح حیات، ہندوستان میں اقبالیات، ترجمہ جاوید نامہ، رودادِ اقبال (پانچ جلدیں)، اقبال زندگی اور فکروفن قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ دوسری کئی موضوعات پر جگن ناتھ آزاد کی پچاس سے زائد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ اس وجہ سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ جگن ناتھ آزاد نہ صرف جموں وکشمیر کے حوالے سے اہم رول ادا کرتے ہیں بلکہ اردو زبان وادب میں وہ ایک اہم شخصیت کے مالک ہیں۔ آخر میں 24/جولائی 2004ء کو یہ ادبی تارہ 85 سال کی عمر گزار کر ہمیشہ کے لیے ابدی نیند سو گیا۔

جموں یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں پروفیسر گیان چند جین نے اپنی نگرانی میں بہت اچھے اچھے مقالے مکمل کروائے ہیں جن میں بہت سارے مقالے اب تک کتابی شکل میں منظر عام پر آچکے ہیں۔ پروفیسر گیان چند جین کی نگرانی میں جو مقالے مکمل ہوئے ہیں ان کی فہرست مندرجہ ذیل ہیں:

1. ''محروم کی شاعری'' کے حوالے سے سب سے پہلا مقالہ پروفیسر گیان چند جین کی نگرانی میں لکھا گیا تھا جس کو بعد میں یوپی اردو اکیڈمی کی جانب سے 1977ء میں شائع کیا گیا تھا۔
2. ''نریش کمار شاد شخصیت اور شاعری'' کے عنوان سے کیلاش کمار نے اپنا مقالہ پروفیسر گیان چند جین کی نگرانی میں 1970ء میں مکمل کیا تھا۔ یہ مقالہ پانچ ابواب اور 155 صفحات پر مشتمل ہے۔
3. ''اردو پر گاندھی کا اثر'' کے عنوان سے تہمنہ اختر نے 1971ء میں اپنا مقالہ پروفیسر گیان چند جین کی نگرانی میں مکمل کیا تھا۔ ان کا یہ مقالہ تقریباً 152 صفحات پر مشتمل ہے۔
4. علی عباس حسینی، حیات اور کارنامے'' کے عنوان سے تہمنہ اختر کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔ جو انھوں نے 1979ء میں پروفیسر گیان چند جین کی نگرانی میں مکمل کیا تھا۔ اس مقالے کو مصنفہ نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں

انھوں نے علی عباس حسینی کی شخصیت کو پیش کیا ہے اور دوسرے حصے میں انھوں نے علی عباس حسینی کی ادبی خدمات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ان کا یہ مقالہ کل 430 صفحات پر مشتمل ہے۔

صوبہ جموں میں شعبہ اردو نے 1965 میں اپنا قیام کے بعد سیمیناروں اور ادبی کانفرنسوں،توسیع خطبوں،مختلف ڈگریوں کے لئے باقاعدہ تحقیقی وتنقیدی کام کرانے کا سلسلہ شروع کر کے اردو تنقید کے ارتقا کی منزل کو ہموار کیا انہی کوششوں کو کی بنا پر 1965 کے بعد اس خطے میں بہت سے اہم کام تحقیقی وتنقیدی کام کرانے کا سلسلہ شروع کر کے اردو تنقید کے ارتقا کی منزل کو ہموار کیا۔1965 کے بعد اس خطے میں بہت سے اہم کام تحقیقی اور تنقیدی حوالے سے کیے گئے کیونکہ اب آنے والی نسلوں کے لیے اس میدان میں بہت سارا مواد اکٹھا ہو چکا تھا جس سے وہ اپنی تحقیقی وتنقیدی کاوشوں کو بڑی آسانی کے ساتھ منظر عام پر لا سکتے تھے شعبہ اردو جموں یونیورسٹی کی جانب سے اب تک جتنا تحقیقی وتنقیدی کام انجام تک پہنچا ہے اس کی فہرست مندرجہ ذیل ہے۔

1۔"تلافی" افسانوی مجموعہ پروفیسر ظہور الدین،1964ء

2 "مرحوم کی شاعری"1967 از پروفیسر ظہور الدین مطبوعہ

3۔اردو ڈرامہ جموں وکشمیر میں 1968ء از جتندر شرما غیر مطبوعہ

4۔عجائب القصص,1949 ایڈیشن روحی غیر مطبوعہ

5۔نقوش غالب,1949 مرتبہ گیان چند جین مطبوعہ

6۔نریش کمار شاد،حیات اور شاعری 1970 از کیلاش کمار غیر مطبوعہ

7۔اردو پر گاندھی کا اثر 1971ء از تخمینہ اختر غیر مطبوعہ

8۔تفسیر غالب,1971 از گیان چند جین مطبوعہ

9۔بیسویں صدی کے اردو ادب میں انگریزی کے ادبی رجحانات 1972ء از ظہور الدین مطبوعہ

10۔تجزیے 1973ء از گیان چند جین مطبوعہ

11۔لسانی مطالعہ 1973 از گیان چند جین مطبوعہ

12۔،جموں وکشمیر میں اردو شاعری 1947 سے 1973ء تک جاوید قاضی غیر مطبوعہ

13۔ریاست جموں وکشمیر میں اردوافسانہ 1973ء اسداللہ نوانی غیر مطبوعہ

14۔جموں وکشمیر میں اردوناول 1974ء محمد شریف ملک غیر مطبوعہ

15۔،اردو میں تمثیل نگاری 1975ء از ڈاکٹر منظر اعظمی مطبوعہ

16۔انشاءاللہ خان دہلوی حیات،شخصیت اوراردوشاعری میں ان کا حصہ مقالہ(برائے پی ایچ ڈی)،1975ء از ڈاکٹر ایس ایل کالرہ

17۔تفکرات 1976ء از ظہورالدین مطبوعہ

18۔صوبہ جموں میں صحافت 1976ء از عبدالرحمٰن رونیال غیر مطبوعہ۔

19۔رسالہ جامعہ کا وضاحتی اشاریہ 1928 سے 1976 تک،صرف 213 رسالے از تسنیم اختر نواز،غیر مطبوعہ

20۔چراغ راہ 1976ء از ڈاکٹر منظر اعظمی مطبوعہ

21اقبال اور کشمیر 1977ء از پروفیسر جگن ناتھ آزاد مطبوعہ

22۔اقبال زندگی شخصیت اور شاعری 1977ء از جگن ناتھ آزاد مطبوعہ

23۔مرقع اقبال 1977ء جگن ناتھ آزاد مطبوعہ

,24۔اردوریڈیو فیچر 1977 از پروفیسر جگن ناتھ آزاد۔

,25۔بچوں کا اقبال 1977 از پروفیسر جگن ناتھ آزاد مطبوعہ

26۔بڑی چھوٹی کہانیاں از ظہورالدین 1978ء

27۔مالک رام سوانح اور ادبی خدمات 1978ء از کنول کمار دگل غیر مطبوعہ

,28۔پشکر ناتھ حیات اور کارنامے،1977 از رام دتیہ چاڑک غیر مطبوعہ

29۔علی عباس حسینی حیات اور کارنامے 1977ء از ڈاکٹر تہمینہ اختر مطبوعہ

30۔ل۔احمد حیات اور کارنامے 1977ء از ڈاکٹر محمد اقبال غیر مطبوعہ

31۔،نقطے اور شوشے 1980،از ڈاکٹر ایس۔ایل۔کالرہ مطبوعہ۔

32۔،اقبال مغربی مفکرین، پاکستان ایڈیشن1980،از پروفیسر جگن ناتھ آزادمطبوعہ

33۔،کینی بلز افسانوں کا مجموعہ 1981ءازڈاکٹرظہورالدین

34۔،آنکھیں ترستیاں ہیں1981،از پروفیسر جگن ناتھ آزادمطبوعہ

35۔کولمبس کے دیس میں امریکہ اورکینیڈا کا سفرنامہ جگن ناتھ آزاد1981

,36۔فکر اقبال کے بعض اہم پہلو,1982از پروفیسر جگن ناتھ آزادمطبوعہ

,37۔نشان منزل1982،از پروفیسر جگن ناتھ آزادمطبوعہ

38۔،ٹھاکر پونچھی حیات اور کارنامے1982،ازڈاکٹرمحمد شریف ملک غیرمطبوعہ

39۔،اردو میں علامتی افسانہ1940کے بعد1982 تک از کلدیپ کمار گپتا غیرمطبوعہ

40۔جموں میں اردو کی ادبی انجمنیں1982ءازراج سنگھ غیرمطبوعہ

41۔شخصیت نگاری جگن ناتھ آزاد1982ء ناشرمکتبہ عالیہ اردو بازار لاہور پاکستان

42۔فکر اقبال کے بعض اہم پہلوجگن ناتھ آزاد1982ءناشر شیخ غلام محمد

,43۔علامتی افسانہ1960کے بعد مقالہ برائے ایم فل نگران ڈاکٹرظہورالدین مقالہ نگار کلدیپ کمار گپتا1982ء۔

,44۔گوپال متل کی شاعری1983ء ازڈاکٹرضیاءالدین غیرمطبوعہ

,46۔پونچھ کے کچھ ادیب,1983ءازڈاکٹر کرن جیت سنگھ غیرمطبوعہ پروفیسر محمد مجیب کی ڈرامہ نگاری وید یوسنگھ غیرمطبوعہ

47۔پروفیسر محمد مجیب کی ڈرامہ نگاری1983،ءازوجے دیوسنگھ غیرمطبوعہ

48۔اقبال کا ذہن اور ہنر1983، پروفیسر جگن ناتھ آزاد غیرمطبوعہ

,49۔شیخ عالم1983 محمد اسداللہ وانی ناشر مرزا پبلیکیشنز سرینگر

,50۔حقیقت نگاری اورڈراماڈاکٹرظہورالدین1984ء

51۔جموں میں اردو زبان کا آغاز وارتقاءازظہورالدین,1985ء

52۔ایک چادر میلی سی کا تنقیدی جائزہ 1985ء، از رتن لعل

,53۔پنڈت میلا رام وفا حیات وخدمات 1985ء از تیرتھ رام شرما

54۔منور لکھنوی حیات اور کارنامے ایک تنقیدی جائزہ 1985ء از راج سنگھ ڈوال

,55۔محمد اقبال ایک ادبی سوانح 1985ء پروفیسر جگن ناتھ آزاد ناشر ماڈرن پبلیشنگ ہاؤس گولا مارکیٹ دریا گنج نئی دہلی

56۔اقبال کی شاعری اور فلاسفی 1985ء یونیورسٹی آف میسور

57۔ذوق اور محمد یاسین آزاد 1985ء از ڈاکٹر شام لعل کالرہ ناشر ادارہ فکر جدید نئی دہلی۔

,58۔فیض احمد فیض کی شاعری ایک مطالعہ 1985ء از ڈاکٹر نصرت چودھری ناشر شافی پبلیکیشنز سرنگر

,59۔کرشن چندر کے ناولوں کی سماجی اور نفسیاتی جہتیں 1986ء از کرن جیت سنگھ

60۔پشکن کے دیس میں روس کا سفر نامہ 1986ء از پروفیسر جگن ناتھ آزاد ناشر مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نگر نئی دہلی

,61۔جدید اردو ڈرامہ 1987 از ظہور الدین

,62۔اردو کی آپ بیتیوں اور شخصی یاداشتوں کا جائزہ ,1987ء از رام دتہ چاڑک

,63۔حیات مرحوم فن اور شخصیت 1987ء جگن ناتھ آزاد ناشر انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی

64۔اسالیب نثر پر ایک نظر 1987ء مرتبہ ڈاکٹر ضیاء الدین

65۔جموں میں اردو زبان وادب کا ارتقا 1988ء از پروفیسر ظہور الدین

,66۔بلونت گارگی بحیثیت ڈرامہ نگار 1988ء از وید پال

67۔جموں میں اردو تالیف از پروفیسر ظہور الدین 1988ء

68۔نرسنگھ داس نرگس کی صحافتی خدمات ,1988ء رنجیت ورما

,69۔اقبال کی کہانی، 1988ء۔

جموں یونیورسٹی کے علاوہ جموں میں بہت سارے اداروں نے اردو زبان وادب کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا ہے۔اسی طرح سے جموں سے نکلنے والے رسائل وجرائد کا بھی اہم رول رہا ہے۔راقم الحروف نے پہلے باب میں

جموں سے نکلنے والے رسائل وجرائد کا جائزہ پیش کیا ہے۔اس کے علاوہ جموں کے حوالے سے جن رسائل وجرائد کا اہم رول ہے ان میں ریاستی کلچرل اکیڈمی سے نکلنے والا رسالہ ''شیرازہ'' کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے اس کے علاوہ ''سنگم'' جس کا انتخاب 1960ء میں ہوا تھا۔اسی طرح سے ''نوری چھم'' 1968ء ''دھنک'' 1971ء وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

دور حاضر میں جموں خطے سے شائع ہونے والے رسالوں میں سہ ماہی ''تسلسل'' جو جموں یونیورسٹی کی جانب سے جاری کیا جاتا ہے اور اس کی شروعات پروفیسر ظہور الدین نے کی تھی۔ضلع راجوری سے خالد کردار کی صدارت میں نکلنے والا سہ ماہی رسالہ ''تفہیم'' اس کے علاوہ ''کشمیر اعظمی'' جو بیک وقت جموں اور سرینگر دونوں جگہوں سے نکالا جاتا ہے اور اسی طرح سے ''اڑان'' کا بھی اہم رول ہے جو جموں خطے سے نکلتا ہے اور اس میں مقامی اور غیر مقامی قلمکاروں کی تحقیقی وتنقیدی تحریروں کو ہر ہفتے میں منظر عام پر لایا جاتا ہے۔

*****

حوالہ جات

(1)Development of Urdu language and literature in Jammu

Region", ,By prof.Zahur Ud Din,p.167

2:''ذکر وفکر''از گیان چند جین،ص61-62

3:''عام لسانیات''از گیان چند جین،ص12

4:''تحقیق کا فن''از پروفیسر گیان چند جین،ص27۔

5:''رموز غالب''از گیان چند جین،ص119

6:''تفسیر غالب''،از گیان چند جین،ص12

7:''اقبالیات آزاد''،از محمد اسداللہ وانی،ص13

8:''اقبال اور کشمیر''از پروفیسر جگن ناتھ آزاد،ص11

9:ایضاً،ص207

اختتامیہ

اختتامیہ

خطہ جموں ریاست جموں وکشمیر کی راجدھانی ہے، گورنمنٹ کے دفتری کام کاج گرمی کے مہینے میں نومبر تا اپریل جموں میں ہوتے ہیں اور اپریل تا اکتوبر سری نگر میں ہوتے ہیں، اس خطے کی خوبصورتی کچھ کم نہیں ہے۔ یہاں پر مختلف مذاہب کے لوگ آپس میں مل جل کر رہتے ہیں اور امن و بھائی چارے کی روایت کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ علاقہ جموں دریائے توی کی پہاڑیوں سے شروع ہوتا ہے اور دریائے چناب جموں سے ہوتا ہوا، علاقہ اکھنور آتا ہے، جو کافی میدانی ہے اور وہاں سے یہ چناب بہتا ہوا ہندوستان کی دوسری ریاستوں میں داخل ہوتا ہے۔

ضلع جموں کو مندروں کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ یہاں مندروں کی کثرت ہے، ڈوگرا حکمرانوں نے اس ریاست میں مذہبی روایت کو قائم رکھا اور کئی محلات اور مندر بھی بنوائے تھے۔ ان میں مہاراجہ رنبیر سنگھ کا بنوایا ہوا "رگھو ناتھ مندر" بہت ہی شاندار ہے اور اس کا کلس اور گنبد سونے کا بنا ہوا ہے، اس کے چاروں اطراف رونق ہی رونق نظر آتی ہے۔ سیاح یہاں سیر و تفریح کے لیے آتے رہتے ہیں اور مندر میں درشن بھی کرتے ہیں۔ نوراتری کے وقت میں اس مندر میں کافی بھیڑ رہتی ہے اور ریاست وہ بیرون ریاست سے کافی تعداد میں لوگ جمع ہوتے ہیں۔ جموں خطے کے دیگر علاقے جیسے بسولی، رام نگر، کٹھوعہ، ادھم پور، رام نگر، ریاسی، سانبہ، رام بن، ڈوڈہ، کشتواڑ، راجوری، پونچھ، بھمبر وغیرہ شامل ہیں۔ بھمبر ریاست چھبال کا دارالحکومت رہا ہے۔

جموں ریاست کی سرمائی راجدھانی ہے۔ صوبہ جموں کے کھنڈرات میں کرمچی، سدھ مہادیو، بلاور، شری ماتا ویشنو دیوی کٹرہ، وغیرہ کے مندر قدیم نمونوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کرمچی کا مندر آریائی دور کا تعمیر کردہ ہے، یہ مندر بھونیشور کے تلک راج مندر سے مطابقت رکھتا ہے اگر چہ بلاور میں جو مندر ہے وہ تعمیر یا بناوٹ کے لحاظ سے قرون سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر اس کا تعلق پانڈو عہد کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ اسی طرح سے سدھ مہادیو کا مندر ڈوگرہ سرزمین کا ایک اہم تیرتھ استھان ہے، یہاں پر ایک ترشول بہت پرانا ہے تقریباً ساتویں صدی میں لگایا گیا تھا۔ اور کٹرا ضلع ریاسی میں شری ماتا ویشنو دیوی کا تیرتھ استھان بہت پرانا ہے، اور یہاں پر بھی لوگ کافی تعداد میں ہر سال درشن کرنے آتے ہیں۔

جہاں تک اردو زبان کی توسیع کا تعلق ہے۔ ڈوگرہ حکمرانوں کا اہم رول رہا ہے، مہاراجہ گلاب سنگھ 1846-1857 اور مہاراجہ رنبیر سنگھ 1857-1885 کے زمانے میں فارسی زبان کو ہی سرکاری زبان کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا، لیکن فارسی کبھی بھی عوام کی زبان نہ بن سکی اس دور میں عوام کے لئے سرکاری دفاتر میں جس زبان کو استعمال کیا جاتا تھا وہ اردو ہی تھی۔ سرکاری سرپرستی ملنے کے ساتھ ہی اردو زبان و شعر و ادب کے حوالے سے بڑی تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کیں۔ اردو ریاست کے تینوں خطوں کے لوگوں کو ملک کے باقی علاقوں سے جوڑنے کا ذریعہ بن گئی، مہاراجہ پرتاب سنگھ نے بذات خود اردو کی ترقی و ترویج کے لیے علمی و ادبی سطح پر خدمات انجام دیں، اور آگے چل کر اسی اردو زبان کو یہاں کے لوگوں نے اپنی مادری زبان بنالیا۔

جموں میں آزادی سے پہلے کے ادیبوں نے اردو نثر کی اصناف جیسے افسانہ، ناول، ڈراما، تحقیق و تنقید، سفرنامہ اور صحافت وغیرہ میں طبع آزمائی کی اور سارے ہندوستان میں اپنی ایک الگ پہچان بنالی۔ جموں میں اگر ہم اردو افسانے کی بات کریں تو اردو افسانے کے ابتدائی نقوش منشی محمد الدین فوق کے لکھے ہوئے مختلف قصوں میں نظر آتے ہیں، اگرچہ ان قصوں کو پوری طرح افسانے کے زمرہ میں نہیں رکھا جاسکتا ہے لیکن پھر بھی ان میں ہلکی سی افسانوی جھلک محسوس ہوتی ہے ۔اس حوالے سے سے پروفیسر قدوس جاوید لکھتے ہیں۔

> " محمد الدین فوق ریاست جموں و کشمیر کے پہلے افسانہ نگار ہیں لیکن اس دعوے کو ثابت کرنے اور اس پر یقین کرنے کے لیے دلائل و شواہد کی ضرورت پیش آئے گی کیوں؟ اس لیے کہ ریاست جموں و کشمیر میں اردو افسانہ نگاری کا آغاز کب اور کس کے ہاتھوں ہوا؟ ابھی تک کسی بھی ادبی محقق یا مورخ نے کچھ نہیں لکھا ہے، عبدالقادر سروری اور حبیب کیفوی سے لے کر محمد یوسف ٹینگ، حامدی کاشمیری اور غلام نبی خیال جیسے دانشوروں کا قلم بھی اس مسئلہ پر خاموش ہی نظر آتا ہے لیکن نہ جانے کیوں محمد الدین فوق کے افسانوں تک ان کی رسائی نہیں ہو سکی (" رسالہ "اعلیٰ تعلیم" جنوری مارچ 2018 صفحہ نمبر "4")

اس متذکرہ بالا اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ محمد الدین فوق کو جموں کا پہلا افسانہ نگار کہا جاسکتا ہے کیوں کہ جموں میں ان سے پہلے کوئی بھی افسانہ نگار نظر نہیں آتا۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "حکایت کشمیر" کے عنوان سے 1928 میں منظر عام پر آیا تھا۔

جب ہم اردو ناوول نگاری کے حوالے سے بات کریں تو اردو ناول نگاری کی بھی ایک بڑی تعداد ملتی ہے جنہوں نے عمدہ ناول تخلیق کیے ہیں، اگر چہ جموں میں اردو ناول کی روایت کوئی زیادہ پرانی نہیں ہے لیکن پھر بھی ناول کی صورت میں جو سرمایہ موجود ہے وہ قابل قدر ہے۔ جموں میں اردو ناول نگاری کے حوالے سے بھی سب سے پہلا نام محمد الدین فوق کا آتا ہے ان کا پہلا ناول "انارکلی" کے عنوان سے 1890 میں لاہور سے شائع ہوا تھا۔ جس میں مصنف نے حسن و عشق کی داستان کو نہایت ہی عمدہ طریقے سے پیش کی ہے، اور ساتھ ہی ساتھ تعلیم نسواں کے فوائد، عورتوں کی جانباز بہادری، مراٹھوں کی جانب داری، ایک عشقیہ قصے کے پیرائے میں دکھائی گئی ہے۔ اس ناول کے بہت سارے قصے حقیقت پر مبنی ہیں۔ اس کے علاوہ محمد الدین فوق کے ناولوں میں " اکبر" ناصح مشفق" "غریب الدّیار"،" نیم حکیم "وغیرہ قابل ذکر ہیں، ناول " اکبر" کو لوگوں نے بہت ہی پسند کیا، یہ بھی تاریخی ناول میں درجہ امتیاز رکھتا ہے۔ کیونکہ اس کے اکثر واقعات بھی حقیقت پر مبنی ہیں۔

ریاست جموں و کشمیر میں انیسویں صدی کے اواخر میں ڈراما نگاری کی ابتدا ہوئی اور خاص طور پر خطہ جموں میں مہاراجہ پرتاب سنگھ کے دور میں رام لیلا کے تہواروں سے ڈرامہ کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ جموں میں ناٹک منڈیوں کی آمد کا سلسلہ بیسویں صدی کے ابتدا میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ ان میں سب سے بڑا اور اہم ڈراما نگار کا آغا حشر کاشمیری ہے وہ بھی دوسرے ڈراما نگاروں کے ساتھ وقتاً فوقتاً جموں میں آتے رہے۔ انہی کی وجہ سے جموں میں اسٹیج ڈرامے شروع ہونے لگے۔ ایسے اداکاروں نے نہ صرف جموں میں اپنا نام روشن کیا بلکہ ملکی سطح پر بھی اپنی اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے۔ ان کے علاوہ جموں سے تعلق رکھنے والے ڈراما نگاروں میں، کے۔ ایل۔ سہگل، اوم پرکاش، سندر، رامانند ساگر وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ڈراما نگاری میں جموں کے حوالے سے یہ بات بہت ہی اہمیت کی حامل ہے کہ تھیٹر کے حوالے سے جموں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس حوالے سے پروفیسر ظہور الدین نے لکھا ہے۔

> " یہاں یہ کہہ دینے میں مجھے کوئی قباحت نظر نہیں آتی کہ انیسویں صدی کے ربعہ آخر کے بعد ریاست میں جہاں تک اردو زبان و ادب یا تھیٹر کا تعلق ہے، جموں کو مرکزی حیثیت حاصل ہوئی، یہی سے اردو کی تھیٹر کی روایات نے اپنے بال پر حاصل کیے۔" (تنقیدی مباحث وتجزیے" از پروفیسر ظہور الدین ص۔ 106.)

محمد عمر نور الہی کا نام نہ صرف جموں میں اہمیت رکھتا ہے بلکہ اردو ڈراما نگاری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے،

ان کی کتاب "ناٹک ساگر" جو 1924 میں لاہور سے شائع ہوئی اس حوالے سے پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں۔

"ناٹک ساگر اردو میں ڈراما اور اسٹیج پر پہلی تصنیف تھی اور جس توجہ اور محنت سے وہ لکھی گئی تھی اس کی وجہ سے ادبی و علمی حلقوں میں اس کی بڑی قدر ہوئی" ("کشمیر میں اردو" جلد دوم۔از عبدالقادر سروری، ص، 472)

یہ دونوں حضرات ڈرامے کے فن سے پوری طرح واقف تھے اور دونوں اسٹیج سے بھی وابستہ تھے، انہوں نے انفرادی طور پر کثیر تعداد میں ڈرامے تخلیق کیے۔نور الٰہی نے بہت سارے اچھے ڈراموں پر تنقیدی مضامین بھی قلم بند کیے، ڈرامے کے حوالے سے "ناٹک ساگر" بھی ان کا ایک اہم ڈراما ہے۔اس کے علاوہ ان حضرات کے ڈراموں میں، ہمہ خاندان، آفتاب" اور" آ بیل مجھے مار" جیسے قابل ذکر ڈرامے ہیں۔محمد عمر کی عرق ریزی کا کمال ہی انھیں منفرد مقام حاصل کرواتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ان کے ڈرامے ترجمے کم اور طبع زاد زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔ان کی تصانیف میں خاص طور پر" روح سیاست"،" جان ظرافت"،" بگڑے دل"،" قزاق"،" خواب پریشان" وغیرہ ترجمے کے حوالے سے اہم تصانیف ہیں۔

ابتدائی دور کے فکشن نگاروں میں اور خاص طور پر جنہوں نے ترقی پسند تحریک میں بھی اہم رول ادا کیا ان میں رامانند ساگر، نرسنگھ داس نرگس، ٹھاکر پونچھی، موہن یاور وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

نرسنگھ داس نرگس کا مشہور ناول" پاربتی" جموں کے مشہور اخبار" چاند" میں پہلی بار 1962 میں شائع ہوا تھا اس کے علاوہ ان کے ناولوں میں" جانکی" اور" نرملا" بھی شامل ہیں۔

ٹھاکر پونچھی کا نام بھی جموں میں اردو فکشن کے حوالے سے بڑا نام ہے۔ان کے افسانوں کے دو مجموعے بہت ہی مقبول ہوئے ہیں۔جن میں" زندگی کی دوڑ" اور" چناروں کے چاند" قابل ذکر ہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے ناول نگاری میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ان کے مشہور ناولوں میں" رات کے گھونگھٹ" پہلا ناول ہے جو 1960 میں شائع ہوا تھا۔ یہ ناول رومانی داستان مبنی ہے، اس کے علاوہ ان کے ناولوں میں" شمع ہر رنگ میں جلتی ہے"،" قفس اداس ہے" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ٹھاکر پونچھی کی تحریروں کا اگر گہرائی سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے، کہ وہ انسانی نفسیات اور سیاسی وسماجی باریکیوں پر گہری نظر رکھتے ہیں، ان کے ناولوں میں سماجی مسائل کی بھرپور عکاسی نظر آتی ہے۔دوسری طرف ان کے ناولوں میں رومانیت بھی موجود ہے۔جموں کے فکشن نگاروں میں موہن یاور کا نام بھی اہمیت کا

حامل ہے، وہ بیک وقت افسانہ نگار، ناول نگار، ڈراما نگار تھے، وسکی کی بوتل"," سیاہ تاج محل" اور" تیسری آنکھ" ان کے بہترین افسانوی مجموعہ ہیں۔ روزنامہ " سندیس" اور" رفتار" بھی ان کی صحافت کے غماز ہیں۔

اسی طرح سے دور حاضر کے فکشن نگاروں میں آنندلہر، پروفیسر ظہورالدین، خالد حسین، مشتاق احمد وانی، زنفر کوکھر وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ آنندلہر کے افسانوی مجموعوں میں "انحراف" پہلا افسانوی مجموعہ ہے جو 1975 میں منظر عام پر آیا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے افسانوی مجموعوں میں خاص طور پر سرحد کے اس پار، 2001, بٹوارہ، 2009, سریشٹا نے بھی یہی لکھا ہے، 2015، اور کوٹ مارشل وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی ناول نگاری کی اگر بات کریں تو ان میں تپسوی کون، 1994، اگلی عید سے پہلے، 1997، مجھ سے کہا ہوتا، 2005، یہی سچ ہے، 2008، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا ایک مشہور ڈراموں کا مجموعہ ہے جو 1988 میں " نروان" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔

پروفیسر ظہورالدین نے اردو زبان وادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی۔ ان کے مشہور افسانوں میں نجات، بدروح، درشہوار، بیگ والا، اور کینی بلز وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کا افسانوی مجموعہ " کینی بلز" کے عنوان سے 1981 میں منظر عام پر آیا اس کے علاوہ افسانوی اور غیر افسانوی ادب کے حوالے ان کی بیس سے زائد تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں۔

خالد حسین نے اردو زبان وادب کے ساتھ ساتھ پنجابی زبان میں بھی افسانے لکھے ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ " ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں" کے عنوان سے پہلی بار 1981 میں شائع ہوا تھا۔ اس مجموعے میں ان کے 33 افسانے شامل ہیں۔ اس کے علاوہ پنجابی زبان میں لکھا گیا افسانوی مجموعہ "ڈونگھے بانیاں دا دکھ" بھی اہم مجموعہ ہے۔ مشتاق احمد وانی کا شمار عصر حاضر کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے اب تک چھ سے زیادہ افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں خاص طور پر ہزاروں غم، میٹھا زہر، اندر کی باتیں، قبر میں زندہ آدمی، کیا حال ہے جاناں، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ زنفر کھوکھر بھی موجودہ دور کی اہم افسانہ نگار ہیں۔ ان کے اب تک چھ افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔

جموں میں اردو فکشن کے حوالے سے جن قلمکاروں نے اہم رول ادا کیا ہے۔ ان کے نام اس طرح ہیں۔ نرسنگھ داس نرگس بی۔ ڈی۔ مل شرما، نشاط کشتواڑی، عشرت کاشمیری، قدرت اللہ شہاب، جگدیش چندر کنول، ٹھاکر پونچھی، اندر جیت لطف، مون یاور، اقبال نرگس، کشوری منچندہ، او۔ پی۔ شرما، کرن کشمیری (دیوراج چوپڑا) بشیر بھدروائی، مالک رام انند، شہباز راجوروی، بہار راجوروی، جوتیشور پتھک، سروال بھلیسوی، نادم کوتالوی، گلزار احمد فدا، اقبال نازش،

عبدالمجید نظامی، تنویر بھدروائی، الفت کاشمیری، دینا ناتھ رفیق، نند گوپال باوا، دھرم چند پرشانت، جگدیش کمل، پشکر ناتھ، برج پریمی، لیش سروج، مدن سنگھ ٹھاکر، مدن موہن شرما، سومناتھ ڈوگرہ، خیراتی لال، ارجن دیو رشک، برج کتیال، وجے سوری، رام کمار ابرول، ویدراہی، پروفیسر ظہور الدین، او۔ پی شرما سارتھی، شاد فرید آبادی، رند بھدرواہی، شاد فرید آبادی، تسکین بڈانوی، قیصر کشتواڑی، راز بھدرواہی، ڈاکٹر عبدالمجید، تمنا منشی، محمد اسلم شہزاد، کرشن چندر، آنند لہر، خالد حسین، اوم پرکاش شاکر، پریمی رومانی، مشتاق بھدروائی، جسونت منہاس، بلراج بخشی، نصیر احمد قریشی، (امین بنجارا) شیخ خالد کرار، مشتاق احمد وانی، طالب حسین رند، زنفر کھوکھر، ڈاکٹر سیدہ نکہت فاروق، راز مناوری، نثار راہی، سہاز راجوری، سوتنتر دیو کوتوال، شام طالب، عبدالسلام بہار، ڈی۔ مینی، اسلم مرزا، اقبال نازش، اقبال شال، مہر طلعت، چاند نارائن چاند، شاہ محمد خان، ایوب شبنم، شیخ آزاد احمد، امتیاز جانی، الطاف کشتواڑی، نواب دین کسانہ، نصرت چودھری، ضیاء الدین وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

باب سوم میں غیر افسانوی اصناف کے حوالے سے اردو صحافت، سفر نامہ اور تحقیق وتنقید کے حوالے سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔

جموں میں اردو سرکاری زبان بننے کے بعد تخلیق کاروں نے سرکار کی اجازت سے اخبار جاری کرنے کی کوشش کی لیکن انہیں ہر بار ناکامی کا سامنا کرنا پڑا مہاراجہ رنبیر سنگھ (1857-1885) کے دور حکومت سے لے کر مہاراجہ پرتاب سنگھ (1885-1924) کے دور حکومت تک یہ کوششیں برابر جاری رہی لیکن ڈوگرہ حکومت نے اس کی اجازت نہیں دی۔ جموں میں اردو صحافت کا آغاز اردو زبان وادب کی ابتدا کے بہت بعد ہوا تھا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ ڈوگرہ حکومت کے دوران ریاست میں کسی بھی صحافی کو اخبارات ورسائل نکالنے کی اجازت نہیں تھی، اس حوالے سے بھی سب سے پہلا نام محمد الدین فوق کا آتا ہے۔ انہوں نے ڈوگرہ حکومت کے دوران اپنی پوری کوشش لگادی مگر پھر بھی انہیں اخبار نکالنے کے لئے اجازت نہیں مل سکی۔ جس کی وجہ سے وہ لاہور چلے گئے اور وہاں سے اپنے اخبارات جاری کرنے لگے۔ ان اخباروں میں سیاسی، سماجی وادبی مسائل پر گفتگو ہوتی رہی، لاہور میں سالک رام سالک ہر گوپال خستہ، محمد دین فوق جیسے صحافیوں نے اہم کردار ادا کیا اس حوالے سے ڈاکٹر برج پریمی لکھتے ہیں۔

> "پنڈت ہرگوپال خستہ اور ان کے بھائی پنڈت سالکرام سالک نے پنجاب سے کشمیر آتے
> ہی مہاراجہ رنبیر سنگھ سے درخواست کی تھی کہ انہیں ایک پریس قائم کرنے کی اجازت دی

جائے اور اخبار نکالنے کی بھی اجازت ملے لیکن ان کی درخواست کو بھی مسترد کر دیا گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے لاہور میں مختلف اخبار جاری کیے" ("کشمیر کے مضامین" از ڈاکٹر برج پریمی،ص۔189-,190)

جموں میں صحافت کا آغاز 1867 میں "بدیابلاس" ہفت روزہ اخبار سے ہوتا ہے جو رنبیر سنگھ کے دور حکومت میں جموں سے شائع ہوتا تھا۔ پروفیسر ضیاءالدین اس بارے میں لکھتے ہیں۔

" صوبہ جموں میں 1867 میں مہاراجہ رنبیر سنگھ نے اخبار" بدیا بلاس" جاری کیا۔"

("اطراف تنقید" از پروفیسر ضیاءالدین ص۔,128)

ابتدائی دور میں، لالہ ملک راج صراف، پروفیسر جگن ناتھ آزاد وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

جموں میں اردو صحافت کے ابتدائی دور کے صحافیوں میں محمد الدین فوق، لالہ ملک راج صراف، نرسنگھ داس نرگس، وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔نرسنگھ داس نرگس کا مشہور ہفت روزہ اخبار" پریم" پہلی بار 1937 میں شائع ہوا۔اس کے علاوہ اللہ راکھا ساغر کا ہفت روزہ اخبار" جاوید" بھی جموں کے ابتدائی دور کے صحافت میں منفرد مقام رکھتا ہے۔

جموں کے پہلے صحافی ہونے کا اعزاز لالہ ملک راج صراف کے سر ہے،سب سے پہلے جموں میں ہی ڈوگرہ حکومت کی جانب سے انھیں اخبار نکالنے کی اجازت ملی تھی۔اورانہوں نے 1924، میں "رنبیر" کے عنوان سے اپنا پہلا اخبار جاری کیا۔اس میں اگر حکومت کے خلاف کوئی بات نہیں لکھی جاتی تھی مگر پھر بھی کبھی کبھی بڑی نرمی سے ریاست میں پیش آنے والے مسائل کو دکھا دیا جاتا تھا۔وہ بنیادی طور پر ایک مشہور صحافی تھے مگر اردو ادب کی دیگر اصناف ادب میں بھی انہوں نے طبع آزمائی کی تھی،اس کے علاوہ انہیں انگریزی میں بھی کافی مہارت حاصل تھی صحافت کے میدان میں انہیں زیادہ دلچسپی تھی اس لیے انہوں نے تعلیم کے فوراً بعد صحافت میں اپنے جوہر دکھائے ،ڈاکٹر برج پریمی اس بارے میں لکھتے ہیں:

"صحافت لالہ صاحب کی گھتی میں پڑی ہوئی تھی"

"(جموں وکشمیر میں اردو ادب کی نشو نما" از ڈاکٹر برج پریمی،ص،175)

ملک راج صراف جموں میں اردو صحافت کے لیے ایک مسیحا بن کے آئے تھے یہی وجہ ہے کہ انہیں ریاست کا "باوائے صحافت جموں وکشمیر" کہا جاتا ہے۔اخبار "رنبیر" کے علاوہ انہوں نے اپنا ایک مشہور رسالہ "رتن" کے عنوان سے 1934 میں جاری کیا تھا، جو صرف بچوں کی کہانیوں کے لئے مخصوص تھا، اس کے علاوہ ان کی دیگر تصانیف میں خاص طور پر، جموں وکشمیر انسا کلو پیڈیا، کشمیر ایر بک، انسانیت ابھی زندہ ہے، میری پاکستان یاترا، پچاس سالہ بطور صحافی، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔دور حاضر کے صحافیوں میں ایس۔ایل۔رازدان کا ہفت روزہ" شاردا" کے عنوان سے 1950 میں شائع ہوا۔اس کے بعد کئی ہفت روزہ اخبارات منظر عام آنے لگے۔جن میں موہن یاور کا" سنگم " اور" رفتار" ہر چرن سنگھ کا" وقت" وید گپتا کا" سویرا" ڈی۔سی۔دیوان کا" شہر ڈگر" وید بھیسن کا" لوک راج" اور وجے سمن کا" چٹان" وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں،اس کے علاوہ میں نے اپنے اس باب میں جموں خطے کے تمام ادبی،، علمی مذہبی رسائل و جرائداور صحافیوں کا ذکر کیا ہے

جموں میں اردو سفرناموں کے حوالے سے بات کریں تو یہاں سب سے پہلا نام، ملک راج صراف کا آتا ہے ان کا سفرنامہ "میری پاکستان یاترا"، 1979 میں شائع ہوا تھا یہ سفرنامہ نہ صرف ان کا بلکہ جموں کے حوالے سے اولین سفرنامہ کا درجہ رکھتا ہے۔اس کے علاوہ جموں کے سفرنامہ نگاروں میں جگن ناتھ آزاد، پرتپال سنگھ بیتاب، پروفیسر شہاب عنایت ملک وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔جگن ناتھ آزاد کے سفرناموں میں خاص طور پر" پشکن کے دیس میں"," کولمبس کے دیس میں" وغیرہ قابل ذکر ہیں پرتپال سنگھ بیتاب کا سفرنامہ" نیپال نامہ "اسی طرح سے پروفیسر شہاب عنایت ملک کے سفرناموں میں" میری لکھنوی یاترا"," مندروں کے شہر سے گوتم بدھ کی سرزمین تک"," یارو عباس کے ساتھ پانچ دن"," سولن کے دیس میں چار دن"," اسفار شہاب" (مجموعہ)،" بازارحسن کے شب و روز" وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

جموں میں اردو تحقیق وتنقید کے شعبوں میں کافی ترقی ہوئی، یہاں پر تحقیقی وتنقیدی کام بہت کم ہوئے ہیں۔تحقیق وتنقید کے شعبوں میں زیادہ کام نہ ہونے کی وجوہات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر برج پریمی لکھتے ہیں,

> "یہ پورا دور ہمارے لکھنے والوں کے لیے عبوری دور تھا اس لیے یہ توقع کرنا کہ ہمارے لکھنے
> والوں نے ادب کی کی جملہ اصناف ......خاص طور پر ادبی تنقید جیسے کم سن شعبے میں اپنا
> جوہر آزمایا ہوگا، بالکل بے جا ہے"

("جموں وکشمیر میں اردوادب کی نشوونما" از ڈاکٹر برج پریمی، ص،72)

جموں میں اردو تحقیق وتنقید کے اولین نقوش ہمیں محمد دین فوق کی تحریروں سے ملتے ہیں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان کا اصل میدان تاریخ نویس کا تھا مگر وہ بیک وقت صحافی، محقق، افسانہ نگار، مورخ تھے۔اردو تحقیق وتنقید کے حوالے سے ان کے بہت سارے تذکرے ہیں، جنہیں ہم براہ راست ادبی تحقیق وتنقید کے زمرے میں رکھ سکتے ہیں۔مثال کے طور پر "یادرفتگاں" تذکرہ علمائے لاہور"،" تذکرہ شعرائے لاہور" اور" تذکرہ اخبارنویساں" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ جموں میں اردو تحقیق وتنقید کے حوالے سے محمد عمرنورالہی اہمیت کے حامل ہیں، خاص طور پران کی کتاب" ناٹک ساگر" یہی سے جموں میں باضابطہ طور پر اردو تحقیق وتنقید کا آغاز ہوتا ہے۔محمد عمر اور نورالہی نے مشترکہ طور پر کئی اہم کارنامے انجام دیے، لیکن ناٹک ساگرفن ڈراما نگاری میں امتیازی خصوصیت کی حامل ہے۔اس کتاب میں ڈرامے کی تاریخ پر تنقیدی انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ناٹک ساگرکو جہاں اردو میں ڈرامہ نگاری کی تاریخ کے لحاظ سے مقبولیت حاصل ہے وہاں اسے ریاست کی اردو تنقید میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔

جموں میں تحقیق وتنقید کے ابتدائی دور میں محمد عمرنورالہی، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، برج پریمی وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔، پروفیسر جگن ناتھ آزاد چونکہ ریاست جموں وکشمیر میں عرصہ دراز تک مقیم تھےاس دوران انہوں نے بہت ساری تحقیقی وتنقیدی کاوشوں کومنظر عام پر لایا تھا اور اپنی نگرانی میں متعدد اسکالروں کی رہنمائی بھی کی تھی ان کے تنقیدی و تحقیقی کاموں میں ان کی پہلی کتاب" اقبال اوران کا عہد 1989" میں لاہور سے شائع ہوئی تھی، اس کے علاوہ میرے " گزشتہ شب وروز" (خودنوشت)" تلوک چندمحروم""اقبال اور کشمیر"،"اقبال اورمغربی مفکرین" جیسی کتابیں قابل ذکر ہے۔

برج پریمی جموں میں تحقیق اورتنقیدنگاروں کے حوالے سے ایک اہم نام ہے، ان کی تحقیقی وتنقیدی تصانیف میں خاص طور پر "حرف جستجو"،" جلوہ صدرنگ"،" ذوق نظر"،" سعادت حسن منٹوحیات اور کارنامے"،" چندتحریریں"،" کشمیر کے مضامین" وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

دور حاضر کے قلم کاروں میں پروفیسرظہورالدین، مشتاق احمد وانی، نصرت چودھری، شہاب عنایت ملک وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

پروفیسرظہورالدین کوجموں میں اردو تحقیق وتنقید کے حوالے سے صفحہ اول میں شمار کیا جاتا ہے، انہوں نے جموں

یونیورسٹی کے شعبہ اردو سے وابستہ نہ صرف خود تحقیقی وتنقیدی مقالات تحریر کیے ہیں، بلکہ بہت سارے ذہین اسکالروں کی بھی اس میدان میں رہنمائی کی ہے،اس حوالے سے ان کی تصانیف میں "بیسویں صدی کے اردو ادب پر انگریزی کے ادبی رجحانات"،"صوبہ جموں میں اردو زبان وادب کی ترقی"،"جدید اردو ڈرامہ"،" کہانی کا ارتقا"وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

مشتاق احمد وانی بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں،مگر تحقیق وتنقید کے حوالے سے انہوں نے بہت ساری تصانیف تحریر کی ہیں، جن میں خاص طورر" تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران"(پی۔ایچ۔ڈی)"2002 آئینہ در آئینہ""2004اردو ادب میں تانیثیت 2013"،"شعور بصیرت"(تحقیقی وتنقیدی مضامین)افہام وتفہیم زبان وادب 2018"(تنقیدی مضامین) "تناظر وتفکر 2019"(تنقیدی مضامین) "نئی تنقیدی معنویت2020" (تنقیدی مضامین)" تنقیدی فکروفن 2021"،" کہکشان خیال2021"وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

نصرت چودھری جموں کی ایک اہم شاعرہ،افسانہ نگار،محقق،نقاد ہیں۔فیض احمد فیض کے شناسائیوں میں ان کا بھی ایک اہم نام ہے،ان کی تحقیقی وتنقیدی تحریروں میں "فیض احمد فیض کی شاعری ایک مطالعہ"،"فیض احمد فیض روایت اورانفرادیت"،"اردو تنقید میں فیض شناسی"،"فیض احمد فیض اور جدید شعری ذہن"،"اردو کے چند اہم افسانوں کا تجزیاتی جائزہ، غیرہ۔ پروفیسر شہاب عنایت ملک دور حاضر کے قلم کاروں میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ان کی تحقیقی و تنقیدی کتابوں میں خاص طور پر قراۃ لعین حیدر کا ناول " گردش رنگ چمن کا تنقیدی جائزہ"(ایم۔فل۔مقالہ) قرۃ العین حیدر بحثیت افسانہ نگار"(پی۔ایچ۔ڈی۔مقالہ)"اردو کا سیکولر کردار"،"جموں وکشمیر میں اردو صحافت ماضی, حال, اور مستقبل"," ارمغان شہاب "نئے امکانات"،"مضامین شہاب"،" وفد بھدرواہی فن اور شخصیت"،" وادی چناب کے چند اہم شعراء"،"ورق ورق آئینہ"،"جموں وکشمیر میں اردو زبان وادب ماضی، حال اور مستقبل" "نئے تنقیدی جائزے"،" چاندنی بیگم ایک جائزہ"،"عصری ادبی تفکرات"وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

جموں میں اردو تحقیق وتنقید کے حوالے سے جن قلمکاروں کا ذکر آتا ہےان میں خاص طور پر" پنڈت دتاتریا کیفی، خوشی محمد ناظر،حنیف ہاشمی، بی۔ڈی۔مل شرما،عبدالمجید نظامی،گلزاراحمد فدا،محمد بشیر،جگن ناتھ آزاد،شام لال کالرا،گیان چندجین،ڈاکٹر منظر اعظمی، پروفیسر ظہورالدین،مشتاق فریدی،منشور بانہالی، رند بھدرواہی، برج پریمی، محمد اسداللہ وانی، مرغوب بانہالی، غلام مصطفیٰ عشرت، نشاط کشتواڑی، عبدالغفار کچلو، اودھے چند ٹھاکر، فاضلی کشتواڑی، غلام رسول

اویسی، سرتاج بھدروائی، فدا کشتواڑی، ریاض احمد نجار، پریمی رومانی، پشکر ناتھ، عرش صہبائی، ہر بھگوان شاد، موہن یاور، نند کمار باوا، مشتاق احمد وانی، ڈاکٹر نصرت چودھری، پروفیسر ضیاء الدین، ڈاکٹر نسیمہ بانو، شہاب عنایت ملک وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔اس کے علاوہ جموں میں مضمون، انشایہ، خطوط، اور ترجمہ نگاری پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

آخر میں جموں میں اردو کے فروغ میں جموں کے ادبی اداروں کا ذکر کیا گیا ہے۔جس میں خاص طور پر ریاستی کلچرل اکیڈمی، شعبہ اردو جموں یونیورسٹی، آل جموں کشمیر ٹیچر ایسوسیشن، ڈوگری سنستھا، مکتبہ اردو ادب وغیرہ پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے۔

*****

کتابیات

کتابیات

نمبر	مصنف	کتاب کا نام	مقام اشاعت	سنہ اشاعت
1	آنند لہر	اگلی عید سے پہلے	کتاب گھر کشمیر	1997ء
2	ایضاً	انحراف	دریائے گنج نئی دہلی	2002ء
3	ایضاً	مجھ سے کہا ہوتا	دریائے گنج نئی دہلی	2005ء
4	ایضاً	یہی سچ ہے	دریائے گنج نئی دہلی	2008ء
5	ایضاً	بٹوارہ	انیس آفیسٹ پرینٹرز دہلی	2009
6	ایضاً	سریشٹا نے بھی یہی لکھا ہے	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی	2015ء
7	اسداللہ وانی محمد	رشی نامہ	جموں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگو یز سرینگر	1982ء
8	ایضاً	شیخ العالم ایک مطالعہ	جموں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگو یز سرینگر	1993ء
9	ایضاً	اقبالیات آزاد	محروم میموریل لٹریری سوسائیٹی ،نئی دہلی	1997ء
10	ایضاً	پریمی رومانی فکروفن	----	----
11	انور پاشا، ڈاکٹر	ہندو پاک میں اردو ناول کا تقابلی مطالعہ	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس نئی دہلی	1992
12	امین بنجارہ	الاؤ	اردو بک ہاوس، جموں	1995ء
13	برج پریمی، ڈاکٹر	حرف جستجو	دیپ پبلیکیشنز سری نگر	1985ء
14	ایضاً	جلوۂ صدرنگ	دیپ پبلیکیشنز سری نگر	1885ء

15	ایضاً	ذوق نظر	رچناپبلیکشنز، جموں	1987ء
16	ایضاً	جموں کشمیر میں اردو ادب کی نشو و نما	نٹی پورہ، سرینگر	1992ء
17	ایضاً	منٹو کتھا	دیپ پبلیکیشنز جموں	1994ء
18	ایضاً	سپنوں کی شام	دیپ پبلیکیشنز جموں	1995ء
19	ایضاً	مباحث	رچناپبلیکشنز، جموں	1997ء
20	ایضاً	پریم ناتھ پردیسی، عہد شخص اور فن	جانی پور، جموں	2009ء
21	بلراج بخشی	ایک بوند زندگی	کلاسک آرٹ پریس، دہلی	2014ء
22	بیگ احساس، پروفیسر	کرشن چندر شخصیت اور فن	ونیتا گرافکس، حیدرآباد	1999ء
23	بشیر بھدرواہی	بھدروہ کی تاریخ وثقافت	کریسنٹ ہاوس پبلی کیشنز، جموں	2010ء
24	پرتپال سنگھ بیتاب	لاہورنامہ (غیر مطبوعہ)	----------	----
25	پریمی رومانی، ڈاکٹر	اوراق	رچناپبلیکشنز، جموں	1981ء
26	ایضاً	برج پریمی ایک مطالعہ	دیپ پبلیکیشنز جموں	1993ء
27	ایضاً	ردعمل	دیپ پبلیکیشنز جموں	1994ء
28	ایضاً	پیش رفت	رچناپبلیکشنز، جموں	2002ء
29	ایضاً	برج پریمی شخصیت اور فن	رچناپبلیکشنز، جموں، نصیب نگر	2003ء
30	ایضاً	میزان	رچناپبلیکشنز، جموں	2006ء
31	ایضاً	اعتراف	رچناپبلیکشنز، جموں	2008ء
32	ایضاً	فکر ونظر	رچناپبلیکشنز، جموں	2012ء

33	پشکر ناتھ	عشق کا چاند اندھیرا	نئی دہلی	1981ء
34	ایضاً	کانچ کی دنیا	دریائے گنج نئی دہلی	1984ء
35	تمنا منشی	حصار	------	------
36	ٹھاکر اچھر چند شاہپوریہ	قدیم ترین جغرافیہ جموں وکشمیر	گلشن پبلیشرز سرینگر	1998ء
37	ٹھاکر پونچھی	قفس اداس ہے	مشورہ بک ڈپو، دہلی	---
38	ایضاً	زندگی کی دوڑ	رسالہ بیسوی صدی دہلی	---
39	ایضاً	ڈیڈی	اتل پبلی کیشنز نئی دہلی	1953ء
40	ایضاً	چاندنی کے سائے	رسالہ بیسوی صدی دہلی	1970ء
41	ایضاً	پیاسے بادل	رسالہ بیسوی صدی دہلی	---
42	ایضاً	شمع ہر رنگ میں جلتی ہے	رسالہ بیسوی صدی دہلی	---
43	ایضاً	یادوں کے کھنڈر	رسالہ بیسوی صدی دہلی	---
44	ایضاً	وادیاں اور ویرانے	مشورہ بک ڈپو، دہلی	---
45	جان محمد آزاد	جموں وکشمیر کے اردو مصنفین	کلچرل اکیڈمی، سری نگر	2004ء
46	جاوید راہی، ڈاکٹر	جموں کشمیر کے قبایل اور ان کی زبانیں	مدینہ چوک سرینگر، کشمیر	2015ء
47	جگدیش چندر ودھاون	منٹو نامہ	جواہر آفیسٹ پرنٹرز، دہلی	1989ء
48	ایضاً	کرشن چندر شخصیت اور فن	مکر جی نگر ایسٹ، دہلی	1993ء
49	جگن ناتھ آزاد، پروفیسر	اقبال اور کشمیر	مکتبہ علم ودانش مزنگ، لاہور	1977ء
50	ایضاً	پشکن کے دیس میں	دریائے گنج نئی دہلی	1986ء

51	چمن لعل بھگت، ڈاکٹر	برج پریمی کی ادبی خدمات	میزان پبلشر، سرینگر	2009ء
52	حامدی کاشمیری، ڈاکٹر	ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب	شیخ محمد عثمان اینڈ سنز سرینگر	2010
53	حبیب کیفوی	کشمیر میں اردو	ڈائرکٹر مرکزی اردو بیورو، لاہور	1979ء
54	حشمت اللہ خان	تاریخ کشتواڑ	کوہ نور بک ہاوس، سرینگر	2016ء
55	خالد حسین	اشتہاروں والی حویلی	ذاکر پبلیکشنز جموں کشمیر	1991ء
56	ایضاً	ٹھنڈی کانگڑی کا دھواں	آرٹ پریس امرتسر	1981ء
57	خلیق انجم	جگن ناتھ آزاد (حیات اور ادبی خدمات)	محروم میموریل لٹریری سوسائٹی، نئی دہلی	1993ء
58	خیراتی لال	پونم کا چاند	----	----
59	زنفر کھوکھر	خوابوں کے اس پار	فیض آفیسٹ پرنٹرس دہلی	1999ء
60	سلیم سالک	جموں وکشمیر کے منتخب اردو افسانے (جلد اول)	میزان پبلشر سرینگر	2011ء
61	شاد فرید آبادی	انور فریدیہ	----	---
62	شہاب عنایت ملک، پروفیسر	اردو کا سیکولر کردار	قاسمی کتب خانہ، جموں	2008ء
63	ایضاً	ورق ورق آیئنہ	میزان پبلشر سرینگر	2009ء
64	ایضاً	جموں وکشمیر میں اردو (ماضی، حال اور مستقبل)	جموں یونیورسٹی	2010ء

65	ایضاً	ریاست جموں وکشمیر کی وادی چناب میں اردو زبان وادب	قاسمی کتب خانہ جموں	---
66	ایضاً	منٹو کی ادبی جہات	میزان پبلشر سرینگر	2012ء
67	ایضاً	اسفار شہاب	قاسمی کتب خانہ، جموں	2020ء
68	شہزاد منظر	کرشن چندر کے دس بہترین افسانے	بک کارپوریشن دہلی	2004ء
69	شہناز قادری ڈاکٹر	اردو کے چند مشاہیر	داستان پبلی کیشنز دہلی	2013ء
70	صابر مرزا، ڈاکٹر	صوبہ جموں کے علاقائی ادب پر اردو کے اثرات	اقرأ پبلیکیشنز سرینگر	2005ء
71	ضیاالدین، پروفیسر	اسالیب نثر پر ایک نظر	دریائے گنج نئی دہلی	1989ء
72	ایضاً	گوپال متل شخص وشاعر	دریائے گنج نئی دہلی	2005ء
73	ایضاً	اطراف تنقید	دریائے گنج نئی دہلی	2006ء
74	ظہور الدین، پروفیسر	حقیقت نگاری اور اردو ڈراما	دریائے گنج نئی دہلی	1984ء
75	ایضاً	جدید اردو ڈراما	دریائے گنج نئی دہلی	1987ء
76	ایضاً	کہانی کا ارتقاء	دریائے گنج نئی دہلی	1999ء
77	ایضاً	جدید ادبی تنقیدی نظریات	دریائے گنج نئی دہلی	2000ء
78	ایضاً	دریا بہ دریا جو بہ جو	دریائے گنج نئی دہلی	2000ء
79	ایضاً	فن صحافت	دریائے گنج نئی دہلی	2006ء
80	ایضاً	فن ترجمہ نگاری	دریائے گنج نئی دہلی	2006ء
81	ایضاً	تنقیدی مباحث وتجزیے	دریائے گنج نئی دہلی	2007ء

82	ایضاً	ساون جلے گا بھادو جلے گا	دریائے گنج نئی دہلی	2007ء
83	ایضاً	Development of urdu language and literature in the jammu region'	گلشن پبلیشرز سرینگر	1984ء
84	عبدالقادر سروری	کشمیر میں اردو	جموں کشمیر کلچرل اکیڈمی	1984ء
85	عمر محمد نور الہی	ناٹک ساگر	اتر پردیس اردو اکیڈمی	1982ء
86	قدرت اللہ شہاب	شہاب نامہ	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس، دہلی	2003ء
87	کشوری منچندہ	تکون کا کرب	جموں کشمیر کلچرل اکیڈمی	1982ء
88	کرن کاشمیری	رات اور زلف	دریائے گنج، نئی دہلی	1982ء
89	کرشن چندر	میری یادوں کے چنار	ادارۂ فروغ اردو لاہور پاکستان	1962ء
90	ایضاً	طلسم خیال	انڈین بک ڈپو نئی دہلی	1982ء
91	گیان چند جین، پروفیسر	تفسیر غالب	جموں کشمیر کلچرل اکیڈمی	1971ء
92	ایضاً	رموز غالب	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی	1976ء
93	ایضاً	ذکر و فکر		1980ء
94	ایضاً	عام لسانیات	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی	2003ء
95	ایضاً	تحقیق کا فن	اتر پردیس اردو اکیڈمی لکھنو	2008ء
96	لیاقت علی، ڈاکٹر	جموں و کشمیر میں اردو ادب	دریائے گنج نئی دہلی	2017ء
97	محمد الدین فوق	حکایت کشمیر	لاہور	1928ء
98	ایضاً	تاریخ اقوام پونچھ	شیخ محمد عثمان اینڈ سنز سرینگر	2009ء
99	مشتاق احمد وانی، ڈاکٹر	ہزاروں غم	میزان پبلیشرز سرینگر	2001ء

100	ایضاً	تقسیم کے بعد اردو ناول میں تہذیبی بحران	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی	2002ء
101	ایضاً	اعتبار و معیار	روشان پرانٹرس دہلی	2011ء
102	ایضاً	اردو ادب میں تانیثیت	ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاوس دہلی	2013ء
103	ایضاً	اندر کی باتیں	میزان پبلیشرز سرینگر	2015ء
104	ایضاً	قبر میں زندہ آدمی	میزان پبلیشرز سرینگر	2019ء
105	ایضاً	تنقیدی فکر وفن	میزان پبلیشرز سرینگر	2021ء
106	ایضاً	میٹھا زہر	---	---
107	ملک راج صراف	انسانیت ابھی زندہ ہے	جے کے آرٹسٹ پرنٹرس دہلی	1980ء
108	:مناظر عاشق ہرگانوی، پروفیسر	پریمی رومانی کی تنقید کا جہان دیگر	تاج کمپنی دہلی	2017ء
109	منشور بانہالی	تاریخ بانہال	کاف پرنٹرس سرینگر، کشمیر	2015ء
110	مولوی حشمت اللہ خان لکھنوی	مختصر تاریخ جموں	قاسمی کتب خانہ جموں	2009ء
111	موہن یارو	سیاہ تاتوی جھلمج محل	سندیش پبلیشرز جموں	1961ء
112	ایضاً		جے کے بک ہاوس، جموں	1962ء
113	مدن موہن شرما	نثار میں تری گلیوں کے	---	---
114	نشاط کشتواڑی	روح نشاط	---	---
115	نصرت چودھری، ڈاکٹر	فیض کی شاعری۔ایک مطالعہ	دریائے گنج نئی دہلی	1984ء

116	ایضاً	فیض احمد فیض۔روایت اور انفرادیت	دریائے گنج نئی دہلی	1995ء
117	ایضاً	فیض افسانہ۔انتخاب اور تجزیے	دریائے گنج نئی دہلی	2002ء
118	نورشاہ	جموں کشمیر کے اردو افسانہ نگار	میزان پبلیشرز سرینگر	2011ء
119	وجے سمن سوسن	رنگمان	---	---
120	وجے سوری	ایک ناؤ کاغذ کی	ہائی وجے پبلیشرز،نئی دہلی	1965ء
121	:ولی محمد اسیر کشتواڑی	ضلع ڈوڈہ کی ادبی شناخت	یاسر گولڈن پبلیشنگ ہاوس،ڈوڈہ	1998ء
122	لیش سروج	زمین پیاسی ہے	دریائے گنج نئی دہلی	1964ء

رسائل وجرائد

نمبر	نام	مقام اشاعت	سنہ اشاعت
1	اعلی تعلیم،سہ ماہی	----	----
2	بازیافت،سالانہ	شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی	2006ء
3	تحریک ادب،سہ ماہی	وارانسی،اتر پردیس،شمارہ،32	2017ء
4	تسلسل،سہ ماہی	جموں یونیورسٹی شعبہ اردو،شمارہ،36	2016ء
5	تعمیر ''ریاست جموں وکشمیر کی سماجی،اقتصادی اور ثقافتی ترقی کا آینہ''	جموں	1999ء
6	جہاد(اخبار)	سیالکوٹ،پاکستان	جون،1950ء
7	چاند(اخبار)	جموں	1944ء
8	دبستان علم وادب،(رسالہ)	علی محمد اینڈ سنز بڈگام،کشمیر	2016ء

9	رتن (اخبار)	جموں	1946ء
10	سب رس، ماہنامہ	ادارۂ ادبیات، حیدرآباد، شمارہ ۱	2022ء
11	سنگم، ماہنامہ	جموں	1964ء
12	شیرازہ، ماہنامہ، گولڈن جوبلی نمبر	جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، سرینگر کشمیر، شمارہ ۵تا۸	
13	ایضاً	جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، سرینگر، کشمیر، شمارہ 5،6	
14	ایضاً ''جموں کشمیر میں اردو افسانہ نمبر''	جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، سرینگر، کشمیر، شمارہ 11,12	
15	ایضاً، ہم عصر ناولٹ نمبر	جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، سرینگر کشمیر	2016
16	ایضاً، جموں کشمیر میں اردو نثر	جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، سرینگر کشمیر	
17	ایضاً، جموں کشمیر میں افسانہ	جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، سرینگر، کشمیر	
18	ایضاً	جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، سرینگر، کشمیر	جولائی 1998ء
19	ایضاً	جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، سرینگر، کشمیر	اگست 2010ء
20	ایضاً، ریاست جموں وکشمیر میں اردو ادب کے پچاس سال		جولائی 1998ء

21	قومی زبان، ماہنامہ	حیدرآباد، شمارہ ۱	2022ء
22	کشمیر عظمیٰ (اخبار)	سرینگر، کشمیر	2019ء
23	لازوال (اخبار)	جموں	29، اکتوبر 2017ء
24	مقتدہ قومی زبان، رسالہ	اسلام آباد	1987ء
25	ہمارا ادب، رسالہ	سرینگر، کشمیر	1959ء
26	ایضاً تنقید نمبر	جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لنگویجز، سرینگر، کشمیر	2013ء
27	ہماری زبان، ہفتہ وار	نئی دہلی	2016ء

شخصی انٹرویز:	تاریخ
1 : پروفیسر ظہور الدین	3، مارچ، 2018
2 : پروفیسر قدوس جاوید	12، مارچ، 2018
3 : ڈاکٹر پریمی رومانی	7، مئی، 2019
4 : ڈاکٹر مشتاق احمد وانی	11، مارچ، 2020
5 : ڈاکٹر محمد اسد اللہ وانی	22، اپریل، 2021
6 : پروفیسر شہاب عنایت ملک	20، اگست، 2021

*****